میر حسن

اور اُن کا زمانہ

ڈاکٹر وحید قریشی
ایم۔اے
پی ایچ ڈی

ڈاکٹر وحید قریشی
ایم اے۔
پی ایچ ڈی

تعداد اشاعت ۱۰۰۰

سنہ اشاعت .... ۸ مئی ۱۹۵۹ء

پرنٹر
پبلشر } ...... محمد شمیم

مطبوعہ ...... استقلال پریس لاہور

میر حسنؔ

ترتیب

حرفِ آغاز

میر حسن پر یہ کتاب میری آٹھ (۸) برس کی محنت کا نتیجہ ہے، غالباً سنہ ۱۹۵۱ء کے آغاز کی بات ہے، جب اس کام کا تہیہ کیا گیا، اور آج کہ سنہ ۱۹۵۹ء آپہنچا ہے خدا خدا کرکے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا، اس دوران میں جن صبر آزما لمحات سے دوچار ہونا پڑا، اس کی رُوداد کا نہ یہ موقع ہے، نہ قارئین کو اس سے کچھ دلچسپی ہو سکتی ہے۔ کچھ میری ہٹ دھرمی، کچھ میرے احباب کی حوصلہ افزائی اور فراہمی کتب کی تگ و دو میں اعانت میرے لئے ان کٹھن منزلوں میں بہت کچھ آسانیاں پیدا کر گئی، اور آج اس کا ثمر آپ کے ہاتھوں میں ہے، یوں تو میرے کرم فرماؤں کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن جن صاحبوں نے اس تحقیقی سفر میں میری بلے دریغ امداد فرمائی ان کا ذکر نہ کرنا بے انصافی ہوگا، سب سے پہلے مجھے ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے برٹش میوزیم کے کلیاتِ میر حسن کا مائکروفلم میرے لئے مہیا کیا، اور علی گڑھ یونیورسٹی کے قلمی نسخوں کے بارے میں مفید اطلاعات بہم پہنچائیں، برلن کے نسخہ تذکرہ مبتلا کے متعلقہ اوراق کا روٹو گراف بھی ان کی عنایت سے میسر آیا، انجمن ترقی اردو کراچی کے نسخوں کی اطلاع ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے دی۔ رامپور کے نسخوں کی کیفیت مولانا امتیاز علی خاں

عرشی، عابد رضا خاں بیدار اور کلب علی خاں فائق کی معرفت معلوم ہوئی۔ لکھنؤ سے مسعود حسن رضوی ادیب اور پٹنے سے قاضی عبدالودود صاحب کی علمی سرگرمیاں میرے لئے روشنی کا باعث بنتی رہیں، ان بزرگوں کی جن تحریروں سے میں نے فائدہ اٹھایا ہے، اس کی مفصل رُوداد کتاب کے حواشی میں ملے گی، جناب عبدالعلیم شیر کوٹی نے کلیاتِ حسن کا قلمی نسخہ عاریۃً دیا۔ ان کا بھی سپاس گذار ہوں، ڈاکٹر محمد صادق اور خلیل الرحمٰن داؤدی کا بھی ممنون ہوں۔

کتاب کی بنیاد معاصر شہادتوں پر رکھی گئی ہے، اس لئے بعض جگہ متاخر مصنفین سے اختلاف بھی کرنا پڑا۔ اورینٹل کالج نے تحقیق کے جن پیمانوں کو فروغ دیا۔ ان میں تاریخ کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے، ادبی تحقیق میں پروفیسر شیرانی مرحوم، ڈاکٹر اقبال مرحوم اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب نے جو مسلک اختیار کیا، اس کی صداقت میرے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتی رہی ہے۔ اس لئے میر حسن کے حالات کی تلاش میں افسانہ طرازی اور عبارت آرائی کو دخل نہیں مل سکتا تھا۔ حقائق کو ان کے خشک واقعاتی تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس مقصد کے لئے تاریخ کا مضمون بڑا مفید ثابت ہوا[1] شاعر کی زندگی کے بعض واقعات کے سنین متعین کرنے کے لئے بسا اوقات

---

[1] میرے لئے یہ میدان ادب کے پسِ منظر کے طور پر بھی اہم رہا ہے اور پیشے کے طور پر بھی۔ منشئ تاریخ میں اتنی مدت (۱۹۵۱ تا ۱۹۵۷) کام کرنے کے باعث تاریخ کی افادیت مجھ پر واضح ہو گئی۔ میرے خیال میں اردو ادب کی تحقیق کا کام تاریخ ہند کے مطالعہ کے بغیر ادھورا رہتا ہے۔

تاریخ کے خارزار میں بھی اُترنا پڑا۔ میرحسن کے فیض آباد آنے کی تاریخ، ان کی پیدائش کا سنہ، معاصرین کے حالات وغیرہ تاریخوں کے صفحات میں بھی بکھرے پڑے ہیں، تاریخ بعض جگہ بلاواسطہ بعض جگہ بالواسطہ مفید ثابت ہوئی۔

پہلا باب تمام تر تاریخی ہے۔ اقتصادی اور سماجی عوامل کے ساتھ ساتھ سیاسی اوضاع و واقعات بھی پیش نظر تھے، انگریزی اور اردو میں بھی اس دور پر مواد ملتا ہے۔ چنانچہ پہلے باب کے ابتدائی حصے کی تعمیر میں زیادہ تر اسی مواد کے حوالے دیئے گئے۔ خصوصًا سرجادو ناتھ سرکار، پروفیسر گپتا، ڈاکٹر سری واستوا، کنکیاٹ، سارڈیسائی کی کتابوں سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ اور ایسے مواقع پر ان کا پابندی سے حوالہ دیا ہے۔ اس میں بلا ضرورت معاصر شواہد کے ذکر سے گریز کیا گیا ہے۔ صرف ان مقامات پر جہاں ان فضلاء سے اختلاف کیا ہے، معاصر حوالوں کو درج کر دیا ہے، لیکن آخری دو تہائی حصے میں (جو میرحسن کا اپنا زمانہ ہے) زیادہ انحصار معاصر بیانات پر ہی کیا گیا ہے اور اس کے حوالے جابجا حواشی میں ملیں گے۔ البتہ معاصرین کی محنت کو یہاں بھی نظر انداز کرنا مناسب نہیں خیال کیا گیا۔

باقی ابواب میں بھی معاصر شہادتیں ہی میرے لئے دلچسپی کا باعث رہی ہیں میرحسن کے اپنے بیانات کو میں نے ہر جگہ ترجیح دی ہے، معاصرین کے بیانات کا نمبر اس کے بعد آتا ہے، جہاں قرائن خلاف گئے ہیں اور واقعات نے ساتھ نہیں دیا معاصر بیانات کو شک و شبے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ واقعات کے سیاق و سباق میں مصحفی کے بیانات بعض جگہ محل نظر تھے۔ یہی حال گلشن ہند کے مولف کا تھا، حسن کے قریبی حلقے کا بیان ان کے مقابلے

میں زیادہ قابلِ لحاظ تھا، کہیں کہیں قیاسات سے بھی کڑیاں ملانی پڑی ہیں، لیکن قیاس کو حتمی دعوے کے طور پر پیش نہیں کیا گیا۔

تنقیدی حصے میں دوسرے ادبا کے بیانات کے دوش بدوش اپنے نتائج کو بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ اورینٹل کالج کے محققین عموماً تنقید سے گریز کرتے ہیں، اور نتائج کی اصل حیثیت سے آگے ان کی فلسفیانہ اور تنقیدی توجیہہ تک نہیں جاتے، یہاں میں نے کچھ جسارت سے کام لیا ہے، تحقیق و تنقید کو میں صرف ایک سائنٹفک عمل (SCIENTIFIC PROCESS) ہی نہیں سمجھتا میرے نزدیک یہ دونوں علم ادبی عمل (LITERARY PROCESS) بھی ہیں، اس لئے اسلوب اور اس کے جاندار ذرائع سے کام لینا بھی میں نے ضروری خیال کیا۔ انداز بیان کی شوخی اگر کہیں زیادہ گہری ہو گئی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔

(ڈاکٹر) وحید قریشی

اسلامیہ کالج سول لائینز
لاہور
۲۱ اپریل ۱۹۵۹ء میلادی

باب اول

مخففات

پہلے باب میں جن انگریزی کتب کا بار بار ذکر آیا ہے، ان کے لئے مندرجہ ذیل مخففات استعمال کئے گئے ہیں۔

اروِن	Later Mughals-2 vols W. Irvine.
بینی پرشاد	The History of Jahangir Beni Persad.
بنیرجی	Humayun Badshah 2 vols Benerji
پرسیوال سپیئر	Twilight of the Mughals P. Spear.
تاریخ لاہور	Lahore past and persent Dr. Baqir.
ٹامسن	The Making of India Princes: Edward Thompson.
گپتا	Studies in later Mughal: history of the Punjab. Ed. 1943. Gupta.
سارڈے سائی	The Main Currents of Maratha History G.S. Sardesai.
سرکار	Fall of the Mughal Empire 4 vols Sir J.N. Sarkar
شجاع الدولہ	Shujaud Daulah 2 vols. The Minerva Book shop LHR. Dr. A.L. Sirivastava. M.A. P.H.D.
کین	The Fall of the Mughal Empire of Hindustan. G.H. Keene.
کیمبرج کی تاریخ	The Cambridge History of India Vol. 5.
کنکیڈ	The history of the Maratha People Vol. 3. Kincaid & Parasius.
مورلینڈ	The Agrarian System of Moslem India. W.H. Moreland

پس منظر

(۱)

اُردو ادب کی ترقی اور عروج کا زمانہ مغلیہ سلطنت کے زوال سے ملا ہوا ہے۔ ایک طرف سیاسی اور تمدّنی انحطاط سُرعت سے پھیل رہا تھا۔ دوسری طرف ادبی لحاظ سے یہ فضا اُردو کے گراں قدر خزائن سے معمور تھی، اِسے تاریک زمانہ کہنا درست نہ ہوگا۔ یہ نہیں کہ انسانی ذہن، دماغ یا ہاتھ نے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ نہ چھوڑا ہو۔ "علم و ادب کی بوقلمونی اور فراوانی اس دور کی رنگا رنگی کا بیّن ثبوت ہے، ادب و فن کی اس ریل پیل کا سیاسی اور تمدنی پس منظر البتہ حوصلہ شکن تھا۔ مغلیہ زوال و انقراض کتنے ہی مختلف النوع اسباب و علل کا نتیجہ ہے، یہ اسباب مغلیہ عروج سے اتنے پیوستہ ہیں کہ کلوسس اپنی ہی عظمت سے دست و گریباں دکھائی دیتا ہے۔

عروج کے دور میں مغل نظامِ حکومت قوت اور حسنِ انتظام کا نمونہ تھا، لیکن اس میں زوال کے آثار بھی تھے، بلدیاتی نظام میں خود مختاری کی کمی تھی، اس لئے بڑے بڑے شہر خانہ جنگیوں اور تخت کے دعویداریوں میں کوئی حصّہ نہ لیتے تھے، لے دے

لہ سرکار، جلد اوّل ص۱۱

کر اک دلی تھی، جس پر قبضہ استحقاق کا کھلا ثبوت بن جاتا تھا، دوسرے شہر اور علاقے دارالخلافے کی تقلید میں غاصب کے قدموں پر جھک جاتے تھے۔ جب تک مرکز کی گرفت مضبوط تھی، یہ خرابیاں ظاہر نہ ہو پائیں لیکن جیسے ہی موت نے عالمگیر کا قوی ہاتھ سلا دیا، دکن میں اس کا مقبرہ بنا اور عظمت و رفعت کے کئی مظاہر زندہ درگور ہو گئے۔"

دوسری خرابی یہ تھی کہ دفتروں کا ایک پیچیدار اور طویل جال پھیلا ہوا تھا، اور سارا نظامِ حکومت ایک فرد واحد (فرمانروا) پر منحصر تھا۔ شاہِ وقت جب تک قوی ہوتا نظام اچھی طرح چلتا لیکن جب مرکز کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی۔ بلاؤں کا نزول شروع ہو جاتا۔ نظامِ حکومت کی بھول بھلیاں مستزاد تھیں دفتروں کی طویل فہرستیں کاغذ پر اچھی معلوم ہوتی ہیں، عملاً کئی مشکلات تھیں، چنانچہ مغل نظامِ حکومت کا چلن بڑی حد تک "اتفاقات" پر منحصر ہو گیا۔ فرمانروا کی ذات اس لئے بھی اہم تھی کہ منصب داری کا انحصار شاہ پر تھا، وہ جسے چاہتا تھا آسمان پر پہنچا دیتا اور جسے چاہتا پاتال میں پھینک دیتا۔ امرا اس کی خوشنودی کے خواہاں رہتے، لیکن یہ اسی صورت میں تھا، جب شاہ قوی ہوتا تاہم منصبداری کو اقتدار کی عارضی منزل سمجھ کر غیر ملکی adventurer عام طور پر عیش و عشرت میں پڑے رہتے۔ دولت بنت سینت کر رکھنا ان کے نزدیک گناہ تھا۔ کیونکہ قوی فرمانروا کے زمانے میں امیر کی وفات پر دولت کا چھن جانا یقینی تھا۔ لیکن بعض اوقات امرا کی خوشنودی

THE central Structure of Mughal Empire میں اس کی پوری تفصیل صفحہ ۳۶ پر درج ہے۔

کے لئے بادشاہ مناصب کو موروثی بنا دیا کرتے تھے۔ کمزور بادشاہوں کے زمانے میں منصبدار خود بھی جاگیرداروں کو موروثی بنانے لگے، اس سے اقتدار کی جنگ اور ہوسِ جاہ زیادہ ہو گئی۔ ساداتِ شاہ گر شجاع الدولہ، نجیب الدولہ اور نجف خاں سب اسی بساطِ سیاست کے مہرے تھے، اقتدار کی جنگ چلتی رہی، لوٹ کھسوٹ اور عیش و عشرت کی گرم بازاری رہی۔ وہ فوجی قوت، جو اکبر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے ہاتھوں میں مغلوں کا سب سے بڑا سہارا تھی، بے مقصد ہونے کے بعد خون آشام ہو گئی۔ عروج کے زمانے میں بھی مغلیہ فوج میں وحدت نہیں تھی، بلکہ وہ متفرق اقوام اور باشندوں کا مجموعہ تھی، مغل، مرہٹے، راجپوت، ایرانی تورانی سبھی افواج میں بھرتی ہوا کرتے، جنہیں فرمانرواؤں سے کوئی جذباتی تعلق نہ تھا، چنانچہ زوال کے زمانے میں یہی فوج خطرناک بن جاتی، سر جادو ناتھ سرکار فوج کی کمزوری کا اس حد تک احساس رکھتے ہیں کہ ان کے خیال میں اورنگ زیب کے زمانے کے بعد سے انفرادی دلیری کی مثالیں بھی نایاب ہیں[1] - لیکن یہ بیان صورتِ حال کا صحیح جائزہ نہیں ہے، یہ دورِ زوال (کم از کم اٹھارویں صدی کا نصفِ ثانی) اعلیٰ درجے کے فوجی افسروں سے خالی نہیں، بس اتنا ہے کہ یہ لوگ سیرت کے اعتبار سے انسان کی بجائے شیطان تھے، قوت کے کھلے اظہار کے سوا ان کے پاس کوئی مقصد نہ تھا، ان کے معرکے تہور اور شجاعت کے اہم کارنامے ہیں[2] یہ دورِ انحطاط کا دور ہے۔ یہ زوال سیاسی اور اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت کا نتیجہ ہے۔ انفرادی عظمت کی غیر موجودگی کا سبب نہیں[3] - شاہوں کی بزدلی البتہ مسلّم ہے، عالمگیر کی متشکک طبیعت کا اقرار، نجیب اشرف اور علامہ شبلی

---

[1] سرکار جلد اوّل صفحہ [2] پرسی دل سپیر صفحہ

جیسے ہمدرد مورخوں کو بھی ہے[۱]۔ عالمگیر کی اولاد اس کی زندگی میں ملکی معاملات میں کوئی نمایاں کارنامہ نہ دکھا سکی، اور تجربے سے محروم رہی، ویسے بھی تخت نشینی کی جنگیں سلطنت کے انقراض کا سبب بنتی رہی ہیں، انتہائے عروج کے دور میں بھی مغلیہ شہزادے جانشینی کے قوانین کی غیر موجودگی کے طفیل آپس میں الجھتے رہے، اورنگ زیب کے بعد جب سیاسی، سماجی، اقتصادی ہر طرح کا انحطاط سلطنت کو تہ و بالا کرنے لگا، مشکلات میں اضافہ ہوتا چلا گیا[۲]۔ اکثر ایسے فرماں روا تخت نشین ہوتے رہے، جو اپنے وقار کے لئے بعض اُمرا کے دست نگر تھے، وہ انہیں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے رہے بادشاہوں میں کم ایسے تھے، جنہیں انتظام سلطنت سے دلچسپی تھی، نہ سلطنت کا اقتصادی نظام غیر ملکی حملوں (نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی) صوبائی بغاوتوں اور گورنروں کی خود مختاریوں کے سبب درہم برہم ہوتا رہا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان کی اقتصادی حالت اکبر کے زمانے سے مسلسل پستی کی طرف جارہی تھی، تو بے جا نہ ہوگا، پھر شاہجہاں کے زمانے میں بہشتی کا شہر آشوب "سوانح کہ در انشائے سنہ ۱۰۶۷ سنہ ۱۰۶۸ دریں عالم کون و فساد بہ ظہور آمدہ" شاہجہاں کے بیٹوں کی خانہ جنگی کے اسباب و علل سے بحث کرنے کے علاوہ اس دور کی اقتصادی حالت پر بھی روشنی ڈالتا ہے[۳]۔ یہ عام دستور تھا کہ مغل حکومت کاشتکاروں سے زیادہ مالیہ وصول کرتی، اگر ایک کاشتکار زمین چھوڑ کر کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرتا تو اسے جبراً اصل پیشے پر واپس لایا جاتا۔ پے در پے حملوں اور اندرونی بغاوتوں (جاٹ، مرہٹے، سکھ، راجپوت وغیرہ) سے ملک کی زمینیں بنجر اور غیر آباد ہوتی گئیں، خاص کر دہلی اور اس کے آس پاس کی حالت اور بھی زیادہ خراب تھی، مورلینڈ نے مغلیہ دورِ عروج میں اقتصادی حالت کا جائزہ

---

[۱] شبلی اورنگ زیب پر ایک نظر ص ۱۴۹ ۔ [۲] نجیب اشرف مقدمہ رقعات عالمگیر، ص ۲، ۱۳۰
صورت حال کی تفصیل کین نے ص ۱۹ پر دی ہے [۳] بحث و نظر ڈاکٹر عبداللہ از مقالہ بعنوان شہر آشوب ص ۱۵۹

لیتے ہوئے اس پر پوری روشنی ڈالی ہے۔[۱۵]

(۲)

اقتصادی بدحالی کے ساتھ اندرونی خلفشار اور بیرونی حملے بھی سلطنت کا شیرازہ بکھیرنے کا باعث ہوئے، اندرونی انتشار کا بڑا سبب مندرجہ ذیل گروہ تھے۔

(۱) مرہٹے
(۲) راجپوت
(۳) جاٹ
(۴) ایرانی (شیعہ)
(۵) تورانی (سنّی)
(۶) افغان
(۷) سکھ

جن کی آپس کی آویزش مُغلیہ سلطنت کو آسودگی سے کوسوں دور لے گئی، ایرانی تورانی مناقشے کی عمر ہندوستان کی تاریخ میں خاصی لمبی ہے، ابتداءً یہ جھگڑا خالصتاً مذہبی جھگڑا تھا۔ ایران میں صفویوں کا عروج شیعہ عقائد کی بزور ترویج کا سبب بنا ماوراء النہر اور افغانستان کا علاقہ اس اثر سے باہر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایران کی تقریباً کُل آبادی شیعہ عقائد اختیار کر گئی، جو لوگ اس سے الگ رہنا چاہتے تھے وہ یا تو افغانستان اور ماوراء النہر کی طرف چلے آئے اور وہاں سے ہندوستان بھی پہنچے یا بعض ترکی کی

---

[۱۵] ہمدرلینڈ حصہ نیز دیکھئے پرسی نل اسپیر صدا

طرف نکل گئے، جہاں ترکانِ عثمانی کا نصیبہ ترقی پر تھا۔ بابر کے زمانے میں شیعہ سنی اختلافات کی ہلکی سی جھلک ہمیں مہدی خواجہ کی بغاوت میں ملتی ہے۔[1] اکبری دور کا حال بھی مختلف نہیں[2]۔ اکبری دور تک ایران میں شیعہ عقائد بڑی سختی سے شکل اختیار کر چکے تھے، صفوی فرمانروا شیعوں کے پیرو بن چکے تھے، ماوراء النہر میں عبداللہ خاں ازبک سنی عقائد و خیالات کو ہوا دے رہا تھا۔ ترکی میں سلطان سلیم نے مصر کے مملوک کو زیر کرنے کے بعد ترکی میں خلافت کی بنا رکھ دی تھی۔ اسی زمانے میں سلیم اور عباس صفوی کے درمیان سیاسی پیکار کا آغاز ہوا۔ سلیم ایشیا کے سنی مسلمانوں کا خلیفہ تھا تو عباس شیعہ مسلمانوں کا۔ ہندوستان میں اکبر کے دینی عقائد اور کارنامے بھی اسی پس منظر میں دیکھے جانے کے محتاج ہیں۔ اکبر کی مذہبی پالیسی کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے شیعہ اور سنی دونوں قسم کے ایران و توران سے آنے والے امرا، شعرا اور علما کی قدر دانی کی اور اقتدار کا توازن سا قائم کئے رکھا لیکن اس کے بعد جیسے جیسے سیاسی اعتبار سے ایران و ہندوستان دور ہوتے گئے، دربار مغلیہ میں ایرانی اور تورانی پارٹیوں کی چپقلش بھی تیز ہوتی چلی گئی (تفصیل کے لئے دیکھئے، راقم کا مقالہ The Indian Persian مطبوعہ Islamic Literature جلد ۷ شمارہ ۵ مارچ ۱۹۵۵ء ص ۱۶۷ تا ص ۱۸۳) جہانگیری عہد میں مہابت خاں کی بغاوت دراصل نورجہاں اور اس کی شیعہ (ایرانی) پارٹی کے خلاف احتجاج تھی[3]۔ آصف خان اور ان کے حواریوں کے طفیل شیعہ پارٹی دوبارہ مضبوط ہوتی جا رہی تھی، سنیوں کے نقشبندی فرقے کا زور عوام میں بڑھ رہا تھا۔[4] چنانچہ شاہجہاں کے زمانے میں بھی یہ کشمکش اسی انداز پر سیاسی رنگ اختیار کرتی رہی، شاہجہان کی اولاد کے درمیان جب تخت نشینی کی جنگ ہوئی تو اورنگ زیب کا ساتھ سنی امرا نے دیا، دارا کی راجپوتوں

---

[1] ڈاکٹر بینرجی جلد اول ص ۱۵۰ [2] ایضاً ص ۱۹ [3] The History of Jahangir by Dr. Beni Parshad [4] رود کوثر (اکرام)

نے شجاع کا شیعہ امرائے اور مراد بیغیر پارٹی کے مختلف امرا کو توڑنے میں لگا دیا[1]۔ جب شاہجہانی عہد میں اورنگ زیب دوسری بار دکن کا گورنر مقرر کیا گیا[2]، اور دکن کی شیعہ ریاستوں سے (ان کی عہد شکنی کے سبب) تعلقات خراب ہوئے، ایرانی حکمرانوں کو شعلہ افروزی کا موقع ملا[3]۔ ایرانی تخت نشینی کی جنگ میں مقصد برآری سے ناکام رہے، اورنگ زیب کی کامیابی نے ۲۴ رمضان ۱۰۶۹ھ (۵ جون ۱۶۵۹ء) کو جلوس شاہی کی بنا رکھی[4]۔ اس کے بعد اسے دارالحکومت میں ایرانی پارٹی کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ایرانی پارٹی کی ہمدردیاں ہمیشہ ایران کی حکومت کے ساتھ رہیں، دکنی پالیسی کے سبب اورنگ زیب نے گولکنڈہ اور بیجاپور کی شیعہ ریاستوں کو ختم کیا[5]۔ تو ایرانی حکومت کے غم و غصہ کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ یہی حال ایرانی پارٹی کا تھا۔ اورنگ زیب کی فتح گولکنڈہ کی وہ طنز سے بھرپور روداد جسے عموماً وقائع نعمت خان عالی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس گرما گرم ماحول کی دست آویز ہے، وقائع ادبی لحاظ سے فارسی کا زندہ جاوید کارنامہ ہے، اس میں ہر سطح کی طنز کا براہ راست نشانہ اورنگ زیب کو بنایا گیا ہے۔ شیعہ سنی کشمکش کا نتیجہ یہ تھا کہ اورنگ زیب نے ۱۰۸۹ھ سے لے کر اپنی وفات تک[6] تورانیوں کی حوصلہ افزائی جاری رکھی[7]۔ ایرانیوں کا وہ تیز رفتار تانتا جو دہلی کی طرف بندھا ہوا تھا عارضی طور پر رک گیا[8]۔ فوج میں تورانیوں کا پلہ پہلے ہی بھاری تھا، اب اس میں اور اضافہ ہوا۔ شاہ نے تورانی امرا کو ترقیاں بھی دینی شروع کر دیں[9]۔

مذہبی اختلاف بالآخر سیاسی اختلاف بن کر رہ گیا۔

---

[1] مقدمہ رقعات عالمگیر۔ نجیب اشرف ص ۲۷ ۲ الم ۲ [2] ۱۵ ربیع الاول ۱۰۶۳ھ = ۳ فروری ۱۶۵۳ء [3] مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۲۱۵ تا ص ۲۷۷ [4] ایضاً ص ۱۸۸ [5] جو مرہٹوں کی پشت پناہی کر کے مغلوں کی سلطنت کو برباد کرنا چاہتی تھیں [6] ۱۷۰۷ء [7] Later Mughals, Irvine vol. I. P. 27 [8] مقالہ اقبال ص ۱۰۵ Islamic Literature March 1954, P. 173 [9] ایضاً

(۳)

اورنگ زیب کو صرف اسی دشمن کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا، بلکہ مقامی قوتیں بھی برسرِ پیکار تھیں، "ہندوستان زا" گروہ جن میں کئی مختلف قوموں کے افراد تھے (مثلاً سادات بارہہ راجپوت۔ جاٹ اور ہندو جاگیردار وغیرہ) ایرانیوں اور تورانیوں کے مقابلے میں الگ پارٹی تھے ایرانی، تورانی ان کے مقابلے میں ہمیشہ ہم آواز ہو جاتے تھے[1]۔ خود ان ہندوستان زادوں میں بھی جھگڑے کی مثالیں مل جاتی ہیں، مذہبی معاملات میں ان کا طریق کار ایک دوسرے سے الگ بھی ہو جاتا ہے، جاٹ اپنے اقتدار کے خواہاں تھے، یہی حال راجپوتوں کا تھا مرہٹے[2] مغلیہ افواج میں معمولی عہدوں پر (عام طور پر بارگیر) فائز ہوتے تھے۔ دکن میں یہ لوگ اپنی سلطنت بنانے میں مشغول تھے، اور مذہبی تعصبات کو ہوا دے رہے تھے، سیوا جی کی پیدائش سے دو سو سال پہلے ہی دکن میں ہندوؤں کی آزادی کے خیالات چکر[3] کاٹ رہے تھے، راجویڈ (Rajwade) نے بڑی دانشمندی سے شمالی ہند کی حالت اور مہاراشٹر کی حالت کا فرق سہشنو (Sahishnu) یعنی ستم کش اور جینشنو (Jayishnu) (فتوحات کرنے والوں) کی تراکیب سے ظاہر کیا ہے[4]۔ سردیسائی دکنی نقطۂ نظر کے لئے "مہاراشٹر دھرم" کی ترکیب استعمال کرتے ہیں۔

۱؎ ایضاً صفحہ ۲۷۲، حاشیہ ۲۷۷ سے مہاراشٹر = راشٹر اور پھر مراٹھا یا مرہٹہ۔ یہ لفظ اس علاقے کے عام بسنے والوں پر چاہے وہ برہمن تھے یا غیر برہمن استعمال کیا گیا۔

The main currents of Maratha History by G. S. Sardesai Lec. I.

P. 4

جوکہ مرہٹی تالیف گرو چوبیتر میں پندرھویں صدی (عیسوی) کے دستانیوں پہلی دفعہ استعمال ہوئی لیکن جس کی تعلیم اس سے قبل کے گرو دیتے چلے آئے تھے"۔ (ایضاً صنٗ) گرو راما داس کی تعلیمات کا اثر سیواجی کی ذات پر بڑا گہرا تھا لے "اگر فرق تھا تو اتنا کہ سوراج کے حصول کے لئے گرو رامداس قوم کی اخلاقی قوت کا مظہر ہے اور سیواجی جسمانی قوت کا۔ مذہبی نقطۂ نظر کا کھلا اظہار اس کی مہر سے بھی ہوتا ہے، جس پر یہ عبارت کندہ تھی "ہلال کی طرح ترقی پذیر ساری دنیا کے حکمران شواجی ابن شاہ جی کی مہر جو دنیا کی فلاح کے لئے درخشاں ہے۔" مہر کی یہ عبارت دراصل (بقول مسٹر بھاوے) جاولی کے سوریہ فرمانرواؤں نے اپنی مہر پر استعمال کی تھی، شیواجی نے انہیں کی تقلید میں اسے برادتی تغیر اپنے ہاں رائج کیا ۲ے مہاراشٹر دھرم کے اصول درحقیقت ان کے چار عقیدوں کی عملی صورت ہیں وہ چار عقیدے یہ ہیں ۔

(۱) دیوا شاستراچرا (یعنی دیوتاؤں شاستروں کی روایات)

(۲) دیشاچرا (مقامی روایات)

(۳) کلاچرا (خاندانی روایات)

(۴) جنیاچرا (ذات پات کی روایات) ۳ے

مرہٹوں کے ان عقائد کا سیاسی اظہار بڑے کڈھب طریقے سے ہوا، اگرچہ مرہٹی زبان ادب، علمی اصطلاحات اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں تعمیری کام ہوتے دکھائی دیتے ہیں، لیکن سیاست کے میدان میں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے جو ذرائع اختیار کئے، انہیں کسی طرح بھی قابل ستائش قرار نہیں دیا جا سکتا، مغلوں سے جھگڑے کا آغاز شاہ جی نے کیا اور شاہجہاں سے مقابلہ ٹھنا۔ یہ کھیل بعد میں شاہ جی

لے صنٗ، صلٗ، صنٗ ۲ے صنٗ ۳ے ایضاً صنٗ ۱۲ کے ۱۹۲۵ء ۱۹۶۶ء

کی اولاد متواتر لڑتی رہی[1]۔ شیواجی باپ سے زیادہ اس فضا میں رنگا ہوا تھا، اسے اورنگ زیب عالمگیر سے معرکہ آرا ہونا پڑا تو اس نے دو مطالبے ہمیشہ پیش نظر رکھے،

۱۔ سردیش مکھی - پہلی بار شاہو نے ۱۶۶۸ء میں مطالبہ کیا کہ میں مرہٹوں کا علاقائی افسر (سردیش مکھ) ہوں، اس لئے یہ ٹیکس مجھے دیا جائے۔

۲۔ چوتھ:۔ اس کا تقاضا پہلی بار ۱۶۶۰ء میں ہوا جب شالی کونکن فتح کیا گیا۔ وہ رام نگر کے راجاؤں کو چوتھ ادا کرتے تھے اس لئے اب ان سے اس ٹیکس کا تقاضا کیا گیا۔ اس جد و جہد کا نتیجہ یہ تھا کہ اورنگ زیب کو اپنے دورِ حکومت کا آخری حصہ مرہٹوں سے نبرد آزما ہونے میں صرف کرنا پڑا جبکہ وہ دہلی تک پہونچنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ شیواجی نے بعض راجپوت سرداروں سے مذہب کے نام پر اپیلیں بھی شروع کردی تھیں اور ۱۶۷۴ء میں باقاعدہ اپنے آپ کو خود مختار فرماں روا قرار دے کر تخت نشین ہوگیا تھا۔ اس وقت ہندو طرز کی رسومات ادا کی گئیں۔ آخری ۶ سال اسی طرح خود مختاری اور جنگ و جدل میں بسر ہوئے، شیواجی ۱۶۸۰ء میں مارا گیا۔ اس کے بعد سنبھاجی راجہ بنا۔ شیواجی نے نظامِ حکومت کے لئے آٹھ وزراء کی مجلس بنا رکھی تھی یہ لوگ اشٹ پردھان کہلاتے تھے، سنبھاجی کو ۱۶۸۹ء میں اورنگ زیب نے جا لیا۔ اور وہ شکست کھا کر مارا گیا۔ پھر راجہ رام راجہ بنا۔ راجہ رام نے ۱۷۰۰ء میں وفات پائی اور حکومت کی باگ ڈور اس کی بیوی تارا بائی کے ہاتھ آئی۔ تارا بائی نے اپنے بیٹے شیواجی ثانی کے نام پر حکومت شروع کی۔ اورنگ زیب نے ۱۷۰۷ء میں وفات پائی۔ شاہو جنوری ۱۷۰۸ء میں سریر آرا ہوا۔

چار سال کے جھگڑے کے بعد آخر وہ کامیاب ہوا اور تارا بائی اور شیواجی ثانی

---

[1] ایضاً ص۱۶، ۲۰، ۵۱، ص۹۰، ص۹۱

گرفتار ہوئے۔ راجہ رام کے دوسرے لڑکے شنبھاجی کا اور شاہو کا معاہدہ ہوگیا، اور "سلطنت" دو حصوں میں تقسیم کرلی گئی، دریائے کرشنا سے جنوب کا علاقہ شنبھاجی کو دیا گیا۔ شاہو (سیواجی کا پوتا) کے دور حکومت میں پیشواؤں نے جو انہیں میں سے ایک تھا، دوسروں سے فوقیت حاصل کرکے اپنا اقتدار بڑھا لیا، اس کا عہدہ موروثی تھا۔ اس کے بیٹے باجی راؤ اول نے ۱۷۲۷ء میں راجہ ستارہ سے تمام مملکت کے پورے اختیارات حاصل کرلئے، اس کے بعد مرہٹہ حکومت دراصل پیشوا اور اس کے ماتحت افسروں کی حکومت رہی، نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ ستارہ برائے نام راجہ رہ گیا اور اس کی حیثیت سیاسی قیدی کی سی تھی، ہاں یہ ہے کہ ظاہرداری کا احترام تھا، اور وہ بھی صرف اس قدر کہ جب کوئی مرہٹہ سردار ستارہ میں داخل ہوتا تو وہاں وہ اپنے نام کی نوبت کا مجاز نہ تھا۔ تمام سردار راجہ ستارہ ہی سے خلعتیں وصول کرتے اور پیشوا راجہ کے پاس حاضری دیئے بغیر کوئی مہم شروع نہیں کرسکتا تھا۔ گویا راجہ ستارہ کی حیثیت پاپائے روم کی سی تھی۔ جس کا اثر و اقتدار صرف اس کے اپنے ضلع تک تھا۔ سیاسی اقتدار پیشوا کے ہاتھ میں تھا جس نے اپنا مرکز پونہ بنا لیا تھا۔ اس طرح مرور ایام سے اشٹ پردھانوں میں سے دوسرے سات وزیر بھی ثانوی حیثیت میں چلے گئے[1]۔ اب حکومت یا تو پیشوا کی تھی، یا اس کے نیم خود مختار سرداروں کی، ان سرداروں میں سے بھی چار قابل ذکر ہیں اور انہیں کی اہمیت اور قوت[2] مرہٹہ کانفیڈریسی کو قائم رکھے ہوئے تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان میں یک جہتی نہ تھی[3] سیواجی کی وفات کے بعد اورنگ زیب کی حملوں کی روک تھام کے لئے

---

[1] The making of the Indian princes. E. Thompson - P. 7

[2] Maratha confedrary

[3] تاریخ شامی صفحہ ۸۱۷

اس کے جانشینوں کو "سرنجمی" (جاگیرداری) نظام کو قائم کرنا پڑا اور آخر یہی چیز مرہٹہ قوت کو منتشر کرنے کا باعث ہوئی[1]۔ مرہٹہ سردار جب شمالی ہندوستان کی طرف بڑھے، ہر شخص نے اپنے ذاتی اقتدار ہی کو اہم جانا۔ آخر "ہندوپد پادشاہی" (ہندو راج) کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکا۔ پیشواؤں نے جس ہندو راج کی بنا ڈالنے کی کوشش کی وہ صرف نام ہی نام تھا، اس میں حقیقت کو کوئی دخل نہیں رہا تھا[2] اور اگر کچھ حقیقت ہو بھی تو اس سے یقیناً مختلف تھی، جس کا خواب سیواجی دیکھا کرتا تھا۔ مرہٹہ سردار جو ملک گیری کے لئے نکلتے وہ فتح کئے جانے والے علاقوں پر شاید بطور جاگیر لے کر نکلتے تھے۔ اس صورت حال کو شاہ ہو کی حکومت بھی برداشت نہ کر سکی، پیشوا نے پرانے سرداروں کے مقابلے میں نئے سردار (سندھیا، ہولکر) بنانے شروع کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نئے سردار بھی قوت پکڑ کر پیشوا کے حلقۂ اثر سے کافی حد تک آزاد ہو گئے[3]۔ مرہٹہ تحریک ایرانی، تورانی مناقشے کی طرح مذہب کے نام سے شروع ہوئی اور انجام کار دنیاوی تحریک ہو کر رہ گئی۔ جس میں اب وحشت اور بربریت کے سوا کچھ نہیں رہا تھا، جلبِ زر اور حصولِ اقتدار کے سامنے ہندو مسلمان کی کوئی تمیز نہ تھی۔ مسلمان ہندو کسی کی عزت ان سے محفوظ نہیں تھی سے

بجور اُچکے سکھ مرہٹے شاہ و گدا! سب خواہاں ہیں
چین سے ہیں جو کچھ نہیں رکھتے فقر بھی اک دولت ہے یہاں[4]

شمالی ہندوستان میں انہوں نے فوجی چوکیاں قائم کرنی شروع کیں، اورنگ زیب کی وفات نے انہیں موقع دے دیا۔ شاہو کے منشور سے شمالی ہندوستان کو حلقہ ہائے اثر میں تقسیم کر لیا گیا۔ اور وحشی دندناتے ہوئے چل پڑے۔ اب اصل مقصد فوجی کنٹرول

---

[1] سارڈیسائی ص۹۴-۹۵ [2] سارڈیسائی ص۹۵
[3] ایضاً ص۹۶ [4] کلیات میر ص۲۳

کے مراکز قائم کرتا تھا، مغلیہ علاقے میں جا بجا مرہٹی قلعے قائم کیے گئے تاکہ ان علاقوں سے حسبِ ضرورت زبردستی مالیہ لیا جا سکے۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن جیسے جیسے پیشوا اور ستارہ کے راجے کمزور ہوتے گئے، ہلکر، بھونسلے، گیکواڑ اور سندھیا مطلق العنان ہوتے چلے گئے۔ پونہ اور ستارہ کی گدیاں اپنی جگہ پر دھری رہ گئیں۔

راجپوتوں نے بھی اقتدار کی جنگ میں حصہ لیا، اور رنگ زیب کی وفات تک اگرچہ ان کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن ہوسِ ملک گیری اس کے باوجود قائم تھی۔ ان کی حیثیت تاریخ کے اس دور میں ثانوی ہو گئی تھی۔ اورنگ زیب کی وفات کے فوراً بعد راجپوتوں نے سر اٹھایا، اور دو شکستوں کے بعد ان کی قوت خطرناک نہ رہی۔ ان سے زیادہ طاقتور جاٹ تھے۔ ذوالحجہ ۱۰۷۹ھ (۱۶ اپریل ۱۶۶۹ء) میں جاٹوں نے مغلیہ فوجدار عبدالنبی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس پر (Abdul Nabi ?) گوکل جاٹ کو سزا دی گئی۔ جاٹوں نے اورنگ زیب کی دکنی مصروفیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شمالی ہندوستان میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ ۱۰۹۹ھ (۱۶۸۷-۸۸ء) میں ان کی سرکوبی کے لئے بیدار بخت اور خان جہاں کو مامور کیا گیا۔ ڈیگ کے قریب جاٹوں نے اپنا اڈہ قائم کر رکھا تھا۔ ۱۵ رمضان ۱۰۹۹ھ (۴ جولائی ۱۶۸۸ء) کو اسے فتح کیا گیا۔ جاٹ سردار راجہ رام مارا گیا۔ ۱۱۰۶ھ (۱۶۹۵ء) میں پھر جاٹوں سے شہزادہ شاہ عالم کو تکلیف اٹھانی پڑی۔ اس زمانے میں ان کا سردار بھجا جاٹ تھا۔ مختار خاں نے ۲ رجب ۱۱۱۲ھ (۱۹ دسمبر ۱۷۰۰ء) میں فوج کشی کی اور جاٹوں کی بستی کو برباد کیا۔ چورامن جاٹ سردار بنا تو جاٹوں کی سرگرمیاں اور بھی تیز ہو گئیں اور مغلیہ سلطنت کو خطرہ پیدا ہو گیا۔

---

۱ سارڈیسائی ص ۹۶، ۹۸، ۹۹ ناسن ص ۴۹

۲ Later Mughals by Irvine vol. I. P. 322

(۴)

جس زمانے میں جاٹوں نے شمالی ہندوستان میں سرگرمیاں تیز کیں، اورنگ زیب عالمگیر نے ۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ (۳ مارچ ۱۷۰۷ء) میں وفات پائی۔ اس کے بیٹوں معظم، اعظم اور کام بخش میں حصول تخت کے لیے کش مکش شروع ہو گئی۔ اعظم شیعہ عقائد اختیار کر گیا تھا، اس لئے ایرانی پارٹی نے اس کا ساتھ دیا، معظم اور اعظم کے درمیان جاجئو یا جاجمئو کے مقام پر جنگ ہوئی (۲۰ جون ۱۷۰۷ء) جس میں اعظم مارا گیا (۱۸ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ) اور معظم بہادر شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ کام بخش نے ۱۳ جنوری ۱۷۰۹ء (۱۱۲۰ھ) میں شکست کھائی۔ بہادر شاہ کا دور حکومت ۱۱۱۹ھ سے ۱۱۲۴ھ تک رہا ہے۔[1]

بہادر شاہ
۱۱۱۹ھ تا ۱۱۲۴ھ

جانشینی کی جنگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چورامن جاٹ نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں اور جاجئو یا جاجمئو کے گرد شکست کھانے والے شہزادے کے لشکر کو لوٹنے میں لگ گیا تھا۔ بہادر شاہ کے پاس آگرے میں آکر منصب سے سرفراز ہوا اور آئندہ معرکوں میں تعاون کرتا رہا۔

تورانی پارٹی کے امرا غازی الدین فیروز جنگ (متوفی ۱۱۲۲ھ) چین قلیج خاں، خان دوراں محمد امین خاں چین بہادر وغیرہ کو دارالخلافے سے دور کے صوبوں پر مامور کیا گیا، یہ لوگ اتنے دور بھی نہیں بھیجے گئے کہ من مانی کر سکیں، ایرانی پارٹی سیاہ و سفید کی مالک بن گئی۔

---

[1] ارون جلد اول صفحہ ۲، صفحہ ۱۳، ۳۳، ۴۲، ۶۵

اُمرائے دربار کی اس نا اتفاقی سے کمزور باغی عناصر نے تقویت پائی، راجپوت حکومت کی کمزوری کو بھانپ گئے تھے، اس لئے انہوں نے سرکشی اختیار کی۔ بہادر شاہ انہیں سزا دینے چلا کہ ادھر پنجاب میں بندہ کی سرکردگی میں سکھوں نے شورش کر دی۔ جب سکھوں کا خطرہ زیادہ بڑھ گیا تو راجپوتوں کو معافی دی گئی، اور ان سے صلح ہو گئی۔ اب بہادر شاہ نے پنجاب کا رُخ کیا۔ بندہ کو شکستیں دی گئیں، اور شاہی فوجوں کے قبضہ میں آ کر بندہ دھوکے سے فرار ہو گیا۔ منعم خاں سے بہادر شاہ ناراض ہو گیا۔ ۱۱۲۳ھ میں منعم مر گیا، (۲۸ فروری ۱۷۱۱ء) اور عنایت خاں دیوان تن و خالصہ عارضی وزیر ہو گیا۔ لاہور کے قیام کے دوران میں بہادر شاہ نے خطبہ میں ترمیم کر کے شیعہ سنی جھگڑا چھیڑ دیا[1] سکھوں کے خلاف وقتی کامیابی ہو گئی تھی کہ بہادر شاہ نے ۲۷ فروری ۱۷۱۲ء (۲۰ محرم ۱۱۲۴ھ) کو وفات پائی[2] نعش ۱۱ مارچ تک بے گور و کفن پڑی رہی اور اس کے چاروں بیٹے تخت کے لئے آپس میں لڑنے لگے، اور کافی کشت و خون کے بعد تخت جہاندار شاہ کے ہاتھ آیا۔

جہاں دار
پ ۱۰ رمضان ۱۰۷۱ھ
ت ۱۱۲۴ھ
و ۱۶ محرم ۱۱۲۵ھ

وہ باغی جو عارضی طور پر اپنی سرگرمیاں بند کئے ہوئے تھے ہر طرف سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جب بادشاہ بے خبر ہو تو اُمرا وزراء سے اصلاح کی توقع عبث ہے۔ متھرا اور دہلی کے درمیان سرکش جاٹوں نے علاقہ تباہ کر ڈالا تھا۔ پنجاب میں سکھ طاقت پکڑ گئے تھے۔ بنگال میں علی وردی خاں گورنر نیم مختار ہو چکا تھا۔ دکن میں نظام الملک آصف جاہ نے اپنے پیر جما لیے تھے، ادھر مرہٹوں کی طاقت اُبھر نے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے اروِن جلد اول صفحہ ۱۳۰ اور تاریخ لاہور از ڈاکٹر باقر صفحہ ۱۰۱

[2] اروِن صفحہ ۱۳۵

گئی تھی

ذوالفقار خاں نصرت جنگ وزیر لائق تو تھا، لیکن اُمرائے دربار کی نااتفاقی دور کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ جہاندار شاہ کو حکومت سے غرض نہ تھی اسے عشرت کی ضرورت تھی، لال کنور کے اشارے پر وہ ناچ رہا تھا۔ صوبے اب بادشاہ کی نااہلیت کی وجہ سے ڈوم دھاڑیوں کو تقسیم ہو رہے تھے، باشعور اُمرا افسوس کرتے تھے، اور بے بس تھے۔ ذوالفقار خاں کی مخلصانہ باوجود جہاندار شاہ نہ سنبھل سکا، اس نے بھی کاہلی اختیار کی اور انتظام حکومت سبھا چند کھتری کے سپرد کر دیا۔ وہ لوگوں سے جھوٹے وعدے اور فریب کرنے لگا، آخر اعتبار جاتا رہا۔

فرخ سیر نے جب انتظام حکومت میں خلل پایا تو عبداللہ خاں (حسن علی خاں) اور حسین علی خاں سے ملا۔ اور امداد کی درخواست کی۔ یہ دونوں بھائی الہ آباد اور بہار کے سپید و سیاہ کے مالک تھے، حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، کھجوہ کے قریب جنگ ہوئی[1] اور شہزادہ عزالدین شکست کھا کر بھاگا۔ آگرہ کے قریب جہاندار شاہ اور فرخ سیر کا مقابلہ ہوا[2] عین میدان جنگ میں تورانی پارٹی کے سردار چین قلیچ خاں اور محمد امین خاں بے تعلق ہو گئے۔ اس لئے فرخ سیر کامیاب ہو گیا۔ جاٹوں نے بھی اس جنگ سے فائدہ اٹھایا اور جہاندار شاہ کی منفردہ فوج کا سامان لوٹ لیا[3] آخر جہاندار شاہ نے دہلی میں پناہ لی[4]۔ ذوالفقار خاں نے باپ سے مشورہ کیا، اسد خاں کی رائے تھی کہ فرخ سیر سے تعاون کرو۔ ذوالفقار خاں کا ارادہ تھا کہ جنگ کرے، آخر باپ کے مشورے پر عمل کر کے ذوالفقار خاں نے خود کو فرخ سیر کے سپرد کر دیا، اور قتل ہوا۔ ۱۶ محرم ۱۱۲۵ھ (۱۱ فروری

---

[1] ۲۸/۲۹ شوال ۱۱۲۴ھ۔ [2] ۱۳ ذوالحجہ ۱۱۲۴ھ، مطابق ۱۰ جنوری ۱۷۱۳ء

[3] اردو ۱۹۴۷ء ص ۲۳۲ [4] ۲۲/۱۸ ذی الحجہ ۱۵ جنوری ۱۷۱۳ء

۱۷۱۳ء کو جہاندار شاہ بھی بے دردی سے قتل کر دیا گیا، اور مرنے کے بعد "خلد منزل" کہلایا۔

فرخ سیر

تورانی بھی فرخ سیر کے حامی ہو گئے تھے اس لئے ایرانی اور تورانی پارٹیاں بادشاہ کی حمایت کے مسئلے پر متفق ہو گئیں لیکن باہمی رقابت بڑھتی گئی۔ میر جملہ (عبید اللہ خاں و شریعت اللہ خاں) فرخ سیر پر چھا گیا۔ ایرانی و تورانی پارٹی کی کش مکش بڑھنے لگی، چھوٹے عہدے تورانیوں کے ہاتھ میں تھے اور ان کی تعداد زیادہ تھی۔ بڑے عہدے ایرانی پارٹی کے ہاتھ میں تھے اور ان کی تعداد کم تھی۔

پ ۹ رمضان ۱۰۹۴ھ
ف ۸ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ
ت ۱۱۲۴ھ

فرخ سیر کے کردار میں بڑی خامی یہ تھی کہ وہ جلدی اپنی رائے بدل لیا کرتا تھا۔ جھوٹ اور فریب کو لازمۂ سیاست سمجھتا تھا، کانوں کا کچا تھا اور بزدل بھی تھا۔

اس کے کردار کا اثر امرا پر یہ پڑا کہ ان کے باہمی شکوک بڑھتے رہے اور ہر ایک فرخ سیر سے غلط توقعات قائم کر بیٹھا۔ رفتہ رفتہ ایرانی و تورانی پارٹیاں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی فکر میں رہنے لگیں، قطب الملک نے فرخ سیر سے ناراض ہو کر دربار جانا چھوڑ دیا۔ لیکن فرخ سیر نے ڈر کر قطب الملک کے گھر جا کر صفائی کر لی۔[۱] اس باہمی درباری لڑائی سے فائدہ اٹھا کر راجہ اجیت سنگھ (راجپوت) نے اجمیر پر بھی قبضہ کر لیا۔ میر جملہ وغیرہ نے دونوں سید بھائیوں کو جدا کرنے کی تجویز دی۔ حسین علی خاں کو اس مہم پر مامور کر دیا، ادھر فرخ سیر نے اجیت سنگھ کو خط لکھا کہ حسین علی خاں کا مقابلہ کر کے ختم کر دے، لیکن حسین علی خاں نے راجہ کو شکست دے کر اجمیر پر قبضہ کر لیا۔ آخر راجہ نے صلح کر لی۔ اور حسین علی خاں کو فرخ سیر کی اس سازش کا پتہ چل گیا۔ میر جملہ کا وقار

لہ ربیع الاول ۱۱۲۴ھ ۲ے ۹ ربیع الاول ۱۱۳۱ھ ۳ے ۲۹ ذی قعدہ ۱۱۲۵ھ

بڑھتا گیا اور سیدوں کے خلاف مختلف منصوبے بنائے جاتے، یہ رنگ دیکھ کر عبداللہ خاں اور حسین علی خاں خانہ نشین ہو گئے، اور اپنی حفاظت کے لئے انہوں نے گھر کو مسلح کر لیا۔ خانہ جعفر اور صمصام الدولہ کی معرفت دربار کی حاضری کا حکم ہوا، شرط یہ طے پائی کہ میر جملہ رخصت کر دیا جائے گا۔ چنانچہ قطب الملک فرخ سیر سے ملا اور ۱۶ دسمبر سنہ ۱۷۱۴ء[۱] کو میر جملہ پٹنے روانہ کر دیا گیا، اور حسین علی خاں دربار میں آیا۔ میر جملہ کی روانگی کے بعد حسین علی خاں کو دکن کی صوبہ داری دی گئی[۲]، اور اسے دہلی سے باہر جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ دوسری طرف داؤد خاں گورنر دکن کو لکھا گیا کہ حسین علی خاں کا مقابلہ کیا جائے، اس لڑائی میں داؤد خاں کام آیا[۳] اور حسین علی خاں کامیاب رہا۔

ادھر دربار میں یہ سازشیں ہو رہی تھیں، دوسری طرف ملک کے حصے باغی عناصر کے ہاتھوں پامال ہو رہے تھے۔ پنجاب میں سکھوں نے اودھم مچا رکھی تھی، عبدالصمد خاں صوبہ دار پنجاب اور زین خاں حاکم سرہند اور قمرالدین خاں کی کوششوں سے گورداسپور ۲۱ ذوالحجہ ۱۱۲۷ھ کو فتح ہوا اور گرو بندہ گرفتار ہوا۔ گرفتار شدہ سکھ دلی میں لائے گئے اور قتل کئے گئے[۴]۔ دہلی کے گرد و نواح کا علاقہ چورامن جاٹ تباہ کر رہا تھا۔ چونکہ سید برادران پورے اس کے طرفدار تھے، اس لئے اس کی جرأتیں بڑھتی رہیں، اس کی مسلسل شکایات ہوتے پر راجہ جے سنگھ سوائی کو مامور کیا گیا اور اس نے چورامن کو محصور کر لیا۔ قطب الملک کے دخل دینے پر محاصرہ اٹھا لیا۔ اس نے ۲۰ لاکھ روپیہ قطب الملک کو دیا اور تیس لاکھ روپے سرکاری خزانے میں داخل کئے۔ لیکن اس صلح سے راجہ جے سنگھ ناراض ہو گیا[۵]۔

فرخ سیر روزانہ نئی تدبیریں سوچتا کہ اقتدار امرا کا زور توڑا جائے، چنانچہ میر جملہ یا تو خود یا فرخ سیر کے ایما سے پٹنے سے دہلی آیا۔ قطب الملک نے مخالفت کی امیر جملہ کو

---

[۱] ۸ رمضان ۱۱۲۷ھ [۲] ص ۳۱۵ [۳] ص ۵ [۴] ۲۹ جمادی الثانی ۱۱۲۸ھ ۱۹ جون ۱۷۱۶ء
[۵] [illegible] ۳۲۵ تا ۳۲۷

حکم ہوا، لاہور جائے، وہ تیار نہ ہوا، اُس کی فوج نے تنخواہ کا مطالبہ کر کے اُمرا کے مکان گھیر لیے، آخر تنخواہ ادا کر دی گئی، لیکن میر جملہ کو دہلی چھوڑ کر لاہور جانا پڑا۔ محمد امین خاں کو مالوہ کا گورنر مقرر کیا گیا، تاکہ تورانی پارٹی کا زور بھی ٹوٹ جائے۔ جے سنگھ (سوائی) کا رتبہ بڑھا دیا گیا۔ عنایت خاں دیوان تن بنا دیا گیا۔ محمد مراد کشمیری کا رسوخ فرخ سیر کے مزاج میں کافی بڑھ گیا، وہ میر توزک بنایا گیا۔ اعتقاد خاں کا خطاب ملا۔ سربلند خاں کو بلایا گیا کہ وہ قطب الملک کو راستے سے ہٹا دے گا۔ جب اسے خبر ہوئی کہ وزارت محمد مراد کے حصے میں آئے گی، تو وہ خاموش بیٹھ گیا اور اُسے آگرے کا صوبے دار بنایا گیا[۱]۔ لیکن اس نے جلد ہی استعفا دے دیا۔

ایک دن قطب الملک کے شکارگاہ میں قتل کی اسکیم بنائی گئی، اسے بھی بروقت اطلاع مل گئی، اور سازش ناکام رہی[۲]، فرخ سیر نے اپنے خسر اجیت سنگھ کو بلایا۔ نظام الملک بھی طلب ہوا[۳]۔ وہ شاہ کی غیر مستقل مزاجی سے واقف تھا۔ آگرے کو نہ گیا، شاہ ناراض ہوا تو میر جملہ کو طلب کیا گیا، وہ بھی قطب الملک سے مل گیا[۴]۔ قطب الملک نے اپنے بھائی حسین علی خاں کو دکن سے بلایا۔ اب فرخ سیر نے سپر ڈال دی۔ صمصام الدولہ سے بھی قطب الملک کی صلح ہو گئی۔ آخر مجبور ہو کر فرخ سیر نے دوستی کی کوشش کی اور قطب الملک کو بلایا[۵]۔ وہ تین دن بعد آیا[۶] اور حسب منشا عہدوں کی تقسیم کر کے مخالف اُمرا کو ہم نوا بنا لیا۔ اب فرخ سیر اکیلا رہ گیا، آخر ۲۹ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ کو فرخ سیر خلوت سے گرفتار کیا گیا۔ آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی[۷] اور ترپولیہ کے اوپر کمرے میں اسے قید کر دیا گیا۔

---

۱ ۱۱ شوال ۱۱۳۰ھ ۲ ۲۳ شوال ۱۱۳۰ھ ۳ ۲۵ شوال ۱۱۳۰ھ

۴ ۵ ذی قعدہ ۱۱۳۰ھ ۵ ۲۷ محرم ۱۱۳۱ھ ۶ ایضاً ص ۲۶۲

۷ ایضاً ص ۲۶۳

بھوک اور پیاس سے اُسے تڑپایا گیا، پھر اُس کے گلے میں پھندا ڈالا گیا، اور ہاتھوں پر چھڑیاں ماری گئیں، ۹ جمادی الثانی ۱۱۳۱ھ کو اسے قتل کیا گیا۔ عوام شاہ کی نالائقی کو بھول گئے اور گلی کوچوں میں اُمرا کو گالیاں دیتے تھے۔ اجیت سنگھ کو چھوکرے داماد کُتّا کہتے تھے۔

مرنے کے بعد فرخ سیر "شہید مرحوم" کے لقب سے موسوم کیا گیا، اس نے کل چھ سال تین مہینے اور ۲۵ دن حکومت کی۔[1] فرخ سیر کے انتقال کے وقت ملک کا ڈھانچہ بکھرنے لگا۔ پنجاب میں سکھوں کی تحریک دوبارہ طاقت پکڑ گئی تھی، شمالی ہندوستان میں ایک طرف جاٹوں نے اپنی طاقت کو مضبوط کر لیا تھا، دہلی سے مشرق کی جانب روہیلا اور بنگش پٹھانوں نے اپنی ریاستوں کی بنیاد ڈال دی تھی، چھوٹے چھوٹے جاگیردار خود مختاری کا ڈنکا بجا رہے تھے، شاہی فوجوں کا رعب اُن کے ذہن سے دور ہو گیا تھا۔ راجپوت اپنی گذشتہ عظمت کو قائم رکھنے میں مصروف تھے اور جنوب مغرب کی جانب مرہٹہ طوفان کے آثار دکھائی دے رہے تھے، حکومت کی اس گرتی ہوئی عمارت کو تھامنے کے لئے عزم محکم اور جرأت و یقین کی ضرورت تھی، لیکن بابر کی نسل ان صفات سے عاری ہو چکی تھی، پہلے اُمرائے دربار میں اتحاد و اتفاق ہوتا تھا، اس لئے مرکزی استحکام کی وجہ سے ہر صوبہ مرکز سے دور ہو یا قریب، آہنی گرفت میں تھا۔ اب اُمرا ایک دوسرے کو شکست دینے کے لئے باہمی سازشوں میں مصروف تھے۔ فرخ سیر کے قتل نے شاہی کا جھوٹا وقار بھی کھو دیا۔ چنانچہ سید برادران نے تھوڑے عرصہ میں تین بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت نشین کئے۔

---

[1] ۳۸۴، ۳۹۰ - ۳۹۸ - ۳۹۹

رفیع الدرجات
پ ۸ جمادی الثانی ۱۱۳۱ھ
و ۴ / ۲ رجب ۱۱۳۱ھ

سلطان شمس الدین محمد رفیع الدرجات بادشاہ غازی، رفیع الشان کا بیٹا اور بہادر شاہ کا پوتا تھا۔ اب اختیارات سید برادران کے ہاتھ میں رہے، اور محل کے اندر بھی نگرانی قائم رکھی گئی۔ اجیت سنگھ ان حالات کو دیکھ کر گجرات کی گورنری پر چلا گیا۔ ادھر جے سنگھ کے اشارے پر مغل شہزادے نیکو سیر کو آگرہ کے قلعے سے نکال کر بادشاہ بنا دیا گیا[1]۔ رفیع الدرجات نے تپ دق کی وجہ سے سلطنت سے دست کش ہونا مناسب سمجھا۔ چنانچہ ۱۷ رجب کو وہ الگ ہوا اور دو دن بعد ۶ جون ۱۷۱۹ع/۲۰ رجب ۱۱۳۱ھ کو اس کا بڑا بھائی رفیع الدولہ بہادر شاہ ثانی کے لقب سے تخت نشین کر دیا گیا۔

رفیع الدولہ (بہادر شاہ ثانی)
د ۔ ۵ ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ

رفیع الدولہ کو تخت نشین کر کے پہلی فکر نیکو سیر کی تھی جس کی تائید میں جے سنگھ تھا۔ شائستہ خان فرخ سیر کا ماموں بھی دلی میں فوج جمع کر رہا تھا۔ اور جے سنگھ سے نامہ و پیام جاری تھا۔ سید برادران نے خبر پا کر ۲۳ رجب ۱۱۳۱ھ کو اس کے مکان پر حملہ کر کے گرفتار کر لیا۔ اس کے شرکا روح اللہ خاں ثالث، تہور خاں تورانی سید صلابت خاں فرخ سیر کے ساتھ فرار ہو کر جے سنگھ کے پاس چلے گئے۔ محمد امین خاں اور صمصام الدولہ سادات کی تائید میں رہے۔ حسین علی خاں نے قلعہ آگرہ لینے کی ٹھانی۔ ۲۷ رمضان ۱۱۳۱ھ کو قلعہ ہاتھ آیا۔ نیکو سیر کو سلیم گڈھ میں نظر بند کر دیا گیا اس طرح جے سنگھ کا منصوبہ ناکام رہا۔ رفیع الدولہ بھی اپنے بھائی کی مانند افیون کا عادی تھا، قویٰ مضمحل تھے۔ ۵ ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ کو وہ بھی چل بسا[2]۔ چار ماہ ۱۶ دن حکومت کی۔

---

[1] ۱۷ / ۱۲ / جمادی الثانی ۔ شہزادہ نیکو سیر بن محمد اکبر خلف عالمگیر سنہ ۵ ۱۹ رجب ۱۱۳۱ھ

[2] ص ۱۳۱ ایضاً ص ۲۶/۱ ، ۱۴۸ نیز دیکھئے گپتا ص ۲۳ ، ۲۴

(۵)

محمد شاہ (روشن اختر) ان دو نام نہاد بادشاہوں کے بعد تیسرے کی ت ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ و ۱۷۱۹ء تلاش ہوئی، تو قرعۂ فال روشن اختر کے نام نکلا۔ اُس کی ماں نے کہا ہمیں حکومت کی ضرورت نہیں، جب سادات نے جان کی حفاظت کا وعدہ کیا تو رضا مندی دی، محمد شاہ کے نام سے موسوم کر کے سادات نے اعزاز بڑھایا۔ محمد شاہ کی حیثیت شاہ شطرنج کی رہی، لیکن اُمرائے دربار سادات بارہہ کے عروج سے تنگ آ چکے تھے۔ حکومت کے ذخائر ان کے قبضے میں تھے اور داد و دہش کے چرچے عام تھے، ہر ایک سادات کی چشم کرم کا امیدوار تھا۔ محمد شاہ سترہ سال کا نوجوان لڑکا تھا، طبیعت میں ولولہ اور جوش تھا وہ رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کی طرح افیون کا عادی تو تھا نہیں کہ دنیا سے آنکھیں بند کر لیتا۔ اُس نے سید برادران کے اقتدار کو رشک کی نظر سے دیکھا، وہ بے دست و پا تھا سکہ اُس کے نام کا تھا، لیکن حکم سید برادران کا چلتا تھا۔ سید برادران بہترین جرنیل تھے۔ وہ داد و دہش میں بے مثل ضرور تھے لیکن انتظام حکومت کے لئے جس فراخ دلی کی ضرورت تھی وہ ان میں مفقود تھی۔ مسلمان عوام اُس کے دیوان رتن چند کے ہاتھوں سے نالاں تھے، لیکن سیدوں کی آنکھیں نہ کھلیں، رتن چند قاضی اور مفتی کے تقرر بھی کرنے لگا۔ ان حالات میں عوام کا جذبۂ نفرت مشتعل ہو رہا تھا اور تورانی پارٹی کے جہاندیدہ راہنما اندر ہی اندر جوش مارنے والے اس لاوے کی حقیقت سے باخبر تھے۔ وہ خود اتنے بااقتدار نہ تھے کہ سید برادران اُن پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے، اس لئے وقت کے انتظار میں تھے، سادات بارہہ نے سوچا کہ نظام الملک کو دہلی سے دور کر دیا جائے۔ اُسے مالوہ کی طرف جانے کا حکم ملا، لیکن وہ دکن کی طرف چل دیا اور اپنی حفاظت کے لئے فوج کی

تیاری شروع کی[1]۔ اسی زمانے میں محمد امین خاں کے قتل کی سازش ہوئی جو ناکام ہو گئی[2]۔ تعلقات بظاہر ٹھیک ہو گئے۔ لیکن تورانی پارٹی نے حسین علی خاں کے قتل کی سازش کی۔ جب محمد[3] شاہ اور مغل فوج ۹ ذی قعدہ ۱۱۳۲ھ کو آگرہ کی طرف چلے تو راستے میں ۶ ذی الحجہ ۱۱۳۲ھ[4] یہ سازش کی گئی۔ اس میں محمد امین خاں، حیدر قلی خاں میر آتش (جو بظاہر دونوں طرف تھا) عبدالغفور اور میر جملہ شریک تھے۔ محمد امین خاں، سعادت خاں فوجدار بیانہ (ایرانی) بھی ان کے ساتھ مل گیا۔ میر حیدر بیگ کاشغری نے موقع پا کر تجویز کے مطابق ۶ ذی الحجہ ۱۱۳۲ھ کو حسین علی خاں کو قتل کر دیا[5]۔ ان سازشیوں کو غالباً محمد شاہ کی تائید بھی حاصل تھی۔ قطب الملک کو جب بھائی کے قتل کی خبر ملی تو دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ دہلی پہنچا اور مقید شہزادے ابراہیم کو ۱۵ ذی الحجہ ۱۱۳۲ھ کو تخت نشین کر دیا[6]۔ محمد شاہ نے محمد امین کو ہشت ہزاری منصب دے کر وزیر بنایا۔ صمصام الدولہ خان دوران رہا۔ قمر الدین خاں (محمد امین خاں کا بیٹا) ہفت ہزاری۔ حیدر قلی خاں شش ہزاری اور سعادت خاں پنجہزاری ہوئے۔ ۱۴ محرم ۱۱۳۳ھ کو حسن پور کے مقام پر قطب الملک اور محمد شاہ میں لڑائی ہوئی۔ جس میں قطب الملک نے شکست کھائی۔ ابراہیم گرفتار ہوا۔ سید عبداللہ خاں قطب الملک گرفتار ہوا۔ سادات کی جاگیر اور لوٹ لی گئی۔ سادات کے مخالفین کو منصب بڑھے۔ محمد امین خاں وزیر کچھ مدت بعد درد قولنج میں مبتلا رہ کر مر گیا۔ محمد شاہ کو تورانی پارٹی سے خاصا پہنچا تھا۔ اس لئے محمد امین خاں کے مرنے کے بعد اس کی نظر نظام الملک

---

[1] ص ۱۶ جلد دوم اردن [2] ۱۸ نومبر ۱۷۲۰ء [3] اردن جلد دوم ص ۳۷، ۵۶، ۵۸
[4] ۱۵ اکتوبر ۱۷۲۰ء۔ [5] ۱۴ نومبر ۱۷۲۰ء [6] اس نے ۸ نومبر ۱۷۲۰ء کو قید سے نجات پائی [7] یکم محرم ۱۱۳۵ھ کو زہر دے کر مار دیا گیا۔
ایضاً ۷۶، ۷۸، ۹۳، ۹۵، ۹۶، ۱۰۳

پسر بڑی نظام الملک دکن پر قبضہ کرکے اپنی بنیادیں مضبوط کر رہا تھا، ۲۰ فروری ۱۷۲۲ء کو دہلی میں وزیر مقرر کر دیا گیا۔ نظام الملک جب منصب وزارت پر سرفراز ہوا تو یہ کام اس کے لیے خوشی کا باعث نہ تھا، اسے ان مشکلات کا بخوبی اندازہ تھا جو محمد شاہ کے قریب رہنے میں مخفی تھیں۔ صمصام الدولہ خاں دوران محمد شاہ کے مزاج میں کافی دخیل تھا۔ اور وہ وزارت کا خواب دیکھتا تھا، دوسری طرف کوکی بھی جو محمد جان کی لڑکی تھی، اس نے محمد شاہ پر ایسا جادو کر رکھا تھا کہ سیاہ و سفید کی مالک تھی، بقول اروِن[1] اندر گیتا تھی سلطنت اس کے قبضے میں تھی وہ حسب منشا احکام جاری کرتی اور امرا بغیر اس کی مرضی کے بادشاہ تک رسائی نہ پاتے۔ ایک با اصول، منتظم وزیر اس بات کو کس طرح برداشت کرتا، چنانچہ کوکی کے بارے میں ایک شعر کی نسبت نظام الملک آصف جاہ کی طرف کی جاتی ہے

مرداں نہ کنند خاک بر سر چہ کنند :: امروز زنے بجائے عالمگیر است[2]

نوبت یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ عبدالغفور نامی ایک مکار فقیر[3] محمد شاہ کو بے وقوف بنائے ہوئے تھا، خدمت گار خاں خواجہ سرا، روشن الدولہ ظفر خاں بہ سبب انعام قدم پر نظام الملک کے کام میں رکاوٹیں ڈالتے وہ آخر کب تک یہ ذلت برداشت کرتا، ادھر ایرانی اور تورانی پارٹیوں کی رقابت ابھر آئی۔ ان حالات میں نظام الملک نے فیصلہ کیا کہ وہ دکن جا کر اپنی ریاست کو درست کرے اور محمد شاہ کی اصلاح سے دست بردار ہو جائے وہ مراد آباد کی جاگیر کی درستی کا بہانہ کر کے دکن روانہ ہو گیا۔ محمد شاہ نے کوشش کی،

---

[1] جلد دوم ص ۱۰۶ [2] ص ۱۲۰ فٹ نوٹ [3] گیتا کی طرح میں کوکی کو خود بھی شاعر تھی اور اس نے یہ شعر کہے تھے ؎ نوبت ذکیاں بجا کیا افتادہ است :: بازی ننگرف بگیا افتادہ است شاباہ کر سپہر سفلہ رفتہ نشاط :: شمشیر زدن بدست زناں افتادہ است [3] فٹ نوٹ لیکن یہ بیان درست معلوم نہیں ہوتا۔

کر نظام الملک دکن پر قابض نہ ہو سکے، لیکن یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی[1]، اور ۱۷ ار
دسمبر ۱۷۲۳ء کو اس کا استعفا منظور ہوا[2]۔ ۱۷۲۴ء میں نظام الملک نے دکن میں خود مختار
ریاست قائم کی، اب محمد شاہ نے بہتری اسی میں سمجھی کہ تورانی پارٹی کو (جو فوجی قوت
کے لحاظ سے بالا تفوق رکھتی) راضی رکھا جائے۔ اس لئے قمرالدین خاں کو (جو نظام الملک کا
چچازاد بھائی اور محمد امین خاں کا بیٹا تھا) وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ اس کی وزارت کا دور
۱۷۲۴ء سے ۱۷۴۸ء تک رہا۔ یہ شخص بادشاہ کی مانند عیش پسند، غفلت شعار اور
بادہ نوار تھا۔ شاہ اور وزیر دونوں عیش و عشرت میں وقت گذارتے۔ اس تورانی وزیر
کے زمانے میں سلطنت کا شیرازہ زیادہ بکھر گیا۔ چنانچہ دہلی کے باہر کے علاقے پر جاٹ قابض ہو
چکے تھے۔ سعادت خاں برہان الملک کو اودھ کا صوبہ دار بنایا گیا تھا۔ اس نے مشرق کی جانب
بڑی مضبوط ریاست کی بنیاد ڈالی، نواب محمد خاں بنگش نے فرخ آباد کی ریاست قائم کرکے
تاریخ میں شہرت پائی۔ محمد شاہ کے عہد میں سعادت خاں اور نواب محمد خاں بنگش بہترین
جرنیل تھے۔ انہوں نے اپنے حدود کے اندر باغی عناصر کو داخل نہ ہونے دیا۔ اسی زمانے میں
نواب علی محمد خاں نے صوبہ شاہجہاں آباد کا وہ علاقہ جو سرکار سنبھل کہلاتا تھا، اس پر قبضہ کرکے
شاہی امرا کی جاگیروں کی آمدنی ختم کر دی۔ قمرالدین وزیر اعظم اس کا در پردہ حامی تھا۔
اس لئے عمدۃ الملک امیر خاں، صفدر جنگ اور دوسرے امرا کے مجبور کرنے پر محمد شاہ
نے اس کی سرکوبی ضروری سمجھی[3] اور اسے مقید کرکے دہلی لائے، لیکن چند دن بعد اسے

---

[1] سیرالمتاخرین [2] اردو ص ۱۳۶، ۱۴۲ [3] گپتا ص ۲۰، ۲۴، ۲۵، ۲۶
۱۷۴۸ء کے واقعات میں البتہ گپتا سے غلطی ہوئی ہے کیونکہ رہیلے ۱۷۲۰ء سے قبل ہی
(یعنی الدولہ بہادر شاہ ثانی) کے عہد میں واپس جا چکے تھے۔ [4] ۱۱۵۹ھ

سرہند کا فوج دار بنا دیا اور ۱۱۶۱ھ میں جب احمد شاہ ابدالی کے حملہ کی خبر ملی تو علی محمد خاں نے دوبارہ اپنے مقبوضہ علاقے سے شاہی کارندوں کو نکال دیا اور حکومت تماشا دیکھتی رہی۔ پنجاب، سرحد اور کابل کی حالت بھی ایسی ہی ہو رہی تھی۔ فرخ سیر کے عہد سے کابل کا صوبہ برائے نام مغلوں کے ماتحت رہ گیا تھا۔ یہاں ایسے گورنر بھیجے جاتے تھے جنہیں دارالخلافہ سے دور رکھنا مقصود ہوتا۔ مرکزی حکومت حفاظتی چوکیوں پر کچھ صرف نہ کرتی۔ اس لئے رفتہ رفتہ یہ علاقے مرکز کی گرفت سے نکل گئے۔ عبدالصمد خاں اور اس کے بیٹے زکریا خاں کے زمانے میں پنجاب کے حالات کچھ بہتر رہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پنجاب میں مکمل امن رہا۔ نادری حملے کے بعد مرکزی حکومت کا رہا سہا وقار بھی جاتا رہا، اور جسا کلال کی سرکردگی میں پنجاب تہ و بالا ہو گیا[1]۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے صوبے مرکز سے خود مختار ہو چکے تھے۔ گورنر ہی ہر کام کا مجاز تھا۔ سالانہ کچھ نذرانہ دربار میں پیش کرنا ہی کافی سمجھا جاتا۔ محمد شاہ کے عہد میں گورنر بنگال کو کبھی بھی دلی میں نہیں بلایا گیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت اپنی کمزوری سے پوری طرح واقف تھی۔ خود دارالخلافہ کا یہ حال تھا کہ ہر امیر دوسرے کے خلاف سازش میں مصروف رہتا تھا۔ جو مسخرہ اور بذلہ گو ہوتا، بادشاہ کا محبوب بن جاتا۔ عبدالغفور اور کوکی کے زوال کے بعد ان کی جگہ دوسرے لوگ لے چکے تھے، عمدۃ الملک امیر خاں انجام محمد شاہ کی ناک کا بال تھا۔ نور بائی جو اس عہد کی مشہور طوائف ہے۔ محمد شاہ کی منظور نظر رہ چکی تھی، اور پھر منور خاں اور عمدۃ الملک سے وابستہ ہو گئی تھی۔ روشن الدولہ ظفر خاں بادشاہ کی طبیعت پر کافی اثر رکھتا تھا، چنانچہ دارالخلافہ کے اندر ہنگامے مسلم، شیعہ، سنی فساد ہوئے۔ رجب ۱۱۴۲ھ میں ہندو مسلم فساد ہوا

۱؎ تاریخ لاہور ص ۱۴۳ تا ص ۱۶۵، نیز ص ۱۴۶، ۱۴۷ اردو ... جلد دوم۔

اسی طرح ۱۱ر شعبان ۱۱۴۱ھ[1] میں جوتہ فروشوں کا ہنگامہ ہوا۔[2] اس واقعہ کو بینوا شاعر
نے جو سنام (ریاست پٹیالہ) کا رہنے والا تھا نظم کیا ہے، اُمرا کی باہمی رقابت سے
کافی کشت وخون ہوا، اور روشن الدولہ کی وہ جوتہ کاری کی گئی کہ شرمندگی کے مارے
گھر سے جیتے جی باہر نہ نکلا۔[3] ایسی صورت میں دہلی پر جو آفت نہ آتی کم تھی۔ مرہٹوں
کو نظام الملک نے ڈھیل دی، وہ چاہتا تھا کہ مرہٹے[4] اس سے نہ الجھیں اور شمالی ہندستان
کی طرف متوجہ رہیں، چنانچہ اس کی چشم پوشی اور راجہ جے پور کی پوشیدہ امداد سے مرہٹے مالوہ
اور اوجین سے گزر کر اجمیر اور آگرہ کے حدود میں تاخت و تاراج کرنے لگے، صمصام الدولہ
بہادر نے اوّل اپنے بھائی مظفر خاں کو مامور کیا۔ لیکن وہ ناکام واپس آیا، تو مجبور کرنے
پر وزیر اعظم قمر الدین خاں اور صمصام الدولہ خان دوراں (خواجہ عاصم) سرکوبی کے لئے
نکلے، لیکن دونوں مقابلے سے جی چراتے تھے، سعادت خاں نے مرہٹوں کو شکست بھی دی،
باجی راؤ نے اس شکست کا دھبا اس طرح مٹایا کہ ۱۷۳۷ء میں دہلی کے آس پاس کی
بستیوں کو بُری طرح لوٹا اور بڑی صفائی سے واپس چلا گیا۔[5] اب یہ طے ہوا کہ نظام الملک کو
دکھن مطلق تباہ دیا جائے۔ مرہٹوں نے نظام الملک کو بھی ایسا اُلجھایا کہ نظام الملک نے ان
کی شرائط صلح کو منظور کر لیا۔[6] اس فتنہ سے فرصت نہ ہوئی تھی کہ نادر شاہ نے ہندستان پر
حملہ کر کے محمد شاہ کو خواب غفلت سے جگایا، ۲۶ نومبر ۱۷۳۸ء کو اس نے اٹک عبور کیا۔[7]

---

[1] ۱۱ر مارچ ۱۷۲۹ء [2] [illegible] ۲۹ [illegible] ص ۲۹۳ [3] یہ مثنوی اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہو
چکی ہے [4] یہ معرکہ ۹ ذوالحجہ ۱۱۴۹ھ ۹ اپریل ۱۷۳۷ء کو تال کٹورا کے پاس ہوا اس کی یاد میں
سودا نے وہ مشہور ہجو لکھی جس کا عنوان تضحیک روزگار ہے [5] ۲۶ رمضان ۱۱۵۱ ہجری ۱۷۳۸ء
[6] [illegible] عبور کرنے پر [illegible] مخلص لکھتے ہیں، در سال ہزار و صد و پنجاہ و یک شاہ ایران گذشت از آب اٹک
یک مو گشتند [illegible] عجب بازی شطرنج [illegible] وقائع مرتبہ ڈاکٹر محمد شفیع ص ۲۶

زکریا خاں نے مجبور ہو کر مقابلہ نہ کیا۔ ۲۶ جنوری ۱۷۳۹ء کو نادر نے لاہور سے کرنال کی طرف کوچ کیا۔ ۱۱ فروری کو کرنال پہنچ گیا۔ ۱۳ فروری ۱۷۳۹ء کو لڑائی ہوئی اور شاہی فوج نے شکست کھائی۔ مغلیہ فوج کا خاصا جانی نقصان ہوا۔ صمصام الدولہ خان دوراں زخمی ہوا اور تیسرے دن فوت ہوا۔ سعادت خاں برہان الملک بھی زخمی ہو کر گرفتار ہوا[۱]۔ نظام الملک نے صلح کی گفتگو شروع کی اور چاہا کہ کچھ تاوان دے کر رخصت کر دے، لیکن سعادت خاں برہان الملک کے مشورے پر (کہ دہلی میں بے شمار دولت ہے) اس نے محمد شاہ سے دہلی جانے کی خواہش ظاہر کی، آخر نادر شاہ کی خواہش پوری ہو گئی اور دہلی کے خزانے پیش کر دیے گئے[۲]۔ ۱۰ مارچ کو کسی نے نادر شاہ کے قتل کی افواہ اڑا دی، غنڈوں نے نادری سپاہ پر حملہ کر دیا۔ آخر برہم ہو کر نادر شاہ نے قتل عام کا حکم دے دیا۔ ۳۰ ہزار آدمی قتل عام میں مارے گئے۔ اور آخر محمد شاہ کی معذرت پر اہل دہلی کی جان بخشی ہوئی۔ اہل دہلی سے تاوان بہت بے دردی سے وصول کیا گیا۔ قحط کے آثار گرد و نواح میں پھیل گئے۔

۵ کروڑ بطور تاوان نقد وصول کیا گیا۔ باقی زر و جواہر الگ تھے[۳]۔ دریائے سندھ کے مغرب کی طرف کا سارا علاقہ نادر شاہ کے قبضہ میں گیا[۴]، اور گجرات، سیالکوٹ، اورنگ آباد پسرور کے علاقہ کا ۲۰ لاکھ روپیہ بطور لگان نادر کو دینے کا اقرار ہوا۔ ۵ مئی ۱۷۳۹ء کو نادر دہلی سے نکلا۔ خواص و عوام تباہ ہو چکے تھے، امراء کی آنکھیں اب بھی نہ کھلیں، ایرانی اور تورانی پارٹی کی سازشیں پھر شروع ہو گئیں۔ اب عمدۃ الملک کا عروج اور بھی بڑھ گیا۔

---

[۱] اروِن، جلد دوم صفحہ ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۹ تا ۳۵۲ ۹ مارچ ۱۷۳۹ء داخلہ نادر شاہ
[۲] سعادت خاں برہان الملک کو بخل ان کے وعدے پر سرزنش کی گئی، اس نے زہر کھا کر خودکشی کر دی۔ خیر التواریخ میں لکھا ہے کہ اس نے ذوالحجہ ۱۱۵۱ھ کو دنبل یا تپ محرقہ سے وفات پائی۔ جلد اول صفحہ ۲۱۲ [۳] ایضاً ۳۷۱ [۴] اروِن صفحہ ۳۷۵

نادر شاہ کی آمد ایرانی پارٹی کو تقویت پہنچانی گئی تھی اسحٰق خاں نے موتمن الدولہ خطاب اور منصب شش ہزاری پایا۔ عالی مراتب عطا ہوئے۔ تورانی پارٹی کا لیڈر نظام الملک ابھی دہلی میں موجود تھا۔ قمرالدین خاں نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ نظام الملک نے محمد شاہ کی کمزوری کا اندازہ کرتے ہوئے کہا کہ تم وزارت چھوڑ کر میرے ساتھ جانے کا اعلان کردو۔ جب محمد شاہ نے نظام الملک کے ہمراہ قمرالدین خاں کے جانے کی خبر سنی گھبرا گیا۔ بالآخر مطالبہ دریافت کیا۔ قمرالدین نے شرط پیش کی کہ عمدۃ الملک کو دہلی سے الہ آباد اس کے صوبے کو بھیج دیا جائے۔ چنانچہ چار و ناچار محمد شاہ نے شرط منظور کی اور عمدۃ الملک کو الہ آباد جانا پڑا۔ اب نظام الملک دکن کو سدھارا۔ پنجاب میں سکھوں کی طاقت ابھرنے لگی، علی محمد خاں نے بھی اپنا رقبہ حکومت بڑھا لیا تھا۔ مرہٹوں نے اب پاؤں زیادہ پھیلانے شروع کئے۔ مغل حکومت بے بس ہو چکی تھی، محمد شاہ اب اور بھی غافل ہو گیا۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا وہ کیوں ماتم کرتا، اس کی مجلس عیش و نشاط کیوں برہم ہوتی۔ عوام تباہ ہوں اس کی بلا سے۔ سعادت صاحب کی جگہ صفدر جنگ اودھ کا گورنر ہو گیا تھا۔ وہ بڑا ذہین اور موقع شناس تھا۔ ایرانی پارٹی کی تنظیم سے فائدہ اٹھانا جانتا تھا۔ محمد شاہ کی طبیعت تلون پسند تھی، اس نے عمدۃ الملک کو یاد کیا تو عمدۃ الملک نے جواب میں یہ لکھ بھیجا ؎

اب بھی احسان بخت نیرا جو نہ ہوا آزاد ہم :: پھر چمن میں جائیں کیا منہ لے کے لے صیاد ہم

لیکن وہ خدا سے جانتا تھا کہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو (۲۹ رمضان ۱۱۵۶ھ)

چنانچہ محمد شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور پھر وہی رنگ رلیاں ہو گئیں، علی محمد خاں کے خلاف پھر مہم عظیم کا آدمی تھا، فوج کشی ہوئی۔ محمد اسحاق خاں اوّل کا انتقال ہو گیا اس کا بیٹا مرزا اسحٰق خاں دوہرے خطاب سے نوازا گیا، اور اس کے بھائی مرزا محمد علی اور رضیہ سالار جنگ نوازے گئے۔ شجاع الدولہ کی شادی مرزا محمد علی کی بہن سے کی گئی۔

اور شادی کا اہتمام محمد شاہ نے کیا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایرانی پارٹی کی طاقت ور ہو گئی تھی۔ لیکن بادشاہ کا رعب اور دبدبہ ختم ہو چکا تھا۔ جیسا کہ آنند رام مخلص نے علی محمد خان کی جنگ کے سلسلے میں نقل کیا ہے۔[۱] کہ

عمدۃ الملک سے محمد شاہ نے ایک دن تیر کمان ہاتھ میں لے کر کہا یہ مار، تو جواب میں عمدۃ الملک نے کہا۔ موئے کس کو مارا۔

آنند رام کہتا ہے کہ مجھے اس قول پر اعتبار نہیں، جس جوہری نے یہ بات بیان کی وہ اسے باور نہیں کرتا، لیکن یہی بات گپتا اپنی تاریخ پنجاب میں لکھتا ہے (ص ۳۲ و ص ۳۳) کہ نادر شاہ کے حملے نے مغل حکومت کے رعب و داب کو عوام کے دلوں سے ختم کر دیا۔

اس حملے کے دوسرے نتائج یہ ہیں :۔

۱۔ دلی کی بربادی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا اس کی تفصیل شہر آشوبوں میں ملتی ہے۔

۲۔ ایرانی امرا کا پرانا طبقہ ختم ہو گیا، امرا کی ایک دوسری پود سامنے آئی جس میں عمدۃ الملک امیر خاں انجام اسحاق خاں شوستری، جاوید خان خواجہ سرا تھے

۳۔ نظام الملک جانے کے جانے کے بعد کوئی اچھا منتظم دہلی میں نہیں رہا۔ محمد شاہ افیون کے استعمال اور عیاشی کے سبب سے اپنی صحت خراب کر بیٹھا۔ اور دلی سے کم نکلتا تھا۔[۲]

۴۔ بدن سنگھ جاٹ نے اپنی قوت اور سلطنت بڑھالی۔

۵۔ بدانتظامی کی نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ نادر شاہ کے حملے کے فوراً بعد بہترین فصل ہوئی اور چیزوں کی قیمتیں گر گئیں، لیکن کسی نے سنجیدگی سے انتظام سلطنت کو درست نہیں کیا۔[۳]

---

[۱] سرکار جلد اول ص ۱

[۲] ص ۶۳ [۳] ایضاً ص ۳۳

امرائے دربار اور خود بادشاہ صوفیا کی صحبتوں کے عادی ہو گئے۔ اور ان کی توجہ امور ملکی سے ہٹ گئی۔

گپتا ایک معاصر مورخ کا بیان نقل کرتے ہیں[1] کہ جب کبھی علاقہ میں وہ مرہٹوں کے حملے کی خبر پہنچتی تو بجائے امداد بھیجنے کے بادشاہ اور وزیر عیش و عشرت اور سیر و شکار میں مشغول ہو جاتے تاکہ یہ غم دور ہو سکے، اس طرح ملک کے مالیہ کی صورت بھی ابتر ہو گئی۔ اور فوج کی تنخواہوں کا بھی خیال نہ تھا۔

۶۔ محمد شاہ میں مرہٹوں کا مقابلہ کرنے کی تاب نہ تھی، مرہٹوں نے اپریل ۱۷۴۲ء میں ناگ پور کی گدی کی طرف سے حملے شروع کر دیئے[2] اڑیسہ، جنوب مشرقی بہار اور بنگال پر حملے ہونے لگے، بادشاہ نے پونے کی گدی سے درخواست شروع کی کہ ناگ پور کی گدی کو بنگال کی طرف بڑھنے سے روکا جائے[3] اس طرف صفدر جنگ کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ بنگال میں مرہٹوں کی سرکوبی کرے اس میں یہ خواہش بھی چھپی ہوئی تھی کہ بنگال دوبارہ حلقۂ اقتدار میں آجائے۔

زکریا خاں یکم جولائی ۱۷۴۵ء فوت ہوا[4]۔ اس کے بعد پنجاب میں صوبہ دار بیک وقت دو آقاؤں کے ملازم رہنے لگے، اس لئے بد نظمی حد درجہ پیدا ہو گئی۔ یحییٰ خاں اور شاہنواز خاں زکریا خاں کے بیٹے پنجاب کی صوبہ داری کے لئے لڑنے لگے۔ یحییٰ خاں قمر الدین خاں کا داماد تھا۔ محمد شاہ پنجاب پر تورانی اقتدار نہیں چاہتا تھا، مگر قمر الدین خاں نے خفیہ طور پر یحییٰ خاں کو پنجاب بھیج دیا، اس نے جا کر قبضہ کر لیا۔ مجبوراً قمر الدین کو محمد شاہ نے گورنر بنایا اور یحییٰ خاں نائب رہا۔ لیکن شاہنواز خاں نے

[1] فتح، نوٹ ص[illegible]

[2] سرکار جلد اول ص۱۸ [3] اروِن جلد دوم ص۳۴۶ [4] بقول آنند رام مخلص، بدائع وقائع قلمی ورق ۱۱ ملوکہ راقم۔ گپتا ص۸۲

تسلیم نہ کیا۔ اور لڑ کر اُسے شکست دی اور قید کر لیا[۱]۔ شاہنواز نے قمر الدین خاں سے استدعا کی کہ وہ اسے اپنا نائب تسلیم کر لے۔ لیکن یہ خواہش پوری نہ ہوئی اس لئے شاہنواز خاں نے آدینہ بیگ خاں کے مشورے سے احمد شاہ ابدالی کو پنجاب پر حملہ کی ترغیب دے دی۔

[۲] ابدالی وسط دسمبر ۱۷۴۷ء میں پشاور سے چلا اور شاہدرہ ۸ جنوری ۱۷۴۸ء کو پہنچا۔ ۱۱ جنوری ۱۷۴۸ء کو اس نے لاہور فتح کیا۔ دہلی میں قمر الدین خاں وزیر اس بات کا انتظار کر رہا تھا۔ کہ راجہ جے پور امداد کو آجائے تو وہ روانہ ہو۔ چنانچہ وہ دہلی سے احمد شاہ ولیعہد سلطنت کے ہمراہ لڑائی کو نکلا۔ ۱۱ مارچ ۱۷۴۸ء کو لڑائی ہوئی اور قمر الدین خاں گولہ لگنے سے زخمی ہو کر ڈھیر ہو گیا۔ معین الملک نے یہ خبر چھپائے رکھی۔ راجہ جے پور (ایشری سنگھ) فرار ہو گیا لیکن معین الملک نے صفدر جنگ کی ہمراہی میں یہ لڑائی بڑی دلیری سے لڑی۔ اتفاقیہ طور پر ابدالی کے ذخیرہ آلاتِ آتشین میں آگ لگ گئی۔ اور اس طرح فتح خدا داد" نصیب ہوئی[۳]۔ احمد شاہ ابدالی شکست کھا کر واپس گیا۔ محمد شاہ نے ۱۱۶۱ھ میں انتقال کیا صاحب سیر المتاخرین کے قول کے مطابق ۲۷ ربیع الآخر کا دن تھا۔ آنند رام مخلص وجہ الفت قمر الدین خان نے بدائع وقائع[۴] میں لکھا ہے۔

بست و ششم ربیع الآخر یک ہزار و یک صد و شصت و یک ہجری روز پنجشنبہ بعلۃ ازشب مانده[۵] - اس سے صحیح تاریخ ۲۶ ربیع الآخر ۱۱۶۱ھ بنتی ہے۔ کیونکہ

---

[۱] ۲۱ نومبر ۱۷۴۷ء۔ ۱۷ مارچ ۱۷۴۸ء گپتا ص ۶۵، ۶۶ [۲] بحوالہ گپتا ص ۶۹

[۳] مفتاح التواریخ ص ۳۲۶ [۴] سیر المتاخرین جلد سوم ص ۱۹ [۵] قلمی نسخہ رامپور ورق ۲۵ الف

اپنی کتاب (مغلوں کا زوال ص۲۶) میں ۱۶ اپریل ۱۷۴۸ء لکھا ہے مفتاح التواریخ میں سیر المتاخرین کی پیروی کی گئی ہے، سرکار نے بالکل سنہ ہی نہیں لکھا ہمارے نزدیک خافی خاں کا بیان مرجح ہے

(۶)

احمد شاہ
پ ۱۷۲۵ء
و ۱۱۸۸ھ

احمد شاہ کو فتح کے بعد محمد شاہ کا خط ملا کہ وہ فوراً دہلی واپس پہنچے، راستے میں تھا کہ اسے محمد شاہ کی وفات کی خبر ملی۔ اس کی تخت نشینی کی تاریخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

۱۔ صفدر جنگ کی سعی سے احمد شاہ غرہ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ کو یکشنبہ کے روز باغ شالامار دہلی میں تخت نشین ہوا[1]

۲۔ یکم جمادی الاول ۱۱۶۱ھ مطابق ۲۹ اپریل ۱۷۴۸ء[5]) [2] ۳۔ سرکار[3] ۱۸ اپریل ۱۷۴۸ء، مفتاح التواریخ میں قطعہ تاریخ دیا ہے، جس سے ۱۱۶۱ھ برآمد ہوتے ہیں۔ (ص۳۲۷)

صفدر جنگ سے وزارت کا وعدہ تھا لیکن نظام الملک کے ڈر سے یہ کام نہیں کیا گیا۔ نظام الملک آصف جاہ دکن میں ۲۱ مئی ۱۷۴۸ء کو فوت ہوا (اس کی اطلاع ۱۹ جون کو دہلی میں پہنچی)، اور ۲۰ جون ۱۷۴۸ء سے وزارت کا کام صفدر جنگ نے شروع کیا[6]۔ عہدوں کی تقسیم یوں ہوئی۔

بخشی اول۔ سید صلابت خاں ذوالفقار جنگ امیر الامرا (ابن سادات خاں خرخ پیری[7])

---

[1] ترجمہ سیر المتاخرین ص۱۵۱ جلد سوم [2] تاریخ لاہور ڈاکٹر باقر ص۱۸۰، [3] جلد اول ص۱۸۵ [4] ص۳۲۷ [5] اس موقع پر ڈاکٹر باقر صاحب نے ہجری کے سنہ کو عیسوی میں بدلنے میں غلطی کھائی ہے۔ یکم جمادی الاول ۱۱۶۱ھ ۱۸ اپریل ۱۷۴۸ء کے برابر آتا ہے [6] سرکار جلد اول ص۱۹۱ [7] ۲۰ جون ۱۷۴۸ء سلخ ۱۱۶۱ھ یکم رجب

بخشی دوم - انتظام الدولہ خان خاناں (ابن قمر الدین خاں وزیر)

دیوان خالصہ - اسحاق خاں نجم الدولہ (پسر اسحٰق خاں موتمن الدولہ

شرف دیوان خاص اعسکر علی خاں[1]

صدر الصدور - عبداللہ خاں خانساماں سعدالدین خاں (بحال رہے)

بخشی ثالث - عبدالمجید خاں[2]

صوبوں کی گورنریاں یوں تھیں کہ کابل ہاتھ سے جاتا رہا تھا۔

پنجاب معین الملک (عرف میر منو) گورنر

اودھ - الہ آباد - صفدر جنگ (اودھ کے علاوہ الہ آباد بھی مل گیا تھا) گورنر

آگرہ - اجمیر بیتار صلابت جنگ "

بنگال - بہار، اڑیسہ علی وردی خاں کی اولاد میں تقسیم رہا - "

مالوہ - پیشوا کے قبضے میں رہا۔

دکن - ناصر جنگ خلف نظام الملک (اپریل ۱۷۴۹ء)

نظام الملک کا بڑا بیٹا غازی الدین خاں - وہلی میں رہا[3] - اسے جاوید خاں خواجہ سرا کی سفارش سے خلعت مانی عطا ہوا[4]۔

احمد شاہ جوانی تک حرم کی چاردیواری میں رہا تھا، اب جو آزادی ملی تو خوب کھل کھیلنے لگا - بیوی (مہابت خاں بیٹی) کو طلاق دے ڈالی - چنانچہ اشرف علی خاں فغاں کوکہ احمد شاہ کہتا ہے ؎

---

[1] ترجمہ سیرالمتاخرین جلد سوم صفحہ ۲۱ پنجشنبہ رجب ۱۱۶۱ھ [2] ایضاً [3] سرکار ریا ئل فال ۱۹۱، ۱۹۲ وفات ۱۱۶۵ھ جو مفتاح التواریخ ۳۰۲ [4] سرکار جلد ا صفحہ ۱۹۲

[5] ۱۱ رجب ۱۱۶۱ھ (ترجمہ سیرالمتاخرین جلد سوم صفحہ ۲۳)

بر دختر رزنشت تو نشد نہ مشتاق ؟ ۔ ما ہیچ نشنیدیم کہ داد است طلاق
افسوس، افسوس ایں چہ حالت رو داد ۔ حال تو خراب گشت اے نرم ساق[1]

صفدر جنگ وزیر ضرور تھا لیکن اصل اختیار احمد شاہ کی والدہ اودھم بائی (جواب نواب قدسیہ قبلۂ عالم وغیرہ خطابات سے سرفراز تھی) کے ہاتھ میں تھا۔ یہ ایک رقاصہ تھی جو محمد شاہ کے حرم میں داخل ہوئی اور بدچلن تھی[2]۔ احمد شاہ کی تخت نشینی پر تمام اختیارات اس کے ہاتھ میں آ گئے[3]۔ اودھم بائی کا معتمد خاص جاوید خاں خواجہ سرا تھا۔ جو پہلے داروغہ دیوان خاص[4] پھر عرض مکرر اور دوسری نوازشوں سے سرفراز ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہانہ رعب داب ختم ہو گیا۔ فوجیوں اور دربانوں کی تنخواہ میں تعویق ہوئی تو دربانوں نے تنگ آ کر محل کے دروازے پر ایک کتا اور گدھا باندھا۔ جو محل میں داخل ہوتا اسے روکتے اور کہتے پہلے انہیں سلام کرو، کتا حضرت قدسیہ اور گدھا نواب بہادر ہے[5]۔ بادشاہ پر جاوید خاں حاوی تھا۔ اکثر امر و نہی اس کے حسب دلخواہ ہوتے۔ اس وجہ سے صفدر جنگ کی دشمنی اس سے بڑھتی گئی[6]۔ دربار میں ایرانی تورانی کشمکش جاری تھی، انتظام الدولہ وزارت اپنا حق سمجھتا تھا جو صفدر جنگ کو ملی غازی الدین خاں بخشی کا عہدہ نظام الملک کے بعد اپنا حق جانتا تھا لیکن صفدر جنگ نے یہ عہدہ [illegible] خاں کو دیا، اس لئے شیعہ سنی چپقلش بڑھ گئی، امرا تورانیوں کا ساتھ دینے لگے۔

۱؎ دیوان فغاں صفحہ ۲۰۹ ۲؎ دیوان فغاں صفحہ ۲۰۰، صفحہ ۲۱۱ میں اس کے خلاف کچھ ہیں دیکھئے، بیچہ ماں خاں خالوے احمد شاہ اور دوسری بچہ (مادر) احمد شاہ
۳؎ ۱۹ جون ۱۷۴۸ء ۴؎ سرکار جلد اول صفحہ ۱۸۹ ۵؎ سرکار صفحہ ۱۸۱ گپتا صفحہ ۱۸
۶؎ ترجمہ سیر المتاخرین جلد سوم صفحہ ۲۰ ۷؎ سرکار صفحہ ۱۹۵، ۱۹۶

اقتصادی بدحالی

ملک اقتصادی بدحالی میں مبتلا تھا ادھم بائی اپنی سالگرہ پر بے شمار روپیہ صرف کرتی، ذرائع آمدنی قبضے سے نکل چکے تھے۔ ملک کے اکثر حصے مرکز سے باغی تھے۔ شاہی احکام کی تعمیل نہ ہوتی۔ دہلی کے قریب کی منڈیاں اور زرخیز زمین نواب قدسیہ کے اعزا اور احباب میں تقسیم تھی۔ جمنا کی نہروں کی آمدنی جو اندازاً ۲۵ لاکھ سالانہ تھی، صفدر جنگ نے اپنے لئے مخصوص کر لی تھی، احمد شاہ نے اخراجات کے لئے بعض اچھی زمینیں صرف خاص کے لئے رکھ لی تھیں، ان میں کا اکثر روپیہ خورد برد ہو جاتا۔ غرض ہر امیر خود غرض تھا اور اپنے فائدے کی سوچتا تھا۔ جاوید خاں، صفدر جنگ اور ذوالفقار جنگ اپنے عہدے اور قوت کے باعث اپنی آمدنی بحال کئے ہوئے تھے۔ باقی امرا مفلس تھے۔ اکثر فوجیوں اور دربانوں کو جواب دے دیا گیا جو باقی تھے، ان کی بھی تنخواہیں ادا نہ ہو پاتی تھیں، چونکہ جو روپیہ آتا وہ عیاشی میں اُٹھ جاتا۔ سرکار بحوالہ شاکر خاں درباری معتمد خاص احمد شاہی کہتا ہے کہ فوجیوں کی تنخواہوں کی ادائیگی تین سال تک ملتوی رہی انہوں نے تنگ آکر یہ رویہ اختیار کیا کہ جس کے ہاتھ جو شاہی چیز آگئی وہ لے گیا فوجی امرا کے مکانوں میں داخل ہو جاتے جو چیز مل جاتی وہ اُٹھا لاتے اور بیچ ڈالتے۔ خواص اور تجارت پیشہ لوگوں کا سامان جو نظر آتا وہ جبریہ لے جاتے اور فروخت کر دیتے۔ دہلی میں اس رویہ سے اتنا خوف و ہراس پیدا ہو گیا کہ ذرا اپنے گھر کچھ نہ رکھتے۔ مٹی کے برتنوں میں کھانا کھاتے بالکل تباہی دور دہلی کے اندر نظر آتا تھا۔ جب سرکاری اشیا بیچ کر فوجیوں کی تین سال کی واجب الادا تنخواہیں ادا کی گئیں، تو لوگ بازاروں اور گلیوں میں حکومت کا مذاق اُڑاتے تھے[1] شاہی خزانہ خالی تھا اور فوجیوں کی تنخواہیں کبھی ۱۴ ماہ کبھی ۱۸ ماہ

---

[1] بیان شاکر خاں۔ بحوالہ سرکار جلد اول ص۱۹۲، ص۱۹۵

کبھی ۱۳ ماہ کی واجب الادا ہو جاتیں اور آخر تنگ آکر فوجی اُمرا اور وزرا کے مکانات پر پہرے لگا دیتے کہ نہ کوئی باہر نکلے نہ اندر جا سکے اور فاقہ کشی کی نوبت پہنچ جاتی۔ آخر مجبور ہو کر حکومت نے تمام کارخانوں کی اشیاء کی فہرستیں مرتب کرائیں ان اشیائے سرکاری میں اسلحہ، قالین، برتن، پلیٹیں، کتابیں دوکانداروں کے پاس فروخت کی گئیں۔ فوجیوں کی تنخواہیں اس رقم سے ادا ہوئیں[۱]، صفدر جنگ اور جاوید خاں دو قوی حریف تھے، پس پردہ جوڑ توڑ کرتے۔

دربار کی حالت

شاہ و وزیر ایک دوسرے کو زیر کرنے کی فکر میں تھے، چنانچہ ناصر جنگ، کو شاہ کی جانب سے لکھا گیا کہ وہ اگر صفدر جنگ کو نکال دے، اس کے آنے میں دیر ہوئی۔ صفدر جنگ کو خبر ہو گئی، اب اس نے مرہٹوں سے امداد چاہی۔ آخر احمد شاہ نے صفدر جنگ کے گھر جا کر صلح کر لی[۲]۔ صفدر جنگ پٹھانوں سے خائف تھا۔ علی محمد خاں ۱۷۴۹ء میں فوت ہوا تو صفدر جنگ نے نواب قائم خاں والی فرخ آباد کے نام حکم شاہی بھیج دیا کہ روہیل کھنڈ کا علاقہ تمہیں دیا جاتا ہے۔ قائم خاں قبضہ کرنے چلا۔ حافظ رحمت خاں وغیرہ نے مقابلہ کیا[۳]۔ قائم خاں مارا گیا[۴]۔ صفدر جنگ قائم خاں کی ریاست ضبط کرنے چلا۔ احمد خاں اور اس کے بھائی نے مدافعت کی اور صفدر جنگ نے شکست کھائی۔ جاوید خاں نے جب یہ خبر سنی خوش ہوا اور صفدر جنگ کو وزارت سے ہٹانے کی کوشش کی[۵]۔ شکست خوردہ وزیر نے جاوید خاں کو بڑی رشوت دیکر وزارت بچائی[۶]۔

۱؎ فال آف مغل ایمپائر سرکار جلد اول ص۱۹۲، ۱۹۰ ۲؎ سرکار ص۱۹۵ ۳؎ ۱۷ اپریل ۱۷۴۹ء

۴؎ سرکار ص۲۰۲ ۵؎ ۱۱ نومبر ۱۷۴۹ء ۶؎ سرکار ص۲۱۰

۷؎ سرکار ص۲۲۲، ص۲۲۵

مگر یہ ذلت وہ بھول نہ سکا۔ اور پٹھانوں کو مٹانے کے درپے ہوا۔ اس کے لئے مرہٹوں اور جاٹوں کو دعوت دی، ملہار راؤ کو ۲۵ ہزار روپیہ (یا ۳۵ ہزار روپیہ) اور سورج مل کو ۱۵ ہزار روپیہ دینا طے کیا تاکہ سب مل کر روہیلوں کو مٹا دیں[1]۔ ان فوجوں نے فرخ آباد کو گھیر لیا۔ احمد خاں نے روہیلوں سے مدد مانگی، وہ بڑا دری کی وجہ سے آ گئے، لیکن صفدر جنگ نے احمد خاں بنگش کو شکست دی، پٹھانوں نے دامنِ کوہ میں پناہ لی اور (فاتح فوجوں نے روہیل کھنڈ میں لوٹ مار شروع کر دی[2])۔ صفدر جنگ نے محاصرہ جاری رکھا کہ ادھر پنجاب میں ابدالی کی آمد کی خبر ہوئی۔ آغاز ۱۷۵۲ء اب احمد شاہ نے وزیر پر دباؤ ڈالا کہ روہیلوں سے صلح کرے۔ چنانچہ آغاز اپریل ۱۷۵۲ء میں عہد نامہ ہو گیا[3]۔ کنکیڈ نے عہد نامے کی تفصیل یوں دی ہے۔ طے پایا کہ پانچ لاکھ روپیہ سالانہ بادشاہ کو روہیلے ادا کریں اور پچاس لاکھ روپیہ کی ہنڈیاں صفدر جنگ کو دیں، جو مرہٹوں کو ان کے اخراجات کے سلسلے میں دے گا، ان ہنڈیوں کی رقم کبھی مرہٹوں کو نہ ملی اور اسی وجہ سے آئندہ روہیل کھنڈ پر مرہٹے اپنا حق جتانے لگے[4]۔ قنوج۔ اکبر پور اور دوسرے مقبوضہ بنگش علاقے گوبند پنت بندیلے وکیل مرہٹہ کے قبضے میں دیئے گئے۔ مہرآباد بنگش علاقہ روہیلوں کے قبضے میں رہا جس پر قائم خاں جنگ میں قبضہ کر چکے تھے، اس طرح روہیلکھنڈ اور فرخ آباد کی ریاستوں کی حدیں مرہٹوں سے مل گئیں[5]۔ سید صلابت خاں ذوالفقار جنگ کا یہ حشر ہوا کہ وہ کافی عرصہ راجپوتانے میں مقیم رہ کر کچھ حاصل نہ کر سکا۔ صفدر جنگ کی علیحدگی کی خبر سن کر وہ دہلی آ گیا۔ فوج لا

---

[1] سرکار جلد اوّل ص ۲۲۶، ص ۲۲۹ [2] ہسٹری آف دی مرہٹہ پیپل جلد سوم ص ۹۳ الفنسٹن ص ۲۳۱ [4] ہسٹری آف دی مرہٹہ پیپل جلد سوم ص ۵۳ [5] سرکار جلد اوّل ص ۲۳۰

کی تنخواہ واجب الادا تھی، خزانہ سے روپیہ نہ ملا۔ دربار کا جانا بند کر دیا۔ بادشاہ
کی نسبت کلمات توہین آمیز کہے۔ جاوید خاں نے شکایت کر کے ۷ جون ۱۷۵۱ء
کو اس کے خطابات اور جاگیر چھنوا دی، فوجیوں کی تنخواہیں اس نے گھر کا سامان بیچ
کر ادا کیں اور فقیری اختیار کر لی، انتظام الدولہ کو خانخاناں کا خطاب اور صوبہ اجمیر
ملا[۱]۔ اس طرح تورانی پارٹی کو جاوید خاں آگے لایا تاکہ صفدر جنگ کا مقابلہ ہو سکے[۲]
دکن میں ناصر جنگ ۵ دسمبر ۱۷۵۰ء کو قتل ہوا، اور دہلی میں ۱۶ جنوری ۱۷۵۱ء
کو یہ خبر پہنچی[۳]۔ شمالی ہند میں احمد شاہ ابدالی داخل ہو چکا تھا، صفدر جنگ روہیلوں
سے صلح کر کے مرہٹوں کو ہمراہ لے کر بڑھا کہ ابدالی کا مقابلہ کیا جائے۔ ابدالی کا حملہ
اس وجہ سے ہوا تھا کہ معین الملک تین سال کے محاصل نہ بھیج سکا۔ پنجاب میں داخل
ہوا۔ لوگ ڈر کر دوسرے علاقوں میں بھاگنے لگے۔ معین مقابلہ کے لئے پل شاہ دولہ
پر ٹھہرا۔ ابدالی راہ کاٹ کر لاہور مقبرہ شاہ بلاول کے پاس جا پہنچا[۴] ۵ مارچ ۱۷۵۲ء
کو مقابلہ ہوا۔ معین الملک نے شکست کھائی۔ اور ۶ مارچ ۱۷۵۲ء کو ابدالی لاہور پر
قابض ہوا۔ چالیس پچاس میل کے اندر کا علاقہ افغانوں نے برباد کر دیا۔ تین منزل تک کہیں
چراغ جلتا نہ دکھائی دیتا۔ ابدالی نے قلندر بیگ کو دہلی بھیجا، کہ پنجاب ہمارے حوالے
کیا جائے۔ اور کشمیر پر فوج کشی کی جو کامیاب رہی۔ صفدر جنگ احمد شاہ کے بلانے کے باوجود

۱؎ ۷ رجب ۱۷۵۱ء ۲؎ سرکار جلد اول ص ۲۰ ۳؎ ڈاڈویل ۱۶ دسمبر۔ قتل کی تاریخ دیتے ہیں بعض ۱۶ دسمبر۔ تاریخ ہسٹری ص ۱۲۵ ۴؎ سرکار نے شاہ بلاول لکھا ہے بقول گپتا شاہ بلاول ہونا چاہیے۔
متوفی ۱۰۴۶ھ لاہور میں دہلی دروازہ کے باہر مزار ہے۔ اردو ترجمہ حدیقۃ الاولیا
از مفتی غلام سرور لاہور نولکشور پریس ۱۲۹۲ھ ص ۱۸، ۱۹

نہ آیا۔ ۱۳ مارچ کو معین شکست کھا چکا تھا، سفیر کے آنے سے شہر میں بے چینی پھیل گئی۔ لوگوں نے اپنے بال بچے شہر کے باہر (خصوصاً متھرا اور جاٹ علاقہ کی طرف) بھجوا دیئے۔ دلی میں کچھ دنوں کے لئے اناج کی گرانی ہو گئی۔ احمد شاہ نے صفدر جنگ کو خط لکھا کہ مرہٹوں کو امداد پر آمادہ کرو۔ یہ معاملات ہو ہی رہے تھے کہ احمد شاہ نے جاوید خاں کے مشورے کے مطابق ابدالی کا مطالبہ مان کر لاہور اور ملتان حوالے شاہ ابدالی کرنا تسلیم کر لیا۔ ابدالی نے اپنی جانب سے معین الملک کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ صفدر جنگ ۱۴ مارچ کو اپنے علاقہ سے روانہ ہوا، آہستہ آہستہ دہلی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اور ۲۵ اپریل کو صفدر جنگ پچاس ہزار مرہٹہ فوج کے ساتھ جمنا کے کنارے پہنچا۔ شاہ ابدالی صلح کر کے اپریل میں واپس لوٹ گیا تھا، صفدر جنگ صلح کی خبر سن کر برہم ہو گیا، وہ مرہٹوں سے جو عہد و پیمان کر چکا تھا اُس کو کس طرح پورا کرتا۔ اس لئے شہر میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ مرہٹوں کو پچاس لاکھ روپے کی وعدہ شدہ رقم نہ ملی تو انہوں نے دہلی کا نواحی علاقہ برباد کرنا شروع کر دیا۔ ہزاروں آدمی بے خانماں ہو گئے۔ لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔[۱] پہلے ہی چوری چکاری عام تھی، اب مرہٹوں نے انتہا کر دی۔ آخر مجبور ہو کر احمد شاہ نے مرہٹوں سے جاوید خاں خواجہ سرا کی معرفت گفت و شنید کی، آخر غازی الدین خاں نے تحریک کی کہ دکن کا صوبہ اُسے دیا جائے تو وہ مرہٹوں کو دہلی سے لے جائے گا۔ ۷ مئی ۱۷۵۲ء کو غازی الدین کو میر بخشی اور صوبہ دار دکن بنایا گیا تاکہ صلابت جنگ (جو فرانسیسیوں کی امداد سے دکن پر قابض ہو چکا تھا اور جس کا مشیر بسی تھا، اس) پر حملہ آور ہو۔ صلابت جنگ کو بے دخل کر کے غازی الدین خاں ناتھ پائیں شہر میں[۲]

---

[۱] سرکار ص ۲۰۲ [۲] گپتا ص ۱۶۵ [۳] سرکار ص ۲۰۲ [۴] غازی الدین نے اسی سال ذوالحجہ میں اورنگ آباد میں وفات پائی۔ سیر المتاخرین، اردو ترجمہ جلد سوم ص ۶۳۲ نے لکھا کہ ان کے دل میں زہر دیا گیا تھا ۱۷۵۲ء

۱۷۵۲ء کو غازی الدین خاں مرہٹوں کو دہلی سے لے کر چلا گیا۔ اور شہر میں امن قائم ہوا۔ جاوید خاں نے اب بلرام جاٹ کی حمایت کی جو دہلی اور آگرہ کی سڑک کو لوٹتا تھا۔ اس نے بلبھ گڈھ میں قلعہ تعمیر کر لیا اور سکندرآباد پر حملہ کیا۔ صفدر جنگ، جاوید خاں کی مخالفت کی وجہ سے اُسے زیر نہ کرسکا۔ آخر اُس نے جاوید خاں کو بقول سرکار ۲۷ اگست ۱۷۵۲ء میں اپنے گھر دعوت کی اور مروا دیا۔[1] ڈاکٹر سری واستو[2] - ۶ ستمبر ۱۷۵۲ء دیتے ہیں[3] سیر المتاخرین نے یہ واقعہ شوال کا بتایا ہے[4] جو مطابق ماہ اگست ہے۔ جاوید کا قتل کرنا سرکار کی نظر میں صفدر جنگ کی اہم غلطی تھی۔ چار دن بعد صفدر جنگ نے ابوتراب خاں کو قلعہ دار مقرر کر دیا، بادشاہ کے ارد گرد اپنے آدمی پھیلا دیئے، اپنے کم عمر بیٹے[5] شجاع الدولہ کو نائب وزیر، میر آتش، داروغہ احدیاں وغیرہ مقرر کرکے گھر میں تمام عہدے رکھ لیے (۲۹ ستمبر ۱۷۵۲ء)

۶ ستمبر سے ۱۶ مارچ ۱۷۵۳ء تک صفدر جنگ مختار کُل رہا۔ لیکن جاوید خاں کو قتل کرکے اُس نے بے شمار دشمن بنا لیے۔ اُدھم بائی (قدسیہ) کو صفدر جنگ سے سخت نفرت ہوگئی تھی۔ امرائے دربار صفدر جنگ کے اقتدار سے برہم تھے، بادشاہ بھی اُس سے نالاں تھا۔ سرکار کی رائے میں صفدر جنگ نہ تو اچھا جرنیل تھا نہ اچھا لیڈر، اگرچہ اس میں ذاتی بہادری کا جوہر تھا، لیکن مزاج کی تیزی اسے بھی غیر مفید بنا رہی تھی، فضول خرچ اور عیاش تھا۔[6]

---

[1] سرکار جلد اوّل ص ۲۰۹، فقرہ ۲۱ [2] شجاع الدولہ ص ۹ جلد اوّل [3] بحوالہ تاریخ محمد شاہی وغیرہ [4] ص ۳۳۱ [5] سرکار ص ۲۱ [6] جلد اوّل ص ۲۵ [7] ہماری رائے میں سرکار نے صفدر جنگ کے کردار کو صحیح طور پر پیش نہیں کیا وہ بہترین مدبر تھا لیکن ایرانی عناصر نے اس حد تک مجبور کر دیا تھا کہ وہ تورانی پارٹی کے بعض اُمرا کو بھی اپنے ساتھ شامل نہ کرسکا اور اس وجہ سے بعد میں شیعہ سنی جو ہنگامہ پیدا ہوگیا وہ اس سیاسی غلطی سے ہوا۔

وہ سرکاری مالیہ اپنے اور اپنے دوستوں کے صرف میں لاتا اور شاہی متعلقین اور ملازمین محروم رہتے، اس لیے شاہی ملازم بلوے اور لوٹ مار کیا کرتے۔[۱] اس نے انتظام الدولہ کے قبضے سے سرہند نکال کر اپنے نام کر لیا، تو انتظام الدولہ اور بھی زیادہ دشمن ہو گیا۔ دربار میں مخالف امرا کو صفدر جنگ داخل نہ ہونے دیتا۔ اُس نے محل میں اودھم بائی پر جاسوس عورتیں مقرر کر رکھی تھیں آخر اودھم بائی نے برہم ہو کر انہیں محل سے نکال دیا۔ شولاپوری بیگم (انتظام الدولہ کی ماں قمر الدین وزیر کی بیوی) اودھم بائی کی مشیر تھی۔ اتفاق یہ ہوا کہ غازی الدین فیروز جنگ (متوفی ۲۹ر اکتوبر ۱۷۵۲ء) کا بیٹا تھا، شہاب الدین جسے صفدر جنگ نے منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا، ۱۲ ستمبر ۱۷۵۲ء صفدر جنگ کی عنایت سے غازی الدین بہادر فیروز جنگ امیر الامرا بن گیا، اس طرح تورانی پارٹی کا ایک کمسن لڑکا ایرانی پارٹی کا زور داراد منیر ہو گیا۔[۲] ۵ فروری ۱۷۵۳ء کو ابدالی نے سفیر بھیجا کہ پنجاب کا لگان ادا کیا جائے یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہ اُن کے پر تفہیم ہے امرائے متفقہ جواب دیا کہ حسب ضرورت مقابلہ کو روانہ کئے جائیں یہ وہ وقت تھا کہ دہلی میں انواکھری بھی ہوتی تھی اور لوگ صفدر جنگ سے بیزار ہو چکے تھے ۱۷ مارچ ۱۷۵۳ء صفدر جنگ کے آدمیوں کو دھوکے سے محل سے بے دخل کر دیا گیا کہ اب صفدر جنگ بے بس ہو گیا اُس کے خلاف تورانی پارٹی مقابلہ میں کھڑی تھی، شہری عوام بھی اُس کے ہاتھوں سے تنگ آ چکے تھے۔ اور وہ مذہب کے نام پر حکومت کا ساتھ دینے پر آمادہ تھے، اب صفدر جنگ نے شاہ کے مقابلہ کی ٹھانی اور دونوں (یعنی شاہ اور وزیر) نے اپنی اپنی حمایت میں مرہٹوں کی امداد چاہی۔ احمد شاہ نے پیشوا کے وکیل مہادیو ہنگنے سے پیشوا کے لیے[۳] اودھ کی گورنری پر معاملہ کر لیا۔ وزیر نے شاہ کو ہراساں کرنے کے لیے سمجھا کے یا امرا کی جاگیروں اور خالصہ زمینوں پر (۲ر اپریل ۱۷۵۳ء) ہاتھ صاف کیا۔ دہلی میں اناج کی ترسیل بند ہو گئی اور

---

[۱] سرکار جلد اول ص ۲۵۳، ۲۵۷ [۲] ص ۲۵۸ [۳] متوفی ۲۹ اکتوبر ۱۷۵۲ء

[۴] سرکار ص ۲۶۳ - سرکار او استقبا شجاع الدولہ ص ۱۱

قحط کے آثار رونما ہوئے، ۱۹؍ مئی کو صفدر جنگ کے ساتھ میر بخشی صلابت جنگ بھی آملا۔ یکم مئی کو سورج مل جاٹ صفدر جنگ کی حمایت میں آیا اور دونوں نے صفدر جنگ کو لڑائی پر اُکسایا۔ ۸؍ مئی کو احمد شاہ نے شجاع الدولہ کو برخاست کر کے صمصام الدولہ ابن خان دوراں کو داروغہ توپ خانہ بنایا۔ ابو تراب کی جگہ احمد انگا قلعدار ہوا۔ ۸؍ مئی سے ۷؍ جون ۱۷۵۳ء تک جھگڑا نئی شکل اختیار کرتا ہے۔ سورج مل جاٹ نے پرانی دلی کو لوٹنا شروع کیا۔ جاٹ گردی شروع ہو گئی۔ شاہجہان آباد کی منڈی کو لوٹا گیا۔ پرانی دلی میں بھگدڑ پڑی اور لوگ شاہجہانی دلّی سے بھاگ کر فصیل میں آ گئے۔ ۱۰؍ مئی ۱۷۵۳ء کو محلہ سبہاواڑہ، بیگم مسجد، نرکہ گنج اور عبداللہ نگر (متصل جے سنگھ پورہ) کو تہ و بالا کیا گیا۔ لاکھوں آدمی تباہ ہوئے، جو رائسینہ اور وکیل پورہ کی بھی شامت آئی۔ بہت سے لوگوں نے خواجہ باسط (صفدر جنگ کے بھتیجے) کے گھر پناہ لی، لیکن وہاں بھی نہ بچ سکے، جاٹ ہر روز دلی کو لوٹتے، صرف وہ جگہ محفوظ رہی، جہاں فوجی دستے پہنچ گئے یا شاہی فوجوں کی توپوں کی مار میں جو علاقے تھے۔ جو محلے تباہ ہو چکے تھے۔ ان کے لوگ اور نئی دلی کے شریف باشندے بھی خوف و ہراس کا شکار ہوتے تھے۔ اور اپنا قیمتی سامان ساتھ لیے پاگلوں کی مانند جائے امن کی تلاش میں تھے، احمد شاہ نے شاہی باغات میں برباد شدہ لوگوں کو رہائش کی اجازت دے دی۔ یاد رہے کہ اُس زمانے میں پرانی دلی کی آبادی نئی دلی کے برابر یا زیادہ ہی ہو گی۔[1]

صفدر جنگ کو وزارت سے ہٹا دیا گیا اور انتظام الدولہ وزیر اور عماد الملک میر بخشی قرار پائے۔ انتظام الدولہ کو قمر الدین اعتماد الدولہ کا خطاب ملا اور عماد الملک نظام الملک آصف جاہ کہلایا۔ صفدر جنگ نے جوابی کارروائی کے طور پر ایک خواجہ سرا

---

[1] سرکار جلد اوّل ص ۲۷۱، ص ۲۷۳

کو کام بخش کا پوتا ظاہر کر کے بادشاہ بنا لیا۔ اس کے جواب میں عماد الملک نے (جو کمسن لیکن نہایت ہی چالباز تھا۔) علمائے اہلسنت والجماعت سے فتویٰ لیا کہ صفدر جنگ نمک حرام رافضی ہے، چنانچہ دلی میں اس کے حامیوں مرزا علی اور سالار جنگ وغیرہ کے گھر لوٹ لیے گئے" اور انہیں گرفتار کیا گیا۔

صفدر جنگ نے ۱۷ر مئی کو قلعہ فیروز شاہ پر قبضہ کیا اور کابلی دروازہ میں داخل ہوا۔ صفدر جنگ اور شاہ کی جانب سے روہیلوں کو بھی اس جنگ میں شرکت کی دعوت دی گئی، حافظ رحمت خاں نے صفدر جنگ کے دباؤ کی وجہ سے غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن عماد الملک کے بھیجے ہوئے علماء کے ساتھ نجیب خاں نے جانے کا اقرار کیا اور اس طرح شہرت کے میدان میں قدم رکھا اور دہلی میں جا کر اس لڑائی میں شاہی فوجوں کی مدد کر کے تاریخ میں مقام پیدا کیا۔ صلے میں نجیب الدولہ کا خطاب اور پنج ہزاری منصب پایا، نتیجہ یہ ہوا کہ صفدر جنگ کی فوج سے ہندوستانی اور بیجوان ٹوٹ کر شاہی فوج سے ملتے گئے، جن کی تعداد کم و بیش ۴۰ ہزار ہو گی۔ صفدر جنگ نے

---

[1] بقول نور الدین ۲ جون ۱۷۵۳ء کو دلی پہنچے اس کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے،
AN ACCOUNT OF NAJIBUDDAULAH (SAYIDNURUD-DIN) TR. ABDURRASHID (1952) ALIGARH. INT. P. L III (پ) تقریباً ۸۰۰، نورالدین نے اس تمام معاملے کی مفصل روداد دی ہے، کتاب کے صفحات ۳، ۲، ملاحظہ ہوں [2] نجیب خاں دوندے خاں کا داماد تھا۔ دوندے خاں نے اسے بجنور کا علاقہ دیا تھا۔ اس معرکے میں احمد شاہ کا ساتھ دیا (کین مثل ہسٹری ص ۲۵)

[3] تعلیقات تاریخ عالم شاہی، مرتبہ عرشی ص ۱۵۵، ص ۱۵۵ ۔ سرگزشت دیباچہ ص ۱ ا ۱ کے لیے ص ۲۲۵

۵ جون سے بڑا حملہ کیا۔ نئی دلی پر گولہ باری کی اور نقصان اٹھایا۔ ۱۸ جون کو راجہ اندر گیر گوسائیں مارا گیا۔ اس دن لڑائی بند رہی، اب شاہی فوجوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ انھوں نے وزیر کی فوجوں کو پیچھے ہٹانا شروع کر دیا۔ نجم تخیر کو فرید آباد کی طرف ہٹا دیا، روہیلہ اور گوجر فوجیں دلی کے آس پاس کے علاقے کو لوٹتی رہیں، اور دلی سے گیارہ میل تک کا علاقہ تہ و بالا کر دیا۔ دونوں فریق جنگ سے اکتا چکے تھے۔ مادھو سنگھ راجہ جے پور نے مصالحت کرا دی، ۵ نومبر کو صفدر جنگ کو اودھ کی صوبیداری کا فرمان ملا۔ ۷ نومبر کو وہ اودھ کی طرف روانہ ہوا، خانہ جنگی نے سلطنت پر برا اثر ڈالا۔ دہلی میں اسی ہزار فوج کی دو سال کی تنخواہ ادا نہ ہوئی تھی۔ لگان کے وعدے پر مہاجن قرضے دینے کو تیار نہ تھے، شاہی محل کے برتن فروخت کر کے تنخواہیں ادا ہوئیں نجیب خاں اور بہادر خاں بلوچ کو ۱۵ لاکھ کے عوض گنگا اور جمنا دوآبہ اور گنگا کے مشرق کے کچھ گاؤں (جن پر وہ خود ہی قابض تھے) کے محاصل عطا ہوئے اور ۲۶ نومبر کو دہلی سے وہ اپنے علاقے کو راستے کے دیہات لوٹتے ہوئے چلے، مرہٹوں کو عماد الملک نے اس طرح تجویز پر راضی کیا کہ سورج مل جاٹ کو لوٹا جائے اور مرہٹوں کا مطالبہ پورا ہو۔ مرہٹے ادھر روانہ ہوئے، اطراف کو عماد الملک گیا اور متھرا سے آگرہ تک کا علاقہ جاٹوں سے چھین لیا۔ ڈیگ کا محاصرہ ہوا (۱۷ جون ۱۷۵۴ء) سورج مل جاٹ کمبھیر میں قلعہ بند ہو گیا اور جاٹ علاقہ لٹتا رہا۔ محاصرہ کو طول ہوا اور قلعہ فتح کرنے کے لئے توپوں کی ضرورت پڑی، عماد الملک نے عاقبت محمود خاں کشمیری کو دہلی بھیجا لیکن انتظام الدولہ اس جنگ کے خلاف تھا وہ سورج مل جاٹ کو قائم رکھنا چاہتا تھا اور شاہی مراسلت

ف صفحہ ۲۷۶ ۲ صفحہ ۲۷۸، ۲۷۹ ۳ سرکار صفحہ ۲۸۳ سرکار و اسنوا جلد اول صفحہ ۱۳

ترجمہ سیر المتاخرین جلد سوم ماہ محرم صفحہ ۲۶

اس سے ہو رہی تھی۔ جب عماد الملک کو انتظام الدولہ کی اس سازش کا علم ہوا تو اس نے مرہٹوں کو سرکوبی کے لئے دہلی کی طرف بھیجا۔ جب عاقبت محمود خاں دہلی میں آیا[1] تو دہلی میں یہ حال تھا کہ شاہ اور وزیر فوج کی تنخواہ کے تقاضوں سے محل میں قیدیوں کی طرح تھے۔ ۲۰ مارچ سے عاقبت محمود اور اس کی فوج نے شہر کے مہاجنوں اور امیروں کو لوٹنا شروع کیا، آخر شاہ نے مقابلے کی ٹھانی ۸ / ۹ اپریل کو شاہی حامیوں اور فوجوں میں جنگ ہوئی۔ جامع مسجد اور کھاری باؤلی کے علاقے میں لوٹ مار ہوتی رہی خدا خدا کر کے شاہی دستے عاقبت محمود کو شہر سے نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ عاقبت شہر سے نکل کر گرد و نواح میں لوٹ مار کرتا رہا۔

احمد شاہ نے سورج مل جاٹ سے بھی نامہ و پیام جاری رکھا تھا۔ اور صفدر جنگ[2] سے بھی اس سلسلے میں خط و کتابت کر رہا تھا۔ راجپوتوں کو بھی ملانے کی تجویز تھی تا کہ عماد الملک سے محفوظ رہے اور مرہٹوں کو شمالی ہندوستان سے نکال دے۔ اس طرح احمد شاہ[3]

---

[1] ۱۶ مارچ ۱۷۵۳ء جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ [2] گیبن کا بیان اس سے مختلف ہے۔ اس کا خیال ہے کہ احمد شاہ میں قوت فیصلہ نہ تھی۔ وہ دلی سے اس ارادے سے نکلا تھا کہ عماد الملک کی امداد کروں گا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے سورج مل کو یقین دلایا کہ اپنی فوجوں پر ہی حملہ کر دوں گا۔ صفدر جنگ کو اس بارے میں کوئی دعوت نہ دی گئی۔ اس لئے وہ الگ رہا۔ احمد شاہ کا سورج مل کے نام کا خط عماد الملک کے ہاتھ پڑ گیا اور بات کھل گئی۔ اب احمد شاہ جلد گھر دارالخلافے کی طرف لوٹا۔ غازی الدین (عماد الملک) اور ملہار راؤ نے اپنی فوجوں سے اس کا تعاقب کیا۔

(گیبن صفحہ ۱۲۳)

دہلی سے شکار کے بہانے نکلا۔ ۲۷ر اپریل کو لونی پہنچا۔ راستے میں عاقبت محمود کے
بیٹے نے شاہی قافلے کو لوٹا۔ ۸ر مئی کو لونی سے چلے، ۱۷ر کو سکندرہ کے قریب
پہنچے کہ خبر ملی، مرہٹوں اور عماد الملک نے سورج مل سے صلح کر لی ہے۔ سورج مل نے
طے کیا کہ تیس لاکھ کی رقم، تین سالانہ قسطوں میں مرہٹوں کو ادا کی جائے گی۔ محاصرہ
چھوڑ دیا گیا۔ عماد ۱۸ر مئی کو وہاں سے چلا اور رگھوناتھ راؤ مرہٹہ ۲۲ کو متھرا روانہ ہوا۔[1]
عاقبت محمود نے یہ چال چلی کہ اس نے شاہ سے معافی مانگ لی، اور اطلاع دی
کہ ملہار راؤ ہلکر کی سرکردگی میں سلیم گڑھ کے جیل خانے کی طرف بڑھ رہے ہیں، اور کسی
شاہزادے کو نکال کر بادشاہ بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ احمد شاہ نے دہلی سے واپس جانے
کا ارادہ کیا کہ ۲۵ر ۲۶ر مئی کی درمیانی رات میں ملہار راؤ ہلکر نے شاہی کیمپ پر حملہ کر دیا
احمد شاہ جان بچا کر دہلی بھاگا اور شاہی خواتین مرہٹوں کے ہاتھ لگیں جن کی انتہائی تذلیل ہوئی۔
احمد شاہ ۲۶ر مئی کو دو بجے سہ پہر دہلی میں داخل ہوا۔[2] اب عماد الملک مع مرہٹوں کے دہلی کی[3]

---

[1] ص ۲۹۳، ص ۲۹۸، ۲۹۹ [2] مخزن ص ۳۰۱، ۳۰۲ ۔ [3] ہمین کی (ص ۳۳۳) یہ رائے ہے
کہ شاہ کو انتظام الدولہ نے اودھ کے نواب کی امداد حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن وہ نہیں مانا اور
انتظام الدولہ اپنی حویلی میں چلا گیا اور احمد شاہ نے محل کے دروازے کھول دیے اور عماد الملک
سے صلح کی گفتگو شروع کر دی۔ ہماری رائے میں کین کا یہ خیال غلط ہے صفدر جنگ وزارت کے عہدے
سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ دہلی میں اس کے قریبی اعزا اور احباب گھٹ چکے تھے اور وہ شکست خوردہ
سپاہی کی مانند پامردانہ اپنی ریاست کو گیا تھا۔ پھر صفدر جنگ نے کوئی کامیاب جنگ تنہا نہیں
لڑی وہ ہمیشہ جاٹوں اور مرہٹوں کی طاقت کے بل بوتے پر مخالفوں کو مرعوب کرتا رہا۔ اسی وقت
مرہٹے عماد الملک سے ساز باز کیے ہوئے تھے، جاٹوں نے بھی مرہٹوں سے شکست کھائی تھی۔ اور اس کا امکان نہ تھا کہ وہ مرہٹوں
کے مقابلہ کی سوچتے۔ پھر صفدر جنگ شاہ کی امداد کیا کرتے۔ امداد تو جب [illegible] تا [illegible] جگہ [illegible] دیا گیا تھا۔

طرف بڑھا۔ ۳۰ مئی کو مرہٹوں نے دریائے جمنا عبور کر کے جے سنگھ پورہ اور دوسری نواحی بستیوں کو لوٹ لیا۔ بے بس ہو کر اور دہلی کے بچانے کے لئے احمد شاہ نے ہلکر کے مطالبات مان لیے۔ دہلی میں ایسی تباہی مچی تھی کہ ویران نظر آنے لگی، عاقبت محمود نے آکر شاہ کو راضی کیا[1]۔ عماد الملک کو وزیر بنایا جائے۔ ۲ رجون کو وفاداری کے اقرار ہوئے۔ وزارت حاصل کر کے عماد الملک نے عاقبت محمود کی مدد سے قلعے پر قبضہ کر لیا اور محمد عزیز الدین ابن معز الدین ابن شاہ عالم بہادر شاہ اول کو ڈیوڑھی سلاطین سے نکال کر عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت نشین کر دیا[2]۔ سیر المتاخرین کے مصنف کا بیان ہے کہ ۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ بروز یک شنبہ احمد شاہ گرفتار ہوا، اور وہ اس کی ماں جیل خانے بھیج دیئے گئے[3]۔

(۷)

عالمگیر ثانی

پ ۶ جون ۱۶۹۹ء
و ۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء

عماد الملک وزیر نے عزیز الدین کو عالمگیر ثانی بنا کر سیّد برادران کی رسم کہنہ تازہ کر دی۔ بخشی اول صمصام الدولہ رہا۔ بخشی سوم عبد الاحد خاں اور راجہ ناگر مل دیوان خالصہ تھے۔ سیف الدین محمد خاں نائب داروغہ ڈیوڑھی خاص تھے۔

مغل حکومت کی نوبت یہ آگئی تھی، کہ دوآب کے اوپر کے حصے اور ستلج کے جنوب کے چند ضلعوں کے سوا کوئی علاقہ کبھی کسی طور پر مغلوں کے ماتحت نہ تھا۔ (گیو ۳۵) بنگال کے علی وردی خاں نے ۱۱۶۹ھ میں وفات پائی، سراج الدولہ اس کا جانشین ہوا، سراج الدولہ صوبہ دار بنگال ہوا، مرہٹوں کے حملے کے زمانے میں، انگریزوں نے اپنی فیکٹریوں کو

---

[1] یکم جون سے سرکار ادنتو شجاع اول ج ۱۵/۱۱ لکھتے ہیں، نیا فرمان روا ۲ جون ۱۷۵۴ء کو تخت نشین کیا گیا۔ [2] ترجمہ سیر المتاخرین جلد سوم ص۷۷ [3] ص۵ [4] سری ... جلد اول ص۲۳

قلعہ بند کر لیا تھا۔ سراج الدولہ نے ایسے قلعے گرانے کا حکم دیا۔ اب جھگڑے کا آغاز ہو گیا نتیجہ پلاسی کی لڑائی تھا ۱۷۵۹ء [1] جس میں انگریز کامیاب ہوئے اور میر جعفر کو نواب مقرر کیا گیا، اور زیادہ مراعات حاصل کیں، اس طرح بنگال انگریزی قبضۂ اقتدار میں آ گیا۔[2] اب دہلی کا حال سنیئے۔ مرہٹوں کے سردار رگھوناتھ نے پیشوا کی جانب سے ۷۵ لاکھ یا کم از کم ۵۰ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا۔ عماد الملک ٹالتا رہا، ۵ ماہ گذار دیئے صرف جزوی امداد دی۔[3] آدھی رقم ادا کرنے اور آدھی کے وعدے پر آمادگی ظاہر کی،[4] وعدہ تو کر لیا۔ لیکن رقم اکٹھی کہاں سے کرے۔ سرکاری ملازموں کی تین تین سال سے تنخواہیں ادا نہ ہوئی تھیں، خزانہ خالی تھا، ادھم بائی کے بھائی بندوں کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں [5] اور نقد روپیہ بھی چھین لیا۔ یہی حشر انتظام الدولہ کی جاگیر کا ہوا، اس طرح تین لاکھ روپے جمع کر کے مرہٹوں کو دیئے، لیکن ایک کروڑ روپیہ سے اپنی فوج اور مرہٹوں کا قرضہ کہاں ادا ہوتا اس لئے جبریہ وصولی پر اتر آیا۔ تجارتی مال پر ٹیکس لگا دیا۔ جس پر لوگ خلاف ہو گئے اور دکانداروں اور تاجروں نے ہڑتال کر دی۔ آخر عماد الملک کے زور دینے پر یہ تجویز ختم ہوئی، ۹ راگست تک وزیر مشکل سے ۹ لاکھ روپیہ جمع کر سکا تھا۔ جو نقد مرہٹوں کو ادا ہوا، باقی کا وعدہ رہا۔ ۷ ستمبر کو پھر اسی قسم کی جبری رقم وصولی کی، شہریوں نے شاہ سے فریاد کی۔ مجبوراً عماد الملک نے ۲۰ راکتوبر کو ہاتھ روکا۔ اب مرہٹوں کو ۲۲ گاؤں سہارنپور کے اور کچھ خالصہ زمین اور صرف خاص کی زمین دے ڈالیں۔ اس کے علاوہ شہری فوجیوں کی شورشیں بھی ہوتی رہیں، چنانچہ بدخشانی فوجوں نے اپنے افسروں کو ذلیل کیا، اس پاداش میں عاقبت محمود ۷ جون کو قتل کرا دیا گیا اور بدخشانی سپاہیوں کو صرف خاص کے بعض پرگنے دے ڈالے۔[6] ۱۴ راگست ۱۵ راگست، ۱۴ راکتوبر اور

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا۔ متعلقہ صفحات [2] سرکار جلد دوم ص ۱۰ [3]

شجاع الدولہ جلد اوّل ص ۱۰ [4] ۱۵ [5] ۱۲ اکتوبر [6] ص ۲۵

۱۸ نومبر کو فوجوں کی بغاوتیں ہو گئیں۔ شاہی متوسلین بھی فاقہ کشی میں مبتلا تھے۔ حرم کی تعداد لاتعداد تھی، ذرائع آمدنی ختم ہو چکے، آخر کیا کرتے، شہری لوگوں کو مرہٹوں نے تباہ کر ڈالا تھا۔ پھر مقامی فوجی بھی ایسے مواقع سے فائدے اٹھاتے، دلی کا تمام نواحی علاقہ مرہٹے برابر لوٹتے رہے۔ ۱۴ ستمبر کو شاہ نے ہنگتے کی معرفت راگھو کو روکا۔ ۲۵ ستمبر کو راگھو آگے نکل گیا۔ گڈھ مکتیسر (۳۰ دسمبر ۱۷۵۴ء تا ۱۲ جنوری ۱۷۵۵ء) تک لوٹ مار کا بازار گرم رہا۔ آخر بار بار کی تاکید پر مرہٹے ریواڑی اور پٹودی ہو کر راجپوتانے چلے گئے۔ مرہٹوں کی مصیبت سے رہائی پاکر عماد الملک نے انتظام ملک کی بابت غور کیا۔

قطب شاہ نے رفتہ رفتہ طاقت جمع کی، اور مختلف علاقوں کو تباہ کر کے سرہند پر قابض ہو گیا۔ پھر وہ دوآبہ جالندھر کی طرف بڑھا تو آدینہ بیگ خاں نے اسے شکست دی۔[1] عماد الملک قطب خاں کو سزا دینے چلا تھا۔ کہ خبر ملی آدینہ بیگ نے شکست دیدی ہے اس نے عماد الملک سے یہ علاقہ مانگ لیا۔ ظفر جنگ خطاب بھی ملا۔ شاہی فوجیں ۱۹ اپریل کو پانی پت پہنچیں یہاں بدخشانیوں نے تنخواہ کے مطالبے میں عماد الملک کو پکڑ کر لے گئے، اور بازاروں اور گلیوں میں گھسیٹے پھرے، بڑی مشکل سے اسے نجات ملی۔ آخر نجیب الدولہ اور کامگار خاں بلوچ کی مدد سے بدخشانی فوج تباہ کر دی گئی، افسروں کی جاگیریں چھین لی گئیں اور یہ فوج ختم ہو گئی، عماد الملک کی سب سے زبردست فوج مٹ گئی۔ اور آئندہ کے لئے مخالفوں (خاص کر نجیب الدولہ) کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔[2]

مئی ۱۷۵۵ء میں جب عماد الملک دہلی پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے پیچھے شجاع الدولہ نے حصول وزارت کی کوشش شروع کی ہے۔ علی قلی دالہ کو موقع مل جائے

---

[1] ص ۱۳ آغاز فروری ۱۷۵۵ء۔ شجاع الدولہ جلد اول ص ۲۹

[2] اپریل ۱۷۵۵ء۔ سرکار جلد اول ص ۱۳۱ ص ۸۲، ص ۸۳

احمد خاں بنگش کو ہموار کر چکا ہے[1] اور دہلی میں سیف الدین محمد خاں داروغہ اور
کش چند ہموار ہو گئے۔ عمادالملک نے کش چند کا مکان لوٹ لیا وہ فرار ہو گیا۔
سیف الدین محمد خاں برخاست ہو کر نظر بند ہوا کچھ خواجہ سرا محل سے نکالے گئے۔[2]
اب عمادالملک نے سازشیوں میں سے پہلے سورج مل[3] سے نبٹنا چاہا۔ عمادالملک نے مرہٹوں
سے اس سلسلے میں تعاون چاہا۔ لیکن ملہار وغیرہ نے جواب دیا کہ ہماری صلح ہو چکی ہے
سورج مل کو آپ کی جاگیروں پر حملہ کرنے سے روک دیں گے۔ سورج مل نے اس وقت
تک مزید علاقے دبائے تھے۔ نجیب الدولہ کے نام حکم ہوا کہ قبضہ شدہ علاقہ واپس لیا جائے ۱۸ رجب
۱۷۵۵ء کو نجیب الدولہ روانہ ہوا، راجہ ناگر مل کے توسط سے ۱۰ رجولائی کو جاٹوں نے صلح کر لی اور
شرائط صلح ۲۶ جولائی کو طے پائیں۔ اس سے فارغ ہو کر دسمبر ۱۷۵۵ء میں عمادالملک نجابت خاں

۱؎ ۵ راکتوبر ۱۷۵۴ء میں صفدر جنگ نے اپنے علاقے میں وفات پائی۔ اور اس
کی جگہ اس کا بیٹا شجاع الدولہ نواب اودھ ہوا۔ یہ خبر ۱۸ راکتوبر دہلی پہنچی، سری
واستوا جلد اول ص۱۵۰، ۱۰۷ ۲؎ سری واستوا جلد اول ص۲۱۱، ۲۴۳۔
۳؎ سورج مل بدن سنگھ جاٹ والی بھرت پور کی محبوبہ کا لڑکا تھا اور
بدن سنگھ کی فرزندی ہی میں معاملات سلطنت میں دخیل ہو چکا تھا، کیونکہ
بدن سنگھ کی بصارت جاتی رہی تھی۔ بدن سنگھ نے ۷ جون ۱۷۵۶ء
۱۷۵۶ء میں وفات پائی۔ اور سورج مل باقاعدہ راجہ ہوا۔ اس
لئے بدن سنگھ کے عہد حکومت ۱۷۵۰ء سے ۱۷۵۶ء
تک کے معرکے دراصل سورج مل ہی کے معرکے ہیں۔
۴؎ سرکار جلد ۲ ص ۳۲۱

زمیندار کنجپورہ کو مطیع کرنے چلا سالانہ روپے کا مطالبہ ہوا، پنجاب کا اس وقت یہ حال تھا۔ معین الملک ۳ر نومبر ۱۷۵۳ء کو مر چکا تھا[1] اس کا دو سالہ لڑکا اس کی بیوہ ثریا بیگم کی سرپرستی میں گورنر ہوا۔ مئی ۱۷۵۴ء میں یہ لڑکا بھی فوت ہو گیا[2] تو احمد شاہ نے ثریا بیگم (مغلانی بیگم) کو گورنر بنا دیا۔ عالمگیر ثانی نے مومن خاں کو گورنر پنجاب بنایا[3]۔ بھکاری خاں نے قبضہ کرنا چاہا۔ لیکن شاہ ابدالی کی حمایت کے باعث ثریا بیگم (مغلانی بیگم) پنجاب پر حکومت کرتی رہی، آخر میں آدینہ بیگ جالندھر کا حاکم خود مختار ہو گیا، لیکن شاہ ابدالی یا عالمگیر ثانی کسی نے توجہ نہ کی، اس کے بعد عماد الملک سے آدینہ بیگ نے گورنری حاصل کیا[4] دسمبر ۱۷۵۵ء میں مغلانی بیگم صوبہ دار اور خواجہ عبداللہ اس کا ماموں نائب صوبہ دار تھے۔ مغلانی بیگم نے عماد الملک کو کہلا بھیجا کہ تم آجاؤ۔ تمہاری شادی عمدہ بیگم دختر معین الملک سے کر دی جائے۔ عماد الملک کی نظر دولت پر تھی۔ اس لئے وہ عالی گوہر کو ساتھ لے کر دلی سے ۱۵ر جنوری ۱۷۵۶ء کو چلا۔ ۷ر فروری کو سرہند پہنچا۔ اس کا مقصد پنجاب پر قبضہ تھا[5]۔ یہاں سے آدینہ بیگ ساتھ چلا۔ عبداللہ خاں جموں بھاگ گیا۔ عمدہ بیگم ۱ر مارچ ۱۷۵۶ء کو عماد الملک کے پاس پہنچا دی گئی۔ ۲۸ر مارچ ۱۷۵۶ء کو عماد الملک مغلانی بیگم کو گرفتار کر کے زبردستی دہلی لے چلا، لاہور اور ملتان کی حکومت تیس لاکھ روپے سالانہ کے عوض آدینہ بیگ کو دی گئی۔ شاہی فوجیں ۹ر مئی ۱۷۵۶ء کو دہلی پہنچ گئیں۔ اب عماد الملک نے روہیلوں سے خراج وصول کرنے کی تدبیر سوچی، فوج وعدہ پر تنخواہ نہیں پا سکی تھی۔ جیسے ہی

---

[1] غالباً زہر دیا گیا تھا۔ [2] ۲۵ر اکتوبر ۱۷۵۴ء لیکن ابدالی کی تائید کی وجہ سے مغلانی بیگم قابض رہی۔ اس سے تنگ آکر ترک امرائے پنجاب نے بھکاری خاں کی سرکردگی میں بغاوت کر دی [3] خلاصہ گپتا ۷۹ تا ۸۱ [4] گپتا ۸۴، ۸۵ [5] سرکار جلد ۲ ۵۵، ۵۶

شاہ اور وزیر آغاز جولائی ۱۷۵۶ء میں دہلی سے لوٹی گئے۔ فوجیوں نے دہلی اور لوتی کے درمیان کا پل بند کر دیا گیا۔[1]

اسی طرح قلعہ دہلی کے دربانوں نے قلعہ کے دروازے بند کرکے آنا جانا روک دیا۔ عماد الملک نے اب یہ سوچا کہ شجاع الدولہ اور احمد خاں کو لڑا دیا جائے۔ چنانچہ احمد خاں بنگش کے نام الہ آباد کی گورنری ہوئی۔[2]

شجاع الدولہ نے جب یہ خبر سنی تو احمد خاں کے خلاف اگست یا ستمبر ۱۷۵۶ء میں فیض آباد سے فوجیں لے کر فرخ آباد کی سرحد پر آ بیٹھا، آخر راجہ ناگر مل اور عماد الملک نے صلح کرادی۔ ادھر راجہ ناگر مل نے سورج مل کو تلپت کے مقام پر بلا کر (اوائل نومبر ۱۷۵۶ء) جولائی ۱۷۵۵ء کے صلح نامہ کی شرائط کی توثیق کرادی۔ مغلانی بیگم نے احمد شاہ ابدالی کو خفیہ خط لکھ کر دہلی کے حالات سے آگاہ کیا۔ اور عالمگیر ثانی اور نجیب الدولہ نے بھی عماد الملک سے چھٹکارا لے کی خاطر درانی کو مدعو کیا۔

احمد شاہ ابدالی ۲۰ دسمبر کو لاہور ۱۰ جنوری ۱۷۵۷ء کو ستلج عبور کرکے ۱۲ جنوری ۱۷۵۷ء

---

[1] ۲۳ جولائی ۱۷۵۶ء کو دہلی میں میر بخشی صمصام الدولہ کا جنازہ اٹھانے سے روک دیا تھا۔ ۲۰ اگست سے ۱۲ ستمبر تک یہی سلسلہ رہا۔ نجیب الدولہ کی مداخلت پر اندر کے دربانوں نے راستہ کھول دیا۔ لیکن بیرونی دربان ۱۲ ستمبر کو باغی ہو گئے۔ جزوی طور پر ان کی تنخواہیں ادا ہو گئیں تو امن ہوا۔

سرکار ج ۲ — ص ۲۱، ۲۲، ۲۳

[2] یاد رہے کہ شجاع الدولہ کے حاکم اودھ بنے پر جو فرمان جاری کیا گیا تھا اس میں الہ آباد کا ذکر عمداً نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ شجاع الدولہ جلد اول ص ۲۶ تا [illegible]

کو پانی پت میں فوجیں بھیجیں۔ ۱۶ر جنوری ۱۷۵۷ء کو دہلی کے نواح میں ابدالی وہنچ آگئے۔ لوگ گھبرا کر دلّی سے بھاگ کر نئی دلی آئے۔ اس افراتفری میں انتاجی مرہٹہ کی فوج نے جو دہلی میں مقیم تھی ریتی میں لوٹ مار شروع کر دی۔ ۱۷ جنوری کی صبح کو ابدالی نے جمنا کے کنارے بھیجیں عماد الملک کو بلایا گیا اور دو کروڑ روپیہ کا مطالبہ کیا گیا۔ اُس نے معذوری ظاہر کی تو اسے گرفتار کیا گیا مبادا مرہٹوں سے مل جائے[1] اس خبر کے سنتے ہی ۲۰ جنوری ۱۷۵۷ء دلّی کا نصف شہر خالی ہو گیا[2] لوگ بھاگ کر جاٹوں کے علاقے میں چلے گئے۔ ۱۹ر جنوری ۱۷۵۷ء کی صبح کو راجہ ناگر مل اور بعض دوسرے بھی بھاگ چکے تھے۔

۲۱ جنوری ۱۷۵۷ء کو جمعہ کے دن عبد الاحد بخشی سوم نے خود ہی ابدالی کے نام کا خطبہ پڑھ دیا۔ عالمگیر ثانی محل سے شاہ برج میں آ گیا۔ احمد شاہ نے انتظام الدولہ کو وزیر مقرر کیا۔ اس موقعہ پر مغل فرماں رواکی شان اتنی رہ گئی تھی، کہ ابدالی کے حکم سے جب ۲۸ جنوری کی صبح کو استقبال کے لئے نکلا۔ تو ایک ہاتھی، ایک گھوڑا تو تخت شاہی اٹھائے ہوئے اور شاہ خود تخت رواں پر سوار تھا، نہ فوجیں تھیں نہ شان و شوکت کے اسباب، صرف چند امرا ہمراہ تھے، ابدالی دلّی میں داخل ہوا تو اس کی فوجوں نے بازاروں میں لوٹ مار کی۔ بلبل پورہ کی منڈی لوٹی گئی اور نذر آتش ہوئی۔ یہ لوٹ بے قاعدہ اور غیر قانونی تھی، ابدالی نے اس جرم میں بعض سپاہیوں کو سزا بھی دی۔ انتظام الدولہ کو حکم دیا گیا کہ وعدہ کے دو کروڑ روپے جمع کرو، عماد الملک سے بھی روپیہ کا مطالبہ ہوا، سنت خاں داروغہ قلعہ اور عماد الملک کے ملازمین کو ذلیل کیا گیا۔ اس سے بھی کچھ زیادہ حاصل نہ ہوا تو آقاؤں کی باری آئی۔ ۱م رفروری کو انتظام الدولہ کی حویلی کھدوا ڈالی گئی۔ اور خواتین کے زیور بھی اتروا لئے۔

---

[1] سرکار جلد ۲ ص ۶۷   [2] ۲۰ جنوری کو ناگر مل اور بعض دوسرے امرا بھاگ گئے۔

گئے۔ ۶ فروری[1] تک سولہ لاکھ روپے انتظام الدولہ کے گھر سے وصول ہوئے صمصام الدولہ سابق بخشی کا مکان بھی کھود اگیا جو لوگ دہلی سے بھاگ گئے تھے اُن کے تالے توڑ کر سامان ضبط ہوا۔ اب اجتماعی جرمانے کی نوبت آئی، ۱۴ فروری سے ۲۰ فروری تک لوگوں پر بڑی زیادتیاں ہوئیں، قتل و غارت اور مار دھاڑ بڑھ گئی، مغلانی بیگم امیروں کی دولت کا اتا پتا بتاتی تھی، اور خوبصورت عورتوں کی تفصیل دیتی جاتی تھی ایک مرہٹی اخبار نویس کا بیان ہے کہ دلی میں بہت سے لوگ مارے گئے۔ خواتین کی آبرو ریزی ہوئی، بعض عورتوں نے عزت بچانے کے لئے خودکشی کرلی، بعض نے کنوؤں میں کود کر جان بچائی۔

ابدالی نے ۹ رفروری کو شاہ کے بڑے لڑکے عالی گوہر کی وزارت کا اعلان کیا، اور انتظام الدولہ اُس کا نائب ہوا، عماد الملک وکیل مطلق بنادیا گیا۔ نجیب الدولہ میر بخشی بنا انتاجی مرہٹہ کی مرہٹہ کی فوجوں کو ۲۰ جنوری کو متھرا کے قریب شکست دی گئی وہ بھاگ کر متھرا چلا گیا۔ اس سے مرہٹوں کا زور شمال میں ٹوٹ گیا، ابدالی کو اب جاٹوں رہیلوں اور اودھ کے سوا طاقت قابلِ ذکر نظر نہ آتی تھی، جاٹوں کے لئے یکم مارچ کو متھرا پر حملہ کیا، ۲۳ مارچ کو بلب گڑھ فتح ہوا پھر گوکل کی باری آئی۔ ۱۲ مارچ کو آگرہ لوٹا گیا اور دلی اور آگرہ کے درمیان بربادی کا دور دورہ ہوا، سورج مل جاٹ سے نامہ و پیام کے ذریعے کچھ مصالحت کی تجویز ہوئی۔ سورج مل نے پانچ لاکھ روپے کا وعدہ کیا اور دو لاکھ روپے کے تحائف دینے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن یہ وعدے کبھی پورے نہ ہوئے۔

ابدالی عماد الملک سے ناخوش ہو گیا اور اُس سے ۳ راپریل کو وزیر اور نجیب خاں کو ابدالی کے طور پر دلی میں چھوڑا گیا۔ کنکیڈ کا یہ خیال کہ نجیب الدولہ اس موقعہ پر وزیر

---

[1] سرکار جلد ۲ صفحہ ۷۳

بنایا گیا درست نہیں[1]۔ اس کے بعد یہ مشورہ ہوا کہ شجاع الدولہ کا علاقہ ضبط کیا جائے۔ اور بنگال پر بھی دوبارہ اثر بحال ہو، روہیل کھنڈ میں مرہٹے بھی لوٹ مار کر رہے تھے ان کی سرکوبی بھی ضروری تھی چنانچہ اس مقصد کے لئے عمادالملک کے ہمراہ دو مغل شہزادے کئے گئے۔ اور امدادی فوج کا کچھ حصہ بھی ہمراہ چلا، ۲۴ مارچ کو یہ شہزادے آگرے پہنچے، دوآبہ میں فوج دو حصوں میں تقسیم ہوئی (ایک حصہ قادر گنج کی طرف) اور دوسرا اٹاوے کی طرف روانہ ہوا۔ شجاع الدولہ نے فرخ آباد پر حملہ کے لئے دستہ روانہ کیا اس لئے احمد خاں بنگش اپنے علاقے کے بچاؤ کے لئے لوٹ گیا، ہدایت جی اٹاوہ آ گیا، سعداللہ (آنولہ) دونوں پارٹیوں میں صلح کرانے لگا، ناکامی ہوئی عمادالملک شہزادے کو ساتھ لے کر فرخ آباد کے شمال کی طرف چلا[2]۔ شجاع الدولہ ادھر مرہٹوں سے ساز باز کرنے لگا اور عمادالملک نے بھی یہی پالیسی اختیار کی، مرہٹے روہیل کھنڈ میں اقتدار چاہتے تھے اور توقع رکھتے تھے کہ شجاع الدولہ اس میں حائل نہ ہوگا۔ شجاع الدولہ ٹال مٹول کرتا رہا۔ دو ماہ گزر گئے۔ اب شجاع الدولہ فوجیں لے کر الٰہ آباد سے نواب گنج آیا، اور جون میں ساندھی پہنچ گیا، عمادالملک یہاں مقابلے کے لئے موجود تھا، سعداللہ نے آ کر صلح کی گفت و شنید کی، کوئی فیصلہ نہ ہوتا تھا، ایک نتیجہ یہ ہوا کہ سعداللہ خاں شجاع الدولہ کا دستار بدل بھائی بن گیا، اور اس کے ساتھ سردار خاں اور دوندے خاں اس کے حامی ہو گئے۔ اس زمانے میں مرہٹوں کے تین فوجی دستے شمالی ہند کی طرف بڑھے، انتاجی کا دستہ دلی کی طرف، دوسرا دستہ عمادالملک سے جا ملا، تیسرا شجاع الدولہ کے پاس آیا اور صلح کے لئے دباؤ ڈالنے لگا۔ چنانچہ تصفیہ ہو گیا۔ وزیر اور شاہزادے

---

[1] کنکیڈ، ہسٹری آف مرہٹہ پیپل جلد سوم ص۵۵ [2] شجاع الدولہ سری واستو جلد اول ص ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰

فرخ آباد کو لوٹے۔ شجاع ۹ رشوال ۱۱۷۰ھ (۲۷ جون ۱۷۵۷ء) کو لکھنؤ کی طرف چل دیا۔ اور اپنا وعدہ پورا کرنے کی ضرورت نہ سمجھی، اس سلسلے میں صرف جانبازی نقد حصّہ لے مرا تھا۔ باقی لوگ خالی لوٹے[1]، مرہٹے دوآب میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں کی بدامنی کی وجہ سے فوجوں کی تنخواہوں کے لئے روپیہ نہ ملتا تھا، گوجر اور جاٹ بھی خود مختار بنے بیٹھے تھے، ان حالات میں مرہٹوں نے سوچا کہ دلی پر دوبارہ تسلط ہونا چاہیئے، عماد الملک بھی نجیب الدولہ سے خائف تھا، عالمگیر ثانی پٹھانوں کی اکھڑ پالیسی سے عاجز تھا نجیب الدولہ کو دلی سے نکالنے کی تدبیر ہوئی۔ دوآب ہی میں مرہٹوں اور عماد الملک میں گٹھ جوڑ ہو گیا تھا۔ یہ دونوں گروہ دلی کے گرد ڈیرے ڈال کر بیٹھ گئے۔ نجیب الدولہ نے مقابلہ کی ٹھانی، مرہٹوں نے نواح دلی کے راستوں سے اناج لوٹنا شروع کیا (۱۰ راگست) دلی میں گرانی ہو گئی ۱۱ راگست ۱۷۵۷ء کو جنگ کا آغاز ہوا، پرانی دلی لوٹی گئی اور بے شمار آدمی مارے گئے۔ نجیب الدولہ نے بدلہ لینے کے لئے شہر میں عماد الملک کی حویلی کا محاصرہ کرکے خواتین کی تذلیل کی، نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ کے لئے نجیب الدولہ اور عماد الملک کی صلح کا دروازہ بند گیا۔ ۲۵ راگست کو دوبارہ جھڑپ ہوئی پھر ۳۰ راگست کو لڑائی ہوئی مجبوراً ۳ رستمبر کو نجیب الدولہ نے صلح کر لی اور اپنی افواج لے کر دلی سے اپنی جاگیر کی طرف چلا گیا، اس کا پانچ مہینے کا اقتدار ختم ہو گیا[2]۔ دلی پر عماد الملک اور مرہٹے قابض ہو گئے۔ انتاجی نوجھادار دلی ہوا۔ نجیب خاں کی جگہ احمد خاں بنگش میر بخشی بنا دیا گیا۔ اس زمانے میں دلی میں بڑی تباہی پھیلی[3]۔ پنجاب کی ریاست نے بھی مرہٹوں کو اپنی طرف

---

[1] شجاع الدولہ جلد اوّل ص۴۹ تا ص۵۰

[2] تفصیلات کے لئے سرگزشت نجیب الدولہ (ترجمہ شیخ عبدالرشید) کے صفحات دیکھے جائیں یعنی ص۳۴ تا ص۳۸

[3] تفصیل سیر المتاخرین میں دیکھیں

متوجہ کیا۔ وہ روپیہ بھی چاہتے تھے، ابدالی کی روک تھام کا بھی انتظام انہیں ملحوظ خاطر تھا۔ اس لئے جب آدینہ بیگ نے پنجاب میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لئے روپیہ کا لالچ دیا۔ تو وہ دلی سے فارغ ہو کر رگھوناتھ راؤ (برادر پیشوا) اور ملہار راؤ ہلکر دلی سے نکلے اور پنجاب گئے ابدالی کے مقرر کردہ گورنر جہان خان اور تیمور شاہ نے ۹ اپریل ۱۷۵۸ء کو لاہور سے نکل بھاگنے کی ٹھانی اور شاہدرہ پہنچ گئے۔ اگلے دن مرہٹوں کا دستہ لاہور پہنچا اور قابض ہو گیا۔ چناب تک افغانوں کا تعاقب کیا گیا۔ پھر یہ لوگ لاہور آ گئے[1] آدینہ بیگ (متوفی ۱۵ ستمبر ۱۷۵۸ء) کو خراج کے وعدے پر حاکم لاہور بنا دیا گیا۔ اس نے لاہور کی جگہ بٹالہ دارالحکومت بنایا۔ مرہٹے زیادہ دیر نہ ٹھہرنا چاہتے تھے، واپسی سے قبل انہوں نے اٹک تک کے علاقے میں بھی پیش قدمی کی، مرہٹوں نے واپس لوٹتے ہوئے کئی شہروں کو لوٹا۔ ۱۸ جون کو سونی پت پہنچ گئے۔ اور وہاں سے رگھو، مالوہ سے ہوتا ہوا دکن پہنچا۔ گویا مرہٹوں کی فوج کی بڑی تعداد اپنے وطن لوٹ گئی۔ ایک سال کے لئے شمالی صوبے مرہٹوں کی لوٹ مار سے آزاد ہو گئے۔ مرہٹوں کے ذہن میں شمالی ہند کے لئے تین تجاویز ہو سکتی تھیں۔

۱۔ عماد الملک اور بادشاہ کے نام سے بنگال اور بہار پر قبضہ کیا جائے۔ ۲۔ یہ ممکن نہ ہو تو پیشوا دہلی سے چلے اور رگھو بنارس، لکھنؤ اور الہ آباد سے بڑھ کر بنگال پر قبضہ کر لیں۔ ۳۔ عماد الملک آمادہ نہ ہو تو شجاع الدولہ کو نصف بنگال اور بہار کے وعدے سے اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔[2] مرہٹوں نے اس مقصد کے لئے شہزادہ عالی گوہر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ عماد الملک دو دشمنوں کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ شجاع الدولہ اور شہزادہ عالی گوہر بھی دشمن تھے، شجاع الدولہ پر فتح کشتی کا مزہ چکھ چکا تھا، اب اس نے نائب میر بخشی آدمیوں کو شجاع الدولہ سے دوستی کا الزام لگا کر گرفتار کیا۔ ۳ [illegible] لطف اللہ بیگ، مولوی قاسم کشمیری اور عالی گوہر کی طرف متوجہ ہوا، عالی گوہر رہتک

---

[1] گپتا ص ۹۴، ص ۹۵ [2] سری واستوا، شجاع الدولہ جلد اول ص [illegible]، ۷۵

اور حصار کی جاگیروں میں گھوم پھر رہا تھا۔ اسے جبراً عالم گیر ثانی سے تحریریں لکھا
کر دہلی بلوایا۔ جھجھر کے مقام پر (۱۷ مارچ) مرہٹہ وٹھل شیودیو کے ساتھ نامہ پیام جاری تھے
عماد الملک کو خبر ہوئی تو اس نے شاہزادے کو فوجی دستہ بھیج کر گرفتار کرنے کی ٹھانی۔
لڑائی ہوئی، قلعہ دہلی میں جو شاہزادے تھے انہیں نظر بند کر دیا گیا تاکہ وہ ہنود سے
میل جول نہ پیدا کریں، عالم گیر بھی نظر بند ہوا، انتظام الدولہ کی حویلی کا محاصرہ بھی کیا گیا اور
احمد خاں بنگش، میر بخشی بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ کر اپنے رسالے کے ساتھ دربار میں آنے لگا۔
عماد الملک نے وٹھل شیودیو سے یہ گفت و شنید کی کہ وہ عالی گوہر سے جدا ہو جائے گا
تو چھ لاکھ روپیہ دیا جائے گا، دوسری طرف بادشاہ سے عالی گوہر کو خط لکھوائے جاتے
رہے ۱۴ مئی تک یہ کوشش رہی کہ کسی طرح شاہزادہ قلعہ میں آ جائے لیکن کامیابی نہ ہوئی
شاہزادہ جان بچا کر نکل گیا۔[1] عماد الملک بادشاہ کو ساتھ لے کر آس پاس کے علاقے سے
لگان وصول کرنے کے لیے نکلا، ایک جگہ بادشاہ کا لشکر لوٹا گیا۔ دوسری جگہ وزیر کا قافلہ
لٹا۔ بھوانا کے مقام پر شاہ کے خیمے میں آگ لگی، اسی طرح ہزار خرابی بہ لیک ۲۲ نومبر
۱۷۵۸ء تک دہلی پہنچ گئے۔[2] عالی گوہر نجیب الدولہ کے پاس آٹھ ماہ قیام پذیر رہا۔ اور
اس کے منصوبے[3] بنگال کے ارادے سے نکلا۔ شجاع الدولہ نے ہاتھ لیا، اور الہ آباد
کے فوجدار کی مدد سے عالی گوہر نے پٹنہ پر حملہ کا پروگرام بنایا۔ اس کا اثر بنگال کے
تاجروں اور بنیوں کے روپے پر پڑا۔ ہنڈیوں کی چلت بند ہو گئی، دلی کا حال اور خراب
ہونا شروع ہوا تو عماد الملک نے میر جعفر، کلایو اور شجاع الدولہ کو شہزادے کے خلاف کر دیا

۱؎ وقائع عالم شاہی مصنفہ فراقی ص ۵ پر اٹھل راؤ نام درج ہے عرشی صاحب نے تعلیقات
وقائع عالم میں ص ۱۲ پر تصحیح کی ہے اور وٹھل راؤ لکھا ہے ۲؎ وقائع عالم شاہی ص ۵
۳؎ سرکار جلد دوم ص ۱۲۰، ۱۲۱

کی ٹھانی[1] - عالی گوہر پٹنہ پر قبضہ کرنے میں ناکام رہا۔ اس دوران میں البتہ شجاع الدولہ الٰہ آباد پر سیاسی چال سے پوری طرح قابض ہو گیا۔ (۱۶ اپریل ۱۷۵۹ء)

دلی کا یہ حال تھا کہ اب ملہار راؤ ہلکر کی نرم پالیسی کی جگہ دتا جی کی گرم پالیسی آنے والی تھی۔ دتا جی اور جنکو سندھیا راجپوتانے میں چوتھ وصول کر رہے تھے وہاں سے دسمبر ۱۷۵۸ء میں دلی کی طرف بڑھنے لگے، مرہٹوں کی آمد سے دلی میں افراتفری پھیل گئی۔ پرانی دلی کے لوگ بھاگ کر نئی دلی میں آگئے۔ ۴ جنوری ۱۷۵۹ء کو مرہٹے براری گھاٹ پہنچے۔ اب انہوں نے عماد الملک سے روپیہ کا مطالبہ کیا۔ لیکن آپس میں تصفیہ نہ ہو سکا، ۱۴ جنوری کو حالات زیادہ خراب ہو گئے اور عماد الملک نے دلی کے دروازے بند کر لیے۔ شاہدرہ اور شمال مغربی بستیوں میں لوٹ مار ہوئی اور یہ سلسلہ ۲۳ جنوری تک چلتا رہا۔ پھر آپس میں صلح کی گفتگو ہوئی۔ مرہٹوں کی رسد بھی ختم ہو گئی۔ پہلی فروری ۱۷۵۹ء کو مرہٹوں اور عماد الملک میں معاہدہ ہو گیا اور مرہٹے دلی کو چھوڑ کرنال کی طرف بڑھے، پنجاب کو دوبارہ تاخت و تاراج کیا گیا۔ پھر دلی کی طرف لوٹے اور دھمکیاں دیں۔ پھر یہ لوگ دتا جی سندھیا کی سرکردگی میں (اوائل جولائی ۱۷۵۹ء) سکرتال کے محاصرے پر لگے، نجیب الدولہ کے ساتھی روہیلے سردار آگئے۔ تو مرہٹے وہاں سے ہٹ کر علاقوں میں رسد روکنے لگے۔ شجاع الدولہ بھی مرہٹوں کی چالوں کو سمجھتا تھا وہ نہیں چاہتا تھا، کہ نجیب الدولہ ختم ہو جائے کیونکہ اس کے خاتمے سے عماد الملک قوی ہو سکتا تھا، ۶ یا ۷ نومبر کو شجاع الدولہ کی امداد کے لیے سکرتال پہنچ گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ابدالی کی آمد کی خبر ہوئی اور سب اپنے اپنے علاقوں کو بھاگ گئے[2]۔

---

[1] شجاع الدولہ جلد اول صفحہ ۷۱، [2] تفصیلات کے لیے دیکھیے سرگزشت نجیب الدولہ صفحہ ۲۲، ۲۳ تا صفحہ ۲۶ سکرتال مظفر نگر سے ۱۷ میل مشرق میں واقع ہے۔ شجاع الدولہ ۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء کو گنگا پر پہنچ گیا

نجیب الدولہ بے درپے ابدالی کو خط لکھ رہا تھا۔ عالمگیر ثانی نے بھی عماد الملک سے تنگ آکر خفیہ طور پر ابدالی کو خط لکھا کہ وہ آئے اور عماد الملک سے نجات دلائے۔ کنگیبڈ[1] کا بیان ہے کہ یہ خط عماد الملک کے ہاتھ لگ گیا اور شاہ کے قتل کا سبب بنا۔ واقعہ قتل سے پیشتر دتاجی کی درخواست پر عماد الملک ۱۶ر نومبر کو سکرتال کے لئے روانہ ہو رہا تھا کہ مرادنگر کے مقام پر اسے ابدالی کی آمد کی خبر ملی اُس نے سوچا کہ بادشاہ ابدالی کو اس کے خلاف اُبھارے گا، اس لئے فوراً واپس آیا اور ۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء کو عالمگیر ثانی کو اور اگلے روز انتظام الدولہ اپنے ماموں کو قتل کر دیا۔ سید علی عباس، تاریخ عماد الملک (غلام عبدالقادر) کے حوالے سے اس بات کی تردید کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں اس قتل میں عماد کا ہاتھ نہ تھا بلکہ قاتلوں نے ذاتی بے عزتی کا بدلہ چکایا ان کی رائے میں عماد الملک کے اس موقع پر ناامید ہونے کا کوئی سبب نہ تھا۔ سرکار نے محض تاریخ عالمگیر ثانی کے نامعلوم مصنف پر بھروسہ کیا ہے[2]۔ وقائع عالم شاہی میں خرافی نے عالمگیر ثانی کا قتل ہشتم ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ دیا ہے۔ لیکن جیسا کہ عرشی صاحب نے بتایا ہے صحیح تاریخ ہشتم ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ ہجری ہے[3]۔ شہزادہ والی گوہر کو یہ اطلاع غرہ ربیع الاول ۱۱۷۳ھ میں ملتی ہے، پٹنہ کے قریب گھوسی کے مقام پر وہ تخت نشین ہوا۔ سہری دا ستوا کے خیال میں ۲۴ر دسمبر ۱۷۵۹ء کو شاہ عالم نے بادشاہت کا اعلان کیا۔ بعض مورخین ۴ر جمادی الاول ۱۱۷۳ھ بیان کرتے ہیں اور یہی درست ہے۔

---

[1] کنگیبڈ صفحہ ۹۶

[2] LIFE AND-TIMES of imadulmulk. P. 104.105

[3] صفحہ

[4] تعلیقات صفحہ ۱۵۹ وقائع عالم شاہی R.U.L.

عالی گوھر

ت ۴ جمادی الاول ۱۱۴۱ھ
و ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ

شاہ عالم ثانی کے لقب سے کھتولی میں تخت نشین ہوا۔ شجاع الدولہ کو وزیر مقرر کیا، لیکن آٹھ مہینے تک اس کا اعلان نہیں کیا۔ ابدالی کا ڈر تھا۔ ۱۲ رجب ۱۱۷۵ھ یعنی (۵ فروری ۱۷۶۲ء) شجاع الدولہ کی وزارت کا باقاعدہ اعلان ہوا۔ دلی میں یہ عالم تھا کہ[1] ۳۰ نومبر ۱۷۵۹ء کو محی السنۃ (کام بخش پسر اورنگ زیب کا پوتا) کو شاہجہان ثانی کے لقب سے عماد الملک نے تخت نشین کیا۔ لیکن یہ بیان درست نہیں محی السنۃ پسر کام بخش کو نہیں بلکہ کام بخش کے پوتے اور محی السنۃ کے بیٹے محی الملت کو تخت نشین کیا گیا اور شاہجہان ثانی اس کا لقب تھا۔ محی السنۃ بن کام بخش بن عالمگیر تو لال قلعہ کی جیل میں محرم ۱۱۶۶ھ ہجری کو پچپن برس کی عمر میں فوت ہو چکا تھا۔[2] ابدالی کی آمد کی وجہ سے ۸ دسمبر ۱۷۵۹ء کو عماد الملک مغل شاہزادوں اور محلات کے ہمراہ حسن گڑھ کے قلعے میں آ گیا جو دوآب میں واقع ہے۔ ابدالی کی فوجیں ہندوستان کی طرف بڑھنے لگیں، ۲۷ نومبر کو وہ سرہند پہنچ چکا تھا۔ مرہٹوں نے آگے بڑھ کر دتاجی کی سرکردگی میں ۲۴ دسمبر کو تراوڑی کے نواح میں لڑائی لڑی اور شکست کھائی۔[3] ۲۵ دسمبر کو خبر پہنچی کہ ابدالی کی فوجیں جمنا عبور

---

[1] سرکار ص ۱۵۱، ۱۵۳ تک تعلیقات وقائع عالم شاہی ص ۱۴۲

[3] پہلے تکوجی ہلکر سکرتال سے چلا ہے، پھر اسی دن نجیب الدولہ چل کھڑا ہوا۔ سرگذشت ص ۲۷

کر کی یہیں اور نجیب الدولہ بھی سکرتال سے نکل پڑا ہے۔ سہارنپور کے قریب نجیب الدولہ
اور ابدالی مل گئے۔ دتاجی کے لئے خطرہ پیدا ہو گیا اور وہ دلی کی طرف چل کھڑا ہوا۔
۲۸ دسمبر کو عماد الملک بھی دلی آ گیا اور جمنا کی طرف مورچے قائم ہوئے، روہیلے سردار
بھی ابدالی کی امداد کے لئے لونی میں خیمہ زن ہوئے جو دلی سے ۶ میل کے فاصلے پر
ہے۔ دتاجی سونی پت تک پہنچ چکا تھا وہاں سے بھاگ کر براری گھاٹ میں دم لیا۔
۶ جنوری کو دلی آیا، اور نظام الدین اولیا کے مزار کو لوٹا اور شہر کے بعض امیروں کو
اغوا کیا، دلی سے دس میل کے فاصلے پر ۹ جنوری ۱۷۶۰ء کو لڑائی ہوئی، دتاجی
مارا گیا۔ مرہٹوں کے قدم اکھڑ گئے۔ اور دلی کی طرف بھاگے، عماد الملک نے بھی بھرت پور
کا رخ کیا۔ اس کے بعد مرہٹے فروری ۱۷۶۰ء کے اوائل میں دکن کی طرف روانہ ہوئے۔ ادھر
ابدالی نے دلی کا انتظام یعقوب علی خاں کے سپرد کیا[۱]، اور خود ملہار راؤ کو کچلنے کے
لئے نکلا، اس کی خواہش تھی کہ مرہٹے اور سورج مل جاٹ آپس میں مل نہ جائیں اس لئے
دلی نہیں گیا اور خضر آباد آ گیا۔ سورج مل کو حاضری کا حکم دیا گیا اور خراج کا مطالبہ
ہوا۔ ۲۷ جنوری کو ابدالی نے ڈیگ کا رخ کیا، اور دوسرے دستے نے ملہار راؤ
ہلکر کا تعاقب کیا۔ ہلکر جان بچا کر دوآب کی طرف نکل گیا[۲]۔ ابدالی خضر آباد آیا[۳]۔ جہان
خاں کو تعاقب میں بھیجا۔ مرہٹوں کو سکندرہ آباد میں جا دبوچا[۴]۔ مرہٹے شکست کھا کر
بھاگ نکلے اور ان کا ساز و سامان لوٹ لیا گیا ہلکر بچ کر نکل آیا اور آگرہ جا کر دم لیا۔
حافظ رحمت خاں اور سورج مل سے دوستی کے وعدے وعید ہوئے جہان خاں متھرا تک
مرہٹوں کو دباتا چلا گیا۔ ابدالی خود بھی پیچھے آیا اور کول (علی گڑھ) پہنچا[۵]۔ نجیب خاں نے

---

[۱] ۳۱ جنوری ۱۷۶۰ء [۲] ۲۶، ۲۷ فروری ۱۷۶۰ء [۳] ۲۹ فروری ۱۷۶۰ء
[۴] ۴ مارچ [۵] ۲۶ مارچ ۱۷۶۰ء

مشورہ دیا۔ کہ گرمی اور بارش کا زمانہ یہیں بسر کیا جائے۔ فوج کے اخراجات پورے کرنے کا وعدہ کیا [۱]۔ ابدالی نے پیش کش مان لی۔

شجاع الدولہ کو مرہٹے اور ابدالی دونوں ملانے کی کوشش کر رہے تھے، آخر نجیب الدولہ کے زور دینے سے شجاع الدولہ نے شرکت قبول کی اور سات ہزار فوج لے کر جولائی کے اوائل میں چلا اور انوپ شہر میں ابدالی سے ۱۸ جولائی ۱۷۶۰ء کو آ کر مل گیا، اطلاع آئی کہ مرہٹوں کا ایک جرار لشکر دکن سے آ رہا ہے، یہ لشکر بھاؤ کی سرکردگی میں شمالی ہندوستان میں وارد ہوا [۲]

۲۲ جولائی کو بھاؤ نے متھرا سے ملہار راؤ، جنکو جی وغیرہ کی سرداری میں دستہ بھیجا، اس کے ساتھ عماد الملک بھی تھا، یہ لوگ علی الصبح شہر کے دروازے تک پہنچ گئے، دوپہر تک شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ (جاوید خاں کی حویلی کے راستے داخل ہوئے) یعقوب علی خاں قلعہ بند ہو گیا، محاصرہ کیا گیا، ۲۹ جولائی کو بھاؤ بھی آ گیا یعقوب علی خاں نے مجبوراً صلح کی درخواست کی، اور جان و مال کی حفاظت کا وعدہ کیا۔ ۲ اگست ۱۷۶۰ء کو دلی پوری طرح مرہٹوں کے قبضے میں آ گئی [۳]۔ شجاع الدولہ اور ابدالی کے سپاہیوں میں شیعہ سنی عقائد میں اختلاف ہونے کی وجہ سے شجاع الدولہ کو دکھ پہنچا اور اس نے

---

[۱] سرکار جلد ۲ ص ۱۶۱ تا ۱۶۴ — شجاع الدولہ جلد اول ص ۸۳ [۲] سرکار جلد دوم ص ۱۶۱

[۳] پیشوا بالاجی نے جب ۲۷ جنوری کو مرہٹہ فوج کی شکست کی خبر سنی وہ احمد نگر سے نکلا اور پونا میں ۱۵ مارچ کو مرہٹہ سرداروں کی ایک کانفرنس کی آخر پیشوا کے مختار اعلیٰ سداشیو راؤ بھاؤ کے سپرد مرہٹہ فوج کی نگرانی ہوئی اور وشواس راؤ دس سالہ پیشوا کا بیٹا سالار بنا دیا گیا۔ بھاؤ پونا سے ۱۶ مارچ کو چلا ۸ جون کو چمبل آیا تقریباً ایک ماہ ٹھہرا۔ (مرحوم تا ۱۲ جولائی ۱۷۶۰ء) سورج مل جاٹ سے مشورہ کیا اس نے دلی پر حملہ کرنے کو کہا سرکار جلد ۲ ص ۱۸۱ تا

[۴] سرکار جلد دوم ص ۱۸۰ ص ۱۸۱

مرہٹوں کو پیام بھیجا کہ وہ ابدالی سے صلح کرلیں۔ بھاؤ اس پر آمادہ ہوگیا کہ سرہند تک
کا علاقہ ابدالی کے پاس رہے۔ باقی معاملات میں تصفیہ ممکن نہ ہوا[1]۔ تجویز یہ تھی کہ
شاہ عالم کو بادشاہ تسلیم کرلیا جائے، جواں بخت اس کا ولی عہد دہلی میں رہے اور وزارت
شجاع الدولہ کو تفویض ہو، عماد الملک نے کام بگڑتا دیکھا، سورج مل اس کا حمائتی تھا،
اس نے علیحدہ ہونے کا بہانہ تلاش کیا، ہلکر اور بھاؤ میں بھی ان بن ہوگئی۔ سورج مل ہر
معاملے میں ہلکر کا ساتھ دیتا، اس لیے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے عماد الملک اور
سورج مل بھاؤ سے ناراض ہوکر بغیر بتلائے تغلق آباد کے کیمپ سے بلب گڈھ آگئے۔ (۳ اگست)
اگلے روز بھاؤ نے صلح کے لیے آدمی بھیجے جو ناکام پھرے۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا کہ
یہ دونوں بھرت پور چلے گئے۔ ادھر نجیب الدولہ کی تدبیر کے سبب گفت و شنید ناکام ہوگئی۔
دریاؤں کی طغیانی کی وجہ سے ابدالی کی مالی مشکلات بڑھتی گئیں اس نے، روہیلوں کو اپنے
علاقے میں جانے کی اجازت دی۔ پھر بھی ابدالی کی مالی پریشانی نہ گئی۔ نجیب الدولہ کی دی
ہوئی رقم ختم ہوگئی۔ شجاع الدولہ سے امداد کا سوال کیا تو وہ بگڑ گیا۔ آخر معاملہ رفع دفع
ہوگیا۔ ابدالی کی مشکلات سے بھاؤ کی دلیری بڑھتی گئی۔ لیکن مالی مشکلات اس کے
لیے بھی کم نہ تھیں، ادھر ادھر علاقہ سے رقم وصول کرنے کی کوشش کی بمشکل نو لاکھ
روپیہ جمع ہوا، ۲۷ لاکھ روپے کا خرچ تھا۔ دیوان خاص کی چاندی کی چھت
۷ اگست کو بھاؤ نے اتروالی، نوے لاکھ روپے اس طرح ہاتھ آئے جو ایک ماہ کے لیے
کافی تھے۔ غرض مالی مشکلات بڑھتی رہیں۔ مرہٹوں نے شاہ جہاں ثانی کو معزول
کردیا[2] اور عالی گوہر کی بادشاہت کا اعلان کرکے مرزا جواں بخت کو ولی عہد بنا دیا۔ اور شاہ عالم

---

[1] شجاع الدولہ جلد اوّل صفحہ ۹۶، ۹۸ [2] سرکار جلد ۲ صفحہ ۱۸۱، صفحہ ۱۸۲ [3] ۱۰ اکتوبر بروز جمعہ۔

کے نام کا سکہ چلایا۔ شجاع الدولہ کو وزیر مقرر کر دیا گیا، اس چال کا مقصد یہ تھا کہ ابدالی شجاع الدولہ سے بدظن ہو جائے۔[1] ۱۶ اکتوبر کو بھاؤ نے کنج پورہ فتح کر لیا اور کافی مال و دولت ہاتھ لگا۔ اس شکست کی خبر سن کر احمد شاہ کو انتہائی صدمہ ہوا اور وہ جوشِ غضب میں مرہٹوں سے فیصلہ کن جنگ کے لئے اٹھ کھڑا ہوا، باغپت کے قریب دریا عبور کر کے یکم نومبر کو پانی پت کے قریب جا پہنچا، اس سے پہلے ۲۹ ر کو بھاؤ پانی پت پہنچ گیا تھا، اس درمیان میں ابدالی نے مرہٹہ فوج کی رسد بند کرنے پر خاص دستے متعین کئے تھے[2]، ان دستوں نے کامیابی سے مرہٹوں کی رسد روک دی، مرہٹے صلح پر آمادہ تھے، اور نجیب الدولہ کے سوا باقی سب صلح کی تائید میں تھے[3]۔ جب دلی کی طرف کا راستہ ابدالی نے حاصل کر لیا تو مرہٹے گھر گئے اور فاقوں سے مرنے لگے، شجاع الدولہ صلح کرانے میں لگا رہا، اور نجیب الدولہ ابدالی کو لڑائی پر اکساتا رہا۔ مجبور ہو کر بھاؤ نے آخری چارہ جوئی کی اور حملہ کر دیا، لڑائی ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو ہوئی، صبح سے دوپہر کے تین بجے تک چلی جس میں مرہٹوں کو شکست ہوئی، بھاؤ مارا گیا اور مرہٹے میدانِ جنگ سے مختلف اطراف کو بھاگنے لگے، افغان، مغل، روہیلے اور شجاع کے فوجی ان پر پل پڑے اور لوٹ مار شروع کر دی، ملہار بچ کر نکل گیا، جنکوجی اور انتاجی گرفتار ہوئے اور ان کے سر قلم کر دیئے گئے۔ مہادجی (مادھوجی) سندھیا بھاگتے ہوئے زخمی ہوا اور عمر بھر کے لئے لنگڑا ہو گیا گرد و نواح کے دیہاتی بھی لوٹ مار میں شریک ہو گئے، اور بعض دیہاتی عورتوں نے بھی اس میں حصہ لیا کوئی تیس ہزار مرہٹے سپاہی مارے گئے[4]۔

---

[1] سرکار جلد دوم ص ۱۸۱، ص ۱۹۲، ۱۹۸ تا ۲۰۰

[2] جنگ پانی پت کی تفصیل کے لئے کاشی راج کا چشم دید بیان ٹین کی کتاب میں ملاحظہ فرمائیے ص ۶۱، ۶۲، مرہٹہ نقطۂ نظر کے لئے [illegible] ص ۶۲ تا ۷۹

[3] شجاع الدولہ کی سرگرمیوں کے لئے سری واستو کی شجاع الدولہ جلد اول ص ۱۰۱ تا ۱۱۳
جنگ کے عمومی حالات کے لئے سرکار، جلد دوم ص ۲۱۹ تا ۲۷۰ نیز گپتا کی کتاب ص ۱۷۱ تا ۱۸۰

[4] نجیب الدولہ کے نقطۂ نظر کے لئے۔ سرگزشت نجیب الدولہ ترجمہ شیخ عبدالرشید دیکھئے۔

بائیس ہزار عورتیں اور مرد قید و بند میں آئے اور غلام بنائے گئے۔ ساز و سامان اور زر و جواہر بھی دشمن کے ہاتھ لگے[1]۔ ملہار راؤ ہلکر بھاگ کر متھرا پہنچا وہاں سے بھرت پور گیا اور سورج مل کا مہمان ہوا۔ شمشیر بہادر بھی یہاں آ کر زخموں سے ڈیگ میں مر گیا۔ فرار شدہ مرہٹوں کو نان و نفقہ سورج مل نے دیا۔ وہ پھر دکن چلے گئے۔ درانی لشکر دلی پہنچا۔ شجاع الدولہ کا داخلہ دلی میں ۲۴ جنوری کو اور ابدالی کا داخلہ ۲۹ جنوری ۱۷۶۱ء کو ہوا[2]۔ آتے ہی ابدالی کی فوج نے لوگوں کے گھروں کو صاف کرنا شروع کر دیا۔ حبش خاں سے دس ہزار اشرفیاں لی گئیں۔ ملکۂ عالم نے خود دلی سے باہر آ کر درانی کا استقبال کیا اور ایک لاکھ شاہ کو بطور نذر دے ڈالا۔ اور نصف لاکھ وزیر کو دیا۔ فروری میں اور نصف مارچ تک احمد شاہ ابدالی محلات شاہی میں رہا۔ اور دیوان خاص میں جلسے کیا کرتا۔ سلطنت کے انتظام کا یوں کیا کہ شاہ عالم فرماں روا نامزد ہوا۔ (جو الٰہ آباد میں تھا) جواں بخت ولی عہد دلی میں قائم مقام رہا۔ ابدالی نے شجاع الدولہ کی وزارت کا ذکر بارہا کیا لیکن وعدہ پورا کرنے سے پس و پیش کرتا رہا۔ شجاع الدولہ اور اس میں اختلاف کا بیج تو پہلے ہی بویا جا چکا تھا۔ اس دوران میں ابدالی کے فوجی شجاع الدولہ کے فوجیوں سے الجھ پڑے اور شیعہ سنی ہنگامہ کر دیا۔ اس پر شجاع الدولہ اور بھی برہم ہوا اور اودھ جانے کی اجازت چاہی جو منظور ہو گئی۔

شجاع الدولہ بے نیل و مرام مارچ ۱۷۶۱ء میں چلا اور ۱۲ مارچ ۱۷۶۱ء کو اپنے علاقے میں داخل ہو گیا[3]۔ ابدالی دلی سے ۲۰ مارچ کو نکلا۔ دو دن شالامار باغ میں رہا۔ ۲۲ کو چل کر ۲۷ مارچ کو انبالہ پہنچا اور پھر اپنے ملک کو لوٹ گیا[4]۔ جاتے جاتے اس کے

---

[1] گپتا ص ۱۸۱ ؛ ص ۱۸۵ [2] شجاع الدولہ جلد اول ص ۱۱ [3] شجاع الدولہ ص ۱۱ تا ص ۱۳ [4] سرکار جلد دوم ص ۳۲۸

سپاہیوں نے تین روز تک پھر دلی کو لوٹا۔

واپسی پر پنجاب میں احمد شاہ ابدالی کی فوج پر سکھوں نے کئی حملے کئے۔ کئی جگہ سامان اور مال اسباب پر بھی ہاتھ ڈالا گیا۔ ہر رات کو ابدالی کو اپنے بچاؤ کے لئے کچھ نہ کچھ خاص انتظامات کرنے پڑتے تھے۔ اٹک تک سکھ اس کے ارد گرد منڈلاتے رہے۔ مرہٹے دکن کی طرف جا چکے تھے، پنجاب دلی کی حکومت سے الگ تھا۔ لے دے کر یہاں سکھ تھے جن سے ابدالی کو پے درپے الجھنا پڑا، اس کے باقی حملے پنجاب میں ان ہی کی سرکوبی کے لئے تھے۔[1] یہ حملے پنجاب پر اس ترتیب سے ہوئے۔

(۱) ۱۷۶۲ء لدھیانے تک آیا ۹ ماہ کے بعد ۱۲ دسمبر ۱۷۶۲ء لاہور سے واپس۔

(۲) ۶۵-۱۷۶۴ء (ساتواں حملہ) کرتار پور تک گیا اور کنج پورہ سے واپس گیا۔

(۳) ۶۷-۱۷۶۶ء (آٹھواں حملہ) امین آباد نزد انبالہ تک آیا (۹ مارچ) واپس ۱۷ مارچ چلا۔

(۴) دسمبر ۱۷۶۸ء جنوری ۱۷۶۹ء (نواں حملہ) ایمن آباد تک آ کر واپس گیا۔

(۵) دسمبر ۱۷۶۹ء تا جنوری ۱۷۷۰ء (دسواں حملہ) دریائے سندھ تک آ کر لوٹ گیا۔

وفات جہان خان ۱۴ مارچ ۱۷۷۰ء

وفات ابدالی – ۱۴ مارچ ۱۷۷۳ء

تیمور شاہ کے پنجاب پر حملے

۱- ۱۵ جنوری ۱۷۷۵ء میں پنجاب تک آیا۔ (۲) اواخر جنوری ۱۷۸۰ء میں ملتان کا محاصرہ کیا۔ ۱۸ فروری کو واپس ہوا۔ (۳) ۱۷۸۲ء کے موسم سرما میں بہاولپور تک آیا (ان حملوں کا خوف دلی پر چھایا رہا۔)

۴- ۱۸ دسمبر ۱۷۸۵ء کو پشاور آیا، دلی کا ارادہ تھا، لیکن سکھوں کی وجہ سے

---

[1] گپتا، ۱۹۵۱ء، ص۱۴۲

مئی ۱۷۸۶ء میں لوٹ گیا۔

۵ دسمبر ۱۷۸۸ء / ۱۳ دسمبر کو ملتان پہنچا۔ پھر بہاولپور آیا اور یہاں سے واپس

۶ - ۱۸ مئی ۱۷۹۳ء پشاور تک آیا۔ بیماری کے سبب لوٹ گیا۔ وفات مئی ۱۷۹۳ء۔

ابدالی کے جانے سے پہلے عمادالملک کو دوبارہ وزیر مقرر کر دیا تاکہ مرہٹوں اور جاٹوں سے معاہدہ ہو سکے، جہاندار شاہ ولی عہد بدستور رکھا، لیکن جہاندار شاہ کی ماں عمادالملک کے خلاف تھی نیز نجیب الدولہ اور عمادالملک مل کر کام نہیں کر سکتے تھے، نجیب الدولہ پہلے دہلی پہنچ گیا اور چھ ہزار سپاہی شہر میں ڈال دیئے [6] اور بطور میر بخشی فوجدار دہلی اور مختار ابدالی انتظام سنبھال لیا۔

مرہٹے اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ چند سال بعد تک دلی میں امن و امان رہا۔ ابدالی کا قاصد عمادالملک کے پاس (۱۹ اپریل کو) متھرا پہنچا اور عمادالملک کو خلعت وزارت دے دیا۔ یعقوب عمادالملک کے مشورے سے بالاجی راؤ پیشوا کے پاس جو قریب المرگ تھا نہیں گیا اس لئے معاہدہ کوئی نہ ہوا اور عمادالملک کی امداد میں سورج مل بھی نجیب الدولہ سے ٹکر لینے کو تیار نہ تھا۔ یہی حال یعقوب علی خاں کا تھا۔ اب عمادالملک وزارت سے مایوس ہو گیا۔ سورج مل جاٹ نے ۱۲ جون ۱۷۶۱ء آگرہ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا، نجیب الدولہ میں مقابلہ کی ہمت نہ تھی، راجہ ناگرمل کو نجیب الدولہ نے سورج مل کے پاس بھیجا اور ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۱ء کو ان دونوں میں ملاقات ہوئی [7] لیکن شاہ عالم کے دلی میں آنے کا کوئی متفقہ فیصلہ نہ ہو سکا۔

شجاع الدولہ شاہ عالم کو بکسر تک لے آیا۔ [8] اور احمد صاحب بنگش کا علاقہ فتح کر کے

---

[6] وزارت کی تفصیلات کے لئے دیکھئے۔ سرگزشت نجیب ص ۱۸، ۵۸ جنوری ۱۷۶۲

لینا چاہا۔ اس پر روہیلہ سردار ناراض ہو گئے اور شجاع الدولہ کی اسکیم ختم ہو گئی۔ نجیب الدولہ شجاع الدولہ سے ملا اور دوستی کے وعدے ہوئے۔ لیکن فوجوں میں تنخواہ نہ ملنے کی بنا پر تکرار ہو گئی۔ ۱۷۶۲ء مئی کو نجیب الدولہ نے واپسی کی اجازت چاہی۔ سورج مل نے دسمبر میں دلی پر حملہ کیا۔ جنگ کا خاتمہ سورج مل کے مرنے پر ۲۵ دسمبر [illegible] کو ہوا۔ نومبر ۱۷۶۴ء میں جواہر سنگھ باپ کا بدلہ لینے آیا۔ نجیب الدولہ اس وقت بیمار تھا۔ چند ماہ کی جنگ کے بعد شاہ ابدالی کی آمد کی خبر ہوئی۔ مرہٹوں نے جواہر سنگھ پر دباؤ ڈالا اور نجیب الدولہ سے صلح کرا دی۔ (فروری ۱۷۶۵ء)

اس زمانے میں شاہ عالم ثانی کو پورب میں جنگ درپیش ہوئی جس کا خاتمہ معاہدہ الہ آباد پر ہوا۔ (تفصیلات کتاب میں آگے درج ہیں)

شاہ عالم نے ۱۲ راگست ۱۷۶۵ء کو فرمان جاری کر کے کمپنی کو بنگال اڑیسہ کی دیوانی دے ڈالی۔ ۱۶ راگست ۱۷۶۵ء کو شجاع الدولہ سے کمپنی کا معاہدہ ہوا۔ اسی طرح شاہ عالم، نجم الدولہ اور کمپنی کے درمیان ۱۹ راگست ۱۷۶۵ء کو معاہدہ ہوا۔ اس معاہدہ نے شاہ عالم کو کمپنی کا قیدی بنا دیا۔ الہ آباد میں اس کی رہائش ہوئی جہاں کرنل اسمتھ کا فوجی ہاتھ ہر وقت موجود تھا۔ اس زمانے میں سکھوں نے پنجاب میں اس قدر طاقت پکڑ لی تھی کہ وہ سہارنپور کے علاقے میں گھس آئے۔ اکتوبر ۱۷۶۵ء۔ نجیب الدولہ اس وقت رہتک میں تھا۔ سکھوں کا دوسرا دستہ دلی کے قریب آکر دیہاتوں پر حملہ آور

لہ موت کی تفصیل میں اختلاف ہے۔ لڑائی ہنڈن کے مقام پر دلی سے ۱۰ میل کے فاصلے پر ہوئی۔ مورخین نے حصہ پر تفصیلات موجود ہیں۔ اختلافات کے لئے دیکھئے قانون گو کی ہسٹری آف دی جاٹس ۱۵۷/۱۵۸ اور ان لڑائیوں کی تفصیل کتاب میں دوسرے مقام پر درج ہے۔

ےہ تفصیلات کے لئے دیکھئے انڈین ہسٹری کانگریس الہ آباد روئداد اجلاس ۱۹۳۸ء صفحات ۵۶۲ - ۵۵۴ نیز شجاع الدولہ ۲۲، ۲۳ جلد ۲

ہوا (یہ جنوری فروری سنہ ۱۷۶۴ء کے واقعات ہیں[1]) ریواڑی راجہ ناگر مل کی جاگیر تھا۔ چھ ماہ تک یہ جھڑپیں جاری رہیں - ۱۷ اپریل کو دلی کے نواح میں منڈی کو لوٹا اور منصور نگر میں پنجہ گاڑا، ایک چھوٹا سا دستہ دارالخلافہ کی جنوبی بستیوں کو بھی لوٹتا پھرا لیکن جلد ہی افغان نے انہیں بھگا دیا۔ نجیب الدولہ دلی کے قریب آگیا تھا۔ مقابلہ میں بہت سے سکھ مارے گئے (۲۰ اپریل)[2]

سکھ بھاگ کر جمنا کی طرف نجیب الدولہ کی جاگیروں کو لوٹنے لگے، انہیں تعاقب کرکے بھگا دیا گیا۔ پٹیالہ کے سکھ راجہ نے نجیب الدولہ کا ساتھ دیا۔ (ابدالی نے اسے سرہند کا گورنر بنا دیا تھا) سکھوں نے اسے گھیر لیا۔ نجیب الدولہ امداد کو پہنچا۔ آخر صلح ہو گئی۔ (مئی سنہ ۱۷۶۶ء) سنہ ۱۷۶۷ء میں ابدالی نے پنجاب پر حملہ کیا اور سات سال کی واجب الادا رقم کا مطالبہ کیا، نجیب الدولہ کو بھی بلایا، نجیب الدولہ ۹ مارچ کو ملا، (بیاس کے کنارے) میرٹھ میں سکھوں پر حملہ کیا گیا، ابدالی کے ساتھ روہیلہ فوجیں شامل تھیں (۱۵ مئی سنہ ۱۷۶۷ء) ابدالی نجیب الدولہ سے ۲۵ لاکھ روپے کا وعدہ لے کر واپس گیا۔

نجیب الدولہ سنہ ۱۷۶۳ء سے بیمار چلا آتا تھا۔ اب بیماری زور پکڑ گئی۔ اس نے شاہ عالم کو دلی آنے کو لکھا۔ دلی کا انتظام زینت محل اور جہاندار شاہ اور ضابطہ خاں (اپنے بیٹے) کے سپرد کر دیا۔ ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۷۶۹ء شاہدرہ میں ٹھہرا، اور خود محل میں جا کر الوداع کہی، اور اپنے وطن نجیب آباد چلا گیا[3]۔ ادھر مرہٹے دس سال بعد آدھمکے، نجیب الدولہ نے دست تعاون بڑھایا، اور ہلکر کی معرفت تحریری اقرار ہو گیا اور طے ہوا کہ پہلے

---

[1] ہسٹری آف سکھس (گپتا)، ۱۷۶۹ء - ۱۸۳۹ء صفحہ ۲۰۰، صفحہ ۲۱۰، ۲۴۲، ۲۴۳،

[2] سرکار جلد دوم صفحہ ۲۹۰، صفحہ ۲۹۲، ہسٹری آف دی سکھس گپتا صفحہ ۲۳۶، صفحہ ۲۴۵

[3] سرکار جلد دوم صفحہ ۲۹۵، صفحہ ۲۹۸

جاٹوں کو شکست دی گئی تھی[1] - اب نول سنگھ کا تھوڑا تھوڑا علاقہ دبا لیا گیا[2] - مرہٹے دوآب کی طرف چلے تاکہ روہیلوں سے روپیہ وصول کریں۔ نجیب الدولہ نے جاٹوں اور مرہٹوں میں (۲۰ ستمبر) صلح کرادی۔ ٹاپر کے مطابق یہی تھا کہ نجیب الدولہ کا بقول سرکار ۳۱ ر اکتوبر ۱۷۷۰ء کو انتقال ہو گیا - (سرکار جلد دوم ص ۳۰۱ تا ص ۳۰۵) معاصر مورخ نورالدین نے سرگذشت نجیب الدولہ میں اس کی وفات کا ۱۱۸۶ھ دیا ہے[3] جو درست نہیں، اصل تاریخ ۳۰ ر اکتوبر ۱۷۷۰ء مطابق ۱۰ رجب ۱۱۸۴ھ ہی ہے - دلی نجیب الدولہ کے زمانے میں تباہی سے محفوظ رہی۔

شاہ عالم نے نجیب الدولہ کے مرنے کے بعد دلی آنے کا فیصلہ کر لیا، (اس نے) ضابطہ خان کو میر بخشی مقرر کیا اور نذرانہ وغیرہ طلب کیا۔ اس نے انکار کر دیا - شاہ کے نمائندوں کو واپس کر دیا (۲۹ ر دسمبر ۱۷۷۰ء) شاہ عالم نے مرہٹوں سے نامہ و پیام شروع کئے - ۲۷ دسمبر کو سیف الدین کو مرہٹوں کے پاس دوآب بھیجا گیا اور کچھ تفصیلات مرتب ہوئیں۔ لیکن جب اجمیر سے سندھیا کے پاس حسب المطلب آیا، تو معاملات کچھ الجھ گئے (سرکار جلد سوم ص ۱۳) آخر مرہٹوں نے فیصلہ کیا کہ دلی جانا چاہیئے اقتدار خواہ عماد کو جائے یا

---

[1] جواہر سنگھ اگست ۱۷۶۸ء کے اوائل میں ایک فوجی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ عماد السعادت کی تاریخ ۱۲ رجب غلط ہے [2] نول سنگھ بقول عرشی صاحب محرم ۱۱۸۳ھ (مئی ۱۷۶۹ء) تخت نشین ہوا۔ اور ۱۲ جمادی الثانی ۱۱۸۹ھ مطابق ۱۲ جولائی ۱۷۷۵ء فوت ہوا تعلیقات وقائع عالم شاہی ص ۱۵۲

[3] تفصیلی بحث کے لئے انگریزی ترجمہ سرگذشت NAJIBUD DAULAH HIS LIFE AND TIMES P. 136 نجیب الدولہ مرتبہ شیخ عبدالرشید ۱۹۵۲ء ص ۱۳۶ حاشیہ ص ۱۷۳ پرسیوال اسپیر ص ۱۷ اصلی وفات نجیب کا میں بیان کرتے جو بر درست نہیں ہاپڑ میں انتقال کیا - نعش نجیب آباد لے جا کر دفن ہوئی۔

احمد خاں کو یہیں قسم یاد ہے (تقریباً ۲۶ فروری ۱۷۷۱ء) سرکار جلد سوم ص۲) ۷ فروری
کو سیف الدین مرہٹوں کے کیمپ سے رخصت ہو کر دلی میں داخل ہوا اور جامع مسجد میں
جا کر شاہ عالم کی بادشاہت کا اعلان کر دیا، قلعہ دار دہلی نے مخالفت کی، مرہٹوں نے ۹ فروری
کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا، اور دلی پر پوری طرح قبضہ ہو گیا اور معاہدہ ہوا۔ (یہ معاہدہ
۱۵ فروری کو جہاندار شاہ سے ہوا، اور شاہ عالم نے اس کی توثیق ۲۲ مارچ ۱۷۷۱ء کو کر دی
الہ آباد دیکھئے تفصیلات کے لئے سرکار جلد دوم ص۵۰۵، ۶۰۰) شاہ عالم نے الہ آباد سے
۱۳ اپریل ۱۷۷۱ء (۲۷ ذوالحجہ) چلنے کا اعلان کیا۔ سرائے عالم چند پر چند دن قیام کیا۔
تاکہ شجاع فیض آباد سے آکر شاہ سے مل سکے، شجاع الدولہ ۱۱ اپریل کو فیض آباد
سے نکلا آہستہ آہستہ سرائے عالم چند آ کر ۳۰ اپریل کو شاہ سے ملا اور شاہ کی خواہش
پر ۱۲ لاکھ روپے دیئے لیکن خود نہ جانے کی خواہش کی، سرائے عالم چند سے ۲ مئی کو شاہ عالم
کی روانگی ہوئی، وزیر جاجمؤ تک ساتھ گیا (۲۳ مئی) یہاں سے شجاع الدولہ واپس
ہوا) ۳ جون) کانپور، بٹھور، قنوج، نواح فرخ آباد۔ (یہاں احمد خان بنگش
۱۷ اپریل کو فوت ہو گیا تھا۔ اس کی جائیداد کی ضبطی کا ارادہ تھا، لیکن نذرانہ لے کر
مظفر جنگ کو ریاست فرخ آباد بحال کر دی[۲]) نبی گنج میں برسات گزاری، نبی ما
بلد سیف الدین اور دوسرے لوگ دلی سے آئے اور ۱۰ نومبر کو شاہ سے ملے۔

۱؎ لیکن ابتدائی دستہ ۵ اپریل کو اور خود ۱۹ اپریل کو ایک بجے دوپہر شہر سے باہر
جہاں نما بنگلے میں آ گیا اور وہاں سے ۲۳ کو چلا کہ انگریزوں اور شجاع کی طرف سے
اندیشہ تھا کہ یہ لوگ دلی جانے سے روک لیں گے، شجاع الدولہ ۱۶۷ ۲؎ تفصیلات کے لئے
دیکھئے تاریخ اودھ جلد دوم

مادھو جی سندھیا ۱۸ نومبر کو آیا، سورج پور (بیگم جنوری ۱۷۷۲ء) شاہ عالم ۶ جنوری سوموار کو دلی دروازے کے راستے دہلی میں داخل ہوا۔[1] دلی آکر شاہ عالم نے ضابطہ خاں کو بلایا اور نذرانہ طلب کیا، اس نے انکار کر دیا۔ فوج کی تنخواہ کے لیے بھی روپیہ کی ضرورت تھی، اس لئے دریاؤں کے چڑھنے سے پہلے حملہ ضروری تھا۔[2] مرہٹوں اور نجف خاں کی مدد سے ضابطہ خاں کے علاقے پر حملہ کر دیا گیا۔ ۲۳ فروری کو چاندی گھاٹ کے مقام پر جمنا عبور کی، شاہ عالم دس میل پیچھے رہا۔ ۲۴ فروری کو لڑائی ہوئی شکست کھا کر روہیلے (دوندے خاں حافظ رحمت خاں وغیرہ) فرار ہو گئے، اور نانک متا کے جنگل میں (ترائی) جا چھپے، ضابطہ خاں بھی یہ دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ یکم مارچ شاہ عالم سکرتال پہنچا جو میواتیوں نے شاہی فوج آنے سے پہلے ہی لوٹ لیا تھا۔ ۱۶ مارچ کو پتھر گڈھ والوں نے ہتھیار ڈالے، نکلنے والوں سے برا نازیبا سلوک ہوا، مرہٹوں کے ہاتھ کافی مال آیا۔ کچھ حصہ شاہ کو دیا، ضابطہ خاں، شجاع الدولہ کے پاس چلا گیا۔ اور اس سے ساز باز کر لی۔[3] (۱۲ مئی) شجاع الدولہ نے چالیس لاکھ روپے کے عوض روہیلوں سے وعدہ کیا۔ کہ مرہٹوں کو ان کے علاقہ سے نکالا جائے گا۔[4] اور خود ضامن بنا۔ مرہٹوں کا ارادہ آگے بڑھ کر انگریزوں وغیرہ سے جنگ کا تھا۔ شاہ عالم راضی نہ ہوا اور ۹ جولائی کو دلی واپس آیا۔ مرہٹوں نے اس حملے میں روہیل کھنڈ کے شہروں کو بری طرح سے پامال کیا تھا۔ اس کا ذکر قائم نے اپنے شہر آشوب میں کیا ہے اور شاہ عالم کو مجرم قرار دیا ہے، اب ضابطہ خاں نے مرہٹوں کو وسیلہ بنا کر میر بخشی کی بحالی چاہی شاہ عالم خلاف تھا۔ اس لئے مرہٹے اور ضابطہ خاں ۲۱ نومبر کو دارالخلافے کے قریب

---

[1] سرکار جلد دوم صفحہ ۵۸، ۶۰ [2] سرکار، جلد سوم صفحہ ۳۶ [3] شجاع الدولہ جلد دوم صفحہ ۱۹۹ تا ۲۰۱ [4] ایضاً صفحہ ۲۰۲

پہنچ گئے۔ نجف خان شاہی فوج لے کر مقابلہ میں نکلا، ۱۰، ۱۲، ۱۶ دسمبر ۱۷۷۲ء
کو جھڑپیں ہوئیں، ۱۷ دسمبر کو پرانے قلعہ کے پاس لڑائی ہوئی، اور شاہی فوجوں نے
شکست کھائی۔ مرہٹوں نے حویلی غازی الدین خاں میں چھپے ہوئے مسلمان ساہوکاروں
کو لوٹا، سعد اللہ خاں کی منڈی لوٹی گئی۔ پنڈاروں نے پرتاپ گنج اور جے سنگھ پورہ
کو آگ لگا دی، شاہ نے ہتھیار ڈال دیئے ۱۹ دسمبر سے صلح کی بات چلی ۲۶ دسمبر کو
مرہٹوں نے بظاہر معافی مانگی اور در پردہ شاہ سے اپنی شرائط منوالیں[1]۔ حسام الدین
نے مرہٹوں کی مدد سے نجف خان کو دلی سے نکلوانا چاہا۔ پہلے تو نجف خاں لڑا۔ پھر
مرہٹوں کا کہا مان کر مرہٹوں کے ہمراہ ہو لیا۔ جو شجاع الدولہ اور انگریزوں سے لڑنے جا
رہے تھے[2] مرہٹے ۲ فروری ۱۷۷۳ء کو دوآب میں داخل ہوئے، مرہٹے روہیلوں سے
بغیر لڑے بھڑے روپیہ چاہتے تھے، انگریزی افواج کے ساتھ شجاع الدولہ ۳۱ جنوری
۱۷۷۳ء کو آ پہنچا تھا۔ مرہٹوں نے فرخ آباد میں ڈیرے ڈال دیئے[3] رام گھاٹ کے
قریب مرہٹوں سے جنگ ہوئی۔ مرہٹوں نے رام گھاٹ کا محاصرہ چھوڑ دیا[3]۔ راہ میں
سنبھل، مراد آباد کو لوٹا، دوسرا دستہ جو وہاں رہ گیا ۲۲ مارچ کو لڑائی میں شکست کھا کر
بھاگ گیا۔ اور دوآب میں ۱۵ میل مغرب کی طرف پڑاؤ کیا (۲۸ مارچ) ۱۹ اپریل کو
مرہٹوں کے آدمی شجاع الدولہ سے ملے۔ ۲۱ کو بات چیت شروع ہوئی اور صلح ہو گئی
(پندرہ لاکھ روپے حافظ رحمت خاں سے اور ۵ لاکھ احمد خاں بنگش کے بیٹوں سے (مظفر جنگ

---

[1] جاٹوں کو ان کا علاقہ واپس دیا جائے۔ قلعہ کی حفاظت کے لئے بقدر ضرورت فوج ہو، ضابطہ خان میر بخشی ہو شاہ مرہٹوں کو روپیہ دے۔ [2] ص ۵۲، ص ۵۵
[3] شجاع الدولہ جلد دوم ص ۲۰۳ تا ۲۱۲ عمارت السعادت کی تفصیلات درست نہیں۔

بنگش سے بطور تاوان شجاع الدولہ نے تاوان مرہٹوں کو دے دینے کا وعدہ کیا۔ اس صلح کے
بعد ۵ رمئی کو مرہٹوں نے نجف خاں کو علی گڑھ سے رخصت کیا۔ اب مرہٹوں نے
دکن کا رُخ کیا۔ نجف خاں ۲۰ رمئی کو دلی آ گیا۔[1] حسام الدولہ کی جگہ شاہ نے عبدالاحد
کو نائب وزیر بنا دیا، مجدالدولہ بہرام جنگ خطاب ملا۔ (۲۱ جون ۱۷۷۳ء) ۵ رجون کو
نجف خاں بخشی دوم ہوا، اب نجف خاں سپاہ و سیف کا مالک ہو گیا۔ ۳۰ راگست ۱۷۷۳ء
کو مرہٹہ پیشوا نارائن راؤ مارا گیا، مرہٹے اب اندرونی خلفشار کا شکار تھے، اس لیے
کافی عرصہ تک شمالی ہندستان اُن کے قدموں سے محفوظ رہا۔ دلی کی حکومت کو امن بحال کرنے
کا موقع مل گیا۔ نجف خاں نے ۲۲ جون ۱۷۷۳ء سے ۲۱ اپریل ۱۷۷۵ء کی مدت
دلی میں بسر کی۔ دوسری طرف شجاع الدولہ بھی اپنے بچاؤ میں اور روہیل کھنڈ پر نگاہ رکھتا تھا۔
۷ رستمبر ۱۷۷۳ء کو اس نے وارن ہیسٹنگز سے بنارس کے مقام پر ایک معاہدہ کیا۔[2] زبانی
معاہدے کی رُو سے روہیل کھنڈ پر حملہ کے سلسلے میں انگریزوں نے امداد کا یقین دلایا
شجاع الدولہ مرہٹوں سے مطمئن تھا۔ وہ نیم مردہ ہو چکے تھے۔ اب جب کہ نجف خاں نے
جاٹوں پر حملہ کیا، نول سنگھ نے شجاع الدولہ سے مدد مانگی، اُس نے وعدہ کیا، چونکہ
جاٹوں نے آگرہ کا قلعہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ شجاع الدولہ دوآب میں آیا ۱۲ ردسمبر کو
اٹاوہ چھین کر آگرے[3] کا محاصرہ کر لیا۔ نجف خاں نے شجاع الدولہ کو گانٹھا اور امداد دی۔

---

[1] سرکار جلد سوم صفحہ ۶۱، ۶ب، شجاع الدولہ جلد دوم صفحہ ۲۱۷ [2] شجاع الدولہ جلد ۲
صفحہ ۲۲۱، ۲۲۲ معاہدے کی رُو سے (ا) کوڑہ اور الہ آباد ۵۰ لاکھ کے عوض شجاع الدولہ
کو ملے (ب) وزیر سے امدادی افواج کے اخراجات کے ادا کرنے کا وعدہ کیا، اس کے علاوہ بھی
بعض معاملے ہوئے جو معاہدے میں نہیں لکھے گئے۔ مثلاً ہیسٹنگز سے روہیلکھنڈ کے حملے میں امداد کا وعدہ لیا
گیا [3] ۱۱ دسمبر کو شجاع الدولہ جلد دوم صفحہ ۲۳۶

۸ر فروری ۱۷۷۴ء[۱] کو حملہ کیا گیا، ۲۰ فروری کو جاٹ عاجز آ گئے اور آگرہ ہاتھ آیا۔ روہیل کھنڈ کی فتح کی تجویز میں شجاع الدولہ نے شاہ عالم سے شرکت کی استدعا کی، شجاع الدولہ، نجف خاں سے اس سلسلہ میں اٹاوہ میں ملا۔ (۲۷ فروری) شاہ عالم بیماری کی وجہ سے غازی آباد سے لوٹ گیا (۲۸ مارچ) اپنی جگہ اکبر شاہ (فرزند) کو ساتھ کر دیا اور آپ دہلی چلا گیا (۱۶ر اپریل) نجف خاں دلی سے ۲۲ر اپریل شاہدرہ پہنچا، لیکن ۲۳ر اپریل کو شجاع الدولہ میران پور کٹرہ پر روہیلوں کو شکست دے چکا تھا۔[۱] (شجاع الدولہ کی ان لڑائیوں کے لئے باب سوم میں وہ مقام دیکھئے۔) جب میر حسن نے سالار جنگ کی ملازمت کی، نجف خاں ۱۲ جون ۱۷۷۴ء سے ۲۱ اپریل ۱۷۷۵ء تک دوآبہ میں رہا اور درباری سازشوں کو توڑتا رہا[۲]۔ جے پور کے راجہ سے ([illegible]) قلعہ چھین لیا۔ (اپریل ۱۷۷۵ء، ص ۸۰) اس کے بعد وہ برسات میں مقیم رہا، جاٹ لڑنے کو ڈیگ سے نکلے۔ نجف خاں نے راجپوتوں کو جاٹوں سے علیحدہ کر دیا۔ اس کا محاصرہ کر لیا۔ ۲۹ر اپریل ۱۷۷۶ء کو قلعہ فتح کر لیا[۳]۔ مالی مشکلات نجف خاں بھی حل نہ کر سکا۔ ضابطہ خاں بھی تنگ کر رہا تھا۔ نجف خاں نے غوث گڑھ کا محاصرہ کر لیا[۴]۔ ۱۴ر ستمبر ۱۷۷۷ء کو ضابطہ خاں کا بڑا بیٹا غلام قادر روہیلہ اور کئی دوسرے لوگ گرفتار ہوئے، ضابطہ خاں سکھ سپاہیوں سمیت بھاگ گیا[۵]۔ غوث گڑھ پر قبضہ ہو گیا۔ (۲۳ ستمبر)

---

۱ شجاع الدولہ جلد دوم ص ۲۱۸ تا ص ۲۵۲۔ اس مہم میں روہیلہ ریاستیں ختم ہو گئیں، صرف فیض اللہ خاں رام پور کا نواب باقی رہا۔ ۱۷۸۰ء میں نواب پر دباؤ ڈالا گیا اور روپیہ کا مطالبہ کیا گیا، مارچ ۱۷۸۱ء میں نواب فیض اللہ خاں کے انکار پر اس سے معاہدہ منسوخ قرار دیا گیا، کیمبرج ہسٹری جلد ۵ ص ۳۰۴۔ مگر وارن ہیسٹنگز کو خود یہ احساس تھا کہ فیض اللہ کا انکار جائز ہے

۲ سرکار جلد سوم ۳ ص ۹۵ ۴ سرکار جلد سوم ص ۹۲ تا ۱۰۱ ص ۱۰۲، ص ۱۰۳

سکھوں[1] نے نجف خاں سے صلح کر لی۔ اور ضابطہ خاں کی امداد سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ نجف خاں نے بڑی دانشمندی سے ضابطہ خاں کو ساتھ ملایا اور دربار سے معافی دلا کر ضلع سہارنپور کی جاگیر کی سند لی۔ (جنوری ۱۷۷۹ء) اور متعلقین کو رہائی دلائی۔ اس طرح اس نے ایک طرف تو سکھوں کے بالمقابل ایک طاقت کھڑی کر دی۔ دوسری طرف عبدالاحد کی درباری سازشوں کی روک تھام کا سامان کیا۔ تیسرے اب وہ اطمینان سے جاٹوں اور راجپوتوں کی طرف متوجہ ہو سکتا تھا۔ اس طرح دستی دو آب میں اس کے اپنے پرگنے بھی محفوظ ہو گئے۔ اس زمانے میں عبدالاحد (مجد الدولہ) نے اقتدار بڑھانے کی کوشش میں ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن نجف خاں سے مات کھا گیا۔ اور ۱۵ر نومبر کو گرفتار کر لیا گیا[2] اور مرزا نجف خاں ۱۶ نومبر کو حاضر ہو کر وکیل مطلق ہوا۔ نجفی دوم [illegible] شاہ ہوا۔ نجف خاں اب سلطنت پر چھا گیا۔ یہ اقتدار صرف دو سال اور چار ماہ رہا۔ حکومت کی مالی مشکلات جیسے بڑھیں اس کی عیش پرستی بڑھتی گئی اور نظم و نسق کشمیری دیوانوں اور شیعہ خواجہ سراؤں کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔ علاقوں میں جاگیر دار آزاد ہوتے گئے۔ ہنڈیوں کے ذریعے مالی مشکلات کا حل ڈھونڈا گیا لیکن کب تک۔ یہ راستہ بھی بند ہو گیا اور شاہ عالم بھی بدظن ہو گیا۔ شاہی خواتین کے وظیفے بند ہو گئے تو انہوں نے تنگ آ کر بھوک ہڑتال کی۔ شاہ نے تمبر خواجہ سرا کو حکم دیا کہ نجف خاں کے دروازے پر دھرنا مار کر بیٹھ جائے حتیٰ[3] کہ وہ اخراجات دینے پر مجبور ہو۔ اس زمانے میں شاہ کی یہ حالت تھی کہ بدلنے کو دوسرا لباس بھی نہ تھا[4]

جہان را جہاں دار دارد خراب ؛ ز دست نجف خاں و افراسیاب[5]

---

[1] ۹ رمضان ۱۱۹۲ھ۔ ۲ر اکتوبر ۱۷۷۸ء بقول فرشی۔ دیباچہ نادرات شاہی ص ۲۳ لیکن نسخہ نوٹ میں سودا کا قطعہ تاریخ بلا درج ہے جس سے ۱۱۹۱ھ برآمد ہوتے ہیں۔ [2] سرکار جلد سوم ص ۱۳۶ [3] سرکار جلد سوم ۱۳ تا ۱۴۲

شاہ عالم کا نیچ و نائب گھاتا لے جانا تھا اس کی ذاتی جاگیریں نجف کے آدمیوں میں تقسیم ہو گئی تھیں اور مالی حالت خراب ہو رہی تھی۔ نجف خاں بھی انگریزوں کے گرالیار (۱۷۸۱) تک آنے کی وجہ سے پریشان ہو رہا تھا۔ عوام کی حالت بھی اچھی نہ تھی، دلی کی نواحی علاقے کی فصلیں روز بروز ختم ہو رہی تھیں اور ۱۷۶۰ء سے نہر بھی اپٹ جانے کی وجہ سے بند پڑی تھی، ۱۱ جون ۱۷۸۱ء میں زبردست آندھی آگئی، سال کے آخر میں بھونچال بھی آیا۔ غرض کہ دلی کا حال خراب ہو رہا تھا (پریسیڈنسی پیپرز ۲۱، ۲۲) نجف خاں اس زمانے میں بیمار تھا، آخر ذوالفقار الدولہ نجف خاں نے پنجر کی صبح کو ۲۲ ربیع الاخر ۱۱۹۶ھ مطابق ۶ اپریل ۱۷۸۲ء وفات پائی۔[۱] نجف خاں کے بعد دلی کی حالت بڑی خراب ہو گئی، لوگ بھاگنے لگے، افراسیاب خاں، امیرالامرا کا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا (۹ اپریل ۱۷۸۲ء) پھر محمد شفیع کی باری آئی (۱۵ ستمبر ۱۷۸۲ء) ۱۶ اکتوبر تک اس کا ستارہ بھی گردش میں آگیا۔ محمد بیگ ہمدانی نے ۱۷ نومبر کو اسے دوبارہ بحال کرایا لیکن ہمدانی اور محمد شفیع میں بھی دسمبر ۱۷۸۲ء تک اختلافات ہو گئے۔ اب محمد شفیع نے مرہٹوں سے ساز باز کی، اور ہمدانی دلی کے نواحی علاقے کو لوٹنے لگا، محمد شفیع ۲۳ ستمبر ۱۷۸۳ء کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ افراسیاب اکتوبر ۱۷۸۳ء میں میر بخشی ہوا، تیرہ ماہ اسے اقتدار حاصل رہا۔ ۲ نومبر ۱۷۸۴ء کو مرزا محمد شفیع کے بھائی کے ہاتھوں قتل ہوا، اس زمانے تک عہد نامہ سلبئی کی مدد سے انگریزوں نے مرہٹوں کی کانفیڈریسی کو توڑ دیا تھا۔ نتیجے کے طور پر سندھیا لیڈر بن گیا، دلی میں سندھیا کا اقتدار بڑھ گیا اور درحقیقت وہی کرتا دھرتا بن گیا (۳۰ نومبر) لیکن جے پور کی طرف نکلا، تو

---

[۱] دیباچہ نادرشاہی عربی صلہ ۲ سطر: دیباچہ نادرات شاہی میں افوشی مرہٹوں پروس قتل کا الزام رکھتے ہیں اور یکم نومبر مطابق ۱۰ ذی الحجہ تاریخ دی ہے۔ طبع

اس کی غیر حاضری میں سازش ہوئی اور غلام قادر روہیلہ دلی کی طرف متوجہ ہوا[1] (داخلہ دہلی ۵ ستمبر ۱۷۸۸ء) غلام قادر خاں کی تائید اسمٰعیل بیگ کر رہا تھا۔ شاہ عالم نے اس نئے فتنے سے چھٹکارے کے لیے سندھیا کو خط لکھا۔ جو پکڑا گیا۔ ۳۰ر جولائی مطابق ۲۲ر شوال ۱۲۰۲ھ میں شاہ عالم کو معزول کیا گیا۔ ۱۰ر اگست مطابق ۷ر ذی قعدہ ۱۲۰۲ھ شاہ عالم کو اندھا کر دیا گیا[2]۔ اس موقعہ پر شاہ عالم اور شاہی خاندان پر بڑے ظلم ہوئے نو ہفتے غلام قادر کی حکومت رہی، دلی میں لوٹ کا بازار گرم رہا۔ مرہٹوں نے اناج کی ترسیل دلی میں بند کی اور سندھیا نے حملہ کر دیا، (قبضہ پرانی دہلی ۲۸ ستمبر، نئی دہلی ۲ اکتوبر) ۱۱ر اکتوبر کو غلام قادر قلعہ سے نکل گیا۔ ۱۷ر اکتوبر کو شاہ عالم دوبارہ تخت نشین کیا گیا۔ غلام قادر گرفتار ہوا (۱۹ر دسمبر) اور ۳ مارچ ۱۷۸۹ء کو قتل کر دیا گیا[3]۔

راج پاٹ کھوئے کے پڑے تمہارے لیں ∴ مادھو ایسا کیجیو کہ جیں میں جس !

شاہ عالم کا چھ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا، اس میں صرف سترہ ہزار روپیہ بادشاہ کے پلّے پڑتے تھے (اس کی مفلسی کی مفصل داستان پرسیول نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۹ پر لکھی ہے اور وقائع عالم شاہی سے بھی اس کی مفلسی کا اندازہ ہو سکتا ہے) جب شاہ کی

---

[1] ایڈورڈ ٹامسن نے اپنی کتاب دی میکنگ آف انڈین پرنسز میں صفحہ ۱۰۹، ان حالات پر روشنی ڈالی ہے۔
[2] شاہ عالم نے اس موقعہ پر فارسی میں ایک نظم لکھی جس کا متن گلشن ہند (مرزا علی لطف) میں آفتاب کے تخلص درج ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ کین نے صفحہ ۱۹۲، صفحہ ۱۹۳ پر دیا ہے۔
[3] سرکار ۳ مارچ ۱۷۸۹ء (سرکار جلد سوم صفحہ ۳۲۹) از عرشی صاحب دسمبر ۱۷۸۸ء ربیع الاول ۱۲۰۳ھ (دیباچہ نادرات شاہی صفحہ ۳) تاریخ قتل لکھی ہے، عرشی صاحب کی تاریخ کسی طرح بھی درست نہیں مفصل حالات کے لئے سرکار جلد سوم اور پرسیول صفحہ ۲۷ تا صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ فرماویں۔

بہ حالت ہو تو رعیت کی تباہی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، ان حالات میں ۱۸۰۳ء میں جنرل لیک کی کمان میں انگریزی فوج دہلی کی طرف آئی، اور رجب ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۰۳ء دلی پر قبضہ ہو گیا۔ مرہٹے[1] ختم ہو گئے اور بادشاہ انگریزوں کے رحم و کرم پر رہ گیا۔ اب بادشاہ کی حکومت سمٹتے سمٹتے صرف لال قلعہ تک رہ گئی، دلی اور آس پاس کے علاقے پر انگریز حکمراں ہوئے، ان حالات کا اندازہ گورنر جنرل کے اس مکتوب سے ہوتا ہے جو اس نے ۲ جون ۱۸۰۵ء کو سیکریٹ کمیٹی کے نام فورٹ ولیم سے لکھا[2]۔ شاہ عالم نے ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ[3] کو وفات پائی۔ اس کے بعد اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ ۲۸ جمادی الآخر ۱۲۵۲ھ کو وفات پائی۔

اکبر شاہ ثانی

ابو ظفر بہادر شاہ (ولادت ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ مطابق ۲۴ اکتوبر ۱۷۷۵ء) تخت نشین ہوا۔ ستمبر ۱۸۵۷ء غدر میں ۷ رمضان ۱۲۷۳ھ معزول ہو کر رنگون میں نظر بند ہوئے اور دہلی سے مغلیہ ۲۸ جمادی الاخر ۱۲۵۲ھ حکومت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

(۹)

اودھ: - فرماں روایان مغلیہ کے زیر سایہ اودھ کی ریاست کی تفصیل یہ ہے کہ پہلا نیم مختار فرماں روا برہان الملک سعادت خاں ہوا۔ اس کا اصل نام میر محمد امین تھا لیکن

---

[1] مرکوزِ رشید جلد چہارم صفحہ ۲۸ تا ۲۴۷ [2] گیبن نے صفحہ ۲۷۴ تا ۲۷۹ پر مفصل بیان دیا ہے جو ان حالات پر روشنی ڈالتا ہے [3] گیبن اپینڈکس III صفحہ ۲۸۹ تا صفحہ ۲۹۰

[3] ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء کو مطابق ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء

خاندان کا پہلا شخص جو ہندوستان آیا، میر محمد نصیر تھا۔ میر محمد نصیر بہادر شاہ کے عہد میں ہندوستان میں وارد ہوا۔ بقول سری واستوا[۱] ۱۱۱۹ھ میں بنگال میں وارد ہوا۔ مرشد قلی خاں نے (جو اس وقت ناظم بنگال تھے) وظیفہ مقرر کر دیا۔

سعادت خاں برہان الملک:- میر محمد امین نے دلی میں ملازمت کی تقریباً جولائی ۱۷۰۸ء میں میر محمد امین سربلند خاں کی طرف سے میر منزل تھا، سربلند خاں اس وقت مانک پور (صوبہ الہ آباد) کا فوجدار تھا۔ یہ عہدہ اُسے عظیم الشان سے ملا۔ عظیم الشان ۷ مارچ ۱۷۱۲ء میں مارا گیا۔ سربلند نے آقا جہاندار شاہ سے صوبۂ دوابہ میں ملا۔ اور مئی ۱۷۱۳ء میں گجرات کا نائب گورنر مقرر ہوا۔ میر محمد امین بھی سربلند خاں کے ہمراہ گجرات پہنچا (نومبر ۱۷۱۲ء) مارچ ۱۷۱۳ء میں دونوں میں اختلاف ہوا۔ میر محمد امین نے ملازمت چھوڑ دی دلی چلا آیا، یہاں آکر تقرب خاں داروغہ شاہی کی وجہ سے فرخ سیر سے تعلق پیدا کر لیا اور نائب کروڑی کے عہدے تک پہنچا۔ لیکن محمد جعفر تقرب خاں کی وفات سے دربار میں اس کا رسوخ کم ہو گیا اور ساڑھے تین سال تک اس کے عہدے میں ترقی نہ ہوئی۔ بعد ازاں فرخ سیر کی وفات کے بعد جب سادات بارہہ کا زور ہوا، اور بالآخر ۲۸ ستمبر ۱۷۱۹ء کو محمد شاہ تخت نشین ہوا تو سادات شاہ گرگے ہاتھوں محمد امین کی شارہ بھی جس کا راسے ہنڈون اور بیانہ کی فوجداری ملی۔ بعد میں سادات سے اس کا بگاڑ ہوا اور وہ مخالف پارٹی سے مل گیا۔ جس نے سازش کر کے حسین علی خاں کو قتل کرا دیا۔ (۸ اکتوبر ۱۷۲۰ء) میر محمد امین خاں کو بھی برسرِ اقتدار پارٹی نے سعادت خاں بہادر کا خطاب اور پنج ہزاری ذات

---

۱ دی فرسٹ ٹو نواب آف اودھ ص ۹ ۲ تفصیل کے لئے دیکھئے راقم کا مقالہ "لکھنؤ کا دبستان شاعری پر ایک نظر" نوائے ادب اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۴۹، ص ۱۵۔ ان کے بیٹے میر محمد امین کے حالات نجم الغنی نے تاریخ اودھ میں جلد اول ص ۲۳ [illegible] لکھنے میں [illegible] کی جائیداد کی [illegible] بعض مورخین نے سعادت السادات کو غلط سمجھ کر بنا لیا ہے تفصیل کے لئے مقالہ [illegible]

و تین ہزار سوار کا عہدہ دیا (۹ اکتوبر) بعد میں ۱۳ ذی الحجہ سنہ ۱۱۳۲ھ (۱۵ اکتوبر سنہ ۱۷۲۰ء)
کو عہدے میں مزید ترقی ہوئی اور صوبہ داری اکبر آباد عطا ہوئی[1]۔ وہاں اس نے اپنا وکیل چھوڑا
اور خود لشکر شاہی کے ہمراہ رہا۔ قطب الملک عبداللہ خاں کی سرکوبی (۱۳ یا ۱۴ نومبر سنہ ۱۷۲۰ء)
کے بعد نومبر سنہ ۱۷۲۰ء ۲۰ نومبر سنہ ۱۱۳۳ھ کو اسے بہادر جنگ کا خطاب اور ماہی مراتب
بھی ملا۔ دو ماہ بعد ۱۷ ربیع الاول سنہ ۱۱۳۳ھ (۱۲ جنوری سنہ ۱۷۲۱ء) اسے دارو غگی خواصان
کا عہدہ ملا۔ فروری سنہ ۱۷۲۱ء میں اسے آگرے جا کر چارج لینے کا حکم ہوا (تقریباً مارچ
سنہ ۱۷۲۱ء) یہاں وہ یکم ستمبر سنہ ۱۷۲۲ء (۲۱ ذی قعدہ سنہ ۱۱۳۴ھ) تک رہا۔ جاٹوں
کی سرکوبی میں ناکام رہا۔ تو ناراض ہو کر شاہ نے اسے بار نہ دیا اور اودھ کا گورنر بنا کر
روانہ کر دیا۔ ۹ ستمبر سنہ ۱۷۲۲ء - ۲۹ ذی قعدہ سنہ ۱۱۳۴ھ) برہان الملک سپاہی پیشہ بھی تھا،
اور شاعر بھی تھا۔ (مادت العادت ص ۳۰ و مقالہ راقم ص ۹۰) سعادت خان برہان الملک
نادری حملے کے فوراً بعد مر گیا (۱۹ مارچ سنہ ۱۷۳۹ء)

صفدر جنگ :- اس کے بعد صفدر جنگ (داماد سعادت خاں) صوبہ دار اودھ مقرر
ہوا اور نومبر سنہ ۱۷۴۳ء کے اواخر میں شاہی حکم سے دلی آ گیا اور ۲۷ نومبر کو محمد شاہ سے ملا۔
۲۱ مارچ سنہ ۱۷۴۸ء کو صوبہ داری مذکورہ بالا کے علاوہ اسے میر آتشی تفویض ہوئی اور وہ
دلی میں رہنے لگا۔ پھر اسے وزارت بھی مل گئی[2]۔ لیکن شیعہ پارٹی کے زوال اور تورانی پارٹی
کے عروج پر اسے دلی چھوڑ کر اودھ کی طرف جانا پڑا۔ نومبر سنہ ۱۷۵۳ء (۲ نومبر سنہ ۱۷۵۳ء)
کو فیض آباد پہنچا اور اپنے صوبے کے انتظام میں لگ گیا۔ ۱۷ ذی الحجہ سنہ ۱۱۶۷ھ کو وفات پائی۔
شجاع الدولہ :- اس کا بیٹا شجاع الدولہ تخت نشین ہوا۔ شجاع الدولہ نے تقریباً سنہ ۱۷۶۱ء

۱؎ بعض مؤرخین نے سنہ ۱۱۳۳ھ لکھا ہے۔ جو غلط ہے۔ ۲؎ تاریخ ہند مرتبہ مصنفہ
مولوی محمد ادریس صفحہ ۱۱۷ ۳؎ تفصیل کے لیے صفحہ [illegible] میں دیکھیے ۴؎ تفصیل اوراق سابق میں دیکھیے۔

میں دارالخلافہ (فیض آباد سے) بدل کر لکھنؤ گیا[1] اور بکسر کی لڑائی تک وہیں رہا۔ بکسر کی لڑائی نے اودھ کی ریاست کو انگریزوں سے ٹکروا دیا تھا۔ شجاع الدولہ نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ لکھنؤ سے فیض آباد اٹھ آیا۔ اور بیرونی فتوحات کی بجائے اندرونی نظم و نسق میں لگ گیا۔ بکسر کی شکست نے اس کی خواہشات کو عارضی طور پر ختم کر دیا، معاہدۂ الہ آباد کی رو سے اس کی سلطنت بحال ہو گئی[2]۔ اگرچہ الہ آباد اور کوڑہ ہاتھ سے نکل گئے۔ باقی ملک پر قناعت کر کے فوجی علاقے کی تنظیم ہی لگ گیا۔ شجاع ۲۲ اگست ۱۷۶۵ء کو اپنی سلطنت میں داخل ہوا۔ ہفتہ بھر انگریزی فوج سے مختلف علاقوں میں چارج لینے میں صرف ہوا، ۲۸ اگست کو لکھنؤ آیا۔ اب ان لوگوں پر عتاب نازل ہوا جنہوں نے کڑے وقت میں شجاع کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ بینی بہادر گرفتار ہوا اور اس کی جائیداد ضبط ہوئی اور آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔ (۲ مارچ ۱۷۶۶ء) بینی بہادر کی جگہ ایلچ خاں نائب مقرر ہوا، اب شجاع الدولہ نے فوج کی تنظیم کی طرف توجہ کی، اور بڑی سرعت سے فوج کی تعداد بڑھانے لگا۔ اس زمانے میں روہیلکھنڈ پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا اور بار ہا انگریزوں کو اس سلسلے میں ہمنوا بنانے کی تدبیر بھی کرتا رہا، ساتھ ہی ساتھ فیض آباد کی آبادی کی طرف بھی متوجہ ہوا (تفاصیل مناسب مقام پر ملاحظہ فرمائیے) اس دوران میں اس کے تعلقات شاہ عالم ثانی سے بھی کشیدہ رہے، کیونکہ یہ اختیار وزیر لینا چاہتے تھے اور شاہ، منیر الدولہ کے زیر اثر اس پر آمادہ نہ تھا، آخر انگریزی دباؤ کی وجہ سے شاہ کو جھکنا پڑا (۳۰ نومبر ۱۷۶۸ء) ادھر انگریز شجاع کی فوجی طاقت سے بھی خائف ہوتے چلے گئے۔ (حالانکہ اس کا کوئی حقیقی سبب نہ تھا) اس بدگمانی کو دور

---

[1] باقی حالات مناسب جگہ پر

[2] اس کے نتائج پر ہم اسی باب میں بحث کر چکے ہیں۔

کرنے کے لئے شجاع الدولہ کو بڑے جتن کرنے پڑے ، اس پر دباؤ بڑھتا گیا اور مجبوراً بنارس میں انگریزی کے سامنے ان کے مطالبات پر اسے جھکنا پڑا[1]۔ چنانچہ ۱۹ رجب ۱۱۸۲ھ (۲۹ نومبر ۱۷۶۸ء) کو معاہدہ بنارس ہو گیا[2]۔ اس کی رو سے یہ طے پایا کہ نواب اور کمپنی دونوں ایک دوسرے کے معین و غمخوار و غمگسار ہو جائیں ، ایک کا دوست ، دوسرے کا دوست ہو ، اور ایک کا دشمن دوسرے کا بھی دشمن ، نواب اپنی فوج کی تعداد صرف پینتیس ہزار کر دیں جس میں دس ہزار سوار ہوں ، دس ہزار پیدل اور پانچ سو توپ خانے والے اور ساڑھے نو ہزار بے قاعدہ جمعیت ، اور اس میں پیدل فوج کی ترتیب اور ہتھیار یورپین ہوں گے[3]۔ اس زمانے میں شاہ عالم کے ساتھ شجاع الدولہ کے تعلقات نہایت اچھے ہیں اور ۱۷۶۹ء اور ۱۷۷۱ء کے درمیان دوستانہ روابط شاہ عالم کے فیض آباد آنے پر کبھی منتج ہوئے ،

۲۲ فروری ۱۷۶۹ء کو شاہ عالم فیض آباد آ کر لال باغ میں ٹھہرا اور ۲۵ کو واپس الٰہ آباد چلا گیا ، اس پر انگریز چوکنے ہو گئے۔ اور شجاع الدولہ کو بنا جھیل کھنڈ کا خیال دل سے نکالنا پڑا ۔ جنوری تا مارچ ۱۷۷۱ء میں جب میر قاسم نے دوبارہ خروج کیا ، انگریز شجاع پر شک کی نظر ڈالنے لگے ۔ جب شاہ عالم نے نجف خاں کو کوڑہ سے برخاست کیا (۲۱ فروری ۱۷۷۱ء) جب بھی اس میں شجاع کا ہاتھ سمجھا گیا۔ اس زمانے میں مرہٹوں نے شمالی ہند کی طرف پیش قدمی شروع کر دی ۔ (اپریل ۱۷۷۱ء) اور شاہ عالم بھی ادھر

---

[1] شجاع الدولہ جلد دوم صفحہ ۱۲۵ تا ۱۲۶ ، ۹ ، ۳۰ ، ۳۱ ، ۵۰ ، ۶۰ ، ۸۷ تا صفحہ ۱۱۱ ، ۲۹۷
[2] نجم الغنی تاریخ اودھ جلد دوم صفحہ ۱۶۳ ، شباب لکھنؤ ، محمد مجتبیٰ علی لکھنؤ صفحہ ۱۲۵ ، شجاع الدولہ جلد دوم صفحہ ۸۶ ، شجاع الدولہ جلد دوم صفحہ ۸۶ ، شباب لکھنؤ صفحہ ۱۳ ، ایک اور تحریر کا

[3] اقرار نامہ کی دو شقیں تھیں باقی ماندہ فوج کو برطرف کر دیا جائے گا اور نئی بھرتی نہ ہوگی اور معاہدہ پر عمل کیا جائے گا - شجاع جلد دوم صفحہ ۹۴ - نجم الغنی جلد دوم صفحہ ۱۶۳ ، ۱۶۴

جانے کی سوچنے لگا، لیکن انگریز شاہ عالم کے مرہٹوں کے ساتھ کسی معاہدے پر پہنچنے
کے راستے میں حائل ہو گئے۔ شجاع الدولہ نے مرہٹوں کو روہیلوں کے خلاف اُکسانا شروع
کر دیا۔ انگریزوں کا ادبہ شجاع الدولہ کے رویے کی وجہ سے خاصا محتاط ہو گیا۔ اور رابرٹ
بارکر (انگریزوں کا نمائندہ) اور شجاع الدولہ کے درمیان بنارس میں مجلس مشاورت ہوئی۔
اس زمانے میں مرہٹے دہلی کی طرف بڑھنے لگے تھے اور دارالخلافہ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ شجاع
الدولہ آمادہ کیا گیا کہ روہیلوں سے صلح کر لے لیکن مرہٹوں کے روہیلکھنڈ سے نکل جانے
کی وجہ سے روہیلے اب شجاع الدولہ سے صلح کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اس لئے معاملہ
رہ گیا۔ دسمبر ۱۷۷۱ء میں جب مرہٹوں اور شاہ عالم میں معاہدہ ہو گیا اور شاہ
عالم ان سے مل گیا۔ تو اب شجاع الدولہ کے لئے بھی معاملات پر غور کا موقع
نکل آیا۔ مرہٹے پھر روہیل کھنڈ میں آ دھمکے۔ ضابطہ خان، حافظ رحمت خان
ایک طرف، اور مرہٹے دوسری طرف تھے۔ شجاع الدولہ آخر مجبور ہو گیا کہ روہیلوں
سے عہد نامہ کر لے چنانچہ انگریزی دباؤ کی وجہ سے ۱۳ جون ۱۷۷۲ء کو
عہد نامہ طے پا گیا۔ اب مرہٹے مجبور تھے کہ روہیل کھنڈ خالی کر دیں
اور انہوں نے عہد نامے کی شرائط کے ضبطِ تحریر میں آنے سے پہلے
خالی کر دیا۔ مرہٹوں نے دوبارہ ادھر توجہ کی، اور رام گھاٹ
کا معرکہ پیش آیا۔ اور روہیل کھنڈ پھر خالی ہو گیا (۲۴ مارچ ۱۷۷۳ء)
اب شجاع اور انگریزوں کے درمیان ۷ ستمبر ۱۷۷۳ء کو بنارس کے مقام

---

۱ شجاع الدولہ جلد دوم ص۱۰۱ (بحوالہ حسینی کا سفرنامہ ص۱۱۰)، ص۱۱۹ ۲ ایضاً ص۱۳۹
۳ ایضاً ص۱۴۳، ۱۷۷۱ء ۴ ایضاً ص۱۴۹ ۔ ص۱۵۰ ۵ ایضاً ص۱۵۶، ۱۵۷
۶ ایضاً ص۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۵ ۔ فروری ۱۷۷۲ء کو بارکر بنارس پہنچا۔ شجاع الدولہ دو دن قبل پہنچ چکا تھا۔
(۷) شجاع الدولہ جلد دوم ص۲۰۱ (۸) ایضاً ص۲۰۳ (۹) ایضاً ص۲۰۴ ۔

پر معاہدہ ہو گیا[1]۔ اس کی دو شرطیں تھیں اول یہ کہ کمپنی نے شجاع الدولہ کے ہاتھ کوڑہ اور الہ آباد کا علاقہ ۵۰ لاکھ روپے کے عوض فروخت کر دیا دوسرے یہ کہ آئندہ جب بھی انگریزی فوج شجاع الدولہ کی امداد کو آئے گی شجاع الدولہ ان کے اخراجات کی کفالت کرے گا[2]۔ اور اس کے لئے ۲۱۰۰۰۰ روپے ماہوار ادا کیا کرے گا۔ معاہدے میں روہیلوں کے خلاف فوج کشی کا ذکر نہ تھا۔ لیکن خفیہ تصفیہ یہ بھی ہوا کہ انگریز روہیل کھنڈ پر حملہ کرکے شجاع الدولہ کو راستہ دیں گے اور اس کے لئے روہیل کھنڈ فتح کر دیں گے بشرطیکہ نواب فوج کشی کے تمام اخراجات برداشت کرے اور چالیس لاکھ روپیہ بھی دے[3]۔ بعض وجوہ سے یہ جملہ عارضی طور پر فریقین کی رضامندی کی وجہ سے تعویق میں ڈال دیا گیا۔ لیکن نومبر ۱۷۷۳ء میں نواب نے روہیلوں کے خلاف جارحانہ اقدام کے لئے مدد مانگ لی اور ۳۰ فروری ۱۷۷۴ء کو پھر تقاضا کیا۔ چنانچہ ۱۷ اپریل ۱۷۷۴ء انگریزی فوج شجاع الدولہ کی امداد کو روانہ ہو گئی[4]۔ یہ شجاع الدولہ کی آخری مہم تھی۔ میران کٹرہ کے مقام پر ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو لڑائی ہوئی[5] اور شجاع الدولہ جیت گیا۔ حافظ رحمت خاں

---

(۱) شجاع الدولہ کی درخواست پر ہیسٹنگز (گورنر جنرل) نے ۱۷۶۸ء کا معاہدہ منسوخ کر دیا اور نواب کی افواج کی تعداد پر جو پابندی تھی اسے دور کر دیا اس کے بعد شجاع الدولہ نے فوج کے اضافے میں پوری کوشش کی ۱۷۷۵ء میں اس کی وفات پر اس کی فوج اور ملازمین فوج کی تعداد ایک لاکھ پچاس ساٹھ ہزار ہو چکی تھی (شجاع الدولہ جلد دوم ص ۳۳۵) (۲) شجاع الدولہ جلد دوم ص ۲۲۱ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد پنجم ص ۲۱۵، ص ۲۱۶، ص ۲۱۹۔ (۳) کیمبرج ہسٹری جلد پنجم ص ۲۱۸ (۴) تفاصیل پہلے درج ہو چکی ہیں۔ مزید تفصیل کے لئے: دیکھئے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد پنجم ص ۲۱۹، ص ۲۲۰

(۵) شجاع الدولہ جلد دوم ص ۲۲۸۔

کی شکست کے بعد روہیلہ فوجوں نے فیض اللہ کو اپنا لیڈر مان لیا۔ اسے بھی لال ڈانگ کی طرف بھاگ جانا پڑا۔[1] شجاع الدولہ نے بریلی اور پیلی بھیت (۲۵) پر بھی قبضہ کر لیا۔[2] ۲۰ اپریل کو شجاع الدولہ بریلی کے لیے روانہ ہوا۔ یہاں سے وہ لال ڈھانگ کی طرف بڑھا۔ ۳۰ ستمبر کو انگریزوں نے فیض اللہ کو ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کر لیا۔ اور ۱۴ اکتوبر کو شجاع الدولہ یہاں سے بسولی اور بسولی سے فیض آباد کی طرف روانہ ہوا اور ۱۵ دسمبر ۱۷۷۴ء کو فیض آباد واپس آ پہنچا۔[3] یہ شجاع الدولہ کی آخری مہم تھی۔ شجاع الدولہ کی وفات اور بیماری کے سلسلے میں اختلافات ہیں۔[4] صحیح رائے یہی ہے کہ ران میں گلٹی نکلنے کی وجہ سے اس کا انتقال ہوا۔[5]

۲۴ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ ہجری صحیح تاریخ وفات ہے۔ سری واستو نے ۲۶ جنوری ۱۷۷۵ء ظاہر کی ہے۔ (ص ۲۸۶) بعض کتابوں میں ۲۲ ذی قعدہ بھی درج ہے۔

عمادت السعادت میں ۲۴ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ رات دو گھڑی گذرے (۱۷۷۵ء) لکھا ہے۔ اور اسی دن دفن کیے گئے یعنی وفات ۲۳ اور ۲۴ ذیقعدہ کی درمیانی رات کو ہوئی۔[6] ہمارے نزدیک منشی فیض بخش کا بیان زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ (تفصیل باب چہارم میں ہے)

آصف الدولہ:۔ شجاع الدولہ کی وفات پر اس کا لڑکا

---

(۱) ایضاً ص ۲۶۱ (۲) ایضاً ص ۲۶۲ (۲) ۱۲ اپریل کو شجاع الدولہ کے پاس حافظ رحمت خاں کے بیٹے آئے اور خود کو اس کے حوالے کر دیا۔ (۳) ایضاً ص ۲۷۱، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۹۔ (۴) تفصیل کے لیے شجاع الدولہ جلد دوم ص ۲۸۶ تا ص ۲۹۳ (۵) ۲۶ جنوری ۱۷۷۵ء کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد پنجم ص ۲۴۳ آخری تاجدار اودھ ص ۱۴ (۶) عرشی حاشیہ وقائع عالم شاہی ص ۱۵۸

آصف الدولہ تخت نشین ہوا(۱)۔ تخت نشینی کے وقت انگریزوں نے حسب عادت
نئے فرمانروا سے نیا معاہدہ کیا۔ کیونکہ ان کو دعویٰ تھا کہ پرانے فرمانروا
کے ساتھ ہی وہ معاہدہ فسخ ہو گیا ہے۔ چنانچہ انگریزوں کے نمائندے
کی مدد سے معاہدہ ہو گیا۔ مشیران وارن ہسٹینگز کے بارے میں لارڈ لش نے
یوں اظہار خیال کیا ہے۔ "نئے کونسلر جب آئے تو ان کی ہمدردیوں کا اندازہ
اس سلوک سے ہو سکتا ہے۔ جو انہوں نے اودھ سے کیا۔ نواب وزیر نے
جنوری ۱۷۷۵ء میں انتقال کیا اور انہوں نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے
اس کے جانشین پر نیا عہد نامہ ٹھونس دیا۔ انگریزی فوجوں کے اخراجات
کے لئے روپیہ بڑھا دیا گیا اور اسے بنارس کا ضلع کمپنی کی تحویل میں دینے
پر مجبور کر دیا۔ ہسٹینگز نے علانیہ اس ناانصافی اور غلط طریقۂ کار کی مخالفت
کی اور کہا کہ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے روایتی دوستانہ تعلقات کے خلاف ہے
لیکن اس کی نہ سنی گئی۔" نیا نواب عیاش تھا۔ اپنی ماں اور دادی کے اثر
سے بچنے کے لئے اس نے مہدی گھاٹ پر ڈیرہ جمایا اور وہاں سے اپنی
والدہ سے قرض روپیہ لے کر اڑاتا رہا۔ اور پھر ۱۱۸۹ھ یا ۱۱۹۰ھ میں
لکھنؤ کو دارالخلافہ قرار دے کر ان کے اثر سے بچنے کے لئے وہاں سے
اٹھ آیا۔ یہاں سے بھی برسٹو کی ضمانت پر روپئے حاصل کئے اور صرف

---

(۱) اس وقت تک (۱۷۷۴ء سے) وارن ہسٹینگز گورنر بنگال کی جگہ گورنر جنرل بن چکا تھا۔
۱۷۷۳ء سے ریگولیٹنگ ایکٹ کے ماتحت اسے تین مشیروں کی جماعت دی گئی تھی۔ ان مشیروں نے
روہیلوں کی لڑائی پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور وارن ہسٹینگز کی مخالفت کی اور ریذیڈنٹ
لکھنؤ مسٹر مڈلٹن کو واپس بلا کر اس کی جگہ برسٹو کو مقرر کر دیا۔ (پی۔ ای۔ رابرٹس برٹش انڈیا

کرتا رہا۔ اس کے اسراف کا یہ عالم تھا کہ اس کے زمانے میں ہجو سنی جاتی تھی جسے
نہ دے مولا، اسے دے آصف الدولہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت چلانے کے لئے بھی
روپیہ نہ رہا۔ انگریزوں سے جو معاہدہ ہوا تھا۔ اس کی رو سے ۵ لاکھ روپے
واجب الادا تھے۔ چنانچہ وارن ہیسٹنگز نے تقاضے شروع کئے۔ کمپنی کی مالی
حالت خراب ہو رہی تھی۔ مرہٹوں کی لڑائیوں نے خزانے کو خالی کر دیا تھا۔
۱۷۷۸ء میں فرانس سے نبرد آزمائی نے روپے کی فوری ضرورت کا احساس دلا
دیا تھا۔ روپیہ کی خاطر وارن ہیسٹنگز نے وہ طوفان کھڑا کیا جو بعد میں اس کے
زوال کا سبب ہو گیا اور پارلیمنٹ کے سامنے اسے جواب دہ ہونا پڑا۔ اس
کے خاص خاص بدنام کرنے والے اقدامات یہ ہیں (۱) راجہ چیت سنگھ کے
خلاف فوج کشی (۲) اودھ پر دباؤ (۳) فیض اللہ خاں پر دباؤ۔

ان میں نمبر ۲ ہمارے موضوع سے متعلق ہے۔ یہ پہلے لکھا جا چکا ہے
کہ بیگمات نے ایک گراں رقم آصف الدولہ کو دی تھی۔ (۲۵۰،۰۰۰ پونڈ) اور
پھر ۱۷۷۵ء میں انگریز ریذیڈنٹ کی ضمانت پر کہ (آئندہ مزید روپے کا مطالبہ
نہ ہوگا) ۳۰،۰۰۰ پونڈ مزید دیئے گئے تھے۔ ۱۷۸۱ء میں جب انگریزوں
نے روپے کا مطالبہ کیا تو اس نے کہا کہ مجھے بیگمات کی جاگیریں ضبط کرنے
اور ان کے خزائن پر قبضہ کرنے کی اجازت دی جائے تو روپیہ ادا کر سکتا
ہوں۔ ہیسٹنگز مان گیا۔ اور بیگمات کی حفاظت سے دستکش ہو گیا۔ اب آصف
ہچکچایا تو انگریز برہم ہوئے (مکتوب ہیسٹنگز دسمبر ۱۷۸۰ء۔ مکتوب دسمبر ۱۷۸۲ء)
آخر کو مڈلٹن کو مستعدی نہ دکھانے پر بدل دیا گیا۔ اور اس کی جگہ دوبارہ
برسٹو ریذیڈنٹ ہوا۔ چنانچہ اب قدم اٹھایا گیا۔ دونوں بیگمات کے خواجہ سرا

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ فرح بخش۔

(جواہر علیخاں اور بہار علی خاں گرفتار ہوئے (جنوری تا دسمبر ۱۷۸۲ء) اور اُن پر بڑے ظلم توڑے گئے۔ دسمبر ۱۷۸۲ء میں روپیہ مل گیا۔ تو انہیں چھوڑا گیا۔ وارن ہسٹنگز فروری ۱۷۸۵ء میں واپس اپنے وطن لوٹا۔ اب کارنوالس نیا گورنر جنرل ہوا۔ آصف الدولہ نے ظلم وستم کی فریاد اور سلطنت کی حالت زار اس کے سامنے کلکتے میں پیش کرائی (امیر الدولہ حیدر بیگ خاں گئے تھے) تو کچھ آسانی ہوئی اور سالانہ رقم کی مقدار کم کر دی گئی حیدر بیگ خاں سے کارنوالس کی ملاقات ۱۵ اپریل ۱۷۸۷ء کو ہوئی۔ کیمبرج ہسٹری میں آصف الدولہ کا مطالبہ بیان ہوا ہے۔[2]

عمارات آصف الدولہ:۔ لیکن حقیقتاً آصف الدولہ کی تخت نشینی اودھ میں جدید دور کا آغاز کرتی ہے۔ فیض آباد کی جگہ لکھنؤ آباد ہوا۔ یہ واقعہ اہم ہے۔ اس کا دوسرا قابلِ غور پہلو یہ ہے۔ کہ فنون لطیفہ کی ترقی اور اودھ کی ثقافتی زندگی کا آغاز بھی یہیں سے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے فرمانرواؤں کو نہ اتنی فرصت تھی نہ زیادہ لگاؤ تھا۔ شجاع الدولہ کے سوا باقی فرمانرواؤں نے محض ہنگامی ضرورتوں اور موسمی شدائد سے بچنے کے لئے گھاس پھونس کے جھپڑوں پر اکتفا کی۔ شجاع الدولہ نے البتہ فیض آباد کو بکسر کی لڑائی کے بعد سنوارنا اور نکھارنا شروع کیا۔ آصف الدولہ نے تخت نشینی کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ فیض آباد کو ویران کر دیا۔ اور لکھنؤ کو ترقی دی۔ دراصل اودھ کی ملک گیری اور بیرونی حکمت عملی، صلح نامہ الہ آباد کے بعد ختم ہو گئی

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے جواہر علیخاں کے حال میں باب چہارم۔ نیز کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد پنجم ص۳۰، ابن (ص) جلد پنجم ص۲۷۱۔

تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مداخلت کی وجہ سے نہ تو اندرون ریاست بغیر مشورے کے کام چلتے تھے۔ نہ فوج بڑھانے کی اجازت تھی۔ علاوہ ازیں بغیر ضرورت فوج کا رکھنا مالی لحاظ سے بھی مفید نہ تھا۔" ایسی صورت میں ان مشاغل سے قدرتاً بے توجہی ہوتی گئی۔ علاوہ اس کے انگریز کا ستارۂ اقبال کچھ اس طرح چمک رہا تھا کہ ہر چہ برانند، درانند۔۔۔۔ انگریزی حکمت عملی سیاسی اور فوجی انضباط نے سب کو پیس ڈالا۔ بہرحال شجاع الدولہ کی نصیحت پر کاربند ہونا ہی بہتر تھا۔ از صاحبان انگریز در ہیچ وقت خلاف نخواہند کرد۔ (چشمۂ فیض مصنفہ فیض بخش) لہٰذا آصف الدولہ کے زمانے سے تاجداران اودھ کا سب سے بڑا مشغلہ لکھنؤ کی ترقی، عمارات کی تعمیر اور فنون لطیفہ کا مذاقِ سلیم رہا۔ اس کے علاوہ آصف الدولہ شاعر بھی تھا، اور میر سوز سے اصلاح لیتا تھا۔ اسی وجہ سے فنون لطیفہ سے اُسے دلچسپی رہی۔ کتابوں کے مطالعہ کا بھی شوق تھا جیسا کہ شاہ کمال نے مجمع الانتخاب کے دیباچے میں کہا ہے کہ آصف الدولہ نے بلا کر مجھ سے اردو اساتذہ کے دواوین لے کر نقل کرائے اُس دور کے بڑے بڑے شعرا اور ادبا کے مربی امرا نظر آتے ہیں۔ (۱) سالار جنگ (۲) نواب محبت خاں (۳) نواب خاں عالم خاں (۴) نواب شوکت جنگ سوزاں (۵) راجہ شکیت رائے (۶) جواہر علی شاں (۷) حسن رضا خاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ریذیڈنٹ کی مداخلت سے آصف الدولہ کی زندگی دوبھر ہو گئی تھی۔ جس کا رکن سے آصف الدولہ راضی ہوتا وہ ریذیڈنٹ کی نظر میں نالائق ٹھہرتا اور اُس کی برطرفی کا مطالبہ

---

(۱) آخری تاجدار اودھ۔ مصنفہ محمد تقی احمد ص۷، ص۸

ہوتا۔ اور جو خائن اور سازشی نائب ہوتا اُس کو آصف الدولہ اگر نکالنا چاہتا تو ریذیڈنٹ مخالفت کرتا۔ اس روحانی اذیت سے اُسے اپنی زندگی سے بھی دلچسپی نہ رہی۔ ملک کا انتظام بھی بگڑتا چلا گیا۔ صفر ۱۲۱۲ھ مطابق اگست ۱۷۹۷ء آصف الدولہ نے وفات پائی۔ اس کا امام باڑہ اودھ کی بہترین عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔

وزیر علی خاں آصف الدولہ کا متبنیٰ تھا۔ آصف الدولہ کے مرنے کے بعد اُس کی دادی اور ماں سے رائے لی گئی۔ اُنہوں نے وزیر علی خاں کی تائید کی۔ چنانچہ وزیر علی خاں تخت نشین ہو گیا۔ اس نے تخت نشینی کے بعد انتظام سلطنت میں دخل لیا۔ جو ریذیڈنٹ کو ناگوار ہوا۔ فوجوں کی دشمنی میں دلچسپی لیتا تھا اور یہ بات قابلِ گرفت تھی۔ اس لئے ریذیڈنٹ نے اُس کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا۔ عوام اُس سے مطمئن تھے۔ لیکن انگریزوں نے سعادت علیخاں سے نئے معاہدہ کی کوشش کی اور نصف سلطنت ضبط کرکے بقیہ اودھ کا تاجدار سعادت علیخاں (معاہدہ ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء) ہوا۔ وزیر علیخاں معزول کیا گیا۔ جرأت نے وزیر علیخاں کی معزولی پر ایک قطعہ لکھا ہے۔ جس میں اس کی اہلیت کی تعریف کی گئی ہے اور معزولی پر اظہارِ افسوس کیا گیا ہے[۱] سعادت علیخاں کے دورِ حکومت کے آخر تک انگریز بجائے خود اودھ کے معاملات میں پوری طرح دخیل ہو گئے اور ۱۷۹۹ء میں "مسٹر بیگ" کی سرکردگی میں زماں شاہ (افغانستان) کے حملے کے تدارک میں ۲۰۰۰۰ ہزار فوج اودھ میں ڈال دی اور پچاس لاکھ روپیہ کا مزید

---

(۱) کلیاتِ جرأت

مطالبہ نواب پر زبردستی ٹھونس دیا گیا۔ (کیمبرج ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۳۵۱)
نواب وزیر بیچ وتاب کھا کر رہ گیا۔ اودھ کے اندرونی انتظام میں بھی دخل
دیا گیا۔ آخر سعادت علی خاں نے دست برداری (۱۲ نومبر ۱۷۹۹ء) کا ارادہ
کیا اور جب انگریز آمادہ ہوئے تو رائے بدل دی۔ نیا گورنر جنرل ویلزلی صورت
حال سے برہم ہوا۔ ۹ فروری ۱۸۰۰ء کو فورٹ ولیم سے نواب وزیر کو خط
لکھا جس میں تفصیل سے ہر معاملہ پر روشنی ڈالی گئی۔ ۲۲ جنوری ۱۸۰۱ء
کو مزید دباؤ پڑا۔ ۱۰ نومبر ۱۸۰۱ء میں معاہدہ ہو گیا۔ جس کی رو سے اضلاع
روہیل کھنڈ۔ فرخ آباد، مین پوری، اٹاوہ، کانپور، فتح گڑھ، الہ آباد،
اعظم گڑھ، بستی اور گورکھپور کمپنی کے قبضے میں چلے گئے۔ ویلزلی کے
سب سڈیری سسٹم کا وار اودھ پر پڑ گیا۔ اور امدادی فوج کے اخراجات
کے نام پر علاقائی قبضہ مکمل ہو گیا۔[1] سعادت علی خاں نے ۴ رجب
۱۲۲۹ھ دوشنبہ کے دن مطابق ۱۲ جولائی ۱۸۱۴ء وفات پائی۔ غالباً
زہر دیا گیا تھا۔ ان کے بعد غازی الدین حیدر حکمراں ہوئے۔ ۱۰ ذی الحجہ
۱۲۳۳ھ ہجری کو کمپنی کی اجازت سے شاہ کا لقب اختیار کیا۔ شاہ دہلی
کے نام کا اثر اودھ سے اٹھ گیا۔ غازی الدین حیدر اپنے آپ کو بادشاہ
سمجھتا تھا۔ لیکن دراصل ہر معمولی سے معمولی بات کی اجازت بھی اسے
لارڈ ہیسٹنگز گورنر جنرل سے لینی پڑتی تھی۔[2] غازی الدین نے ۲۷ ربیع الاول
۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸ اکتوبر ۱۸۲۷ء انتقال کیا۔[3] نصیر الدین حیدر تخت نشین

---

(۱) کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد پنجم صفحہ ۳۲۳، صفحہ ۳۵۲ (۲) مفتی خلیل الدین کا قلمی
مکتوب اس واقعہ کی شہادت دیتا ہے۔ آخری تاجدار اودھ صفحہ ۲۹ (۳) ایضاً۔

ہوا۔ اُس نے ۲۸ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ مطابق ۸ جولائی ۱۸۳۷ء دفات پائی۔
بیگم غازی الدین حیدر نے انگریزوں کی مرضی کے خلاف منا جان کو
تخت نشین کیا۔ ریذیڈنٹ نے فوجی قوت کے ذریعہ اُسے گرفتار کر لیا۔ (۱۵ اکتوبر
۱۸۳۷ء مطابق ۲ رجب ۱۲۵۳ھ) ۲۸ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ کو محمد علی شاہ کے
لقب سے سرکاری طور پر محمد علی شاہ (نصیر الدولہ سعادت علیخاں) جانشین
ہوا۔ ۵ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۶ مئی ۱۸۴۲ء وفات پائی۔
امجد علی تخت نشین ہوا۔ یہ یکم فروری ۱۸۴۷ء کو بیمار ہوا اور ۱۳ فروری
۱۸۴۷ء کو (مطابق ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ) وفات پائی۔ اب واجد علی شاہ
کی نوبت آئی۔ ان کا دور دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ امین الدولہ کا دور ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ سے ۱۹ رجب ۱۲۶۳ھ تک
۱۳ فروری ۱۸۴۷ء " ۹ جولائی ۱۸۴۷ء تک

(۲) علی نقی خاں کا دور ۲۲ شعبان ۱۲۶۳ھ سے ۲۹ جمادی الاول ۱۲۷۲ھ تک
۱۵ اگست ۱۸۴۷ء سے ۷ فروری ۱۸۵۶ء تک

اس کے زمانے کے بارے میں انگریز مورخین نے عام طور پر مبالغہ سے
کام لیا ہے۔ یہ اتنا برا نہ تھا۔ جتنا انگریزی سیاست نے بنا دیا ہے۔
سیلی اودھ کے سلسلہ میں کمپنی نے جو کتاب شائع کی۔ اُس کا جواب واجد علی
شاہ نے ہلوبک کے نام سے دیا ہے اور تمام الزامات کی تفصیل سے
تردید کی ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ انگریزی علاقے سے اُس کے علاقہ کا
انتظام بہتر ہے۔ (ملاحظہ ہو جواب، بلوبک، منجانب واجد علی شاہ) اس کے
علاوہ دورِ حاضرہ کی کتابوں میں محمد تقی احمد کی کتاب آخری تاجدار
اودھ ان الزامات کو غلط ثابت کرتی ہے۔ واجد علی شاہ معزول ہو کر مٹیا برج
کلکتہ میں نظر بند ہوئے اور وہیں ۱۳۰۵ھ میں وفات پائی۔

باب دوم

خاندان اور معاصرین

(۱)

خاندان: میر حسن اپنے خاندان کے بارے میں راوی ہیں:-

"امّا بعد بر سخنورانِ شاطر و دانشورانِ ماہر (مخفی نماند)[۱] کہ اصل این مؤلف ابن میر غلام حسین ابن میر عزیز اللہ[۲] ابن میر برات اللہ ابن میر امامی موسوی از شاہجہان آباد[۳] است کہ میر امامی موسوی در وقت شاہجہان بادشاہ از ہرات آمدہ منصب سہ ہزاری ذات بین الاقران ممتاز گردیدند۔ فاضلِ متبحر و فقیہ بے ہمال بودند۔ گاہ گاہ بجہتِ تفریحِ طبع فکرِ شعر ہم می نمودند کہ از کارِ معاد فرصت بے فائدہ گوئی نمی بخشید۔ چنیں ایں عاجز بسخن از سررشتۂ شاعری اجدادی ست نہ امروزی و قبلہ گاہی[۴] سلمہ اللہ ہم با ایں ہمہ ندرتِ علم چوں طبائع سامعاں را در سخن بلند نیافتند بقدرِ حوصلہ

(۱) مالی گرد قلمی میں نہیں ہے۔ واقعات انیس (حصہ ۲) سے اضافہ کیا (۲) گارساں دتاسی نے تاریخ ادب ہندوستانی طبع ثانی (بزبان فرانسیسی) جلد دوم صفحہ ۲۲۲ پر حاشیہ ۱۲ [illegible] انکے والد کا نام عزیز عبداللہ دیا ہے جو کسی طرح درست نہیں (۳) مالی گرد قلمی میں "شاہجہاں آباد" تصحیح بیاضِ فائق اور واقعات انیس سے کی گئی ہے۔ (۴) قیاسی تصحیح۔

آں (ہا) بطرفِ ہزل توسنِ قلم راندند بحکم آں کہ ہرگاہ کہ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز (دیباچۂ دیوانِ حسن مائی کردہ قلم صفحہ ۲۴۳)

تذکرہ شعرائے اردو میں لکھتے ہیں۔

اما بعد ایں بپا دردہ آغوشِ رنج و محن، یامیرِ دار الحزن، میر غلام حسن ابن میر غلام حسین بن میر عزیز اللہ را تمنائے آں شد کہ ... ...
(دیباچۂ تذکرہ صفحہ ۲)

پوشیدہ نماند کہ اصلِ ایں فقیر ابن غلام حسین ولد میر عزیز اللہ بن امیر امانی ہروی ست، میر امامی نور اللہ مرقدہٗ بصفتِ علم و فاضلِ متبحر بودند۔ بسبب فضیلت در شاہجہاں آباد آمدہ بین الاقران ممتاز گردیدند۔ گاہ گاہ شعرہم می فرمودند پس ایں عاجز سخن را سر رشتۂ شاعری اجدادی است نہ امروزی (ایضاً صفحہ ۵۳)

باپ کے حال ایں تذکرے میں لکھتے ہیں:۔

مولانا میر غلام حسین المتخلص بہ ضاحک ابن میر عزیز اللہ والد ایں فقیرِ مولف۔ از سادات عالی شانِ سپہر مکان، عالم و فاضل، ناشر و ناظم بہ غایت فہیم۔ ہزل دوست۔ مزاح پسند۔ بذلہ گو۔ نکتہ سنج، درویش مزاج، متوکل۔ از سی سال ترکِ روزگار نمودہ بہ کمال بے پروائی بہ سرمی برند۔ در فہمیدہ عالم موسیقی گوش شنوا، ذہن رسا، و فکر رسا۔ باوجود قوت آں علم کہ در ہیچ مولوی ساجد بہ کار بردہ اند چوں طبایع سامعاں را در نحو سخن بلند نیافتند بہ نحو خوشطبعی آں ہا بہ طرف ہزل توسن قلم راندند لیکن زبانِ عجیب و غریب اختیار کردہ اند کہ از آدم تا ایں دم کسے نہ گفتہ۔ چنانچہ

ازاں جملہ یک مطلع ترقیم می نماید۔ مشتے از خروارے (ایضاً ص ۱۰۲)

شجرہ:- حسن کے بیانات کی روشنی میں شجرہ یہ ہے :-

میر امامی[1]

میر برات اللہ

میر ضاحک

میر حسن

میر امامی:- ان کے بارے میں حسن ہمارے ماخذ ہیں لیکن جتنا اہم انہوں نے شاہجہانی دور میں انہیں دکھایا ہے۔ اتنے نظر نہیں آتے۔[2] باوجود تلاش کے (میر حسن اور ان کے مقلدین نے جو کچھ تحریر کیا ہے

---

[1] میر حسن اور ان کے خاندان کے شجرہ اصل (دیباچہ رموز العارفین ص ۶) میں برات اللہ نہیں ہے۔

[2] نشترِ عشق (قلمی، شیرانی کلیکشن) ورق ۷۴ ب و ۷۸ (پہ میر امانی کا ذکر کر کے لکھا ہے "بہ ہندوستان آمدہ بعہد اکبری و بسنۂ نہصد و ہشتاد و یک بہ جونپور در رسید۔ و دو انیدن اسپ از خانہ زین بر روئے زمین افتادہ امانتِ جان بجان آفرین سپرد" مخزن الغرائب (احمد علی سندیلوی) (قلمی شیرانی کلیکشن) میں ورق ۴۲ ب پر میر امانی ہروی اور ورق ۲۶ الف پر میر امانی کابلی کا ذکر کیا ہے۔ کابلی کے حال میں لکھا ہے کہ در جونپور از اسپ افتادہ زیر آب و گِل در گذشت ۔ ۔ ۔ شاید کہ این ہر دو شاعر یکے باشند از غلطی برائی نوشتہ اند۔ اما صحیح تر در کابلی بودن است کہ نسبت برادر کہ شیخ عبدالقادر او را دیدہ و اشعارش در بداونی (؟) ثبت نمودہ (ورق ۲۷ الف) امانی اکبری دور میں ہندوستان آیا، میر حسن کے مورث اعلیٰ شاہجہانی عہد میں آئے۔ اس لیے ہمارے خیال میں امانی ہروی اور امانی کو ایک سمجھنا درست نہ ہوگا۔

اس سے قطع نظر) مجھے میر امانی سے متعلق ایک حرف بھی کہیں نہیں
ملا۔ عہد شاہجہان کی تاریخوں میں (شاہجہاں نامہ معتمد خاں وغیرہ اور
عمل صالح) منصبداران عہد کی طویل فہرستیں دی ہیں۔ مگر ان
میں میر امانی کا نام نہیں۔ بخوبی ممکن ہے کہ ان کے فضل و کمال اور
ان کی سماجی حیثیت کے باب میں میر حسن نے مبالغے سے کام لیا ہو۔
ایک امکان یہ بھی ہے کہ یہ میر امانی نہیں بلکہ میر امانیؔ ہوں جن
کا ترجمہ تذکرۂ اور حمدی وغیرہ میں ہے[1]۔

شاہجہانی دور کی تاریخوں اور تذکرہ نویسوں کے حالات کی ورق گردانی
کی گئی لیکن بے نتیجہ۔ یہ ممکن نہیں کہ اتنا اہم شخص (سہ ہزاری ذات جسے شاہ
وقت نے اتنا بڑا اعزاز دے رکھا ہو کہ اس کا رتبہ صرف تنخواہ کے لیے ہو اور سوار دں
کے التزام کا بوجھ بھی اس پر نہ ہو) معاصر تاریخیں یوں نظر انداز کر دیں۔ "مغلیہ
منصبداری نظام میں ایسے لوگ خاص خاص ہوتے ہیں جو صرف ذات رکھتے
ہوں اور سوار کے رتبے سے خالی ہوں"[1]۔

بظاہر میر حسن نے مبالغے سے کام لیا ہے۔ غالباً امانی نہ اتنے بڑے کاتب
تھے نہ اتنے بڑے منصبدار۔

ایک بیان :- آزاد نے آبِ حیات کی تالیف کے سلسلے ہی بعض افراد سے
خط و کتابت کی تھی اور اس مواد کو آبِ حیات میں استعمال کیا ہے۔ حسن اتفاق سے
ان خطوط کا پلندہ ڈاکٹر محمد صادق صاحب کو مل گیا ہے۔ اس میں دو خط
خاندان حسن کے بارے میں ہیں۔ مکتوب نویس (شاید فراغ) ایک خط میں خاندانِ

---

[1] Mansabdari System and Mughal-army. (Abdul Aziz)

[2] میر ضاحک (قاضی عبدالودود ص۱۲۵) فرط ملاحظہ ہو

سے کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

ان کے مورث جو دہلی میں نیشاپور یا خراسان سے آئے ان کے دہلی میں آنے کا یہ سبب ہوا کہ بادشاہِ دہلی جو فیل پہ سوار ہوتے تھے جو آگے بیٹھنے والا فیل بان بادشاہی ایک شخص معزز و محترم سید شریف الطرفین چاہیئے تھا تاکہ بادشاہ کی طرف پشت کر کے بیٹھے اور ایسا شخص بجز سید نجیب کے دوسرا ممکن نہ تھا۔ اس لئے ساداتِ صحیح النسب کی تلاش ہوئی تو ولایت سے طلبی مورث میر ضاحک کی ہوئی اور عہدہ فیل بانی و شاہی پر مشاہرہ بیش قرار و جاگیر وغیرہ پر تقرری ان کی ہوئی ۔

(بشکریہ ڈاکٹر محمد صادق صاحب)

یہ بیان دوسرے بیانات کے سلسلے میں قابلِ غور ہے۔ اگرچہ اس کے اندراجات پر تمام و کمال بھروسا کرنا ممکن نہیں ۔

دوسرا بیان :- میر شیر علی افسوس اپنے دیباچۂ سحرالبیان میں راقم ہیں :-

یہ چند سطریں مصنف (میر حسن) کے حسب و نسب اور احوال میں ہیں :-

مصنف اس کا میر حسن دہلوی متخلص بہ حسن خلف میر غلام حسین ضاحک کا وطنِ اجداد شہر ہرات۔ قوم سادات گردشِ فلکی سے انہوں نے شہر مذکور کو چھوڑا اور دِلی میں آکر پرانے شہر کا رہنا اختیار کیا۔ وہیں یہ بزرگ پیدا ہوا۔ بلکہ سنِ تمیز کو پہنچا۔ دادا اس عالی قدر کا سنتے ہیں کہ حاجی دی حسل تھا۔ لیکن باپ کو نضیلت نہ تھی مگر طالب علمی میں شرحِ ملا تک پڑھا تھا۔ ہم فارسی میں استعداد اچھی تھی بلکہ شعر بھی متین و رنگین گاہے گاہے اس زبان میں کہتا تھا . . . . قصیدہ بھی ایک آدھ اس مغفور کا رتبہ دار دیکھا ہے۔ لیکن ہزل پر از بسکہ مزاج مرغوب

تھا۔ غزل گوئی ترک کی تھی۔ قبایت ہنوز اور بھٹول تھا تخلص اس کا اس پر دال ہے۔ پر بظاہر نہایت ثقہ اور متشرع[۱] ....

لیکن ان ہی مسودے میں افسوس کا بیان مختلف تھا:۔

مصنف سحر البیان میر حسن خلف میر غلام حسین صاحب (ضاحک)
وطن اجداد شہر ہرات قوم سادات اور دادا اس عالی قدر کا فاضل متبحر اور فقیہ بے مثال تھا۔ باپ کو بھی فضیلت تھی۔ لیکن فارسی کی استعداد خوب ہے بلکہ شعر بھی رنگین کا ہے گا ہے اس زبان میں کہتا تھا ...... قصیدہ بھی ایک اور مغفور کا تہ دار دیکھا ہے لیکن ہزل پرداز بسکہ مزاج مرغوب تھا تخلص اس کا اس پہ دال ہے پر بظاہر نہایت ثقہ اور متشرع[۱]۔

اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ پہلے مسودے میں افسوس حسن کے دیباچے سے دھوکا کھا رہے تھے۔ حسن نے امامی کا ذکر کیا ہے افسوس نے حسن کے دادا کے نام میں امامی کی خصوصیات درج کر دی ہیں اور بعد میں اپنے بیان میں ترمیم کر کے قابل اشاعت بنایا ہے۔

حسن کا ایک اور بیان:۔ میر ابوالحسن کے حال میں حسن لکھتے ہیں :۔
از اولادِ بندہ نواز گیسو دراز چوں قبلہ گاہ ایں فقیر از بنیرہ ہائے بندہ نواز اند بنا بریں یک رشتۂ داری ماہم باوے ست[۳]۔

اس سے زیادہ اس کے آبا کے بارے میں ہمارے پاس کوئی اطلاع نہیں۔

---

[۱] (دیباچہ مثنویات مرتبہ آسی صد ۱۶) [۲] مائکروفلم برٹش میوزیم)
[۳] (تذکرہ شعرائے اردو صد ۲۲)

(۲)

ضاحک:۔ قاضی عبدالودود صاحب نے میر ضاحک پر مقالہ لکھ کر تمام معلوم ماخذسے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ ضاحک کے سفر لکھنؤ اور ہجویات کے بارے میں ہمارے نتائج قاضی صاحب سے قدرے مختلف ہیں۔

پیدائش: سفینۂ ہندی کے مؤلف (بھگوان داس) حسن اور ضاحک دونوں سے تعلقات رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنا "تذکرہ" پندرھویں صدی کے دوسرے عشرہ میں لکھا۔ ضاحک کے بارے میں کہتے ہیں۔

"میر غلام حسین دہلوی سید و فقیر و بخدلی بے نظیر بود و ہندی اشعار ضحک آمیزی گفت برائے ہمیں ضاحک تخلص می کرد۔ طرزے کہ او اختیار کردہ ازو ادر بود۔ اکثر بملاقات راقم می آمد۔ عمرش بہ شصت سال رسیدہ بود۔ طبع جواں داشت گاہے شعر فارسی می گفت ازاوست"[۱]......

وفات کے وقت ضاحک کی عمر ساٹھ سال بیان کی گئی ہے۔ گلزار ابراہیم میں ہے۔

ضاحک دہلوی میر غلام حسین والد میر حسن تذکرہ نویس در ہزالی و زبذلہ گوئی استاد و در فہم موسیقی منا سبتے دارد الحال کہ سال یک ہزار وصد و نود و ششش ہجری باشد شنیدہ شد در فیض آباد بہ آوارگی می گذارند[۲]

محمود فاروقی کا خیال ہے کہ یہاں "ششش" کی جگہ "دو" ہونا چاہیئے۔ لیکن مجھے اسے غلط قرار دینے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ گلزار کے بیان کے مطابق ۱۱۹۶ھ

---

[۱] (ورق ۱۰۷ ب و ۱۰۷ الف (نسخہ بانکی پور پٹنہ۔ اقتباس بشکریہ قاضی عبدالودود صاحب)
[۲] مکتوب بنام آزاد شخص نامعلوم نے ان کا نام میرزا ہدا لمتخلص بہ ضاحک دیا ہے جو کسی طرح درست نہیں ہے (صفحہ ۱۷۲) [۳] میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعرا، ص ۲۴

تک ضاحک زندہ تھے اور فیض آباد ہی میں قیام رکھتے تھے۔ صاحب سفینۂ ہندی ان کی وفات کے وقت عمر ۶۰ سال بیان کرتا ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ ضاحک اس سال یا ذرا بعد وفات پا گئے۔ مصحفی ۱۱۹۸ھ میں لکھنؤ آئے اور میر حسن سے ان کے دوستانہ روابط تھے۔ تذکرۂ ہندی میں وہ ضاحک کا ذکر نہیں کرتے البتہ ریاض الفصحا میں ضاحک کا حال دیا ہے۔ شوق نے بھی طبقات الشعرا (نظر ثانی ۱۲۰۵ھ) میں اس کا ذکر بطور مرحوم کے کیا ہے۔ آزاد نے دو روایتیں بیان کی ہیں۔ ایک کی رو سے ضاحک ۱۱۹۵ھ (تاریخ وفاتِ سودا) سے قبل وفات پا چکے تھے دوسری روایت کے مطابق بقولِ گلزار ۱۱۹۶ھ تک زندہ تھے[۲] محمود فاروقی ۱۱۹۲ھ میں انہیں زندہ اور وفاتِ سودا سے قبل انہیں مردہ تسلیم کرتے ہیں[۳]۔ ضاحک اگر وفات کے وقت ۶۰ سال کے تھے اور انہوں نے ۱۱۹۶ھ کو وفات پائی تو پیدائش ۱۱۳۶ھ کے قریب ہوگی۔ نصیر حسین خیال دواماسی کے حوالے سے تاریخ پیدائش ۱۱۱۸ھ اور تاریخ وفات ۱۱۹۸ھ دیتے ہیں[۴]۔ لیکن جیسا کہ قاضی عبدالودود صاحب نے بتایا ہے دواماسی کے ہاں یہ سنۂ پیدائش موجود نہیں[۵]۔ بہرحال ضاحک بعہد محمد شاہ ۱۱۳۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔

ملازمت :- نصیر حسین خیال[۶] اور ان کی تقلید میں مرزا علی حسن[۷] عمدۃ الملک امیر خاں انجام کی سرکار سے ضاحک کا تعلق بتاتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ دریائے لطافت (انشا) کی اشاعت کے بعد نواب خیال نے عماد الملک کو (جس کا مفصل ذکر دریائے لطافت میں ہے) عمدۃ الملک بنا کر تخیل کا ایک

---

[۱] آب حیات ص... [۲] میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعرا ص۱۱... [۳] داستان اردو صفحہ[؟] [۴] مکتوب ضاحک۔ قاضی عبدالودود ص۱۲۰ [۵] داستان اردو ص۱۲۷ [۶] ص۱۲۰ [۷] دیوان غزلیات غیر مطبوعہ ص۹

طلسم کھڑا کیا ہے۔[1] عمدۃ الملک امیر خانِ ثانی کے متوسلین میں بھی شعرا و ادبا تھے۔[2] لیکن بغیر کسی ثبوت کے خاندانِ ضاحک کا تعلق درست نہ ہوگا[3] اور ہم ا خیال کے دماغ کی اختراع ہی سمجھیں گے تصویرِ گردش کا ایک اور پہلو بھی ہو سکتا ہے۔

تذکرہ جلوۂ خضر (جلد اوّل) میں ہر دور کو الگ کمیٹی قرار دے کر ادبا کے لیے عہدے مخصوص کیے گئے ہیں۔ کمیٹی ششم کی تفصیل یوں دی گئی ہے "اس کمیٹی میں بھی چیئرمین دلی دکھنی اور وائس چیئرمین میر ضاحک سیکرٹری میر حسن انڈر سیکرٹری میر مستحسن خلیق۔ ممبرانِ کمیٹی میر حسن کے شاگرد احتر، عاشق باقی ممبر اور شعرا ان کے شاگرد ہیں۔"[4]

ترکِ دہلی:- ضاحک اور حسن نے ایک ساتھ دہلی چھوڑ دی (دیباچہ افسوس) حسن کے ترکِ دہلی کا سنہ ہم نے اندازاً محرم ۱۱۷۹ھ قائم کیا ہے۔ ضاحک بھی اسی وقت دہلی سے لکھنؤ گئے ہوں گے۔ مجھے قاضی صاحب کے اس بیان سے اختلاف ہے کہ میر حسن نے غالباً حملۂ درانی کے بعد[5] دہلی کو چھوڑا۔ ترکِ دہلی جیسا کہ اگلے باب میں مفصل بحث ہوگی ۱۱۷۹ھ کے لگ بھگ ہوئی۔

فیض آباد۔ فیض آباد میں آکر ضاحک نے کسی کی ملازمت نہیں کی۔ میر حسن کے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱۸۹ھ کے قریب انہیں ملازمت اور توسّل ترک کیے ہوئے تیس سال ہو چکے تھے۔[6] اسی تیس سال کو تیس پینتیس سال بتاتے ہیں (تذکرۂ خندہ گل ص ۲۰۲)

۱۔ قاضی عبدالودود ص ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۵ ۲۔ معاصر جلد اول ص ۱۳۴ ۳۔ میر حسن نے اپنے والد کے حال میں تیس سال سے گوشہ نشینی کا ذکر کیا ہے۔ اگر تالیفِ تذکرہ کی ابتدا کے وقت ہی یہ حال رقم ہوا ہو تو ملازمت امیر خاں کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ امیر خاں کی اصل اہمیت حملۂ نادری کے بعد ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) سے شروع ہوتی ہے (معاصر جلد اول ص ۲۰۰)۔ اگر یہ حال تکمیلِ تذکرہ کے وقت لکھا گیا تو ۱۱۵۹ھ سے گوشہ نشینی کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی طرح ۱۱۵۲ھ اور جمادی الاول ۱۱۵۳ھ (۲۷ فروری ۱۷۴۰ء) سے قبل انجام گورنری الہ آباد ہوا کے درمیان اور شعبان ۱۱۵۶ھ واپسی دہلی ۵ نومبر ۱۷۴۳ء) اور ذوالحجہ ۱۱۵۹ھ قتل کے مابین ایسا ممکن ہے لیکن کسی ثبوت کے بغیر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ۴۔ جلوۂ خضر ص ۲۸۔ ۵۔ تفصیل باب سوم میں۔ ۶۔ یہ نکتہ بات سے معلوم ہوا کہ "بعد" سے فوراً "بعد" مراد لی ہے۔ ۷۔ تفصیل کے لیے میر ضاحک، قاضی عبدالودود ص ۱۴۱، ۱۴۲

لیکن یہ ان کی بے احتیاطی ہے حالانکہ انہوں نے تمام وکمال حسن کے بیان کا بعض جگہ ترجمہ اور بعض جگہ خلاصہ پیش کیا ہے۔

سودا اور ضاحک :- اپنے معاصرین کے ساتھ میر ضاحک کے کیسے تعلقات تھے، اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ میر انشاء اللہ مصدر سے دوستانہ نہ تھا اور ان کے بیٹے انشاء سے "دوستی دلی رکھتے تھے"۔ باقی بزرگوں میں معاف کسی کو نہیں گیا۔ قطع نظر ان قصوں کے جو سودا اور ضاحک کے ابتدائی جھگڑے کے بارے میں میر حسن کے دور العد کے زمانے سے تذکروں کا موضوع بنے ہیں (اور جن کی مفصل روداد قاضی صاحب نے اپنے محولہ بالا مقالے میں دی ہے) سودا کی ہجویات اور کلیاتِ حسن کی بعض چیزیں اس پر کچھ روشنی ڈالتی ہیں۔ ہم صرف انہی کی مدد سے "مکابرے" کے خد و خال اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن پہلے خاندانِ ضاحک کے بارے میں بعض اہم اطلاعات پیش کی جاتی ہیں جن کا واحد ماخذ ہجویات سودا ہیں (اس میں مبالغے کا امکان ہے لیکن تمام وکمال افترا ہونا اسے تسلیم نہیں کیا جاسکتا)

حالاتِ ضاحک :- ضاحک اور سودا "صورت آشنا"[1] ہیں گہرے دوست نہیں[2]۔ ضاحک حریص ہے[3] اور بواسیر میں مبتلا ہے[4]۔ دیپک راگ اور جیون خاں کو موسیقی میں خاطر نہیں لاتا - گانے کا شوقین ہے لیکن آواز باریک ہے۔ بیدکھلا تا ہے۔ والد غالباً دق میں مبتلا ہوئے اور ان کے لئے گدھی کا دودھ تجویز ہوا۔ اپنے "ریزہ چینیوں" کی ہجو کرتا ہے (ایضاً) اور انہیں ماں بہن کی گالیاں دیتا ہے[5]۔ ہجو[6] (ضاحک کی اہلیہ نے) سے معلوم ہوتا ہے۔ ضاحک پورب میں غریب الوطن[7] ہے۔

[1] کلیات سودا جلد اول ص ۳۲۲ (ایضاً ص ۳۴۳) (کلیات جلد اول ص ۳۴۲) (ایضاً ص ۳۴۳) (ص ۳۴۷) (ص ۳۳۶) (ص ۳۳۶) (ایضاً) [7] ہجو در نسخہ خطی دیوانِ سودا مملوکہ ابواللیث صدیقی)

دوسروں کی دو لڑکیاں لے کر پالی ہیں ان کے بعد آجکل بھی ایک لڑکی پال رکھی ہے جس کی عمر دس برس ہے نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ضاحک کی اہلیہ بوڑھی ہو چکی ہے (بوڑھے چونڈے کو جب ہلایا) تیسری ہجو (مچھندر سکندر) سے معلوم ہوتا ہے ضاحک بے روزگار ہیں۔ بنگلے میں قیام ہے گانے کے علم میں ادھورا ہے (اپنی لونڈی کوئی نہیں ہے (کوئی بیٹی مجھے اچھی سی تو نے بھی نہ جن دی) ان اطلاعات کے بعد ہم ہجوؤں کے دوسرے پہلوؤں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

تبصرہ ۔ سودا نے ہجو ضاحک میں جن آدمیوں کے نام لیے ہیں ان میں سے بعض کا تعین ممکن ہے۔ مرزا علی سالار جنگ کا بھائی تھا۔ شوکت جنگ سوزاں اسی کا بیٹا تھا۔[1] حکیم محمد معالج خاں ان پانچ طبیبوں میں سے تھا جو شجاع الدولہ کے نکبر سے فیض آباد آنے کے بعد دہلی سے وارد ہوئے تھے۔ ان میں سے مولوی محمد منیر جواہر علی خاں کا ملازم ہوا۔ اس کا ساتھی ایرانی مغل طبیب آغا ملا عبدالمجید تھا۔ یہ دونوں ایک طرف تھے اور ان کے خلاف محمد معالج خاں تھا۔ حکیم محمد منیر خاں کی وجہ سے جواہر علیخاں بھی حکیم محمد معالج خاں کو ناپسند کرتا تھا۔ چنانچہ بہار علی خاں خواجہ سرا کے گھر میں دونوں پارٹیوں کے آدمیوں میں شیعی عقائد پر مباحثہ ہوا تھا اور فساد بھی ہو گیا تھا۔ یہ واقعہ ۱۲ ذی قعدہ ۱۱۹۲ھ کو پیش آیا۔[2] شعرا نے ان واقعات کی تفصیل میں نظمیں بھی کہی تھیں۔

میرزا پہلو کمان غالب یہ ہے میرزا فیضو ہے اور اسکی تزحیح کی ہجو سودا کے کلیات میں شامل ہے۔[3] یہی حال مرزا علی والی ہجو کا ہے جو کلیات حسن کے اکثر نسخوں میں عظیم کشمیری کی ہجو کے طور پر شامل ہے۔[4] میر حسن کے گھرانے نے ہجو کا عنوان غالباً بعد

---

[1] تذکرۂ شعرائے اردو میر حسن ص۹۲ [2] تاریخ فرح بخش جلد دوم ص۳۸-۲۹۰ [3] ص۳۹۳
[4] کلیات سودا کی مرسس در ہجو مرزا علی ص۱۲۴ ۔

میں بدل دیا ہوگا۔ میر نواب بھی تاریخی شخصیت ہے۔ حکیم میر نواب کے نام رقعات پنجہ زائن (منشی جواہر علی خاں) میں دو رقعے ملتے ہیں صفحہ ۵۵ بعنوان "بہ حکیم میر نواب متضمن اظہار دردِ پا" و صفحہ ۵۸ "رقعہ بحکیم قبلا نت ایاب میر نواب در رسیدِ سرمہ"[۱]

مولوی ساجد کے بارے میں کتب تاریخ خاموش ہیں۔ ہجو ساجد اجو کلیاتِ سودا میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے سنی تھا اور شاہ آباد (صوبہ اودھ) میں مقیم تھا۔ مجموعۂ نغز میں گمنام کے حال میں ہے :-

غلام محی الدین خاں خلف الصدق مولوی ساجد مرحوم کہ بہ حلیۂ علم و علم آراستہ و بزیور صلح و صلاح پیراستہ است۔ این شعر او راست۔[۲]

باقی رہے سکندر۔ شاہ سکندر کا نام خلیفہ محمد علی۔ میاں سکندر کر کے مشہور ہیں[۳] پنجابی تھے۔ عرف ان کا گھسیا تھا۔[۴] دہلی میں نشو و نما پائی۔ قصہ خوانی۔ مرثیہ گوئی اور عرق کشی میں شہرت رکھتے تھے۔ ابتدا میں قصہ خوانی کی طرف توجہ تھی۔ آخر عمر میں مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہوئے[۵] دائم الخمر خوش طبع اور ظریف تھا۔ میاں ناجی کے شاگرد تھے۔ بقول حسن عالم نہ تھے لیکن مراثی پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی۔ قاسم نے ان کی مرثیہ گوئی کی تعریف کی ہے۔ ان کے تذکرے کی تالیف کے وقت دکن میں فوت ہو چکے تھے۔ مصحفی ان سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ میر حسن اور مصحفی دونوں نے ان کا ذکر اسی انداز میں کیا ہے۔ کمال کے تذکرہ مجمع الانتخاب میں ہے :-

سکندر کہ در مرثیہ گوئی اشتہار دارد۔ شاگرد میاں ناجی و در آہیر شہر حیدرآباد از لکھنؤ آمدہ ...... انتقال کردہ .. .. ..

---

[۱] نولکشور پریس اکتوبر ۱۸۸۲ء) [۲] (صفحہ ۱۲۷ جلد دوم) [۳] مجموعۂ نغز صفحہ ۲۶۹ [۴] میر حسن تذکرہ شعرائے اردو صفحہ ۹۳ [۵] تذکرہ ہندی صفحہ ۱۱۶، ۱۱۷ ★

از فقیر در لکھنؤ اکثر ملاقات می شد[۱] .. ..

(۳)

مقام معرکہ :- یہ تمام تخصیتیں فیض آباد میں جمع ہیں ۔ اس لئے یہ معرکہ فیض آباد ہی میں وقوع پذیر سمجھنا چاہیئے ۔ ہجویات میں ایک جگہ فیض آباد کا صاف ذکر ملتا ہے ۔

یارب تو میری سن لے یہ کہتا ہے سکندر
ضاحک کے اڑا دیوے کسی بن میں قلندر
گھر اس کے تولد ہو اگر بچۂ بندر
گلیوں میں نچاتا پھرے وہ بنگلے کے اندر[۲]

قاضی عبدالودود لکھتے ہیں ۔

معارضۂ ضاحک و سودا فیض آباد میں ہوا ہے اور میرے نزدیک اس کا زمانہ ۱۱۸۶ھ یا اس کے کچھ بعد ہے لیکن ۱۱۸۸ھ اس کی آخری حد ہے ۔ ابتدائی حد جو ۱۱۸۶ھ مقرر کی گئی ہے ۔ وہ اس لئے کہ سودا اس سنہ سے پہلے فیض آباد نہیں آئے ۔ کلیات سودا میں فدوی کی ایک ہجو پنجابی زبان میں ہے جس کا مادۂ تاریخ اسی سنہ کا ہے اور یہ مسلم ہے کہ فدوی و سودا کا جھگڑا فرخ آباد میں ہوا ۔ ۱۱۸۸ھ آخری حد اس لئے بتائی گئی ہے کہ ہجو یہ لفظوں میں روہیلوں کا اس طرح ذکر ہے کہ گویا ان کے زمانۂ عروج کی بات ہے اور ۱۱۸۸ھ میں انہیں شجاع الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے شکست دے کر ان کے ملک پر

---

[۱] ایضاً بہ متن فائق [۲] مطبوعہ دیوان میں بنگلے کی جگہ شہر چھپا ہے ۔ لیکن اکثر نسخوں میں بنگلہ صاف لکھا ہے ۔ چنانچہ شیخ چاند نے "سودا" میں بنگلہ ہی دیا ہے ۔ سودا ص ۸۳ ۔

قبضہ کر لیا تھا۔"[۱]

قاضی صاحب نے جن اشعار کا ذکر کیا ہے وہ غالباً یہ ہیں :-

ہاتھوں سے اس کے میں نے پاپڑ بہت ہیں بیلے
بیروں سے یہ ... پریوں سے ... کھیلے
جو دیو زاد بھڑوے کہلاتے ہیں رو بیلے
جاتی تھی یہ ... ... ساتھ ان کے بیٹے ٹھیلے[۲]

مقام معرکہ کے بارے میں دہلی اور لکھنؤ کے نام بھی لئے جاتے ہیں۔[۳] دہلی اور لکھنؤ میں معرکے کے بارے میں آرا یہ ہیں :-

"مرزا رفیع سودا میر ضاحک کے ہم عصر تھے۔ دونوں حضرات میں اکثر چھیڑ چھاڑ رہا کرتی تھی۔ جو صرف دلی تک ہی محدود نہ رہیں بلکہ لکھنؤ میں بھی قائم رہیں۔" جلوہ خضر میں صفیر بلگرامی لکھتے ہیں۔

"(لکھنؤ میں) سودا اور ضاحک امیروں کے لنگوٹیے ہو گئے۔ بعد میں ان دونوں کی آپس میں ہجویں۔ باعثِ توسیع و ترقی شہرت اور امیروں کے خوش کرنے کو ہجووں کی بھرمار شروع کر دی۔"

دونوں پھکڑ باز اور ہزل گو تھے کیا کیا نہ گندگیاں ایک دوسرے پر اچھالی گئی ہونگی[۴]

---

[۱] ضاحک۔ قاضی عبدالودود ص ۱۲۶۔۱۲۷ [۲] سید احمد اللہ قادری اس جھگڑے کی کوئی تاریخ نہیں دیتے بلکہ کہتے ہیں کہ "ان میں اور مرزا سودا میں ہمیشہ چشمک رہا کرتی تھی" (دیباچہ رموز العارفین ۱۳۵۲ھ ص ۱) لیکن معاصر بیانات ایسی کوئی بات نہیں لکھتے جس سے چشمک کی ہمیشگی ظاہر ہو۔ [۳] میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعرا۔ محمود فاروقی ص ۲۸
[۴] بحوالہ کلیات سودا مرتبہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔

"میر ضاحک کی شاعری کی ابتدا دلی میں ہوئی تھی لیکن شہرت فیض آباد آنے پر ہوئی۔ سودا سے ان کے معرکے دلی ہی میں شروع ہو گئے تھے لیکن ان معرکوں میں شدت دل، چھیڑ چھاڑ بڑھنے کے اسپر پیدا ہوئی۔ خصوصاً اس وقت جب تمام شعراء کا اجتماع لکھنؤ میں ہوا ... ... میر ضاحک اور سودا کی زبان تو پہلے ہی بدلگام ہو رہی تھی۔ لکھنؤ میں آ کر ان کی جو خراب حالت ہوئی ہو کم ہے[1]۔

ان بیانات میں دو باتیں قابلِ غور ہیں :-

(۱) ضاحک کا جھگڑا سودا سے دلی میں شروع ہوا

(۲) لکھنؤ میں آ کر اس جھگڑے نے تیزی اختیار کی

پہلے بیان کی تائید میں غالباً ان کے ذہن میں ایک ہجو کا مندرجہ ذیل بند ہے۔

یارب تو میری سن لے یہ کہتا ہے سکندر ۔ ضاحک کے اڑا دیوے کسی بن میں قلندر
گھر اس کے تولد ہو اگر بچۂ بندر ۔ گلیوں میں نچاتا پھرے وہ شہر کے اندر
روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر[2]

یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں معاصر شعرا "شہر" سے مراد "دہلی" لیتے تھے[3]۔ اس لحاظ سے کے مطابق یہ ہجو اس وقت لکھی جانی چاہیئے جب ضاحک کا قیام دہلی میں تھا یعنی ۱۱۳۰ھ اور ۱۱۸۰ھ کے درمیان لیکن بعض قابلِ اعتبار قدیم قلمی نسخوں میں اس بند کا چوتھا مصرعہ یوں ہے :-

گلیوں میں نچاتا پھرے وہ بنگلے کے اندر[4]

---

[1] ایضاً ص ۵۸ [2] یہ ہجو نولکشور کے مطبوعہ کلیاتِ سودا میں نہیں ہے۔ جناب ابواللیث صدیقی کے مملوکہ قلمی نسخہ سے پیش کیا جا رہا ہے۔ [3] اردو ترجمہ دریائے لطافت۔ کیفی، ص ۱۳۵ [4] سودا۔ چاند ص ۸۳)

نیز اس ہجو میں ہے۔

ان باتوں میں سے اس کو اگر کچھ نہ گر آوے
اک مرثیہ کہہ شمر کا اس طرح بنا دے
اس طرح کہ پھر مولوی ساجد کو سکھا دے
یاروں سکنے اس بات کو پھر لے سکے یہ جاوے
رنڈی تو کسی طور کما کھائے مچھندر

مولوی ساجد شاہ آباد ضلع لکھنؤ میں موجود تھے۔ اس ہجو میں ضاحک کی بے کاری اور بے روزگاری کا بھی ذکر ہے۔ کلیات سودا کی ایک دوسری ہجو (مخمس در ہجو اہلیہ ضاحک) سے ضاحک کی اہلیہ کا بڑھاپا اس کی غریب الوطنی اور پورب میں موجودگی کا پتا چلتا ہے۔

ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر دھرایا
.... ہوئی رات ساری ہمسایوں کو جگایا
مجلس (منجھک) میں بیٹھ بوڑھے چونڈے کو جب بلایا
تب شیخ سدو اس پہ .. .. کھا کے آیا
بولا کہ کیوں بے ضاحک بکرا کوئی منگایا..

ان باتوں کا بھی لائی ضاحک کی اہلیہ رد
کیا ہی نیک ہو سے بھڑوا یہ سمجھے ہے بد
اک خلق کی یہ ناحق کرتا ہے ہجو جد تند
ہے ہجو پہ تمہاری اب میراں اس کو ہی کد
غربت پہ تم نہ بھولو ہیں نے تمہیں ستایا

پورب کے اس کنے سے تا اس سرے تلک اب
ہیں ناطے دار تیری نرچے کی رنڈیاں سب

ان میں سے لیا تو جس عمدہ کے کئے جب
پہلے کہہ اس کو بھنا پیچھے کر اپنا مطلب
پھر ساتھ اوس ملانے والے کے جا سلایا[1]

اس کے علاوہ ان ہجویات میں جا بجا ضاحک کی قلندرانہ وضع کے بارے میں اشارے بھی ہیں۔ قلندرانہ وضع انہوں نے آخر تیس سال میں اختیار کر رکھی تھی۔ اس لئے ہمارے خیال میں یہ واقعہ فیض آباد میں ہوا۔

فیض آباد میں میر حسن اور ضاحک ۱۱۸۱ھ سے قبل پہنچے۔

(تفصیل حسن کے حال میں) سودا بقولِ چاند ۱۱۸۴ھ اور ۱۱۸۵ھ کے مابین اور بقول قاضی عبدالودود ۱۱۸۶ھ کے بعد پہونچے۔ "ہ مکابرہ" اس لحاظ سے ۱۱۸۶ھ کے بعد ہونا چاہیے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اس کی آخری حد ۱۱۸۸ھ قرار دی (جو ہجو کے بنا کی بنا پر ہے) اس آخری حد کا مزید ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ تذکرہ شعرائے اردو میں (۱۱۸۹ھ) میر حسن سودا کو بڑے اچھے لفظوں میں یاد کرتے ہیں[2]۔ آزاد نے آب حیات میں[3] ضاحک اور سودا کے جھگڑے کی روداد پیش کی ہے[4]۔ اور فراغ کے حوالے سے پوری داستان لکھ دی ہے جو پھبند ر والی ہجو کی شانِ نزول قرار دی گئی ہے[5]۔ اس سے لکھنؤ میں اس کا پیش آنا تسلیم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"سودا کے دیوان میں میر ضاحک کی یہ ہجو جب میں دیکھتا تھا" یا

---

(۱) پہلا بند بحوالہ کلیات سودا مطبوعہ جلد اول ص۳۶۳ باقی بند لیث صاحب کے قلمی نسخے سے لئے گئے ہیں (۲) ہم نے میر حسن کے حال میں اس سلسلے کی مزید شہادتیں نقل کی ہیں۔ باب سوم دیکھا جائے۔ (۳) آب حیات ص۱۸۲ (۴) ص۱۸۳ (۵) ایضاً ص۱۸۳، ص۱۸۴

رب یہ دعا مانگتا ہے تجھ سے سکندر" تو حیران ہوتا تھا کہ سکندر کا یہاں کیا کام ؟ میر مہدی فراغ کی خدا مغفرت کرے انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن حسبِ معمول مرزا اشکوہ کے ہاں پائیں باغ میں تخت بچھے تھے۔ صاحبِ عالم خود مسند پر بیٹھے تھے۔ شرفا اور شعرا کا ہجوم تھا۔ مرزا رفیع اور میاں سکندر مرثیہ گو موجود تھے کہ میر ضاحک تشریف لائے۔ ان کی پرانی وضع ..... ان دنوں بھی انگشت نما تھی ..... اتفاقاً صاحبِ عالم نے رفیع سے کہا کچھ ارشاد فرمائیے (دونوں صاحبوں کے معاملات تو انہیں معلوم ہی تھے۔ خدا جانے چھیڑ منظور تھی یا اتفاقاً زبان سے نکلا) سودا نے کہا میں نے تو ان دنوں کچھ کہا نہیں (میاں سکندر) نے ایک مخمس کہا ہے۔ صاحبِ عالم نے فرمایا کیا؟ سودا نے پہلا بند۔ پڑھا تھا۔ کہ میر ضاحک مرحوم اٹھ کر میاں سکندر سے دست و گریباں ہو گئے۔ سکندر بے چارہ حیران کہ نہ واسطہ نہ سبب یہ کیا آفت آ گئی۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں صاحبوں کو الگ کیا اور سودا دیکھئے تو الگ کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ یہ ہے شانِ نزول اس مخمس کی"۔

یہ قصہ دلائل کی بنا پر باطل ٹھہرتا ہے۔ حسن کے لکھنؤ آنے تک معاملہ ختم ہو گیا تھا۔ مزید براں سلیمان شکوہ کی لکھنؤ میں آمد سے پہلے سودا (۱۱۹۵ھ) وفات پا چکے تھے۔ سلیمان شکوہ ۱۲۰۵ھ میں آئے۔ اس وقت تک ضاحک بھی غالباً فوت ہو چکے تھے۔ (آزاد خود اس بات کے مؤید ہیں کہ ضاحک سودا سے پہلے مر چکے تھے۔ دیکھئے آبِ حیات ص۱۰۲) اس لئے لکھنؤ میں اس واقعے کے پیش آنے کا کوئی امکان نہیں۔ محمد حسین آزاد اس داستان کے خالق ہوں یہ بھی قابلِ

تسلیم نہیں۔ فراغ سے قبل یہ داستان وجود میں آچکی ہوگی۔ میرے پاس ایک قلمی بیاض ہے جو عباس بیگ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اور بعض اشعار کے آخر میں ۱۲۱۱ھ کی تاریخ بھی درج ہے۔ اس میں "مرزا رفیع سودا" کے زیرعنوان یہ رباعی درج ہے:

سودائی دنیا تو بہ ہر سو (کذا) کب تک آوارہ ازیں کوچہ بآں سو کب تک
حاصل تو ای (کذا) ہے اس سے کہ تا دنیا ہو بالفرض اگر یوں یہ ہوا تو کب تک

اس کے بعد دوسرا عنوان ہے " زاہک (کذا) در جواب "

سودائی دنیا تو بہ ہر سو کب تک آوارہ بہر کہ ر دنکت (کذا) سو کب تک
حاصل تو ہے اسے کہ تا لاکھ خبر یں (؟) بالفرض اگر لاکھ جریں (؟) ذکر کو (ی) کب تک

پھر تیسرا عنوان ہے " میاں سکن رے شاگردِ مرزا (در؟) جواب "

زاہد (کذا) کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر دھرایا (تین بند)

اگرچہ داستان کے بعض اجزا جو فراغ کے حوالے سے آزاد نے درج کئے ہیں اندرونی شواہد کی بنا پر باطل ٹھہرتے ہیں۔ لیکن اس سے قصے کی قدامت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہجویاتِ ضاحک :- جھگڑے کی تفصیل میں جانے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہجویاتِ ضاحک کے بارے میں ہم اپنے اقتباسات درج کر دیں اس کے بعد ان کی روشنی میں ہم اس جھگڑے کی قیاسی ترتیب پیش کریں گے۔ معاصر تذکرے تفصیلی روشنی نہیں ڈالتے۔ گارساں دتاسی[1] ضاحک کے حال میں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس نے سودا کے خلاف ہجو لکھی جس

---

(۱) تاریخِ ادبِ ہندی (ہندوستانی) جلد سوم ص ۳۲۲

کے اقتباسات اصل تذکروں میں ملتے ہیں" ذتاسی میر حسن کے حال میں ضاحک وسودا کے جھگڑے کا ذکر کرکے کہتے ہیں "سودا نے مخمس کی شکل میں ان کی ہجویں کہیں جو کمال کے تذکرے میں موجود ہیں[۱]" کلیاتِ سودا کی مندرجہ ذیل ہجویات غالباً ضاحک کی ملکیت ہیں :-

(۱) قصیدہ در ہجوِ مولوی ساجد در بیانِ آنکہ یزید علیہ اللعنۃ ہدا ادنی الامر گفتہ بود[۲]

اس میں مولوی ساجد کو شمر سے بھی بڑا لعنتی کہا گیا ہے

مکن تو لعن بر شمر و یزید و ابن زیاد — بگو بہ مولوی ساجد مدام لعنت باد

سودا نے ضاحک کی جو ہجو کہی ہے اس میں ساجد کو شمر کہنے والا حوالہ موجود ہے[۳]۔ تذکرہ شعرائے اردو میں میر حسن ضاحک کے حال میں لکھتے ہیں

باوجودِ قوتِ آں علم کہ در ہجو مولوی ساجد بہ کار بردہ اند
چو طبائع سامعاں را در خورِ سخن بلند نہ یافتند بہ قدرِ
حوصلۂ آں ہا بطرفِ ہزلی توسنِ قلم را تاختند[۴] .....

(۲) اگر یہ استدلال صحیح ہے تو ساجد کے خلاف اور بھی جتنی رباعیات کلیاتِ سودا میں ہیں ۔ ضاحک کی ملکیت ٹھہرتی ہیں۔

کلیاتِ سودا (طبع نولکشور ۱۹۳۲ء) میں ساجد کے خلاف مندرجہ ذیل رباعی ملتی ہے :-

پیٹ اپنا ہر اک سے ساجد پالے — گویا وہ چیل وہ گلہری کھالے

---

(۱) ایضاً جلد اول ص ۵۲۸ تا ص ۵۲۹ (۲) کلیاتِ سودا ص ۲۴۱ تا ص ۲۶۳ (۳) کلیاتِ سودا جلد اول (۴) تذکرہ ص ۱۰۰۔

بنڈک چھوڑے نہ چھپکلی نے سالا | اُسکے پپڑیں پاس ڈھونڈنے لڑکے بالے[1]

کلیات میر حسن (مائی کروفلم برٹش میوزیم) میں مولوی ساجد کے خلاف دو رباعیاں اور ایک تبد تضمین کا موجود ہے۔ "رباعیاتِ ہجو مولوی ساجد"

یہ مولوی ساجد جو ہے مومن کا غنیم | حکمت میں دخل (دے) ہے اکثر وہ لئیم
عنی دیلی (کذا) لکا کرتا پھرتا ہے علاج | آیا ہے دجگہ خالی ایسے ۔۔۔ کا حکیم
ہیں مولوی ساجد کے دو فرزند جہول | ایک شیعہ ہے ایک سنی نامعقول
شیعہ سے ۔۔۔۔ سنی کی ۔۔۔ وہ آہ | کس طرح کرے بحثِ فاعل مفعول
بسکہ تھا یہ اہلِ ایماں کا دیار | ساجد بے دین ہوا یاں آکے خوار
اب شکل یوں دیتی ہے نہر ڈا (کذا) نابکار | ہبز دارم صفا ایں جہاں ہے مدار

ماچو بو بکریم در دے خوار و زار

قیاس چاہتا ہے کہ یہ بھی میر ضاحک کی ملک ہوں۔

(۳) "مسدس در ہجوِ مرزا علی" (کلیات ص ۱۲الف) سودا ہجوِ ضاحک میں لکھتا ہے:-

میرزا بہلو (فیضو) سے تا مرزا علی نظم میں آئے تیرے سب سے پرے[2]

اندازہ ہے کہ یہ ہجو ضاحک نے مرزا علی برادرِ سالارِ جنگ کے خلاف کہی گئی۔ بعد میں اس میں عظیم کشمیری (غالباً فرضی نام ہے) کا نام ڈال دیا گیا کیونکہ حسن سالارِ جنگ کی ملازمت میں ۱۱۸۹ھ میں آ گئے تھے۔ کلیاتِ حسن کے بیشتر نسخوں میں یہ ہجوِ عظیم کشمیری کے نام پر ملتی ہے اور عام طور پر حسن کے نام سے منسوب ہے۔

(۴) قیاس ہے کہ میرزا بہلو درحقیقت میرزا فیضو ہے۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو

---

(۱) کلیات جلد اول ص ۵۵ (۲) کلیات ص ۳۳۹ میں مرزا رفیع لیکن قدیم نسخوں میں مرزا علی۔

سودا کے کلیات میں مثنوی در ہجو "شیخ مرزا فیفو" ضاحک کا کلام ہے۔ گلزار ابراہیم کے حاشیہ نگار (نام نامعلوم) کے خیال میں یہ مثنوی احسن اللہ بیان کی کہی ہوئی ہے۔[۲] وہ اسے "جبک نامہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں، اور ایک شعر بھی درج کرتے ہیں۔ بہر حال سودا سے اس کا انتساب مشکوک ہے۔

(۵) "مخمس در ہجو میر علی ہاتف شاعر۔ بموجب استدعائے حکیم آفتاب کہ ہجو حکیم مذکور گفتہ بود"

محمود فاروقی صاحب اسے ضاحک کا اثاثہ قرار دیتے ہیں۔[۳] ان کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ ہجو ضاحک نے سودا کے خلاف کہی ہے۔ چنانچہ اس شعر سے اس خیال کو تقویت ہوتی ہے۔

شیرازی قصائد باپ تیرا اور نہ آملی ــــ وہ فرس گر کہی ہوگا تو کابلی
گونان کونوں کہنے پہ تیری زباں کھلی ــــ ہرگز کسے نگوید آقا علی قلی
زیں گفتگو عبث دل خود شاد کردہ

(۶) کلیات حسن کے مختلف نسخوں میں ایک ہجو پائی جاتی ہے۔ جو چھندر دائی ہجو کا جواب ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کی رائے میں یہ ضاحک کی ملکیت ہے اور غلطی سے حسن کے کلام میں داخل ہو گئی ہے۔[۴]

کلیات سودا میں الحاقی کلام بہت ہے چنانچہ شیخ چاند لکھتے ہیں۔

"اب تک کلیات سودا کا جو زیادہ رائج اور متداول نسخہ ہے۔ وہ نولکشور کا ہے۔ لیکن اول تو یہ غلط ہے دوسرا اس میں الحاقی کلام کثرت سے ہے۔ جو دوسروں کا ہے۔ تیسرے اس میں بہت سا کلام ایسا

---

(۱) ص ۲۹۳ جلد اول (۲) دستور الفصاحت دیباچہ از عرشی ص ۵ (۳) کلیات سودا ص ۱۲ (۴) میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعرا ص ۲۴۔

> موجود نہیں ہے جو سودا کا ہے اور دوسرے قلمی نسخوں میں ملتا ہے۔۔
> ..... (مرتب نے) کئی جگہ سے رطب و یابس جمع کیا اور بے تحقیق و تفتیش سودا سے منسوب کر کے مرتب کر دیا۔ (اس کے بعد شیخ چاند نے ص۱۰۱ سے ص۱۷۱ تک الحاقی کلام کی فہرست دی ہے ص۱)

جب تک سودا کے کلام کا کوئی معاصر نسخہ نہ مل جائے (انڈیا آفس کا نسخہ مفید ہو سکتا ہے) قطعی طور پر کچھ کہنا محال ہے تاہم منظومات کو ضاحک کی ملک مان کر قصے کو ترتیب دیا جائے تو ایک ممکن الوقوع داستان ضرور بنتی ہے۔

معادیہ و مجادلہ:۔ سودا کے ساتھ جھگڑے سے پہلے ضاحک مرزا علی۔ میرزا فیجو(؟)، مولوی ساجد شاہ آبادی کے خلاف ہجویات لکھ چکے تھے۔ سودا سے ان کی ٹھن گئی۔ اس کا اصل سبب کیا تھا(؟) اس پر کلیاتِ سودا (قلمی مملوکہ ابو اللیث صدیقی) کی ہجو ضاحک کے عنوان سے روشنی پڑتی ہے۔ نسخے میں عنوان یوں درج ہے:۔

"در ہجوِ میر ضاحک کہ خود را از دیگراں در تر زبانی بہتر می دانستند"[۲]

ضاحک نے کسی مولوی صاحب کے خلاف ایک ہجو لکھی[۳]

[۴]
ہے عجیب و غریب زیرِ سما اک یہاں صورت آشنا اپنا

اس میں ضاحک کی بسیار خوری پر چوٹیں کی ہیں اور راگ رنگ سے ان کی واقفیت کا مذاق اڑایا ہے۔ ضاحک نے غالباً سودا کے خلاف وہ ہجو کہی جو کلیاتِ سودا میں اس عنوان سے درج ہے "مخمس در ہجو میر علی ہاتف شاعر....." اور جس

---

(۱) سودا ص۱۰۱ (۲) یہ عنوان خود لیث صاحب نے بھی اپنے مقالہ میں دیا ہے۔ ادبی دنیا، اشاعت خاص ۱۹۵۱ء ص۹۵ (۳) محمود فاروقی میر حسن اور ان کا خاندان ص۲۰۳ اس سے مراد مولوی ساجد لیتے ہیں۔ میں اس کے تعین سے قاصر ہوں (۴) کلیاتِ سودا ص۳۳۲

کا پہلا مصرعہ ہے :۔

آنی کہ طرزِ فتنہ تو ایجاد کردہ؟ [۱]

اس میں کہا گیا ہے کہ تو شیعہ کیسا اور تیرا شیعہ ہونا کیا معنی تو تو سادات کی ہجو کرتا ہے (جبکی زبان نے ہجو کی سادات کی قبول) پھر سودا نے ترجیع بند در ہجو ضاحک [۲] کہا جس کا اولین شعر ہے :۔

جا حبا ضاحک سے کہہ بعد از سلام — کیوں کیا کرتا ہے ہجوِ خاص و عام

آپ کو کہتا ہے تو سید ہوں میں — جا مرا پوچھو تو ہے خیر الانام.... [۳]

اس میں "میرا" اور "ریم" کی رعایتِ لفظی سے ٹیپ کا شعر بنایا ہے۔ اسے گدھی کا دودھ پینے والے کا لڑکا بتا کر اس کے سید ہونے میں شک کیا ہے۔ اس کی باریک آواز اور مصاحب خاں اور رہسو خاں سے ہم سری کے دعوے کا پول کھولا ہے اور کہا ہے کہ تو نے جس کی زن اور دختر (مولوی صاحب) کی ہجو کی ہے۔ ان کا سخن بھی تیرے گھر تلک ہے [۴]۔ اور یہ کہا کہ تو ہر امیر آدمی کی ہجو کرتا ہے۔ چنانچہ تو نے میر نواب (حکیم میر نواب) معالج خاں (حکیم معالج خاں) مرزا پہلو (فیضو) اور مرزا علی (برادرِ سالارِ جنگ) کی ہجو میں لکھ چکا ہے۔ تجھے سید کیسے کہا جاسکتا ہے۔ تو نے آئندہ اگر مولوی صاحب سے کچھ کہا تو تجھے "چت و پٹ" کردوں گا [۵]

اب جھگڑا تیز ہو گیا۔ سودا نے ہجوِ ضاحک لکھی جن کا عنوان ہے۔

"مخمس در ہجوِ اہلیہ میر ضاحک" [۶] کلیاتِ سودا مطبوعہ میں ہجو کے ۵ شعر

---

(۱) کلیاتِ سودا جلد اول ص۱۸۱ (۲) ایضاً ص۳۳۶ (۳) کلیات ص۳۳۶ (۴) ص۳۳۷ (۵) ص۳۳۷ نسخے میں چت ڈ پٹ۔ دود و صاحب کے مقابلے میں چٹ دپٹ لیکن مجھے یہ دونوں غلط معلوم ہوتے ہیں۔ (۶) کلیاتِ سودا جلد اول ص۳۲۷

دیے ہیں ۔ لیکن درحقیقت یہ ایک طویل ہجو ہے ۔ جس کے کل بند ۱۰ ہیں ۔ (کلیات سودا مملوکہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی) آخر میں سودا کا تخلص بھی موجود نہیں ۔ آخری سے پہلا بند ہے :۔

دو سال پرے اب تو ضاحک نے بات ڈالی — اور بوڑھی ... اپنی کر مکر و فن بچالی
بس لئے محب تو تو رکھتا ہے طبع عالی — موقوف کر زباں سے یہ گفتگو ترالی
کس نے نجلب کے ناحق قصہ ہے سر پھرایا

اس سے یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ یہ مخمس محب کا کہا ہوا ہے یا شاید سودا نے کہہ کر اس کے نام پر مشہور کیا ہے ۔ اس ہجو میں ضاحک کی بیوی (حمیدہ) کے بڑھاپے کا ذکر ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ شیخ سدو صدر جہاں زریں خاں ۔ ننھے میاں اور بعض دوسرے جو اس پر عاشق ہیں[۲] اس کے علاوہ ہجو میں یہ بھی کہا ہے کہ ضاحک دوسروں کی لڑکیاں پالتا ہے ۔

جب ایک جورو تجھ کو کافی نہ ہووے گو جن
تب لے کے لڑکیاں دو پالا کیا بہت دھن
ادن میں سے جب تمہارا ایک آدھ پر چلے من

---

(۱) اگر اس سے مراد میر ولی اللہ محب ہیں تو وہ ابھی اودھ میں نہیں پہونچے تھے ۔ اگر محمد تقی خاں محب ہیں تو وہ شاید زندہ تھے ۔ التفات علی خاں خواجہ سرائے نواب بیگم والدۂ شجاع الدولہ کی سرکار میں فیض آباد میں ملازم تھے ۔ تکمیل تذکرۂ مصحفی (عقد ثریا) کے وقت فوت ہو چکے تھے (ص ۹)

(۲) ملاحظہ ہو دریائے لطافت اردو ترجمہ ص ۱۸۳ تا فرہنگ محاورات بیگمات رنگین و انشا مرتبہ نظامی ص ۱۲ تا ص ۱۸ اور سید احمد دہلوی ۱۹۱۷ء لغات النسا ص ۲۱۲

ایسے ہی تو نے بھڑوے تب بھی کری تھی ان بن
دم داب بھاگ نکلا بکرا الگ بچایا
پھر بعد اس کے لایا آسامیاں کئی تو
اور ۔ ۔ ۔ ۔ لے آیا دوشیزہ اور نئی تو
پورب کے اس سرے سے تا اس سرے تلک اب
ہیں ناطے دار تیری نوچے کی رنڈیاں سب
ان میں سے لے لیا تو جس عمدہ کے کنے جب
پہلے کہہ اوس کو بھینا پیچھے کر اپنا مطلب
پھر ساتھ اس ملانے ڈالے کے جا سلایا

رنڈیوں کی آمدنی لوگوں سے وصول کرتا ہے اور لڑکیاں پال کر دھن پیدا کرتا ہے اور آج کل بھی ایک لڑکی پال رکھی ہے :-

ہاں اب بساط پر ہے اک چہرہ بند لڑکی
وہ پالی پوسی ہیں نے اب کی ہے دس برس کی
دو سال اور ٹھہرو تا وہ نہ چھوٹے کچی
پھر بیکے وہ پٹا خاچیں عمدہ کو دکھا دی ۔ ۔ ۔ ۔

اس طرح ایک دوسری ہجو ہے[1] جس کا پہلا بند ہے :-

یارب تو مری سن لے یہ کہتا ہے سکندر
ضاحک کے اڑا دیسے کسی بن میں قلندر
گھر اس کے تو لد ہو اگر بچہ بندر

---

(۱) قاضی عبدالودود صاحب کے خیال میں یہ ہجو سکندر کی کہی ہوئی ہے ۔

گلیوں میں نچاتا پھرے وہ بنگلے کے اندر[1]
روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر

اس میں سودا (؟) نے ضاحک کے "نکھٹو پن" پر چوٹیں کی ہیں اور باقی ہجو اس کی بیوی کی زبان سے ادا کی ہے۔ اس میں ایک بند ہے۔

ان باتوں سے اس کو اگر کچھ نہ کر آوے
اک حرف تنبیہ کبھو شمر کا اس طرح بنا دے
اس طرح کہ پھر مولوی ساجد کو سکھاوے
یاروں کنے اس بات کو پھر لے کے یہ جاوے
روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر

اور آگے ضاحک کے ہاں کوئی بیٹی نہ ہونے کا ذکر ہے:
تب سن کے یہ ضاحک نے کہا سنتی ہے خندی
کوئی بیٹی مجھے اچھی سی تو نے بھی نہ جن دی
ہم سب کو وہ پھر پالتی اللہ کی بندی
کہہ کہہ کے یہ کامیکو زباں کرتی ہے گندی
روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر[2]

اس کا جواب ضاحک کی اس ہجو میں ہے جو عام طور میرحسن کے کلیات میں پائی جاتی ہے۔ ضاحک نے اس پہلے بند ہی میں اپنا تخلص استعمال کیا ہے ہجو کا عنوان ہے مخمس ہجو سکندر شاعر۔

---

(۱) لیث صاحب کے نسخے میں "شہر" میں نے شیخ چاند کے درشن کو ترجیح دی ہے۔

(۲) بحوالہ قلمی نسخہ مملوکہ ڈاکٹر لیث۔ اس ہجو کے آخری بند میں سودا کا تخلص درج ہے۔

ضاحک نہ خوف کر تو اب کیا ہے وہ چھندر
بکرے کا ہے وہ .... اور زادہ قلندر
باندھے ہے جب نہ تب وہ بکرے کو باہر اندر
لکڑی کے بل نچا تو اوس کو مثالِ بندر
.... ترا ڈرے ہے .... پہ ہے سکندر [1]

آگے چل کر بدزبانی میں سودا کی مہارت کا ذکر کیا ہے اور گالی دی ہے :-

ہر ایک زباں کا ماہر اس واسطے ہوا ہے
ماں نے حرام اس کی ہر جنس سے کیا ہے
سو نطفے جمع ہو کر ہر بابلی اک بنا ہے
کہہ اس کے منہ پہ جا کر ایسا وہ شخص کیا ہے
.... ترا ڈرے ہے .... پہ ہے سکندر [2]

پھر اس کی جورو پر جن پھٹنے کے واقعات لوٹا کر پیش کئے ہیں، اسے رانی خاں کا سالا کہا ہے۔ گالی شاید اس لئے دی ہے کہ سودا اس سے قبل کی ہجو میں ضاحک کی بیوی کے زین خاں کے ساتھ "تعلقات" کا بہتان لگا چکا تھا [3]

اس جوابی ہجو میں زیادہ زور جنوں پر دیا گیا ہے جن میں "ننھے میاں" نمایاں ہیں۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ اس سے قبل کی ہجو سکندر کی کہی ہوئی ہجو (جیسا کہ قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے) یا سودا نے کہہ کر سکندر کے نام

---

(۱) کلیاتِ سودا مملوکہ عبدالعلیم شیر کوٹی ورق ۳۷۵ (۲) ایضاً ۴۸ ب

(۳) اول تو یار گاڑے اس کے صدہا جہاں ہیں .... کس کس کا نام لوں میں ایک ان میں دریا خاں ہیں
جو چاہا زین خاں نے بات اس کی بیوی نہ مانی — اور مانتی تو کیا گھس جاتی مری فلانی ....

سے مشہور کر دی ہو۔ سکندر سے مراد یہاں شاہ سکندر جن نہیں ہو سکتا کیونکہ کلیات حسن والی ہجو میں "سودا ہے یا سکندر" کہا گیا ہے۔ شاہ سکندر شلو ہوگا

سودا ہو یا سکندر گو ہو وے کوئی کیں مفلس ہو وے حسن یا رکھتا ہے پاس پیسا
جیا کوئی کر ہو گا پاوے کا بارو دیا ناحق ہجو ہو شے دشمن تو کیا ہے ایسا تیسا

.... ترا ڈرسے ہے .... یہ ہے سکندر[1]

مزید اطلاعات:۔ معاصر بیانات میں مصحفی جھگڑے کا ذکر کرتے ہیں لیکن پہل کس کی طرف سے ہوئی اس کا ذکر نہیں کرتے[2]۔ قاسم صریحاً سودا کو ملزم قرار دیتے ہیں[3]۔ ایک تیسرا معاصر بیان جھگڑنے کی وضاحت کرتا ہے۔ اگرچہ پہل کے بارے میں خاموش ہے۔

"مہاجات مرزا (سودا) دمیر غلام حسین ضاحک برالسنہ و افواہِ خاص و عام مشہور است، چوں ہجو گوئی طرفین طول کشیدہ، میرزا چند بندِ مخمس درہجوِ ضاحک را ورعجب مخمصہ دمضحکہ گرفتار کردہ، آخر پسرش میر غلام حسن کہ مرد غیور است از فتورِ آں تشنیع وتشہیر اندیشہ نمودہ مرزا را بمنت و الحاحِ کثیر از یں تفضیح و تحقیر باز داشت۔ من بعد ہر چند مرزا ارادۂ اخفا نمودہ لیکن تمادیدۂ خامہ اش را واہبِ مطلق اثرے بخشیدہ کہ بمجرد تمادش عالمگیر می شود۔ باوجود اصرار بر اخفا اشتہار یافتہ تا یک بندِ آں مخمس بجہتِ تضحیک دوستاں می نویسیم ہے"

---

(۱) ایضاً ورق ۱۲۵ و (۲) ریاض الفصحا ص ۱۸۰ (۳) مجموعۂ نغز ص ۳۰۲ جلد اوّل ترجمہ سودا۔

ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر دھرایا الخ[1]

مسرت افزا کا مولف ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ میں سودا سے مل چکا ہے۔ اس کا بیان (جو معاصر ہے) ہمارے نزدیک وقیع ہے۔ اس سے جھگڑے کے خاتمے کا بھی پتا ملتا ہے۔ اور آزاد (بتقلید ناصر) کا یہ خیال کہ خاتمہ ضاحک کی وفات کے بعد ہوا باطل ٹھہرتا ہے۔ میر حسن کی کوششوں سے دونوں خاندانوں کے تعلقات اس سے پہلے دوبارہ استوار ہو چکے تھے۔

(۴)

شیخ حزیں :- تاریخ ادبیات اردو (سکسینہ) میں انیس کے حال میں ضاحک اور شیخ علی حزیں کے دوستانے کا بدیں الفاظ ذکر موجود ہے

At first he (Anis) adopted the pseudonym of Hazin probably owing to the intimacy of Mir Zahik with Ali Hazin the famous Persian poet.[2]

اس عبارت کا ترجمہ عسکری نے یوں کیا ہے: "پہلے (میر انیس) حزیں تخلص کرتے تھے۔ شاید اس مناسبت سے کہ ان کے پر دادا میر ضاحک اور مشہور شاعر شیخ علی حزیں میں بہت ربط ضبط تھا"[3] اور فٹ نوٹ میں یوں تبصرہ کیا ہے "یہ نسبت قرین عقل نہیں معلوم ہوتی اس وجہ سے کہ میر ضاحک

---

(۱) مسرت افزا صفحہ ۹۵۔

2. A History of Urdu Literature - p. 127.

۳۔ تاریخ ادب اردو ترجمہ عسکری صفحہ ۲۴۹۔

میر اور سودا کے معاصر تھے اور شیخ علی حزیںؔ خانِ آرزو کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے اور اُن سے سن میں بڑے تھے۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ضاحک نے اپنی صغیر سنی میں شیخ کو کہیں دیکھا ہو ارتباط وغیرہ تفاوتِ سن کی وجہ سے غیر ممکن ہے[1]۔

وفات:۔ ضاحک نے بقول بھگوان داس (سفینۂ ہندی) ساٹھ سال کی عمر کو پہونچ کر وفات پائی (اقتباس پیدائش کے تحت دیا جا چکا ہے) بقولِ گلزارِ ابراہیم[2] سنہ ۱۱۹۶ھ تک فیض آباد میں زندہ تھے اور وارستگی سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ اس سنہ میں یا اس کے فوراً بعد وفات پائی

دیوان قاموس المشاہیر[3] میں ہے کہ ضاحک کا "ایک اردو دیوان بھی ہے"۔ اس بیان کی تائید کسی معاصر یا متاخر تذکرے سے نہیں ہو سکی۔

(۵)

میر حسن کا خاندان ان کے قریبی ماحول کو ظاہر کرتا ہے۔ عام علمی فضا کا اثر بھی حسن کی ذات پر تھا۔ خصوصاً ان ادبا کے حالات بے حد توقع نہ ہوں گے جو میر حسن کے بہت قریب رہے یا جن کی تحریروں کا اثر ان کے ہاں نظر آتا ہے۔ میر حسن نے میر ضیاءؔ سوداؔ میر اور درد کے اثر و نفوذ کا خود اقرار کیا ہے۔ ان کے علاوہ ان کی شاعری پر حسرت، جرأت اور سوز کا بھی خاصا اثر ہے۔ افسوس، مصحفی۔ قتیل، رنگین اور انشا بھی ان کے معاصرین میں سے تھے ان کے ساتھ حسن کا بہت میل جول رہا ہے۔ اس

---

(۱) ایضاً (۲) ایضاً (۳) جلد دوم ص۲۴۔

لئے ان شعرائے کے تراجم بھی بے موقع نہ ہوں گے۔ ان کے ذکر کے
بغیر حسن کے زمانے کا جائزہ مکمل نہ ہوگا۔

ضیا :۔ میر ضیاء الدین حسینؔ ضیا[۱] تخلص، میر تقی میر نے میاں کہہ کے لکھا ہے[۲]۔ "جوانے است مودب۔ مہذب، متواضع بافقیر ربطے بسیار دارد"
ضیا دلّی ہی میں نشو و نما پائی[۳]۔ ۱۱۶۸ھ تک دلی ہی میں تھے[۴]۔ شفیق نے (۱۱۷۵ھ) ان کا حال میر اور گردیزی ہی کے حوالے سے لکھا ہے[۵]۔ میر حسن اپنے
تذکرے میں ۱۱۸۹ھ ان کے حال میں لکھتے ہیں:

"اصلش از شاہجہان آباد۔ از چندے بہ طرف عظیم آباد استقامت دارد۔ پسیر را جا شتاب رائے بطریق ندرکم و بیش خبرگیران می باشد۔ شنیدہ ام کہ او ہم فکرِ شعر می کند۔ لیکن تا حال نہ شنیدہ ام۔ اکثر شاعرانِ آں دیار اصلاحِ سخن از میر موصوف می گیرند۔ بندہ ہم استفادۂ سخن از آں بزرگوار حاصل نمودہ۔ استادِ فقیر مولفِ کتاب ہماں است[۶]"

شاگردیٔ حسن کا زمانہ بقولِ افسوس (دیباچۂ سحرالبیان) (سی دیار) (فیض آباد) میں آیا۔ اس کے بعد ہی میر ضیا فیض آباد سے عظیم آباد گئے ہوں گے
میر حسن نے اپنے تذکرے میں اس مقام پر "چندے" کا لفظ استعمال کیا ہے
خیال ہوتا ہے کہ شاید میر حسن قریبی زمانہ ۱۱۸۹ھ کی بات کر رہے ہیں

---

(۱) دیباچہ دیوان میر حسن مائی کرو فلم ص۲۳۲ (۲) نکات الشعراء ۱۱۶۵ھ (۳) نکات الشعرا ص۴۲
(۴) گردیزی۔ ۱۱۶۶ھ ص۱۰۲ (۵) مخزنِ نکات۔ قائم ۱۱۶۸ھ ص۲۰
(۶) چمنستانِ شعرا ص۵۵۲ (۷) تذکرۂ شعرائے اردو ص

لیکن میر حسن اس لفظ کے استعمال میں خاصے غیر محتاط ہیں۔ مثلاً رسوا کے حال میں[1] چندے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میر تقی میر نے بھی رسوا کے حال میں اس موقع پر "چندے" ہی لکھا ہے۔ میر حسن کا تذکرہ ۱۱۸۹ھ میں اور میر تقی میر کا ۱۱۶۵ھ میں لکھے گئے۔ اسی طرح حزیں کے حال میں میر حسن لکھتے ہیں :- "از مدتے بہ طرفِ بنگالہ رفت"[2]،

حالانکہ حزیں ۱۱۶۵ھ سے پہلے بنگال جا چکے تھے۔ گمان غالب یہ ہے کہ ضیا ۱۱۸۱ھ (میر حسن کے فیض آباد آنے کی آخری تاریخ) تک فیض آباد میں تھے۔ دلی سے کب نکلے؟ اس کا صحیح طور پر علم نہیں ہے ان کے دلی میں قیام کے بارے میں میر حسن اپنے تذکرے میں میر احمد یارؔ کے حال میں لکھتے ہیں :-

محبوبِ روزگار و یارِ طرح دار، میر احمد المتخلص بہ یارؔ۔ ولد شاہ اللہ متوطن شاہجہان آباد۔ جوانے بود بہ کمال وجاہت و ملاحت کہ یوسفِ ثانی تواں گفت۔ دراں زماں عالم عالم فریفتۂ رخِ نیکو و آشفتۂ زلفِ او بود۔ در وقتِ احمد شاہ ہنگامہ حسنِ او گرم بود۔ ایں ہمہ شعرائے متوسطین مانندِ پروانہ دل خود را بر شعلۂ حسنش می سوختند۔ او نیز بہ ایں ہا صحبت می داشت۔ اکثر اصلاحِ سخن از میر تقی میر سلمہ اللہ می گرفت طبع موزونے داشت۔ گاہ گاہے دو سہ بیت می گفت۔ از کتب عربی تا شرح ملا خواندہ بود۔ میر ضیا سلمہ اللہ بہ او

---

(۱) ص۳۲ (۲) ص۸۸

نظر لطف داشتند۔ چنانچہ تا حال ہر وقت کہ یاد او مے کنند می گریند۔ غرض کہ در عین نوجوانی از جہان فانی درگذشت[1]"

قیاس ہے کہ ضیاء احمد شاہ (۱۱۶۱ھ تا ۱۱۶۷ھ) کے زمانے تک دلی میں مقیم تھے۔ لیکن ان کے مزاج کی آشفتگی اس سے قبل شروع ہو چکی تھی۔ قائم مخزنِ نکات (۱۱۶۸ھ) میں لکھتے ہیں :-

بشامعشا۔ پرستی مشہور است ولیل و نہار بالشباہہ این روزگار مختو نی ہر حالتش آمد اسپت۔ تمکین و اصلاح است۔ یمکن کہ باطن نیز بخیر و فلاح باشد"

فیض آباد آنے کے بعد سوزاں کے ہمراہ دن گذرتے تھے اور ان کے متوسلین میں تھے۔ (تذکرہ شعرائے اردو ترجمہ سوزاں) ۱۱۹۴ھ میں ان کے بارے میں امراللہ الہ آبادی تذکرۂ مسرت افزا میں لکھتے ہیں :-

وطنِ اصلی[2] وے شاہ جہاں آباد است[3] از چندے دہلی را گذاشتہ توطن در عظیم آباد اختیار کردہ و برفاقتِ راجہ کلیان سنگھ عاشق تخلص[4] ناظم آں دیار[5] بسر می برد۔ اشعارش ضیاء ضیائے دیدۂ[6] طالبان است و راحت بخش گوشِ سامعان از

---

(۱) تذکرہ شعرائے اردو ص ۲۰۱، ۲۰۲ (۲) ص ۶۰ (۳) کلیان سنگھ کے حال کے لئے دیکھئے مسرت افزا ص ۱۵۲ (۵) تفسیر چند پارۂ کلام اللہ۔ دیوانِ فارسی۔ دیوانِ ہندی اور ایک تاریخ کی کتاب کے مصنف تھے۔ ۱۲۳۷ھ تک اتنی عمر رکھتے تھے۔ کہ اپنے باپ) راجہ شتاب رائے) کی نائب۔گی کرتے ہوئے محاربۂ بکسر میں فریقین کے درمیان گفت و شنید کرا سکیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے شجاع الدولہ از سری واستو ا۔جلد اول)

مولف ہم در عظیم آباد اکثر ملاقات می شد"[1]

امراللہ کلکتہ جاتے ہوئے ۱۱۹۲ھ میں الہ آباد میں تھے[2]۔ اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں (۱) میر ضیا ۱۱۹۲ھ تک زندہ تھے (۲) ۱۱۹۲ھ سے قبل عظیم آباد پہونچ چکے تھے پہلے نتیجے کی روشنی میں اشپرنگر کا یہ بیان (بحوالہ گلشنِ ہند و گلزارِ ابراہیم) کہ ضیا ۱۱۹۶ھ میں عظیم آباد پٹنہ گئے درست نہیں ہوسکتا۔ ہمارے خیال میں ضیاء ۱۱۹۲ھ سے بھی بہت پہلے فیض آباد سے پٹنے جاچکے تھے کہ مصحفی ۱۱۸۶ھ میں فیض آباد آئے تھے (تذکرۂ ہندی ترجمہ سودا) اس کے بعد ۱۱۹۸ھ (عقد ثریا: ترجمہ بے تاب) میں لکھنؤ میں تعزیت کش ہوتے۔ ضیاء کے حال میں تذکرۂ ہندی[3] میں لکھتے ہیں :۔ "بندہ او را نہ دیدہ[4]"

اس لئے اغلب ہے کہ ۱۱۸۶ھ سے قبل ہی ضیا فیض آباد سے جاچکے تھے غالباً اسی لئے میر حسن کو سودا کے فیض آباد آنے کے بعد (۱۱۸۶ھ) اس سے اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی۔ طبقات الشعرائے قدرت اللہ شوق جو ۱۱۸۸ھ کی تالیف ہے۔ اس میں ضیاء کے حال میں لکھا ہے کہ "از استادانِ میر حسن کہ مصنفِ مثنوی بدر منیر است بودہ و دیگر احوالش بہ تحقیق نہ رسیدہ" (اقتباس بشکریہ قاضی عبدالودود صاحب) یہ بیان ۱۱۸۸ھ کا نہیں بلکہ ۱۱۹۹ھ کے بعد کا ہے۔ اس لئے کہ اس میں سحرالبیان کا ذکر بھی موجود ہے۔ جو ۱۱۹۹ھ میں تصنیف ہوئی۔ وہاں یہ نتیجہ ضرور نکالا جاسکتا ہے کہ ضیا اس وقت تک فوت ہوچکے تھے۔

---

(۱) مسرت افزا ص ۱۳۳ (۲) راسخ کے حال میں اس سفر کی تفصیل خود ہی دیتے ہیں دیکھئے ص ۸۶
(۳) آغاز تذکرہ: ۱۲۰۰ھ انجام ۱۲۰۹ھ اضافے بعد میں بھی کئے (۴) تذکرۂ ہندی ص ۱۴۱
(۵) اگلے باب میں بھی اس کا ذکر آئے گا۔

مجموعۂ نغز کے مصنف قدرت اللہ قاسم (۱۲۲۰ھ) بھی ان کا ذکر بطور مرحوم کے کرتے ہیں۔ یہی حال گلشنِ ہند (۱۲۱۵ھ) کا ہے۔ اشپرنگر کی رائے میں ضیاء آخر عمر میں مرشد آباد چلے گئے تھے[1] اتنا غلطی ہے کہ ۱۱۹۴ھ تک زندہ تھے۔
عبدالغفور نساخ (۱۲۹۱ھ) سخن شعراء میں لکھتے ہیں:۔

"۱۱۹۴ھ میں فوت کی بعض صاحبِ تذکرہ نے لکھا ہے کہ وہ ۱۱۹۶ھ میں عظیم آباد میں بقیدِ حیات تھے[2]"

سید علی حسن خاں (بزمِ سخن (۱۲۹۸ھ) میں لکھتے ہیں کہ ۱۱۹۲ھ میں وفات پائی (ص ۷۹) سید نورالحسن طورِ کلیم (۱۲۹۸ھ) میں لکھتے ہیں:۔

"در ۱۱۹۴ھ یا ۱۱۹۶ھ آنجہانی شد[3]"

جواہرِ سخن میں کیفی چڑیا کوٹی ان کی وفات کا سال ۱۱۹۴ھ دیتے ہیں[4]۔ ان کی تقلید میں نورالحسن ہاشمی "دلی کا دبستانِ شاعری" میں ۱۱۹۴ھ ہی کو درج کرتے ہیں[5]۔ دتاسی کا بیان ہے کہ لطف نے ضیاء کا قطعہ تاریخ وفات بھی کہا تھا[6] ہمیں لطف کا کہا ہوا قطعہ نہیں مل سکا ورنہ قطعی تاریخ ہاتھ آجاتی۔ بہرحال وفات کا حال نہیں کھلتا۔ ضیاء کا ایک مختصر دیوان اردو قاضی عبدالودود صاحب کے پاس پٹنے میں ہے عنقریب شائع ہو گا۔

سودا: سودا پر اب تک خاصا کام ہوا ہے۔ شیخ چاند کی "سودا"، قاضی عبدالودود کے مقالات (معاصر اور نقوش میں)، کلب علی خاں فائق کے مقالے (معارف اور ماہِ نو میں) اسی طرح حافظ محمود شیرانی کا تبصرہ آبِ حیات

---

(۱) اشپرنگر فہرست بزبان انگلش ص ۲۱۹ (۲) ص ۲۹۰ (۳) ص ۶۶ (۴) ص ۲۰۷ جلد اوّل دورِ اوّل۔
(۵) ص ۱۸۵ (۶) دتاسی تاریخ ادبِ ہندی و ہندوستانی بزبانِ فرانسیسی جلد سوم ص ۳۴۴۔

(۱) اورنٹیل کالج میگزین، اہم ہیں۔

نام محمد رفیع والد کا نام مرزا شفیع، سنہ پیدائش میں اختلاف ہے۔ شیخ چاند کے خیال میں ولادت سنہ ۱۱۰۶ھ سے قبل ہوئی[۱] (سودا صفحہ ۳۵) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی رائے میں سودا کی ولادت سنہ ۱۱۱۰ھ سے قبل کی ہے[۲]۔ فائق کی رائے میں سودا سنہ ۱۱۱۸ھ اور سنہ ۱۱۲۰ھ کے مابین پیدا ہوئے[۳]۔ قاضی عبدالودود کی رائے میں پیدائش سنہ ۱۱۱۹ھ کے قریب ہوئی[۴]۔ شیخ چاند کا بیان قائم کے تذکرے کی عبارت پر منحصر ہے۔ شیرانی لکھتے ہیں کہ چاند کو قائم کی عبارت کا مطلب سمجھنے میں دھوکا ہوا ہے[۱]۔ نیز "تذکرۂ میر حسن سنہ ۱۱۸۰ھ کے قریب لکھا جاتا ہے کہتے ہیں کہ "سن شریفش بہ ہفتاد رسیدہ باشد" اس اقتباس سے انہیں سنہ ۱۱۱۸ھ یا سنہ ۱۱۲۰ھ میں پیدا ہونا چاہیے[۵]۔ ڈاکٹر ابواللیث اپنی تائید میں کلیاتِ سودا کے ایک نسخے کا ذکر کرتے ہیں۔ جس کی مہر پر بھروسہ کر کے وہ سودا کی ولادت سنہ ۱۱۱۰ھ سے قبل مانتے ہیں[۶]۔ کلب علی خاں فائق لیث کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ لیث نسخۂ کلیات کی مہر کو صحیح طور پر نہیں پڑھ سکے۔ عرشی صاحب نے اسی علی گڑھی نسخے کی مہر کو خوردبین سے پڑھا ہے۔ اور وہاں سنہ ۱۱۱۶ھ نہیں بلکہ سنہ ۱۱۷۶ھ لکھا ہے۔ عمر پر مفصل بحث کرنے کے بعد فائق سودا کی پیدائش سنہ ۱۱۱۸ھ اور سنہ ۱۱۲۰ھ کے مابین قرار دیتے ہیں[۷]۔ اس لئے کہ تذکرۂ نکات الشعراء (میر: سنہ ۱۱۶۵ھ) کی تحریر کے وقت

---

(۱) لکھنؤ کا دبستانِ شاعری صفحہ ۸۸ (۲) سودا کی صحیح عمر، مقالہ فائق معارف نمبر ۱ جلد ۷، جولائی سنہ ۱۹۵۲ء صفحہ ۶۸ تا صفحہ ۷۵ (۳) معاصر حصہ دوم صفحہ ۱۰۹ (۴) اورنٹیل کالج میگزین نومبر سنہ ۱۹۲۱ء صفحہ ۴۳۔

(۵) ایضاً (۶) لکھنؤ کا دبستانِ شاعری صفحہ ۸۸ (۷) سودا کی صحیح عمر۔ فائق معارف نمبر ۱ جلد ۷، جولائی سنہ ۱۹۵۲ء صفحہ ۶۸، صفحہ ۷۵۔

انہیں جوان ہونا چاہیے: "مرزا رفیع المتخلص بسودا کہ جوانیست خوش خلق، خوش خو، گرم جوش"[1]۔ لیث اور چاند کے بیان کے مطابق تو وہ اس وقت بوڑھے ہو گئے۔ صاحبِ گلشنِ ہند سودا کو وفات (۱۱۹۵ھ) کے وقت ستر برس کا بیان کرتے ہیں[2]۔ اسی بنیاد پہ محمد حسین آزاد سودا کا ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہونا قیاس کرتے ہیں۔ مردان علی خاں مبتلا کے گلشنِ سخن پر اعتبار کیا جائے تو سودا کے قیام دہلی تک ان کی عمر ساٹھ سال کی ہو چکی تھی

نشترِ عشق کا بیان اس سے ملا کر دیکھا جائے تو سودا درانی کے دوسرے حملے کے بعد (۱۱۷۱ھ) دلی سے روانہ ہوئے[3]۔ اس حساب سے پیدائش ۱۱۱۲ھ کے قریب بنتی ہے۔ لیکن پہلے یہ طے ہونا ضروری ہے کہ سودا کس سنہ میں دہلی سے نکلے۔ مخزنِ نکات میں زندہ کے حال میں ہے

"چنانچہ میر سوز و بغیرہ دو سہ شاعر ریختہ از قدیم بخدمت او می بودند۔ و دریں اثنا یگانۂ جہاں ... حضرتم مرزا محمد رفیع سودا سلمہ اللہ تعالیٰ برفاقتِ وزیر الممالک نواب غازی الدین خاں بہادر در بلدۂ فرخ آباد رسیدند و خانِ موصوف (زندہ) از نواب وزیر درخواستہ مرزائے موصوف را برفاقتِ خود گرفت"[4]

چاند کے خیال میں سودا اس موقع پر عماد الملک کے ہمراہ ۱۱۶۸ھ میں فرخ آباد گئے[5]۔ لیکن یہ درست نہیں۔ لوشی صاحب کی رائے[6] اول بار عماد الملک ۱۱۷۰ھ میں فرخ آباد گئے۔ سودا کو ۱۱۷۰ھ کے دہلی کو خیرباد کہنا چاہیے۔ سودا کے دیوان میں نواب مہربان خاں کی شادی کا قطعہ تہنیت پایا جاتا ہے جس

---

(۱) نکات ص ۳۱ (۲) گلشنِ ہند ص ۱۲۴ (۳) حواشی دستور الفصاحت (۴) ص ۱۱۵ (۵) سودا ص ۵۵

...... سے ۱۱۷۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔ چونکہ عماد الملک ۱۱۷۶ھ میں بھرت پور سے فرخ آباد گئے ہیں۔ اس لئے اغلب یہ ہے کہ سودا احمد شاہ کے دوسرے حملے کے بعد عماد الملک کے پاس بھرت پور پہونچے اور وہاں ان کے ساتھ ۱۱۷۶ھ میں فرخ آباد چلے گئے۔ اس صورت میں قائم نے ان کے متعلق جو لکھا ہے وہ ۱۱۷۶ھ کے بعد کا اضافہ ہوگا۔[1] فائق سودا کے عماد الملک کے ساتھ پہلے سفر میں فرخ آباد جانا بیان کرتے ہیں جو ۱۱۷۰ھ کا واقعہ ہے۔ عرشی نے غالباً سودا کی استادیٔ شاہ عالم کے خیال سے دوسرے سفر کو ترجیح دی ہے۔ حالانکہ معاصر تذکرے اس استادی شاگردی کے بارے میں خاموش ہیں۔ گلشن ہند کا تخمینہ عرشی کے بیان کے ساتھ دیکھا جائے تو پھر سودا کا سنہ ولادت ۱۱۰۱ھ بنتا ہے جو کسی طرح صحیح نہیں۔ سر جادو ناتھ سرکار کی ۔ سقوط سلطنت (Mughals. سے معلوم ہوتا ہے کہ عماد الملک بھرت پور میں ۱۷۶۶ء میں تھے۔ وہاں سے وہ فرخ آباد ۲۷ مئی ۱۷۶۶ء میں پہونچے ہیں جو ۱۶ ذی الحجہ ۱۱۷۹ھ کے برابر ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جواہر سنگھ جاٹ نے انہیں ڈیگ سے چلتا کیا ہے قیاس ہو سکتا ہے کہ سودا اس سفر میں عماد الملک کے ہمراہ ہوں۔ اس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ مہربان خاں کی شادی کا قطعہ سودا نے دہلی یا ڈیگ سے انہیں روانہ کیا۔ اس طرح سودا کی روانگی ۷۰ سال کی عمر میں تھی تو سنہ ولادت ۱۱۰۹ھ ہوگا۔ بقول قاضی عبدالودود باغ معانی (۱۱۷۴ھ) میں سودا کو ۵۵ برس کا لکھا ہے۔[2] اسطرح سودا کا سنہ ولادت ۱۱۱۹ھ بنتا ہے (ملخصاً)

---

(۱) دیباچہ دستور الفصاحت عرشی ص ۵۸ (۲) کچھ سودا کے بارے میں معاصر جلد دوم ص ۱۰۹۔

میر حسن ۱۱۸۶ھ میں سودا کو ستر برس کا بتا رہے ہیں۔ یہ بھی ۱۱۱۹ھ کی تائید میں ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ سودا ۱۱۷۹ھ میں دلی سے نکلے اور فرخ آباد گئے۔
دلی میں سودا کے والد تجارت پیشہ تھے۔ ان کی وفات کے بعد سودا کے ہاتھ ترکہ لگا تو اس کا تھوڑے عرصے ہی میں اس نے صفایا کر دیا[۱]۔ آخر فوج میں نوکری کی۔ شاعری کا آغاز ۱۱۵۰ھ کے قریب ہو گیا تھا۔ اول سودا نے سلیمان قلی وداد سے اور حاتم سے اصلاح لی (عقد ثریا: مصحفی ص ۳۲) حاتم نے انہیں اپنے شاگردوں میں شمار کیا ہے۔ لیکن سودا خانِ آرزو سے بھی اصلاح لیتے رہے ہیں۔ خانِ آرزو کے بھانجے میر حسن کے لڑکے میر محسن ۱۱۸۰ھ میں محاکمات الشعراء میں لکھتے ہیں:۔

عزیز دلہا الطوطی خوش نوا، مرزا رفیع السودا کہ ملک الشعرائے ریختہ گویاں ذاتِ ستودہ صفاتِ اوست۔ اکثر در جنابِ حضرت سراج المحققین و دقائقِ محاورۂ زبانِ ریختہ را تحقیق فرمودہ و اشعارِ خود را برائے اصلاح از نظرِ مبارکِ آں تارۃ الشعراء می گزرانید و بجناب راہم کمالِ محبت دلی با مرزا رفیع سودا اسلمہ اللہ تعالیٰ بودہ[۲]

دلی سے سودا عماد الملک کے ہمراہ ۱۱۷۹ھ میں فرخ آباد پہنچے بقولِ چاند وہاں ۱۱۸۵ھ سے قبل تک قیام کیا (سودا ص ۵۵) فرخ آباد چھوڑنے کی تاریخ ۱۱۸۳ھ اور ۱۱۸۵ھ کے درمیان پڑتی ہے[۲] لیکن قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ سودا

---

(۱) چاند: بحوالہ مخزن نکات (۲) شیرانی: اورئینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۲۱ء ص ۳۴ اسی اورئینٹل کالج میگزین: مقالہ ڈاکٹر سید عبداللہ بعنوان محاکمات الشعرائے میر محسن اکبر آبادی - فروری ۱۹۵۱ء ص ۷۲ (۲) ایضاً ص ۵۶ -

۱۱۸۶ھ میں فیض آباد گئے[1]۔ مصحفی فیض آباد میں ۱۱۸۶ھ میں ان سے ملا تھا[2]۔ جہاں سودا شجاع الدولہ کی سرکار میں صیغۂ شاعری میں سرفراز تھے[3]۔ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد جب آصف الدولہ نے دارالخلافہ لکھنؤ بنایا تو یہ بھی لکھنؤ چلے آئے (۱۱۸۹ھ یا ۱۱۹۰ھ) اور بقیہ عمر یہیں بسر کی۔

قیام فیض آباد کے دوران میں ان کا میر ضاحک سے معرکہ ہوا۔ پھر مکین سے مجادلہ کیا۔ جو ۲۱(۲۴) ذی قعد ۱۱۸۹ھ اور صفر ۱۱۹۰ھ کے درمیان پیش آیا[4]۔ لکھنؤ آنے کے بعد دربارِ اودھ میں انہیں عروج حاصل رہا۔ ۱۱۹۲ھ میں مصحفی انہیں لکھنؤ میں مقیم پاتے ہیں[5]۔ اس سے قبل ۱۱۹۱ھ میں امراللہ الہ آبادی ان سے لکھنؤ میں مل چکے تھے[6]۔ ۱۱۹۱ھ سے قبل ان کی ماشاء اللہ مصدر، پدرِ انشاء سے بھی چھیڑ چل چکی تھی[7]۔ سودا نے لکھنؤ میں ۴ رجب ۱۱۹۵ھ میں وفات پائی[8] اور ائمہ باقر کے امام باڑے میں دفن ہوئے[9]۔ مصحفی نے تاریخ وفات کہی:-

"سودا کجا و آں سخنِ دلفریبِ او"

درد :- "سید العارفین حضرت میر سید محمد حسینی قادری بن نواب میر احمد خاں شہید نے جو ان کے نانا تھے ان کا نام خواجہ میر رکھا[10]۔" درد نے اپنی تصانیف میں اکثر جگہ اپنا نام خواجہ میر المحمدی یا میر محمدی لکھا .... اصلی

---

(۱) ضاحک ص۱۳۶ (۲) تذکرہ ہندی ترجمہ سودا (۳) تذکرہ شعرائے اردو ص۸۲ (۴) مکین و سودا مقالہ قاضی عبدالودود۔ معاصر حصہ اول ص۹۵ (۵) حواشی دستور الفصاحت ص۱۵ (۶) مسرت افزا ص۹۷ (۷) ایضاً ص۹۸ (۸) فائق اورینٹل کالج میگزین، ۱۹۵۶ء، ص۹۲ بحوالہ قطعہ شفیق۔ (۹) تذکرہ ہندی ص۱۲۶، گلشن ہند ص۱۲۳ (۱۰) اکرام اللہ۔ خواجہ میر درد اور ان کی شاعری تحقیقی مقالہ برائے ایم اے اردو۔ قلمی پنجاب یونیورسٹی لائبریری ص۲ بحوالہ علم الکتاب ص۸۴"

میں محمدی یا المحمدی کا لفظ ان کے نام کا جز نہیں، بلکہ یہ محقق اضافہ ہے۔ طریقۂ محمدیہ کی مناسبت سے جو ان کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب سے شروع ہوتا ہے[۱] درد تخلص تھا۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب کے بیٹے تھے۔ سلسلۂ نسب خواجہ بہاالدین نقشبندی تک پہنچتا ہے (مجمع النفائس قلمی از خان آرزو) ان کے بزرگوں میں خواجہ محمد طاہر تھے۔ جو شاہ جہاں کے عہد میں بخارہ سے ہندوستان میں آئے اور شجاع برادر اورنگ زیب کے متوسل ہوئے[۲]۔ اسی خاندان میں نواب ظفر اللہ خاں روشن الدولہ تھے۔ فرخ سیر اور جہاندار شاہ کے زمانے میں سیاست میں حصہ لیا۔ محمد شاہ کے عہد میں بڑا ارتبہ پایا۔ طرہ باز خاں کے نام سے مشہور ہوئے۔ ۱۰ ذی الحجہ ۱۱۶۱ھ میں چورانوے سال پانچ مہینے کی عمر پاکر سرطان کے مرض سے انتقال فرمایا[۳]۔ روشن الدولہ کے گھر ۲۵ شعبان ۱۱۰۵ھ میں خواجہ محمد ناصر پیدا ہوئے۔ انہوں نے بھی دنیاداری میں قدم رکھا۔ بیس سال کی عمر میں فوج میں سردار ہوئے۔ لیکن باپ کی وفات پر سیاسیات سے کنارہ کشی ہو کر زہد و تقوی کی زندگی شروع کی اور صوفی ہو گئے[۴]۔ سلوک میں طریقہ محمدیہ کا آغاز کیا۔ درد نے شمع محفل میں آپ کی تاریخ وفات ۱۱۷۲ھ دی ہے کتبۂ مزار پر ولادت ۲۵ شعبان ۱۱۰۵ھ اور رحلت یوم شنبہ بعد العصر

---

(۱) اللہ دتہ نسیم - خواجہ میر درد کا تصوف - تحقیقی مقالہ ایم اے اردو قلمی پنجاب یونیورسٹی لائبریری ص ۱۹ (۲) اکرام اللہ ص ۱۳ بحوالہ ماثر الامرا صمصام الدولہ ص ۳۴۲ - (۳) اکرام اللہ ص ۱۴ ، ص ۱۵ بحوالہ ماثر الامرا ص ۳۴۵ لیکن ماثر الامرا میں سنہ وفات غلط ہے ۱۱۴۹ھ نہیں ۔ قطعہ تاریخ سے ۱۱۶۱ھ برآمد ہوتا ہے۔

قریب بہ شام دوم ماہ شعبان ۱۱۷۲ھ اور عمر شریف ۶۶ برس درج ہے۔[1]
خواجہ محمد ناصر عندلیب کی دو بیویاں تھیں۔ ایک بیوی سے میر محفوظ[2] (یہ بھی سب سے بڑے تھے۔) دوسری بیوی سے خواجہ میر درد سب سے بڑے میر محمدی[3] ان سے چھوٹے اور محمد میر اثر سب سے چھوٹے تھے۔[4] کتبہ مزار اور شمیم محفل کے بیانات پر تفصیلی بحث کر کے اکرام اللہ نے ولادت ۱۹ ذی قعدہ ۱۱۳۳ھ عمر شریف ۶۸ سال اور رحلت ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ یوم جمعہ قبل صبح صادق درج کی ہے۔[5] اللہ ونہ نسیم ۱۱۳۱ھ کے حق میں ہیں۔ لیکن ان کا دعوے بے دلیل اور غلط فہمی پر منحصر ہے۔ میر حسن اپنے تذکرے میں انہیں جوانان محمد شاہی میں شمار کرتے ہیں۔ جناب آسی[6] فرماتے ہیں " درباری مصاحبت میں بھی وقت گذرا۔ ۲۸ برس کا سن ہوا تو دنیا و مافیہا سے منہ موڑ کر سجادۂ فقیر و قناعت کا تکیہ لگا کر بیٹھ گئے۔" اکرام اللہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔[7] فقیری سے پہلے درد سپاہی پیشہ تھے۔[8] میر تقی میر گردیزی اور قائم کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۶۵ھ تک تصوف کا رنگ ان پر خوب چڑھ چکا تھا۔
ان کی شادی ۱۵/۱۶ برس کی عمر میں ہوئی۔ چند سال بعد ان کے ہاں خواجہ "صاحب میر" (الم) پیدا ہوئے۔ ان کے بعد پراتی بیگم عالم ظہور میں آئیں "زینت النساء" نے ان دونوں کے بعد جنم لیا۔[9] زینت النساء کے بیٹے محمد نصیر

---

(۱) ایضاً ص۱۷، ص۱۸ (۲) ولادت ۱۱۲۵ھ: محمد محفوظ تاریخی نام رحلت ۱۶ رجب ۱۱۵۶ھ رسی ۱۹ سال کی عمر میں ۵ ربیع الثانی ۱۱۶۳ھ وفات پائی (۵) ایضاً ص۱۹، ۱۵ (۵) ایضاً ص۱۹، ص۲۰۔
(۶) دیباچہ دیوان درد۔ نولکشور پریس ایڈیشن ۱۹۲۹ء ص۱ (۷) اکرام اللہ ص۲۲ (۸) عقد ثریا: مصحفی نے ان کا حال ۱۱۹۹ھ کے بعد قلم بند کیا ہے (۹) اکرام اللہ ص۲۲

رنج تھے۔ ان کی اولاد اب تک دلی میں باقی ہے[۱]۔ درد نے اپنا تخلص ایک خاص نسبت سے رکھا۔ یہ بات ان کے پیروں کے سلسلے کو دیکھ کر معلوم ہوتی ہے:

حضرت شاہ محمد	گل (تخلص)	حضرت سعد اللہ	گلشن:
خواجہ ناصر	عندلیب	خواجہ میر	درد
خواجہ میر محمد	اثر	خواجہ صاحب میر	الم
خواجہ میر نصیر	رنج	خواجہ ناصر نذیر	فراق[۲]

انہیں موسیقی کا بھی شوق تھا اور میاں فیروز خاں گویے سے "نقش" درست کیا[۳]۔ علوم رسمیہ کی تکمیل مفتی دولت سے کی[۴]۔ شاعری میں خانِ آرزو سے فیض حاصل کیا۔ (چنانچہ محمد حسین ان کے بارے میں مفصل اطلاع دیتے ہیں) دلی پہ بربادیاں نازل ہوتی رہیں لیکن خواجہ صاحب نے شہر کو نہ چھوڑا اور وہیں ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ میں وفات پائی[۵]۔

ان کی تصانیف تعداد میں ۱۲ ہیں۔ بعض پوری کتابیں اور بعض کتب رسائل متفرقہ کا مجموعہ ہیں۔ اکرام اللہ نے نالۂ درد۔ آہِ سرد۔ شمع محفل وغیرہ کے حوالے سے جو فہرست دی ہے ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

(۱) اسرار الصلوٰۃ: پندرہ کا سن تھا رمضان کا مہینہ حالتِ اعتکاف میں تحریر کیا (بحوالہ نالۂ درد) (۲) واردات: انتالیس سال کی عمر میں مرتب کیا۔ (ایضاً) (۳) صحیفۂ واردات: تین سال میں مکمل کی ۱۱۷۹ھ، ۱۱۸۰ھ، ۱۱۸۱ھ (۴) نالۂ درد۔ ۱۱۹۰ھ (بحوالۂ درد) (۵) آہِ سرد ۱۱۹۲ھ (بحوالہ آہِ سرد)

---

(۱) ایضاً (۲) اکرام اللہ ص۲۷ب (۳) اورینٹل کالج میگزین جلد ۱۹۵۱ء ص۲۳
(۴) ایضاً (۵) دستور الفصاحت حواشی ص۳۸۔

(۶) دردِ دل۔ شمع محفل کے ساتھ ابتدا کی (شمع محفل) (۷) شمع محفل ۱۱۹۹ھ میں مکمل کی (الیضاً) (۸) حرمتِ غنا (۹) سوزِ دل و (۱۰) واقعاتِ درد (یہ رسائل بقول فراق (میخانۂ درد) غدر میں تلف ہو گئے[۱]) (۱۱) دیوانِ فارسی (۱۲) دیوانِ اردو[۱]

میر :۔ میر کے حال میں خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "میر ــــ" شائع ہوئی ہے۔ اس میں اکثر "ذکرِ میر" ہی کے بیانات کا ترجمہ یا خلاصہ پیش کیا ہے۔ خود ذکرِ میر (میر تقی میر) کا یہ عالم ہے کہ میر نے اپنی اس خود نوشت سوانح عمری میں واقعات کی ترتیب کا کوئی خاص لحاظ نہیں رکھا۔ اس میں تاریخی واقعات آگے پیچھے ہو گئے ہیں۔ جس سے مورخین نے سنین کے تعین میں دھوکے کھائے ہیں۔ بعض جگہ میر سے واقعات کے بیان میں بھی غلطیاں ہو گئی ہیں۔ خصوصاً اپنے "پاگل پن" سے قبل کے واقعات (ابتدائی حالات) پوری صحت کے ساتھ قلم بند نہیں ہوتے۔ اس کا سبب شاید یہ بھی ہے کہ اصل واقعات اور ان کی تحریر میں نصف صدی کا فصل ہو گیا ہے بہرحال (ان اوگھٹ گھاٹیوں سے قطع نظر) میر کی زندگی کے بعض اہم واقعات یہ ہیں:۔

میر تقی میر خود کو سید کہتے ہیں۔ ان کے بعض معاصرین[۲] اس میں شک کرتے ہیں۔ ان کے والد کا نام محمد علی اور لقب علی متقی تھا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب ذکرِ میر کے حوالے سے میر علی متقی نام دیتے ہیں۔ لیکن پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی تحقیق کے مطابق ذکرِ میر میں میر محمد علی نام دیا ہے اور خطاب علی متقی تھا۔ آگرے میں ۱۱۳۵ھ میں پیدا

---

(۱) اکرام الدولہ ۲۶ تا ۲۵ (۲) مثلاً امر اللہ الہ آبادی مسرت افزا ترجمۂ میر (۳) آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ ۲۶ ، ۲۷

ہوئے۔ دس برس کے تھے کہ والد نے وفات پائی[۱]۔ والد کے حالات ذکرِ میر میں انہوں نے خود تفصیل سے لکھے ہیں۔ لیکن زیادہ قابلِ اعتبار نہیں۔ ان کے بعض بیانات مثلاً والد کے سفرِ لاہور کی تفصیل[۲] نیز صمصام الدولہ سے ملاقات کی تفصیل محلِ نظر ہے[۳]۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ حملۂ نادری تک صمصام الدولہ کی سرکار سے انہیں اور یہ ملتا رہا میر جب دلی آئے تو خانِ آرزو کے ہاں مقیم ہوتے۔ یہیں ان پر جنون کا دورہ پڑا[۴]۔ اطبا کے علاج سے افاقہ ہوا۔ خانِ آرزو سے انہوں نے ادب و شعر میں استفادہ کیا اور اس کا اقرار خود نکات الشعرا میں کیا ہے۔ ذکرِ میر اگرچہ بعد کی تالیف ہے لیکن اس میں خانِ آرزو کے شاگردی کا ذکر نہیں کرتے۔ نکات الشعرا کے علاوہ محمد محسن ۱۱۸۰ھ کی محاکمات الشعرا میں بھی میر کے شاگرد آرزو ہونے کا مفصل ذکر موجود ہے[۵]۔ میر نے شعبان ۱۱۶۵ھ میں نواب بہادر جاوید خان کے قتل ہونے پر خانِ آرزو کی ہمسائیگی بھی چھوڑ دی[۶]۔ دلی میں مختلف امرا سے متعلق رہے اور اس کی تفصیل ذکرِ میر میں دیتے ہیں۔

خانِ آرزو مجمع النفائس میں لکھتے ہیں کہ چند سال سے عمدۃ الملک مہاراجہ بہادر کی سرکار میں ہیں[۷]۔ مہاراجہ بہادر سے مراد راجہ ناگرمل ہیں جنہیں ۱۱۶۳ھ میں راجہ کا خطاب ملا تھا۔ لکھنؤ میں میر کی آمد کے سنین میں اختلاف ہے۔ آزاد کا بیان ہے میر ۱۱۹۰ھ میں لکھنؤ آئے[۸]۔

---

(۱) دیباچہ کلیاتِ میر آسی ص ۹ بحوالہ نولکشور کلیات (۲) مقالۂ فائق مطبوعہ اخبارِ امروز بعنوان علی متقی (۳) کچھ میر کے بارے میں۔ مقالہ قاضی عبدالودود صاحب نقوش اگست ۱۹۵۳ء ص ۔۔
(۴) ذکرِ میر ص ۴۳ (۵) اورینٹل کالج میگزین۔ فروری ۱۹۵۱ء ص ۴۳، ۴۷ (۶) دیباچہ دستور الفصاحت ص ۴۶ (۷) دستور الفصاحت ص ۲۳ (۸) آبِ حیات ترجمۂ میر۔

مرزا علی لطف فرماتے ہیں کہ میر سودا کی وفات (۱۱۹۵ھ) کے بعد وارد لکھنؤ ہوئے ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے ادبی دنیا دسمبر ۱۹۴۰ء میں رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو پر جو ریویو کیا تھا اس میں میر کے لکھنؤ آنے کا سنہ متعین کیا ہے، فرماتے ہیں :-

ذکر میر میں میر صاحب نے لکھنو جانے کا حال تفصیل سے لکھا ہے لیکن افسوس ہے کہ تاریخ نہیں بتلائی ۔ ہاں اس زمانے کے بعض تاریخی واقعات ایسے لکھے ہیں جس سے لکھنؤ جانے کا زمانہ بہ آسانی متعین ہو سکتا ہے ۔ میر صاحب لکھتے ہیں کہ میر کے لکھنو پہونچنے کے بعد ذوالفقار الدولہ نجف خان کا انتقال ہوا "بعد از آمدن من ایں طرف آں جا کہ نجف خاں بہ بستر افتادہ بود فوت کرد"[1] اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ نجف خاں کا کب انتقال ہوا ۔ میر صاحب کے دہلی چھوڑنے کا زمانہ خود معلوم ہو جائے گا ۔ خیر الدین محمد الہ آبادی کا بیان ہے کہ دوم ربیع الثانی ۱۱۹۶ھ از حویلی قمر الدین خان در حویلی صفدر جنگ آوردند لیکن مرض روز بروز در تزاید بود (عبرت نامہ جلد دوم) خود نجف خان کے مزار پر جو کتبہ قطعہ تاریخ کا کندہ ہے اس سے وفات کا سن ۱۱۹۶ھ نکلتا ہے کمال الدین حیدر مصنف سوانحات سلاطین اودھ نے اس قطعہ کو اپنی کتاب میں لکھا ہے ۔ ان دونوں بیانوں سے پتا چلتا ہے کہ نجف خان نے ۲ ربیع الثانی ۱۱۹۶ھ کو انتقال کیا اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ میر صاحب نے

---

[1] ذکر میر ص۱۴۲ ..

"۱۰ محرم کے کئی ہفتہ بعد اور ۲۴ ربیع الثانی ۱۱۹۶ھ سے کچھ قبل دہلی چھوڑ دی تھی اور لکھنؤ پہونچ گئے تھے۔"

میر کا باقی زمانہ لکھنؤ ہی میں گزرا۔ مرزا قتیل نے اپنے ایک رقعے میں ایک مشاعرے میں میر کی شمولیت کا ذکر کیا ہے اور بڑھاپے کے باعث ان کی آواز کی پستی کی تفصیل بیان کی ہے۔ "میر نے لکھنؤ میں ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ کی شام کو وفات پائی اور ۲۱ شعبان کی دوپہر کو اکھاڑہ بھیم میں اپنے اقربا کی قبروں کے درمیان دفن ہوئے[۱]۔"

ایک ضخیم کلیات۔ ذکر میر اور فیض میر ان سے یادگار ہیں۔ (حال ہی میں ان کے مرثیوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا ہے) مرتب مسیح الزماں)

سودا:- محمد میر نام[۲]، سید ضیاء الدین بخاری کے فرزند۔ نکات الشعراء کی تالیف کے وقت (۱۱۶۵ھ) تک دلی ہی میں تھے اور میر تخلص کرتے تھے[۳]۔ سید تھے۔ بے نظیر خوش نویس، خط شکستہ اور خط شفیعہ کے ماہر تھے۔ موسیقی سے بھی واقف تھے[۴]۔ مخزن نکات کی تالیف کے وقت (۱۱۶۸ھ) توپ خانہ شاہی (دلی) میں ملازم تھے اور قائم سے "ہم قربتی" کے سبب اکثر اس سے ملاقات رہتی تھی۔ سودا سے قبل مہربان خاں کی سرکار میں پہونچ چکے تھے[۵]۔ "غالباً ۱۱۶۹ھ میں فرخ آباد پہنچ چکے تھے جیسا کہ قائم نے سودا کے حالات میں لکھا ہے۔ تاریخ فرخ آباد میں مولوی

ملہ:۔ مقدمۂ کلیات میر مرتبہ آسی ص۳ :۔ ملہ تذکرہ شعرائے اردو ص۵۸ :۔ ملہ نکات الشعراء ص۱۵۰ :۔ ملہ مخزن نکات ص۴۸ :۔ ملہ ایضاً ص۴۸ :۔ ملہ:۔ ایضاً ص۵۵ وحواشی تذکرۂ شعراء ابن طوفان ص۲۵ :۔

ولی اللہ فرخ آبادی لکھتے ہیں کہ نواب احمد خاں بنگش کی حیات (وفات ۲۸ ربیع الاول ۱۱۸۵ھ) میں ان کے دیوان مہربان رند سے متعلق تھے[1]۔ میر انہیں جوان لکھتے ہیں۔ مصحفی[2] انہیں ستر برس سے متجاوز بیان کرتے ہیں[3]۔ قیاس ہے کہ میر کے ہم عمر ہوں گے۔ قدرت اللہ شوق (۱۱۸۸ھ) تالیفِ تذکرہ سے قبل محمد نگر، ٹانڈہ میں ان سے ملے تھے[4]۔ مصحفی تذکرۂ ہندی میں لکھتے ہیں کہ نواب، یار محمد خان نے ٹانڈہ میں سودا اور سوز کو بلایا۔ وہ ان دنوں فرخ آباد میں مہربان خان رند کے ملازم تھے اس لئے نہ آئے[5]۔ نواب نے قائم کو جو بسولی ہی تھے بلا لیا[6]۔ مصحفی بھی اس زمانے میں نواب کے ملازم تھے، قائم وہاں تازہ وارد تھے کہ مصحفی ٹانڈہ پہنچے اور تین ماہ وہاں قیام کیا[7]۔ یہ واقعات ۱۱۸۵ھ کے ہیں گویا ۱۱۸۵ھ تک سوز فرخ آباد میں مہربان خان کی سرکار میں تھے۔ سکر تال کی لڑائی (۱۱۸۵ھ) میں مصحفی کے مربی کی بساط درہم برہم ہوئی[8] اور مصحفی لکھنؤ چلے آئے۔ ٹانڈے میں شوق، سوز سے ۱۱۸۵ھ کے بعد ملے ہوں گے۔ تاہم اتنا قطعی ہے کہ ۱۱۸۹ھ سے پہلے سوز فیض آباد آچکے تھے اور میر حسن کے ان سے روابط قائم ہو چکے تھے[9]۔ میر حسن سے دوستی کے وقت تک تیراندازی پر ایک رسالہ بھی لکھ چکے تھے[10]۔ اس زمانے میں سوز نے گوشہ نشینی بھی اختیار کر لی تھی[11]۔ اس کی تصدیق گلشن ہند (۱۲۱۵ھ) سے

---

[1] دلی کا دبستان شاعری ریویو از کلب علی خان فائق ص۶۶ اورنٹیل کالج میگزین اگست، ۱۹۵ء

[2] تذکرہ ہندی سنہ ۱۲۰۰ھ تا ۱۲۰۹ھ اضافات مابعد بھی۔ [3] ص۱۱۱۔ [4] تلخیص طبقات الشعراء مرتبہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ص۱۳۲ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص۱۲۴۔ [5] فائق صاحب اسے ۱۱۸۶ھ کا واقعہ قرار دیتے ہیں۔ [6] تذکرہ ہندی ص۱۳ ترجمہ محمد یار خان امیر۔ [7] ایضاً

[8] دیباچہ تذکرہ ہندی ص۸۔ [9] تذکرہ شعرائے اردو ص۸۹۔ [10] ایضاً ص۸۰۔ [11] ایضاً ص۸۸۔

بھی ہوتی ہے سنہ اٹھارویں میں جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے وارستہ مزاجی کی تکلیف سے لباس فقر اختیار کیا۔ شاہ عالم ۱۱۷۳ھ میں تخت نشین ہوئے اٹھارواں سال ۱۱۹۱ھ میں پڑتا ہے جب فیض آباد کی جگہ لکھنو دارالخلافہ بنا (۱۱۹۴ھ یا ۱۱۹۰ھ) تو یہ بھی لکھنؤ چلے آئے ہوں گے۔ مسرت افزا (۱۱۹۷ھ) کا مولف انہیں لباس درویشی میں بیان کرتا ہے[۲]۔ اسی طرح گلشن سخن کا مصنف بھی انہیں ۱۱۹۴ھ میں لباس درویشی کے ساتھ لکھنو میں مقیم پاتا ہے[۳] مصحفی ۱۱۹۸ھ میں لکھنو میں قیام پذیر ہوئے۔ تالیف تذکرۂ ہندی (۱۲۰۰ھ تا ۱۲۰۹ھ) کے وقت مصحفی پر مہربان تھے اور شفقت فرماتے تھے[۴]۔ اور سلیمان شکوہ کی سرکار سے انہیں (بعد از ۱۲۰۵ھ) انعام بھی ملا تھا[۵]۔ "۱۲۱۲ھ بارہ سو بارہ ہجری میں مرشد آباد تک تشریف لائے لیکن اطوار سکونت کے وہاں کچھ نظر نہ آئے اسی سال پھر لکھنو تشریف لے گئے۔ اور پھر اس دار فنا سے راہی ملک بقا ہوئے[۶]"

۱: ۔ گلشن ہند ص ۱۵۱، ۱۵۲ ؛

۲: ۔ گلشن ہند ص ۱۰۲ ؛

۳: ۔ حواشی دستور الفصاحت ص ۵۱ ؛

۴: ۔ تذکرۂ ہندی ص ۱۱ ؛

۵: ۔ تذکرۂ ہندی ؛

۶: ۔ گلشن ہند ص ۱۵۲ ؛

"۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ کو نواب آصف الدولہ نے استسقا کے مرض سے وفات پائی۔ اوائل صفر میں بیمار ہوئے تھے۔ ایسی صورت میں ۱۲۱۲ھ میں مرشد آباد سے واپسی پر شاگردی اور آصف الدولہ کی نوازش کا واقعہ غلط ہے۔ شاگردی کا مسئلہ ۱۲۱۲ھ سے پہلے کا ہو سکتا ہے اور آصف الدولہ کے مرنے پر بنگالہ کا سفر صحیح ہو سکتا ہے۔ چونکہ نئے مربی کی تلاش آصف الدولہ کے مرنے ہی پر ہوئی تھی۔"[1]

"نواب آصف الدولہ مغفور (متوفی ۱۲۱۲ھ) از دل عاشقِ صحبتِ ایشاں بود و کمالِ عزت و احترام می نمود و نواب سرفراز الدولہ مرحوم نائب وزیر بودہ، او ہم بسیار معتقد بلکہ مرید و علیٰ ہذا القیاس اعزہ و عمائدینِ لکھنو خدمتِ میر را شرف و برکتِ خود می دانستند و صحبتِ او غنیمت می شمردند۔۔۔ ۔۔۔ تاریخ آں اوستادِ بے نظیر میاں جرأت قلندر بخش چنیں نوشتہ است۔۔۔۔۔۔

"داغ اب سوز کا لگا دل کو"[2]

۱۲۱۳ھ

---

[1] فائق۔ اورنٹیل کالج میگزین اگست ۱۹۵۷ء ص ۶۷ ؞

[2] دستور الفصاحت ص ۵۲، ۵۳ ؞

حسرت

جعفر علی نام حسرتؔ تخلص تھا والد کا نام بقولِ میر حسن و مصحفی ابوالخیر تھا جو عطاری کا پیشہ کرتے تھے[1]

سالِ ولادت نامعلوم - قرائن کہتے ہیں کہ ۱۱۵۰ھ کے لگ بھگ ہے۔ ان کے کلیات میں ایک قطعہ ہے جس میں حملہ درانی سے دلی پر جو تباہی آئی تھی اس کا حال ہے[2]

قیاس ہے کہ حملہ درانی کے بعد دلی چھوڑی ہوگی - عام طور پہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ دلی سے فیض آباد گئے لیکن ایک قطعے سے جو سوداؔ نے فدوی کی ہجو میں کہا ہے اور فدوی کی اور ہجووں کی طرح یقینی ہے کہ فرخ آباد میں منظوم ہوا ہو حسرتؔ کا کچھ زمانے تک وہاں رہنا ثابت ہوتا ہے[3]

میر حسن نے ان کا حال غالباً ۱۱۹۱ھ یا ۱۱۹۲ھ میں لکھا ہوگا فرماتے ہیں۔

میاں جعفر علی المتخلص بہ حسرت ... خلف میاں ابوالخیر کہ بہ پیشۂ عطاری در لکھنؤ متصل اکبری دروازہ بسری برد - جوانِ طبعش از حد گذشتہ قصیدہا و رنگین بشکل گفتہ - حالا بہ وسیلۂ فنِ شاعری در سرکار حسن علی خاں بہادر سرفراز است - مدتے اصلاح سخن از رائے سرب سنگھ گرفتہ الحال منحرف است ... کثرت شاگردانش چناں است کہ در صورت شناسی خود ہم حیران است[4]

معلوم ہوتا ہے کہ جب آصف الدولہ نے فیض آباد کو چھوڑ کر (۱۱۸۹ھ یا ۱۱۹۰ھ میں) لکھنؤ کو دارالخلافہ بنایا تو حسرتؔ اور ان کے والد بھی لکھنؤ آگئے اور اکبری دروازے میں ابوالخیر نے عطاری کی دوکان کھولی ۱۱۹۴ھ میں مبتلا حسرتؔ کو لکھنؤ ہی میں مقیم بتاتے ہیں[5]

---

[1] تذکرۂ ہندی صہ ۷۵ تذکرۂ شعرائے اردو صہ ۵۲ [2] رسالہ معاصر حصہ اول صہ ۱۵ [3] معاصر حصہ دوم صہ ۱۱۸

[4] تذکرۂ شعرائے اردو صہ ۵۲ [5] حواشی دستور الفصاحت صہ ۲۲ بحوالہ گلشن سخن

۱۱۹۶ھ میں خلیل نے ان کے اشعار کو لکھنؤ سے بنارس طلب کیا۔ جہاں دار شاہ شہزادۂ دہلی ۱۱۹۸ھ میں لکھنؤ آئے۔ جرأت نے ان کی ملازمت بھی کی چنانچہ مصحفی تذکرۂ ہندی (۱۲۰۰ھ تا ۱۲۰۹ھ دبجمد) میں لکھتے ہیں۔

"تا ایں مدت معاش بر پیشۂ شاعری بسر بردہ آخر آخر چندے در سرکار صاحب عالم مرزا جہاندارشاہ ہم عمر و امتیاز و اشرت چوں پدر ش جہان فانی را پدرود کرد۔ نوکری صاحب عالم گذاشتہ خود بجائے پدر در دکان خیبرین گردیدہ بود کہ یک ناگاہ بہ ایمائے بزرگے خرقہ درویشی پوشیدہ و ترک لباس دنیا کردہ کنج عزلت اختیار نمودہ"[1]

اسی طرح مجمع الانتخاب میں کمال لکھتے ہیں۔

"قبل از وفات چہار سال ترک لباس ہم نمودہ بہ کنج قناعت نشستہ بود نام بخشیدۂ مرشد مقصود علی داشت عرصۂ دو از دہ سال می شود کہ از قضائے الٰہی انتقال فرمودہ چنانچہ رباعی میاں جرأت صاحب بہ ماتم آں بزرگوار ہماں زماں گفتہ بود ندایں است۔

تھا جام جہاں نما ایاغ حسرت
جز داں مشعل ماہ تھا چراغ حسرت
سو باد فنا سے گل کیا تونے فلک
اب کچھ نہ رہا سوائے داغ حسرت

در لکھنؤ متصل نخاس حویلی خود داشت بہ ہموں حویلی مدفنش گردیدہ"[2]

جہاندار شاہ ۱۱۹۸ھ میں لکھنؤ آئے اور ۱۲۰۰ھ میں لکھنؤ سے بنارس چلے گئے۔[3]

[1] گلزار ابراہیم صفحہ ۱۰۷ [2] صفحہ ۱۷۷ [3] دریائے لطافت

حسرت غالباً لکھنؤ ہی میں رہے۔ ۱۱۹۵ھ سے پہلے حسرت کا سودا (متوفی ۱۱۹۵ھ) سے معرکہ ہو چکا تھا جس کی طرف احمد علی یکتا نے دستور الفصاحت میں اشارہ کیا ہے۔[1] مصحفی ۱۱۹۸ھ میں لکھنؤ آ گئے۔ ان سے بھی حسرت کا معرکہ ہوا۔ چنانچہ مصحفی نے غزل کہی ہے جس کا ایک شعر ہے۔

بعضوں نے تب تو شعر یہ حسرت سے کے یہ کہا
کیا دال موٹھ بیچنے والے کی شاعری

حسرت نے (جیسا کہ جرأت کے قطعے سے معلوم ہوتا ہے) ۱۲۰۶ھ میں وفات پائی۔ اس حساب سے اندازاً ۱۲۰۱ھ میں درویشی اختیار کی ہوگی۔ حسرت کے والد ۱۲۰۲ھ سے پہلے فوت ہو چکے ہوں گے۔ ان کی وفات پر حسرت نے عطاری شروع کی اور لکھنؤ ہی میں وفات پائی اور دفن ہوئے۔

جرأت

قلندر بخش نام جرأت تخلص۔ میر حسن نے انہیں میاں کر کے پکارا ہے۔ تذکرے میں حسن نے افسوس کا حال بطور جوان اور جرأت کا بطور نوجوان کیا ہے۔[2] ظاہر ہے کہ افسوس حسن سے عمر میں خاصے چھوٹے ہوں گے۔ دلی میں پیدا ہوئے اور فیض آباد میں نشو و نما پائی۔[3] بقول مصحفی ان کا آبائی نام یحییٰ مان ہے۔ یحییٰ مان کی اولاد میں سے تھے جن کے نام پر چاندنی چوک کے پاس کوچہ رائے مان ہے۔ خاندان والوں کے ساتھ ہی صغرسنی میں پورب کی طرف آ گئے۔[4] کمال مجمع الانتخاب میں لکھتے ہیں:

"باعث نیرنگی زمانہ بعہد نواب شجاع الدولہ مرحوم و مغفور بہ لکھنؤ وارد شدند۔"[5]

شجاع الدولہ ۱۱۷۹ھ سے قبل لکھنؤ میں تھے۔ اس زمانے میں جرأت صغرسنی میں

۱۔ دستور الفصاحت ص ۱۰۲ ۲۔ تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۴۰ ۳۔ ایضاً ص ۱۴۷ ۴۔ (ک) تذکرہ ہندی ص ۶۳
۵۔ بیاض خاق

لکھنو آئے پھر دارالخلافہ ۱۱۷۹ھ میں فیض آباد ہو گیا۔ ظاہر ہے ان کا گھرانہ بھی فیض آباد چلا گیا۔ چنانچہ بقول میر حسن فیض آباد ہی میں پروان چڑھے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی "جرأت ان کا عہد اور عشقیہ شاعری" میں جرأت کے والد کو حملۂ نادری میں مقتول دکھاتے ہیں اور اس پر قیاس کرتے ہیں کہ "جرأت حملۂ نادری سے قبل پیدا ہوا" سلہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی دوسری کتاب سلہ میں بالکل درست فرمایا تھا کہ حملہ نادری میں جرأت کے مورث اعلیٰ نے وفات پائی۔ لیکن یہاں غلطی کھا گئے ہیں۔ دراصل اس حملے میں جرأت کے والد نہیں دادا فوت ہوئے تھے۔ جرأت کی پیدائش کو ۱۱۵۰ھ سے قبل ماننے سے تمام معاصر تذکرہ نویسوں کے دوسرے بیانات غلط ہو جاتے ہیں۔ میر حسن کے ہاں نوجوانی کا معیار بیس برس کے قریب ہوتا ہے۔ نیز انہیں اپنے استاد سے (حسرت) بھی عمر میں چھوٹا ہونا چاہئے۔ تذکرۂ میر حسن کی تالیف کے وقت (۱۱۸۹ھ اور ۱۱۹۱ھ) تک جرأت چیچک رو ہو چکے تھے لیکن ابھی بینائی قائم تھی سلہ مصحفی تذکرۂ ہندی میں (۱۲۰۰ھ تا ۱۲۰۹ھ) لکھتے ہیں:-

حیف کہ چشمش در عینِ جوانی بہ یک ناگاہ نابینا شد سلہ

احمد علی یکتا جن سے جرأت کا دوستانہ تھا۔ اپنے تذکرہ دستور الفصاحت میں لکھتے ہیں:

مردم چشمش بعارضۂ نزول مدت است کہ از حلیۂ ابصار عاری بودند سلہ

سلہ ص۲۶ سلہ لکھنو کا دبستانِ شاعری ص۱۳۳ سلہ میر حسن نے آنکھوں کی خرابی کا ذکر نہیں کیا سلہ تذکرۂ ہندی ص۶۳
سلہ ایضاً ص۹۹

تذکرۂ ابنِ طوفان (۱۲۴۷ھ تا ۱۲۵۱ھ) میں ہے:-

در سن نوزدہ سالگی چشمانش رفتہ [1]

اگر ابنِ طوفان کا بیان صحیح ہے تو پھر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ۱۲۰۰ھ سے پہلے جبکہ وہ ۱۹ برس کے تھے نزدل سے ان کی بینائی جاتی رہی۔ میر حسن نے اپنے تذکرے کی آخری اشاعت (۱۱۹۲ھ) میں بھی جرأت کی بینائی کے جانے کا ذکر نہیں کیا۔ قیاس چاہتا ہے کہ ۱۱۹۲ھ اور ۱۲۰۰ھ کے درمیان کسی وقت بینائی سے محروم ہوئے۔ اگر ۱۱۹۲ھ ہی کا واقعہ ہو تو (۱۱۹۲ — ۱۹ = ۱۱۷۳ھ) کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔ ۱۱۸۹ھ تک حسرت کے شاگرد ہو چکے تھے۔

"ابتدا میں نواب محبت خاں محبت تخلص اعانتِ اخراجاتِ مزدوری کرتے تھے [2]

نواب محبت خاں محبت پسرِ حافظ رحمت خاں ۱۱۸۸ھ میں آصف الدولہ کے پاس مہدی گھاٹ پر آ گئے تھے۔ جہاں آصف الدولہ پڑا ہوا تھا [3] جرأت محبت خاں کی سرکار میں اسی زمانے میں ہوئے۔ آصف الدولہ کے ساتھ ہی محبت خاں اور جرأت فیض آباد سے لکھنؤ آ گئے۔ انہوں نے حسن بخشی کے حال میں ایک مثنوی لکھی ہے۔ اس میں اس سفر کا مفصل حال لکھتے ہیں:-

سنو یار د بیانِ عشق ہے یہ	عجائب داستانِ عشق ہے یہ
کریں گی چشم سن کر خوں فشانی	کہ عشق اور حسن کی ہے یہ کہانی
شروع داستاں کا ہے یہ مذکور	کہ ہے اک شہر فیض آباد مشہور

---

[1] تذکرہ ابنِ طوفان ص۸ [2] گلشن ہند ص۹۱ [3] بحوالہ نجم الغنی تاریخ اودھ جلد سوم

ہوا تھا شہر دہلی جب سے غارت — تھی اپنی اُسی جگہ میں استقامت
فلک نے کر جہاں آباد برباد — کیا تھا خوب فیض آباد، آباد
تو جو تھے ساکنانِ شہر دہلی — سکونت اُن کی فیض آباد میں تھی
کہ ناگہ اک بزرگ آیا جو اس جا — ہوا شدت سے ہیں مشتاق اس کا
میسر آئی مجھ کو بارے صحبت — بجا ہے گر کہوں پیرِ طریقت.....
بجا ہے گر کہوں اس کو ولی ہے — نبی کی آل، اولادِ علی ہے
کروں در پردہ تا کے وصف اِدغام — ہے اس کا حضرت خواجہ حسن نام
وہی ہے مبتلائے عشق بازی — لقب اِن حضرتِ خواجہ کہماری
نہ سمجھے نیک جو اس کو وہ بد ہے — کہ اُس کے حضرتِ مودود جد ہے
زبس رہتا تھا میں دن رات حاضر — ہوا تھا رازِ پنہانی سے ماہر
کہ خوباں سے انہیں ہے اُنس بیحد — لَن ہو خواہ اُس میں خواہ امرد
یہ سچ ہے جو ہو سرِّ حق سے آگاہ — تو ہو دے خوب ردیوں کی اسے چاہ
زبس شاہد پرستی اُن کا تھا شوق — نہایت سیر سے حضرت کو تھا شوق
کبھی جو سیر کرتے حسبِ دلخواہ — تو پھر ہوتا تھا یہ عاصی بھی ہمراہ
جہاں تک خوبرو تھے اور گل اندام — وہ حاضر صبح سے رہتے تھے تا شام
نہایت تھا سرود و رقص کا شوق — اُسی کے دیکھنے سننے کا تھا شوق .....
سدا تھی خوب ردیوں سے ملاقات — کہیں کیا کچھ عجب کٹتے تھے اوقات
یکایک یوں ہوا کرنا خدا کا — کہ اس بستی کو گردوں نے اجاڑا
نہ خوش آئی جو گردوں کو یہ صحبت — کیا صبحِ وطن کو شامِ غربت
حسین جو کہ تھے وہاں رشکِ مہتاب — اٹاوے کو گئے ہمراہِ نواب
جب اس بستی سے خوباں کا ہوا کوچ — مقامِ دل سے عشرت نے کیا کوچ

یہ حامی اپنے تھا نواب کے ساتھ
محبت کا یہ شیشہ جن کے ہے ہاتھ
وہی نواب نامی فخرِ صائب
وہ ہیں یعنی محبت خاں صاحب.....
ہیں ان کے ساتھ تھا اُن کا نمک خوار
سفر دِیاں سے ہوا درپیش ایک بار
سخن نکلا یہ حضرت کی زباں سے
برائے سیراب چلئے یہاں سے
تو کی ہیں عرض بس بہتر ہے یہ بات
پسندِ خاطرِ حضرت ہو جو بات

آگے جرأت نے بیان کیا ہے کہ اٹاوہ پہنچے اور وہاں سے لکھنؤ آئے۔ خان عالم خاں صاحب سے ملے۔ انہوں نے کہا متّن نام مہ جبیں آپ کی مشتاقِ ملاقات ہے۔ چنانچہ اسے بلا یا اس کے ساتھ ایک اور حسینہ بھی آئی تھی۔ جاتے وقت اس نے اپنے گھر بلا یا اُس کے گھر حضرت (حسن) گئے وہیں بخشی سے ملاقات ہوئی۔ خاتمۂ مثنوی بھی تاریخ اب اس کی عیاں ہے۔ یہ عشق اور حسن کی اک داستان ہے ۱۱۹۱ھ ان تفاصیل سے بھی بالواسطہ معلوم ہوتا ہے کہ جرأت ابھی نابینا نہیں ہوئے۔ دید اور سیر دونوں سے محروم نہیں ہیں، آصف الدولہ ۱۱۹۰ھ میں مہدی گھاٹ سے اٹاوے گئے۔ محبت خاں، جرأت خواجہ حسن بھی ہمراہ تھے پھر لکھنؤ چلے آئے ۱۱۹۱ھ سے قبل لکھنو پہنچ چکے تھے۔

مصحفی لکھنو میں ۱۱۹۸ھ میں قیام پذیر ہوئے تذکرۂ ہندی میں جرأت کا قیام رستم نگر میں بیان کرتے ہیں [1] سیلان شکوہ ۱۲۰۵ھ دوسری روایت ۱۲۰۳ھ) میں وارد لکھنو ہوئے مصحفی غالباً ۱۲۰۶ھ کے قریب ان کی سرکار میں ملازم ہوئے تو جرأت کے بارے میں لکھتے ہیں:-

و ہمچنیں قلندر بخش جرأت کہ پس از فقیر بعہد سہ چہار ماہ

---

[1] تذکرۂ ہندی ص ۲۶

دولتِ ملازمتِ حضور (سلیمان شکوہ) حاصل نمودہ بہ نوازشِ خسروانہ
در آمدہ و نیز نوکر شد" [۱]

گلشن ہند (۱۲۱۵ھ) میں ہے :-

تمام عمرِ عزیز کی بے کاری میں بسر ہوئی اور پلے روزگاری میں کٹی۔
بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری میں صاحب عالم و
عالمیان میرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے کچھ امداد ہوتی ہے" [۲]

مصحفی کے ورودِ لکھنؤ کے فوراً بعد ان کی ان کی چلنے لگی تھی (۱۱۹۸ھ) یہ
رقابت کم و بیش پچیس برس (وفاتِ جرأت تک) جاری رہی [۳] ان کا معرکہ
نوا کے ساتھ بھی ہوا

"نوا بدایوں سے لکھنو آئے۔ اور وہاں ان سے اور جرأت سے
مباحثات ہوئے۔ جرأت نے نوا کی ہجو لکھی۔ وہ ان کے دیوان
میں موجود ہے۔ نوا بعد ازاں ایران چلے گئے اور معلوم ہوتا
ہے کہ جرأت کی وفات کے بعد لکھنؤ واپس آئے [۴]

اغلباً یہ جھگڑا ۱۲۱۵ھ سے قبل ہوا (الف) علمِ مجلس۔ نجوم۔ ستار نوازی
میں ماہر تھے اس کی تعریف سب معاصر تذکرہ نگاروں نے کی ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ جرأت نے ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی۔ یہ درست
نہیں ۱۲۲۷ھ میں وفات پائی [۵]

---

[۱] تذکرۂ ہندی ص ۱۲۱ [۲] ص ۹۱ [۳] معاصر حصہ دوم مقالہ مصحفی اور
جرأت ص ۲ [۴] معارضۂ جرأت و نوا۔ از فیاض الدین حیدر معاصر حصہ ۲
ص ۸ [۵] معاصر حصہ ۲ ص ۹ و حواشیٔ تذکرۂ ابنِ طوفان از قاضی عبدالودود

ایک بیٹا یادگار چھوڑا۔ نام احمد علی اور قوت تخلص تھا۔ ریاض الفصحا (مصحفی) کی تالیف کے وقت اس کی عمر تیس برس تھی[1]

مصحفی :۔ مصحفی کا نام غلام ہمدانی تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ راجپوت تھے اکبر پور (جو منجھ دلی اور شیخ پور کے درمیان واقع ہے) میں قیام رکھتے تھے۔ وہاں کشت و خون ہوا ایک بچہ نظام الدین بچا۔ جسے موضع شیخ پور کی ایک عورت لے گئی اور اس کی پرورش کی۔ نظام الدین بعد میں دکن چلے گئے بعد میں واپس آئے ان کا مزار اکبر پور میں ہے۔ نظام الدین سے مصحفی تک بارہ پشتیں تھیں مصحفی کے والد کا نام ولی محمد اور دادا کا نام شیخ درویش محمد تھا۔ ولی محمد کے تین لڑکے تھے۔ غلام جیلانی (امروہہ میں دفن ہوئے) غلام صمدانی اور غلام ہمدانی (مصحفی) مصحفی دونوں بھائیوں سے چھوٹے تھے[3]۔ امیر احمد علوی کے قول کے مطابق ۱۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے[4] مصحفی تذکرۂ ہندی میں تاباں کے حال میں لکھتے ہیں :۔

فقیر آں یوسف ثانی را بسبب نہ بودن در آں دورہ کہ در عین
جوانی کہ گرگِ اجلش در ربودہ ندیدہ[5]

---

[1] ریاض الفصحا صـ ۲۶۲ [2] انیس العاشقین (رتن سنگھ زخمی) (روٹو گراف) ۳۹ پنجاب یونیورسٹی لائبریری) میں مصحفی کی پیدائش کے بارے میں صرف اس قدر ہے کہ مولا بخش دہے است از مضافاتِ دہلی لیکن حفیظ رامپوری کا بیان ہمارے نزدیک زیادہ صحیح ہے جو بلم گڑھ متصل امروہہ بتاتا ہے (تفصیل آگے آتی ہے) [3] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ مصحفی اور اس کا کلام طبع اول صـ ۴۲ ؛ ۵۔ بحوالہ مجمع الفوائد مصحفی قلمی نسخہ ہے پنجاب یونیورسٹی لائبریری
نگار مصحفی نمبر۔ حیاتِ مصحفی از امیر احمد علوی صـ ۹، ۱۰ [5] تذکرۂ ہندی صـ ۴۷

تاباں انداز" ۱۱۴۲ھ کے بعد اور ۱۱۶۵ھ سے قبل فوت ہوئے۔ اس سے یہ شبہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصحفی وفات تاباں کے بعد پیدا ہوئے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ "نہ بودن دراں دورہ" سے ان کی مراد "نہ بودن دراں دورہ در دہلی" ہو۔ میر حسن ان کی پیدائش اکبر پور متصل امروہہ بیان کرتے ہیں [1] چیف رامپوری جو مصحفی سے خود ملے تھے۔ انہیں کے حوالے سے ان کا مولد بلم گڑھ متصل دہلی بتاتے ہیں [2] ابتدائے شاعری کا زمانہ امروہے میں گزرا [3] فارسی نظم و نثر کی تکمیل دہلی میں کی [4] دلی سے نکلے تو آنولہ آئے۔ وہاں سے ٹانڈہ پہنچے جہاں تین ماہ قیام کیا۔ [5] پھر نواب محمد یار خاں کی بساطِ سلطنت الٹ گئی۔ سکھر تال کا معرکہ اس زمانے میں پیش آیا" فقیر دراں حادثۂ جاں گزا بہ لکھنو رسیدہ بود بعدِ انقضائے مدتِ یک سال بہ شاہجہان آباد رفتہ رختِ اقامت دراں دیارِ رہنو نشان انداختہ" [6] سکھر تال کا معرکہ ۱۱۸۵ھ میں ہوا۔ مصحفی اس وقت لکھنو آئے جہاں سال بھر تک رہے۔ درمیان میں فیض آباد بھی گئے (ایضاً ترجمۂ سودا) کیونکہ سودا سے ملے تھے اور سودا اس وقت فیض آباد میں تھے۔ یہ واقعہ غالباً ۱۱۸۶ھ میں ہوا پھر مصحفی دلی لوٹے۔ جہاں نجف خاں کا دورِ اقتدار تھا۔ "دو از دہ سال در شاہجہان آباد بہ دورِ نواب نجف خاں مرحوم بگوشۂ عزلت گزیدہ" [7] ۱۱۹۸ھ میں لکھنو آئے [8] ۱۱۹۹ھ تک میر حسن سے ان کے روابط

---

[1] عرشی دیباچۂ دستور الفصاحت ص۲۵۷ مبنی بر نسخۂ خطی تذکرۂ شعرائے اردو [2] ایضاً ص۹۳ [3] تذکرۂ ہندی ترجمہ نثار ص۲۵۴ [4] ایضاً ص۲۴۸ [5] ایضاً ص۱۲۹ [6] ایضاً ص۱۴ [7] تذکرۂ ہندی ص۲۴۸ [8] عقدِ ثریا ترجمۂ بے تاب

ہو چکے تھے۔ اور ان کے فرزند کی استادی کا شرف بھی انہیں جلد ہی حاصل ہو گیا۔ لکھنؤ میں مصحفی کا جرأت سے بھی جھگڑا ہوا ۱۲۰۶ھ کے قریب سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازمت کی۔ جہاں انشا سے ان کا معرکہ ہوا[1] بعض دوسرے درباروں سے بھی مصحفی متعلق رہے "میر محمد نعیم خاں، مرزا میڈھو میر مبتلا۔ نواب مہدی خاں۔ فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر۔ مرزا حاجی۔ نواب کلب علی خاں بہادر وغیرہ سے مصحفی متعلق رہے[2] تصانیف کلیاتِ مصحفی (مع رسائل نثر و مجمع الفوائد) تذکرہ ہندی۔ ریاض الفصحا اور عقدِ ثریا ہیں۔

۱۲۴۰ھ میں وفات پائی[3]

افسوس :- شیر علی نام، افسوس تخلص۔ میر علی مظفر داروغہ توپ خانہ میر قاسم (نواب بنگال) کے لڑکے تھے[4] ۱۱۵۲ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ عمدۃ الملک امیر خان انجام کی شہادت کے تین چار سال بعد جب ان کے والد تلاشِ معاش میں نکلے تو افسوس کی عمر گیارہ برس کی تھی[5] انجام ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۵۹ھ کو شہید ہوئے افسوس دلی میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد انجام کی سرکار میں تھے۔ میر مظفر کو" نواب خان عالم بقا اللہ خاں مرحوم نے لکھنؤ میں بلوایا اور سرکار وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مرحوم کے مشاہرہ میں تین سو روپے

---

[1] مابین ۱۲۱۰ھ و ۱۲۱۲ھ نگار مصحفی نمبر ص۱۲ [2] مصحفی اور اس کا کلام ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی [3] تفصیل کے لئے مقالہ راقم "ریویو ہائے مصحفی اور اس کا کلام" ماحول، راولپنڈی شمارہ ۴، ۵ ص۱۵۵ [4] تذکرۂ شعرائے اردو ص۱۱ [5] ارباب نثر اردو۔ سید محمد قادری۔

کے واسطے ان کے درماہہ ٹھہرایا" [1] شجاع الدولہ کا قیام لکھنؤ ۱۱۶۷ھ سے ۱۱۷۰ھ تک رہا۔ اس کے بعد انہوں نے فیض آباد کو دار الحکومت کر لیا تھا۔ بعد کئی برس کے حسب الامر نواب صادق علی خاں کے کہ بڑے بیٹے نواب میر محمد جعفر خاں صوبہ دار بنگالہ کے تھے سید مظفر خاں (پدرِ یادنوس) وارد مرشد آباد ہوئے اور داروغگیٔ توپ خانہ وغیرہ کے ساتھ موردِ عنایت والطاف ہوئے۔۔۔ غرض جب وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ بہادر ہم صوبہ دار بنگالہ صاحبانِ عالی شان سے معرکہ آرا ہوئے تو سید مظفر علی خاں بھی ہمراہ رکاب کے تھے۔ بعد میر محمد جعفر خاں کی وفات کے روزگار نواب سیف الدولہ کا انہوں نے نہیں کیا بلکہ لکھنؤ چلے آئے اور بعد کئی برس کے حیدرآباد کی طرف گئے [2] میر جعفر ۲۸ جون ۱۷۵۷ء کو سراج الدولہ کی جگہ نواب بنگال ہوئے (شوال سنہ ۱۱۷۰ھ) ان کی نوابی کا زمانہ ۱۰ ربیع الاول ۱۱۷۴ھ تک ہے۔ گویا مظفر علی خاں ۱۰ ربیع الاول سنہ مذکور سے قبل لیکن ۱۱۷۰ھ کے بعد لکھنؤ پہنچ چکے تھے اور چند سال وہاں رہ کر ۱۰ ربیع الاول سنہ مذکور میں میر قاسم ناظم بنگال ہوئے تو یہ ان کے ساتھ تھے۔ بکسر کی لڑائی میں (۲۳ اکتوبر سنہ ۱۷۶۴ء = ۲۶ ربیع الثانی سنہ ۱۱۷۸ھ) یہ میر قاسم کی طرف سے شریک تھے۔ میر جعفر کو انگریزوں نے اپنی طرف سے ۷ جولائی ۱۷۶۳ء کو بنگال کا ناظم بنا دیا۔ لڑائی کے ساڑھے تین ماہ بعد ۱۴ شعبان روز سہ شنبہ ۱۱۷۸ھ کو میر جعفر فوت ہو گئے (۵ فروری) نجم الدولہ غالباً ذی الحجہ ۱۱۷۹ھ میں اور سیف الدولہ اواخر ۱۱۸۳ھ میں فوت ہوئے

---

[1] گلشنِ ہند ص ۲۷ [2] گلشنِ ہند ص ۲۷

بکسر کی لڑائی میں اودھ پر انگریزی قبضہ ہوا ۱۶ راگست ۱۷۶۵ء الہ آباد میں شجاع الدولہ سے انگریزوں کا معاہدہ ہوا تو یہ علاقہ انہیں واپس ملا۔ شجاع الدولہ (۱۱۷۹ھ) اسی سال لکھنؤ آیا۔ اور پھر فیض آباد کو دارالحکومت قرار دے دیا۔ بظاہر افسوس کے والد کو بھی سنہ ۱۱۷۹ھ میں لکھنؤ آنا چاہیئے۔ افسوس اپنے والد سے دو سال قبل ہی لکھنؤ آچکے تھے۔

"قصہ کوتاہ والدِ ماجد نواب جعفر علی خاں بہادر مرحوم کے واقعہ تلک بھی عظیم آباد میں تھے بعد اس سانحے کے لکھنؤ میں آئے اور حقیر ان سے دو برس پہلے یہاں آچکا تھا۔ آخر وہ حیدر آباد تشریف لے گئے اور چند روز بعد وہیں بقضائے الہی بہشت نصیب ہوئے: [1]

افسوس کے والد پٹنہ سے لکھنؤ آئے۔ یہاں باپ بیٹا غالباً شجاع الدولہ کے ساتھ ہی فیض آباد چلے گئے۔

فیض آباد میں ۱۱۸۹ھ میں سالار جنگ۔ برادرِ نسبتی شجاع الدولہ کی سرکار میں افسوس نے ملازمت کر لی اور دس سال تک اس کے بیٹے میر نوازش علی سردار جنگ کے زمرۂ مصاحبین میں رہے [2] ۱۱۸۹ھ۔ دیا سنہ ۱۱۹۰ھ میں جب آصف الدولہ نے فیض آباد کی جگہ لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا تو سالارِ جنگ بھی ان کے ساتھ لکھنؤ میں اٹھ آئے تھے افسوس ان کے متوسلین میں تھے۔ ظاہر ہے یہ بھی لکھنؤ آ گئے ہوں گے۔ لیکن افسوس کی گذر اوقات لکھنؤ میں مشکل سے ہوتی تھی ۱۱۹۷ھ میں صاحب مسرت افزا لکھتے ہیں:

---

[1] دیباچۂ باغ اردو۔ سیر المصنفین جلد اول طبع اول صلہ تا صکہ [2] ملاحظہ ہو دیباچۂ سحر البیان۔

افسوس کہ از چندے فلکِ پلنگ فطرت مرو یاہ بازی ادرا در شاخِ گوزنِ افلاس آویختہ و بناخنِ کینہ جوئی رشتہ[۲] اقتدارش گسیختہ اکنوں در بلدۂ لکھنو بسر می برد[۱]

۵ جمادی الآخر سنہ ۱۱۹۸ھ میں جہاندار شاہ لکھنؤ پہنچے سنہ ۱۱۹۹ھ میں افسوس ان کی سرکار میں ملازم ہو گئے اور ان کے ساتھ ذوالحجہ کے دوسرے عشرے میں سنہ ۱۲۰۰ھ میں بنارس گئے[۲] جہاندار شاہ کے حال میں نجم الغنی تاریخِ اودھ (جلد سوم) میں لکھتے ہیں:

"تاریخ شاہیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۲۰۰ھ میں ایک لکھنوی طوائف کریم بخش نام سے جوشِ محبت میں آنکھیں لڑ گئیں اور اس کو کاشانۂ محل بنایا۔ اس سے وزیر (آصف الدولہ) کو بہت رنج ہوا بعض دوسری کتب سے ثابت ہوتا ہے کہ بیگم صاحبہ کی پاسداری کی وجہ سے یہ امر نواب وزیر کی ناخوشی کا باعث تھا۔ یہاں تک کہ وہ شاہزادے (جہاندار) سے بے رخصت ہوئے لکھنؤ سے فیض آباد کو چلے گئے۔ اب شاہزادے کو لکھنؤ میں ٹھہرنا ناگوار ہوا۔ اور ماہ ذی حجہ کے عشرۂ دوم سنہ ۱۲۰۰ھ میں لکھنؤ سے بنارس کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں جاکر قیام کیا جبکہ وارن ہیسٹنگز اپنے عہدۂ گورنر جنرلی سے مستعفی ہو کر کلکتے سے چلے گئے اور لارڈ کارن والس اُن کی جگہ مقرر ہو کر آئے اور

---

[۱] ص ۲۴، ۲۵ [۲] ملاحظہ ہو دیباچہ سحرالبیان و تاریخ اودھ نجم الغنی جلد سوم ص ۲۶۵

سنہ ۱۲۰۱ھ میں لکھنؤ کو وزیر سے ملنے کے ارادے سے روانہ ہوئے تو راہ میں بنارس کے اندر شاہزادے سے ملاقات ہوئی۔۔۔ گورنر جنرل نے کہا کہ آپ لکھنؤ کا قصد رکھتے ہیں اور میں بھی وہیں جاتا ہوں۔ وہاں پہنچ کر یہ بات وزیرالممالک سے کہی جائے گی (یعنی کورٹ اور الہ آباد کے علاقے شہزادے کو ملیں) غرض کہ گورنر جنرل لکھنؤ کو گئے ان کے پیچھے پیچھے شاہزادے بھی لکھنؤ کو روانہ ہوئے۔۔۔۔ آصف الدولہ نے لطائف الحیل کے ساتھ ان اضلاع کے دینے سے انکار کر دیا۔۔۔۔۔ (شہزادے کو) نواب کی عملداری میں رہنا ناگوار گزرنے لگا۔ اس لئے گورنر جنرل کے مشورے سے اکبرآباد کی طرف چلے گئے۔۔۔۔ بادشاہ نے انہیں (فرخ آباد سے) دلی بلالیا۔ کچھ دنوں یہاں رہ کر ۲۲ ربیع الثانی سنہ ۱۲۰۱ھ کو اکبرآباد پہونچے مگر یہاں اتنی آمدنی نہ تھی کہ ان کے مصارف کو مکتفی ہوتی اس لئے دوبارہ لکھنؤ کا عزم کیا اور ۱۵ رجب سنہ ۱۲۰۱ھ کو فرخ آباد کے رستے سے لکھنؤ میں آئے اور وہاں سے بنارس روانہ ہوئے۔۔۔۔۔ آخر شاہزادے نے ۲۵ شعبان سنہ ۱۲۰۲ھ کو عارضۂ ہیضہ میں مبتلا ہو کر انتقال کیا [1]

"جہاں ایام میں نیر اوج شہریاری (جہاندار) کا خیمہ مغرب

---

[1] تاریخ اودھ جلد سوم ص ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷

کی سمت نکلا اور کوچ شاہجہان آباد کو ہوا تو میر مذکور
(افسوس) بہ سبب بعض عوارض کے رہ گئے اور ساتھ نہ
جا سکے [1]

اس سے معلوم ہوا کہ جب جہاندار اول لکھنؤ آئے تو افسوس یہیں
رہ پڑے پھر وہ دلی سے ہو کر لکھنؤ لوٹے اور یہاں سے بنارس
جاکر فوت ہوئے ۔ جہاندار کی وفات ۔ بقول صاحب قاموس المشاہیر
(ترجمۂ جہاندار) ۲۵ شعبان ۱۲۰۲ھ اور بقول سرجادو ناتھ
سرکار ۲۱ رمئی ۱۷۸۸ء (= ۱۴ شعبان ۱۲۰۲ھ) کو ہوا [2]
افسوس ذی الحجہ ۱۲۰۰ھ میں لکھنؤ میں فرد کش ہوئے ۔
بعد میں مرزا فخرالدین احمد خاں کی سفارش پر فورٹ ولیم کالج
میں نوکر ہوئے [3]

۱۲۱۵ھ میں افسوس کلکتے جاتے ہوئے مرشد آباد میں
مرزا علی لطف (صاحب گلشن ہند) سے بھی ملے تھے ۔ افسوس نے

---

[1] گلشن ہند ص ۷۵

[2] سرکار جلد چہارم ص ۲۲۵

[3] دستور الفصاحت احد علی یکتا ص ۱۰۲ ، ۱۰۳ نیز آرائش محفل
افسوس ۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو طبع اول ص ۵

کلکتے میں ۱۲۳۲ھ میں وفات پائی۔

ان کی تصانیف میں باغ اردو (ترجمہ گلستان) آرائش محفل (ترجمہ خلاصہ، اضافہ بر کتاب سبحان رائے بٹالوی) اور دیوان قابل ذکر ہیں۔

انشا۔ سید انشاء اللہ خان نام، انشا تخلص، ان کے اجداد نجف کے رہنے والے نجفی سید تھے[1] آزاد ان کے بزرگوں کو خطۂ کشمیر کے سید قرار دیتے ہیں۔ یہ روایت سب سے پہلے آب حیات ہی میں نظر آتی ہے اس لیے ایک افواہ سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی[2] ہندوستان میں ان کے خاندان کا وطن دہلی تھا[3] ان کے والد حکیم ماشاء اللہ مصدر تھے۔ مصدر نے بنگال کے نوابوں کے ہاں بطور شاہی طبیب بڑا عروج پایا۔ سراج الدولہ کے عہد حکومت میں انشا مرشد آباد میں پیدا ہوئے[4]۔ سراج الدولہ بقول غلام حسین (سیر المتاخرین) مہابت جنگ کی وفات پر ۹ جمادی الاول ۱۱۶۹ھ کو بنگال کے نواب ہوئے۔ ۷ شوال ۱۱۷۰ھ کو میر جعفر نے ان کے مقابلے میں اپنی نوابی کا اعلان کیا۔ اور سراج الدولہ ۱۵ شوال ۱۱۷۰ھ کو گرفتار ہو کر مرشد آباد آئے اور قتل ہوئے۔ گویا انشاء کا سنۂ ولادت ۱۱۶۹ھ اور ۱۱۷۰ھ کے مابین ہے۔ مبتلا نے اسے میر جعفر کے دور حکومت میں حالت صغر سنی ہی دیکھا تھا[5] میر جعفر کا پہلا دور حکومت ۷ شوال

لہ انشا اور یاس کا تغزل، سید انجد الطاف، قلمی تحقیقی مقالہ ایم اے باب دوم بحوالہ مخزن الغرائب و تذکرہ ہندی وغیرہ ۲ۂ ایضاً خط نوٹ ۳ۂ انیس العاشقین قلمی ورق ۶۲ حاشیہ پر انشا کا حال درج ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۴ۂ محمود مخزن صفحہ ۱ دیوان نما اقتباسات در معاصر حصہ دوم صفحہ ۳۴ ۵ۂ مبتلا گلشن سخن اقتباس اور حواشی دستور الفصاحت صفحہ ۱۰۴

۱۱۷۰ھ تا ۱۰ ربیع الاول ۱۱۷۴ھ اور دوسرا دور ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۷۸ھ تا
۲۴ صفر ۱۱۷۹ھ ہے۔ ان ادوار میں سے کسی ایک دور میں مبتلا نے نہیں رشید آباد
میں دیکھا ہوگا۔ نواب میر قاسم کے دور حکومت میں عالم تنزل میں (مابین ۱۰ ربیع
الاول ۱۱۷۴ھ اور ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۷۸ھ) میر ماشاء اللہ مصدر شجاع الدولہ
کی سرکار میں اودھ (لکھنؤ) میں آکر ملازم ہو گئے[1]۔ ۱۱۷۹ھ میں شجاع الدولہ نے
لکھنؤ کی بجائے فیض آباد کو دارالحکومت بنایا تو باپ بیٹا دونوں اٹھ آئے۔
جب انشا کی عمر ۱۶ سولہ برس کی ہوئی تو شجاع الدولہ کے حضور میں داخل
جلسا ہوئے[2] میر حسن ان کے بارے میں ۱۱۸۸ھ یا ۱۱۸۹ھ میں لکھتے ہیں۔

جوانے است خوش ظاہر خوش طبع ۔ با قبلہ گاہی (ضاحک)
دوست دلی است ، نو مشق است[3]

ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ میں شجاع الدولہ فوت ہو گئے۔ اور ان کی جگہ آصف الدولہ
فرماں روا ہو گئے۔ آصف الدولہ نے فیض آباد کی جگہ لکھنؤ کو دارالحکومت
بنایا تو یہ باپ بیٹا بھی لکھنؤ آ گئے۔ بعد کے حالات مخزن الغرائب میں یوں
درج ہیں۔

دربار آصف الدولہ مجلس ارا ذل شد۔ خان مذبور چندے
بلشکر نواب ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں مرحوم و
مدتے در بوندیل کھنڈ و بعد چند روزے ہم پائے پدر بدہلی
رفتہ با محمد بیگ خان ہمدانی معزز بود[4]

اس پر بحث کرتے ہوئے سید امجد الطاف یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔

---

[1] مخزن الغرائب در حواشی دستور الفصاحت ص ۱۰۴ [2] ایضاً ص ۱۰۵ [3] ص ۱۹
[4] مخزن الغرائب اقتباس در حواشی دستور الفصاحت ص ۱۰۵۔

اس حساب سے وہ شجاع الدولہ کے دربار میں ایک دو سال سے
زیادہ نہیں رہے اور جب وہ دہلی پہنچے تو ان کی عمر ۱۸ سال
سے متجاوز نہ تھی۔

ہمارے خیال میں یہ استدلال صحیح نہیں کہ انشا شجاع الدولہ کی وفات کے فوراً بعد نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے لشکر میں چلا گیا۔ صاحب تذکرۂ مسرت افزا ان کے والد مصدر کے حال میں لکھتے ہیں:

آخر الامر امسال کہ سنۂ یک ہزار و یک صد و نود و چہار سپری گشتہ وہ خاطر شدہ رو بہ لشکر نواب ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں بہادر کہ قدر شناس اہل فضل کمال است آوردہ نمی دانم کہ دراں جا چہ سان است [1]

مصدر اور انشا سنہ ۱۱۹۴ھ میں ہی لکھنؤ سے نکلے اور بندھیل کھنڈ اور پھر دلی چلے گئے۔ اسی طرح دلی پہنچنے کے وقت انشا کی عمر اٹھارہ برس نہیں ہو سکتی۔ دلی میں انشا کے روابط شاہ عالم سے ہو گئے۔ یہیں ان کا اور عظیم کا معرکہ پیش آیا [2]۔ انشا کے دلی سے لکھنؤ آنے کے بارے میں قدیم خیال یہ تھا کہ انشا سنہ ۱۲۰۶ میں لکھنؤ آئے [3]
لیکن جیسا کہ آمنہ خاتون نے تحقیقی نوادر میں لکھا ہے انشا اس تاریخ

---

[1] صفحہ ۲۱۲ [2] مجموعہ نغز صفحہ ۸۱ تفصیل کے لئے سید امجد الطاف کا مقالہ خیر و اتم کا مقالہ بعنوان "لکھنؤ کا دبستان شاعری پر ایک نظر" نوائے ادب بمبئی ملاحظہ فرمائیے۔ [3] لکھنؤ کا دبستان شاعری۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی صفحہ ۱۵۵

سے بہت پہلے ۱۲۰۳ھ تک لکھنؤ آچکے تھے۔ ان کا استدلال یہ ہے۔
کلیات انشا میں ایک قصیدہ نواب الماس علی خاں کی مدح میں ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ممدوح کی عمر چالیس سال تھی۔

یعنی الماس علی خاں بہادر کہ مدام
در جہاں دست سخائش گہر افشاں باشد
چہل سال است کہ اوقات شریفش ایں است
کس ندیدم بعبادت کہ بدیناں باشد

ان کی وفات پر انشا نے جو قطعہ لکھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ساٹھ برس کی عمر پا کر انتقال کیا۔

شصت سال است کہ اوقات شریفش آں بود
آہ آہ زچنیں مرد مسلماں افسوس
سال تاریخ وفاتش زخرد جستم گفت
حیف اے آہ ز الماس علی خاں افسوس ۱۲۲۳ھ

گویا متذکرہ بالا قصیدہ ۱۲۰۳ھ میں لکھا گیا۔
اس طرح انشا کا ۱۲۰۳ھ میں یا اس کے قبل لکھنؤ آنا ثابت ہے۔
میرزا ماشاءاللہ کو تو نواب مظفر جنگ نے فرخ آباد میں ٹھہرا لیا اور انشا لکھنؤ پہنچ کر الماس علی خاں کی سرکار سے وابستہ ہو گئے... لے
جب سلیمان شکوہ لکھنؤ آئے۔ (۱۲۰۵ھ) تو انشا ان کے دربار سے متعلق ہو گئے۔ اسی زمانے میں انشا کا مصحفی سے معرکہ پیش آیا۔

مناقشۂ مصحفی و انشا کی تاریخ معین کرنا مشکل ہے۔ مصحفی نے اپنا تذکرہ ہندی گویاں ۱۲۰۹ھ میں ختم کیا تھا۔ اس میں انشا کے بیان میں انہوں نے کسی جھگڑے کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چشمک کا آغاز ہو چکا تھا۔ چنانچہ تبیان گرم کے حال میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دو دشمنوں کی کلہ شکنی کے لئے میرے برابر موجود رہتے ہیں۔ مصحفی کا ایک دیوان سلیمان شکوہ کے کتب خانہ میں ۱۲۱۲ھ میں داخل ہوا۔ اس میں معذرت انہام دالاقصیدہ موجود ہے۔ اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جھگڑے ۱۲۰۸ سے ۱۲۱۲ تک چلے رہے۔[1] کہا جاتا ہے کہ آصف الدولہ نے انشا کو لکھنو سے چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ انشا نکلے لیکن آصف الدولہ کی وفات ۱۲۱۲ھ کے بعد لوٹ آئے۔ ۱۲۱۴ھ میں شہزادہ سلیمان شکوہ ہی کے سایہ عاطفت میں لکھنو میں بسر اوقات کرتے تھے۔[2] پھر سعادت علی خاں نواب اودھ کے مصاحبوں میں انشا شامل ہوئے۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ مرزا سلیمان شکوہ سے نازک مزاجی کے سبب ناراض ہو گئے۔ الماس علی خاں کی رفاقت اختیار کی۔ جلد ہی سعادت علی خاں کے درباریوں میں شریک ہو گئے۔[3] دریائے لطافت ۱۲۱۲ھ کے[4] رانی کیتکی کی کہانی[5]

---

[1] انشا کا تغزل باب دوم [2] گل رعنا نیز لکھنو کا دبستان شاعری فٹ نوٹ ص ۱۵۹ بحوالہ خاتم الشعرا [3] گلشن ہند ص ۱۴ [4] دیباچہ ص ۶ [5] ۶ جمادی الآخرہ ۱۲۲۳ھ کے بعد۔ دیباچہ سلک گوہر مرتبہ عرشی ص ک

ردنرناپچہ بزبان ترکی[۱]۔ سلک گوہر (غیر منقوط نثر) لطائف السعادت[۲] اور کلیات انشا وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ سعادت علی خان کے مزاج میں انشا نے وہ دخل پایا تھا کہ سالار جنگ کے فرزند قاسم علی خان کو سربار ذلیل و رسوا کیا۔ اس کی تفصیل نوائے ادب بمبئی کی ۱۹۵۲ء کی فائل میں موجود ہے۔ لیکن ان کی قسمت کا ستارہ روبہ زوال بھی ہوا۔ ذلیل وخوار ہوکر خانہ نشین ہوگئے۔ ۱۳ جمادی الاول چہارشنبہ ۱۲۲۶ھ سے دو ماہ قبل انشا برطرف ہو چکے تھے[۳]۔ اس زمانے میں سبحان قلی بیگ راغب کی ہجو کہی داماد وپسر انشا نے راغب اور بعض دوسرے معزز لوگوں سے کہ ان کی بھی ہجویں کہی گئیں تھیں، معافی مانگی اور معاملہ رفع دفع ہوگیا ۱۲۲۸ھ میں انشا کی لڑکی مولائی بیگم چیچک سے فوت ہوئی[۴]۔ ۱۲۲۹ھ میں مولوی غلام احمد یحییف رامپوری انشا سے لکھنو میں ملے تھے[۵]۔ آزاد نے رنگین کی زبانی آخری زمانے کے جو واقعات بیان کئے ہیں صحت سے دور ہیں۔ انشا آخری زمانے میں پاگل ہوگئے تھے۔ چنانچہ احمد علی یکتا دستور الفصاحت میں لکھتے ہیں۔

آخر آخر مجنوں شدہ۔ چند سال گذشتہ بود کہ بہماں مرض درگذشت[۶]

---

[۱] ۱۸ جمادی الاول ۱۲۲۲ھ تا ۲۵ جمادی الآخر ایضاً صفحہ ۱۵ [۲] ۱۲۲۰ھ سے قبل معاصر حصہ ۴ ص ۱۶۴ تا ۱۷۰ [۳] محمد حسین آزاد نے ۱۲۲۵ھ لکھا ہے یہ درست نہیں۔ تفصیل کے لئے مقالہ راقم بر مرزا محمد حسین قتیل ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۴۸ء ص ۲۷۔ [۴] ایضاً ص ۲۸ [۵] حواشی دستور الفصاحت ص ۱۰۶۔ [۶] دستور الفصاحت ص ۱۰۷ و آب حیات کا تنقیدی مطالعہ ص ۵۸، ۱۹۵۹ء

نواب سعادت علی خاں نے ۱۲۳۰ھ میں وفات پائی۔ انشا اگر مخبوط الحواس نہ ہوتے تو نئے نواب کے ہاں ضرور کوشش کر کے دربار میں جگہ حاصل کر لیتے۔ ۱۲۳۳ھ میں وفات پائی۔ رتن سنگھ زخمی نے انیس العاشقین (۱۲۴۵ھ) میں انشا کی تاریخ وفات ۱۲۳۰ھ دی ہے۔ یہ کسی طرح درست نہیں بسنت سنگھ نشاط نے انشا کی تاریخ وفات کہی ہے۔

خبر انتقال میر انشا — دل غم دیدۂ نشاط شگفت
سالِ تاریخ او ز جان اجل — عرفیٔ وقت بود انشا گفت

زخمی کو دوسرے مصرع سے دھوکا ہوا ہوگا۔ "عرفیٔ وقت بود انشا" سے ۱۲۳۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔ انہوں نے غالباً اس کا خیال نہیں کیا کہ "جان" اجل یعنی "ج" کے تین عدد بھی اسی میں شامل کرنے ہوں گے جس سے ۱۲۳۳ھ ہو جائے گا۔ اس کی تصدیق دوسرے معاصر تذکروں سے بھی ہو جاتی ہے۔

رنگین۔ سعادت یار خاں رنگین خود لکھتے ہیں۔ کہ میں ۱۱۷۰ھ میں سرہند میں پیدا ہوا۔[1] ان کے والد کا نام طہماس بیگ خاں تھا۔ جو سات سال کی عمر میں ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کی فوج کے ساتھ ہندوستان میں آئے۔[2] پہلے پہل لاہور میں میر منو کے ملازم ہوئے۔ اس کی وفات پر نجیب الدولہ کی ملازمت کی۔ پھر ضابطہ خاں کے اور بالآخر ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے رفیق ہوئے۔[3] نواب نجف خاں کے زمانے میں بہ اقتدار کلی رکھتے تھے۔[4] طہماس بیگ نے ۱۲۱۷ھ میں انتقال کیا۔[5]

۱؎ سعادت یار خاں رنگین حیات و کلام تحقیقی مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی از صابر علی خاں (قلمی) پنجاب یونیورسٹی لائبریری ص ۱۳ ۲؎ ایضاً ص ۱۲ ۳؎ مجموعۂ نغز جلد اول ص ۲۸۶ ۴؎ تذکرہ ہندی مصحفی ص ۱۰۱ ۵؎ سعادت یار خاں رنگین حیات و کلام ص ۲۰

ان کی اولاد میں رنگین کے علاوہ صوفی اللہ یار بیگ خان بڑے بیٹے[1] خدا یار خان (رنگین سے چھوٹے) (المتوفی ۱۲۱۳ھ) محمد یار خاں تھے[2]

رنگین نے شاعری کا آغاز دہلی میں کیا۔ اور ابتدا ایں حاتم سے اصلاح لی (تذکرہ ہندی ص۱۰۱) لکھنو آنے سے قبل ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گھومتے رہے[3] وہ گھوڑوں کی تجارت بھی کرتے تھے[4] مجموعہ نغز میں ہے۔ کہ محمد امان نثار سے بھی اصلاح لی تھی[5] مصحفی کہتے ہیں سارا دیوان مجھے دکھایا اور اصلاح لی ان کا اصل اقتباس یہ ہے۔

در ایام آغاز شوق شعر تا در دلی بود

شعر خود را از نظر شاہ حاتم ... می گزرانید

حالا کہ بفضل الہٰی در نظم کلام ترقی و امتیاز

تمام پیدا کردہ از راہ انصاف دیوان خود

را از اول تا آخر بہ نظر مولف در آوردہ

کلامش بسیار کم اصلاح بر آمدہ[6]

مسدس رنگین کے دیباچے میں تحسین سروری لکھتے ہیں۔ خود مصحفی نے اپنے تذکرے میں رنگین کو شاگرد بنانے کا اشارہ تک نہیں کیا[7] اقتباس بالا سے سروری صاحب کی غلطی ظاہر ہے۔ رنگین کے لکھنو پہنچنے کی تاریخ بھی تذکرہ نگاروں نے عام طور پر نہیں دی۔ کمال مجمع الانتخاب میں رنگین

---

[1] حیات و کلام ص۱۵ [2] ایضاً ص۱۰ ۔ [3] مجالس رنگین مرتبہ مسعود حسن رضوی ص۱۷، ۱۸، ۲۱، ۲۳، ۴۷، ۵۱، ۵۷ [4] مسدس رنگین مرتبہ تحسین سروری دیباچہ ص۲ [5] ص۲۷۸ [6] تذکرہ ہندی ص۱۰۱ [7] مسدس رنگین ص۶

کے حال میں لکھتے ہیں۔

وقتے کہ مرزا سلیمان شکوہ از دہلی بہ لکھنو تشریف فرما شدند،
خان مذکور ہمراہ رکاب آمدہ چنانچہ از فقیر ہم صورت آشنا گردیدہ
و سال ہائے سال اتفاق ملاقات بے[1]

رنگین سلیمان شکوہ کے ساتھ ہی (۱۲۰۵ھ) لکھنو آئے۔ انہیں سنوکر نیے کا خاص طور پر شوق تھا۔ جس کی تفصیل مجالس رنگین دیتی ہیں۔[2] مصحفی کے تذکرہ ہندی کی تالیف کے وقت سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم تھے۔ انشااور مصحفی کے جھگڑے میں غالباً انھوں نے بھی شرکت کی ہے۔[3] مجموعہ نغز کی تالیف کے وقت (۱۲۲۱ھ) سودائے ملازمت کو ترک کرکے گوشہ نشین نزادیہ عزلت ہوچکے تھے۔[3] انہوں نے کم از کم دو شادیاں ضرور کیں تین بیٹے نواب یار (۱۲۱۴ھ) و (تا ۱۲۱۷ھ) مرزا علی یار۔ افتخر یار اور دو بیٹیاں فاطمہ اور محمدی بیگم تھیں۔ ایک نواسے یعقوب بیگ کا بھی ذکر ملتا ہے۔[4] رنگین نے اکیاسی برس کی عمر میں ۱۲۵۱ھ میں وفات پائی۔ تقریباً ۳۱ کتابوں کے مصنف ہیں۔[5]

قتیل :- اصل نام دیوانی سنگھ تھا۔ اصلاً پنجابی تھے۔ کھتری بھنڈاری خاندان از وطن بٹالہ (پنجاب) ۱۱۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ (غالباً دہلی میں)۔

۱؎ بیاض فائق ۲؎ مجالس رنگین صد ۳۲ ۳؎ مجموعہ نغز جلد اول صد ۲۷۸
۴؎ سعادت یار خاں رنگین حیات و کلام صد ۱۵ ۵؎ فہرست مجالس رنگین
صد ۱۵ پر دیکھئے۔

تذکرہ نگاروں نے ان کی پیدائش ۱۱۷۲ھ میں لکھی ہے جو درست نہیں[1]۔ دس برس کی عمر میں والدین کے ساتھ فیض آباد میں آئے[2] سترہ اٹھارہ برس کی عمر تک علوم کی تکمیل کی چودہ سال کی عمر میں ۱۱۸۶ھ کے لگ بھگ) اسلام قبول کیا۔ دو سال تک چھپائے رکھا پھر اندازاً ۱۱۸۸ھ کے قریب شیعہ فرقے میں علانیہ شریک ہو گئے۔ اسی زمانے میں نواب نجف خاں کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ آٹھ سال فوج میں زندگی گذاری اور ۱۱۹۴ھ یا ۱۱۹۵ھ کے قریب اس کے لشکر کے ساتھ دہلی پہنچے۔ ۱۱۹۶ھ میں نجف خاں کی وفات کے بعد لکھنو چلے آئے[3] یہاں ان کا دوستانہ میر حسن سے ہوا۔ (۱۱۹۹ھ میں سحر البیان کی تاریخ کہی) شروع شروع میں سعادت علی خان کے دربار سے متعلق رہے لیکن پھر ۱۲۱۱ھ کے قریب کالپی گئے۔ ۱۲۱۷ھ سے کچھ عرصہ پہلے دو یا تین سال سیاحت میں بسر کئے[4] ۱۲۱۸ھ یا ۱۲۱۷ھ کے قریب سکندر شکوہ کی سرکار میں ملازمت کی[5] آخر میں معدے کی بیماری میں مبتلا ہوئے استسقا کے مرض میں ۲۳ ربیع الاول شنبے کے دن ۱۲۳۳ھ کو لکھنو میں وفات پائی۔

خاندان حسن اور میر حسن کے بعد اب حسن کے حالات پیش کئے جاتے ہیں۔

---

[1] مفصل بحث راقم کے مقالہ بعنوان مرزا قتیل ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۴۸ء صـ ۲ سے
[2] ایضاً صـ ۵ [3] ایضاً صـ ۱۰ [4] ایضاً صـ ۱۹ [5] ایضاً صـ ۲۳۔

باب سوم

قیام دھلی (ابتدائی حالات)

نام :۔ تمام قدیم تذکرہ نگار متفق ہیں کہ حسن کا نام غلام حسن تھا[1]۔
سب سے قدیم بیان اس کا اپنا ہے۔ تذکرۂ شعرائے اردو کے دیباچے
میں لکھتے ہیں :۔

اما بعد ایں پروردۂ آغوشِ رنج و محن، امیرِ دار الحزن، میر غلام حسن
ابن میر غلام حسین بن عزیز اللہ را تمنائے آں شد کہ تذکرۂ سخن آفرینان
ہندی زبان را ...... دستہ بند صفحۂ اوراق نماید[2]۔

سفینۂ ہندی میں بھی نام یہی دیا ہے[3]۔ مصحفی[4]۔ کمال[5] میں بھی یہی نام ہے۔

---

[1] احمد علی یکتا نے نام سید حسن المتخلص بحسن دیا ہے (ص۵۵ دستور الفصاحت) لیکن حسن کے اپنے بیانات اور دوسرے تذکرے اس کا پورا نام غلام حسن دیتے ہیں۔

[2] :۔ تذکرہ شعرائے اردو (حسن) طبع ثانی ۱۹۴۰ء ص۲۔

[3] :۔ سفینۂ ہندی بانکی پور ورق ۱۷ ا بحوالہ اقتباس از قاضی عبد الودود صاحب۔

[4] :۔ تذکرۂ ہندی ص۶۹۔

[5] :۔ بحوالہ اقتباس از نسخۂ ایشیاٹک سوسائٹی لندن نمبر ہندوستانی ۹۔ مہیا کردہ ڈاکٹر محی الدین احمد۔ دیباچۂ فائق مبنی بر نسخۂ انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔

مبتلا[1] نے حسن دہلوی لکھا ہے۔ وہ میر حسن کرکے مشہور ہیں۔
میر غلام حسن جو اردو کی دنیا میں میر حسن کے لقب سے مشہور ہیں[2]۔
عام روش کے خلاف دو جگہ یہی وتیرہ اختیار[3] کی ہے ؎

سچ تو یہ ہے کہ آج[4] میر حسن
اس نے خلعت پہن کے عباسی
ایک تم پر نہیں جنون گیا
کتنے ہی سید وں کا خون گیا
کچھ کل سے ہم کو میر حسن کی خبر نہیں[4]
کیا جانے تیرے کھوج میں کیدھر نکل گیا

سحر البیان میں ایک جگہ صرف تخلص ہے[5] ؎

غرض جس نے اس کو سنا یہ کہا
حسن آفریں مرحبا مرحبا

اور اسی صفحے پہ دوسری جگہ پورا نام دیا ہے :- ؎

بحق حسین و امام حسن!
رہوں شاد میں بھی غلام حسن

تخلص :- مثنویوں میں اور دیوان میں حسن تخلص کیا ہے تذکرے میں اپنے

---

[1] :- بحوالہ رو ٹوگراف ترجمہ محسن از تذکرہ طبقاتِ سخن۔ ذخیرۂ برلن :-
[2] :- م۔ علی حسن مقالہ بعنوان میر حسن ادبِ لطیف فروری ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۳ :-
[3] :- دیوان حسن۔ نولکشور پریس صفحہ ۲۱ :- [4] غزلیات میر حسن (غیر مطبوعہ) مرتبہ مرزا علی حسن سرفراز پریس لکھنؤ ۱۹۴۴ء صفحہ ۴۳ :- [5] :- مثنویات حسن مرتبہ آسی ۱۹۴۴ء صفحہ ۱۲۲ :-

ایک ہم تخلص کا ذکر یوں کرتے ہیں :۔

(خواجہ حسن) مدتے بہ طرفِ بریلی اقامت داشت چوں از تخلص فقیر واقف نہ بود، بنابریں حسن تخلص نمود۔ الحال درفیض آباد اقامت دارد[1]۔

تخلص کی مقبولیت کا پتا معاصر اور متاخر تذکروں سے بخوبی ملتا ہے۔ معاصر تذکروں میں میر حسن (غلام حسن) کے علاوہ دو اور حسن (محمد حسن اور خواجہ حسن) بھی ہیں جس سے بعض محققوں کو غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔ اس لئے ان دو حسنوں کا مختصر حال بھی درج کیا جاتا ہے۔

میر محمد حسن :۔ میر تقی میر نے نام نہیں دیا[2]۔ صرف میر حسن کر کے لکھا ہے۔ جوان تھا۔ نوکر پیشہ تھا اور سودا سے اصلاح لیتا تھا۔ اس کے بعد میر نے دو شعر بھی دیئے ہیں۔ یہی دو شعر گردیزی نے بھی دیئے ہیں[3]۔ اور نام میر محمد حسن لکھا ہے قیام دہلی میں تھا۔ خود میر حسن (غلام حسن) اپنے تذکرے میں اس میر محمد حسن کے بارے میں ان بیانات پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ ایک عرصے سے یونس خان کی صحبت میں ہیں۔ کبھی کبھی شعر کہتے ہیں، خدا سلامت رکھے[4]۔ مصحفی[5] اس شاعر سے واقف نہیں۔ اس طرح صاحبِ مجموعۂ نغز (۱۲۲۱ھ) بھی نا آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ صاحب گلزار ابراہیم نے ان کا بہت مختصر حال لکھا ہے۔ (نمبر ۱۰۹) اور غالباً اسی ایک شاعر کے دو شاعر بنا کر ۱۰۹ اور ۱۱۰ نمبر پہ ترجمہ دے دیا ہے۔ میر حسن غیر مطبوعہ غزلیات کے دیباچہ نگار (مرزا علی حسن) نے میر حسن اور غلام حسن کو ایک آدمی سمجھ کر دونوں

---

[1] :۔ تذکرۂ شعرائے اردو (حسن) ص ۵۰۔ [2] نکات الشعراء ۱۱۶۵ھ ۔
[3] :۔ ریختۂ گویاں ۱۱۶۶ھ ۔ [4] :۔ تذکرۂ میر حسن ۱۱۸۵ھ تا ۱۱۹۴ھ ۔
[5] :۔ تذکرۂ ہندی ۱۲۰۱ بعد ۔

کے حالات ملا دیے ہیں (حالات صفہ) یہی حال رام بابو سکسینہ نے کیا ہے[1]۔

خواجہ حسن :- میر تقی۔ گردیزی اور صاحب گلشن گفتار کے تذکرے اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ میر حسن ان کے حالات میں لکھتے ہیں "نبیرۂ خواجہ کمہاری۔ جوان ہیں۔ مدت تک بریلی میں اقامت رکھی۔ فقیر سے ناواقف ہونے کی بنا پر حسن تخلص کیا۔ اب فیض آباد میں سکونت رکھتے ہیں۔ مصحفی کے زمانے تک خواجہ حسن لکھنؤ میں آچکے تھے۔ نواب وزیر اور صاحب عالم کے ہاں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ابتدا میں جعفر علی حسرت سے اصلاح لی۔ جرأت کے دوستوں میں سے تھے غزل کے مقطعے میں بخشی نام اپنی محبوبہ کا لاتے ہیں۔ مجموعہ نغز کے بیان کے مطابق پہلے دہلی میں رہا کرتے تھے بعد کو لکھنؤ گئے ہیں۔ موسیقی کے ماہر تھے۔ صاحب گلزار ابراہیم ان کا وطن دہلی بتاتے ہیں اور پہاڑ گنج مسکن تھا۔ سرفراز الدولہ حسن رضا خان (اودھ) کے متوسلین میں سے تھے" بخشی نام ایک رنڈی ارباب نشاط سے ہے اسی پہ مرتے تھے اور اکثر نام اس کا مقطع میں غزل کے داخل کرتے تھے۔"

یہ چونکہ خواجہ کر کے مشہور تھے اس لئے ان کے اور میر حسن کے نام میں التباس ممکن نہ تھا۔ البتہ دونوں کے کلاموں میں خلط ملط ہوا ہے۔ آب حیات میں میر حسن کی پانچ غزلیں دی گئی ہیں۔ ان میں غزل نمبر ۲ کا مقطع ہے :- [2]

کیا قتل اور جان بخشی بھی کی
حسن اس نے احساں دوبارا کیا[3]

یہ غزل کلیات حسن[4] میں نہیں ملتی۔ نساخ نے سخن الشعراء میں یہ شعر حسن بخشی ہی سے منسوب کیا ہے[5]۔ آزاد کا مغالطہ ظاہر ہے۔

---

[1] A Hist: of urdu Lit: P-58 .

[2] آب حیات صفہ ۲۵۹ :۔ [3] :- مائکروفلم برٹش میوزیم یہ [4] صفہ ۱۳۰ :۔

وطن اور مولد:- میر حسن اپنے وطن (ہندوستان میں) کے بارے میں مندرجۂ ذیل اطلاع دیتے ہیں :-

اصل این مولف (میر حسن) ابن میر غلام حسین ..... از شاہجہان آباد است[1]۔

...... پوشیدہ نماند کہ اصل این فقیر ابن غلام حسین... ہروی است میر امامی ..... فاضل متبحر بودند بسبب فضلیت در شاہجہان آباد آمدہ ..... (۱)[2]

دوسرے معاصر تذکرہ نگار بھی انہیں شاہجہان آباد کا باشندہ لکھتے ہیں[3]

..... اصلش از ایران و مولدش ہندوستان جنت نشان است۔ در سید واڑہ دہلی کہنہ تولدش واقع شدہ[4]۔

(میر حسن) در شہر کہنۂ دہلی مسکن داشت[5]۔

---

[1] :- دیباچہ دیوان حسن از کلیات حسن (قلمی) برٹش میوزیم مائیکروفلم مملوکہ راقم ص۳۲۲۔

[2] :- تذکرۂ مسرت افزا میں بھی حسن کے تذکرے کے حوالے سے حال لکھا ہے (ص۶۰، ۵۹ ترتیب قاضی عبدالودود) لیکن پرورش در شاہجہان آباد لکھ دیا ہے۔ حالانکہ حسن کا اپنا بیان ہے کہ میر امامی ہروی شاہجہان آباد میں قیام پذیر ہوئے۔ (تذکرۂ میر حسن طبع ثانی ص۵۲)۔

[3] :- مصحفی تذکرۂ ہندی ص۶۸۔ امراللہ الہ آبادی تذکرۂ مسرت افزا ص۵۹۔ شوق طبقات الشعراء (بحوالہ مکتوب قاضی عبدالودود اقتباسات دو قلمی نسخوں پر مبنی ہیں)۔

[4] :- مجموعۂ نغز۔ قدرت اللہ قاسم ص۲۰۳ جلد اول۔

[5] :- گلشن عشق مبتلا ۴۲ ا بحوالہ عرشی مرتب دستور الفصاحت حواشی ص۸۵

حسن : شاہجہان آبادی ..... دلی کے پرانے شہر میں بود و باش رکھتے تھے[1]

حسن تخلص دہلوی اسمش میر غلام حسن ابن میر غلام حسین ضاحک تخلص از اولاد میر امامی ہروی است۔ در کہنہ شاہجہان آباد متصل بعجل (کذا) مسجد می باشد دریں دلا کہ ۱۱۹۶ھ ہجریہ است۔ ابیات خود از لکھنؤ بو بنارس براقم آثم فرستادہ وبقلم دادہ کہ ..... مدتیست از دہلی وارد گشتہ بالنواب سالار جنگ و خلف ایشاں ..... می گذرانم۔ الحاصل میر غلام حسن مذکور در لکھنو بسخنوری مشہور است[2]۔

ان اقتباسات سے دور حاضر کے ایک محقق نے بعض نتائج نکالے ہیں :۔

حکیم قدرت اللہ خان قاسم کا بیان ہے کہ میر امامی نے محلہ سید واڑہ پرانی دہلی میں مکان لے کر قیام کیا۔ لیکن صاحب گلزار ابراہیمی اس رائے سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے فرمانے کے مطابق میر امامی بجلی مسجد کے پاس رہتے تھے۔ آزاد نے پہلا قول نقل کیا ہے جو زیادہ درست ہے[3]۔

---

[1] :۔ گلشن ہند مرزا علی لطف ص ۱۱۸ ۔ [2] گلزار ابراہیم نسخہ کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ۔ اقتباس بشکریہ قاضی عبدالودود صاحب۔ گلشن ہند کے ساتھ انجمن ترقی اردو نے حسن کے ترجمے کی جو تلخیص بحوالہ گلزار ابراہیم دی ہے۔ اس میں لکھا ہے "کوئی اضافہ (گلشن ہند میں) نہیں خلیل نے انہیں حالات کو جو لطف نے اپنی طرف سے پیش کئے ہیں میر حسن ہی کے قلم سے لکھا ہے۔ کیونکہ انہوں نے لکھنؤ سے خود حالات بھیجے تھے ....." (گلشن ہند ص ۱۱۸) اختلاف ظاہر ہے۔

[3] :۔ میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعراء محمود فاروقی ص ۱۷

معلوم ہوتا ہے [1]:

پیدائش (حسن) ۱۱۵۱ھ میں محلہ سید واڑہ پرانی دہلی میں ہوئی تھی [2]:

قاسم نے حسن کی جنم بھومی کے بارے میں سید واڑے کی اطلاع دی ہے۔ امامی کے قیام کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ آزاد کا قول بھی حسن کے بارے میں یہی ہے۔ اس لئے دوسرا اقتباس صحیح اور پہلا جعلی ہے۔ گلزار ابراہیم (جسے آزاد کی تقلید میں انہوں نے گلزار ابراہیمی کہا ہے) کے اقتباس سے جو کچھ آزاد نے اخذ کیا ہے یہ ہے کہ ضاحک کا قیام بجلی مسجد کے پاس بھی رہا۔ ہاں حسن پیدا سید واڑہ محلے میں ہوئے۔ اصل اقتباس کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ حسن کا قیام بجلی مسجد کے پاس رہا ہے۔ واقعاتِ دارالحکومت دہلی۔ سیون سٹیپز آف دہلی اور دہلی گا یڈ پرانی دلی کے ان محلوں کے بارے میں خاموش ہیں۔ یہی حال آثار الصنادید کا ہے۔

ولادت: معاصر تذکرہ نگار میر حسن کی پیدائش کا کوئی سنہ نہیں دیتے لیکن جیسے جیسے ہم دورِ حاضر کی طرف آتے ہیں تعینِ زمانہ کی کوششیں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ اول ایسی کتابوں کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن میں قطعی سنین دیئے گئے ہیں:-

(۱) پیدائش ۱۱۵۱ھ میں محلہ سید واڑہ، پرانی دہلی میں ہوئی تھی [3]:

---

[1] اس کے قدیم راوی آزاد (آبِ حیات) ہیں جو میر ضاحک کے حال میں گلزار ابراہیمی (گلزار ابراہیم) کے حوالے سے ضاحک کا قیام بجلی مسجد میں بتاتے ہیں (ص۱۸ فٹ نوٹ) اس کے بعد آزاد کا حوالہ مولانا سید امجد علی اشہری نے حیاتِ انیس میں نقل کیا ہے (حیات انیس ص۹) فاروقی صاحب نے غالباً انہیں دو ماخذوں سے استفادہ کیا ہے۔ [2] ایضاً ص۳۹:-

[3] :-(فٹ نوٹ):- رام بابو سکسینہ نے تاریخ ۱۱۴۲ھ لکھی ہے جو غلط ہے۔ فاروقی

[میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعرا (۱۹۵۲ء) محمود فاروقی ص۳۷]

(۲) میر غلام حسن، حسن تخلص ۱۱۴۲ھ ۱۷۲۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔[1]

(۳) حسن کی تاریخ ولادت تقریباً ۱۱۴۲ھ ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ میر (تقی) نے ۱۱۶۵ھ سے قبل حسن کے حالات قلمبند کئے تھے حتیٰ کہ ۱۱۶۰ھ میں فرض کر لیا جائے جب بھی میر حسن جوان تھے اور دہلی میں تھے۔[2]

(۴) غالباً ان کی ولادت پرانی دہلی کے محلہ سید واڑے میں ۱۱۴۰ھ میں ہوئی[3]

(۵) میر حسن ۱۱۴۰ھ ۱۷۲۷ء کو بمقام سید واڑہ پرانی دہلی میں پیدا ہوئے۔[4]

(۶) Mir Hasan. Mir Ghulam Hasan, Hasan (1736—1786); born in Delhi[5] .....

۱ آگے حسرت کا اقتباس دیا ہے۔

(۷) میر حسن۔ میر غلام حسن حسن (ولادت ۱۷۳۶ء وفات ۱۷۸۶ء)[6]

(۸) میر حسن از ۱۱۵۰ھ تا ۱۲۰۱ھ[7]

(۹) یہ ۱۱۴۰ھ ۱۷۲۷ء یا اسی کے لگ بھگ ..... پیدا ہوئے۔[8]

---

[1] :- اردو شاعروں کا البم (۱۹۵۲ء) ص ۱۱

[2] :- میر حسن اور مرزا علی حسن، ادب لطیف فروری (۱۹۵۲ء) ص ۱۴

[3] :- غزلیات میر حسن از مرزا علی حسن (۱۹۴۴ء) ص ۸ (حالاتِ زندگی)

[4] :- مثنویاتِ حسن مرتبہ آسی (۱۹۴۳ء) ص ۱

[5] Hand book of urdu Literature. Dr. Mohan Sing (1942 A.D.) P.129

[6] :- تاریخ ادب اردو ڈاکٹر زور (۱۹۴۰ء) ص ۹۷

[7] :- حسرت موہانی رسالہ اردوئے معلیٰ گڈھ۔ اقتباس بحوالہ حیات انیس۔ مولانا اشہری (۱۹۰۵ء) ص ۱۱

[8] :- دیباچہ رموز العارفین از سید احمد اللہ قادری ص ۲

(۱۰) انتقال کے وقت آپ کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی۔ [۱]

(۱۱) میر حسن ۱۱۴۰ھ ۱۷۲۷ء میں پرانی دلی میں پیدا ہوئے۔ [۲]

اب یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ یہ سنین کس طرح معین کئے گئے ہیں۔ اس کی تلاش و جستجو ان کتابوں اور حوالوں سے ذرا پہلے کی کتب سے بہ آسانی ہو سکتی ہے جو حسب ذیل ہیں:-

(۱) انتقال ۱۲۰۱ھ پہلی محرم کو ہوا۔ عمر کا حال نہ کھلا لکھتے ہیں کہ پچاس برس سے زیادہ پائی۔ [۳]

(۲) میر حسن لکھنؤ کس سنہ میں آئے؟ اس کے متعلق کوئی فیصلہ قطعی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خود صرف اتنا لکھتے ہیں کہ شروع جوانی میں ترک وطن کر کے لکھنؤ اور فیض آباد آیا۔ مؤلف گل رعنا کا خیال ہے کہ اس وقت بارہ تیرہ برس کی عمر ہوگی۔ وفات ۱۲۰۱ھ میں ہوئی اور اس وقت عمر تقریباً ۵۰ سال کی تھی۔ اس حساب سے ۱۱۶۳ھ یا ۱۱۶۴ھ میں پورب آئے ہوں گے۔ [۴]

(۳) میر حسن کی ولادت پرانی دلی کے محلہ سید واڑہ میں ہوئی۔ [۵]

He (Mir Hasan) fell ill in 1200 A.H. (1785 A.D.) (۶) and died in Maharram 1201 A.H. (October 1786 A.D.) being over fifty years of age and was buried

---

[۱]:- خمخانۂ جاوید۔ جلد دوم ص ۴۲۱ :-

[۲]:- مشرب تاریخ ادب اردو نمبر ۱۹۵۶ء سحرالبیان از پروفیسر خان رشید ص ۸

[۳]:- صفیر بلگرامی۔ جلوۂ خضر جلد اول ص ۱۸۳ :-

[۴]:- لکھنؤ کا دبستان شاعری۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (۱۹۴۴ء) ص ۹۳ :-

[۵]:- تاریخ ادب اردو (رام بابو سکسینہ) اردو ترجمہ از حسن عسکری ص ۱۰۹ :-

(۵) خلاصہ کلام کا یہ کہ ١٢٠١ھ اول محرم کو دار فانی سے رحلت کی۔ مفتی گنج میں
..... دفن ہوئے۔ عمر کا حال نہ کھلا لکھتے ہیں کہ ٥٠ برس سے زیادہ پائی[٢]

عمر کے اس مسئلے کی کڑی مصحفی اور کریم الدین کے بیانات تک جاتی ہے۔ مصحفی کے تعلقات میر حسن سے آخر عمر میں گہرے تھے۔ حسن کی وفات پر انہوں نے تاریخ کہی ہے اور تذکرۂ ہندی میں (ابتدا ١٢٠٠ھ۔ خاتمہ ١٢٠٩ھ بعد میں اضافے بھی کئے ہیں) لکھتے ہیں:۔

در عشرۂ محرم رحلت او و سن عمرش از شصت متجاوز خواہد بود[٣]

١١٤٠ھ کے حق میں فیصلہ اسی اندازے کا مرہونِ منت ہے کہ حسن وفات کے وقت ساٹھ سال سے اوپر تھے اس لئے پیدائش تقریباً ١١٤٠ھ میں ہوئی ہوگی۔

کریم الدین اپنے تذکرے (١٨٤٧ء) میں لکھتے ہیں:۔

آخر ذی الحج ١٢٠٠ھ میں بیمار ہوا۔ عشرۂ اول محرم ١٢٠١ھ ماہ اکتوبر میں فوت ہوا۔ عمر اس کی پچاس برس سے زیادہ ہوئی[٤]

گویا مصحفی نے عمر ٦٠ سال سے اوپر بتائی ہے۔ اور تاریخ وفات عشرۂ محرم ١٢٠١ھ ہے۔ اس طرح تذکرہ نگاروں کے ایک گروہ نے ١٢٠٠ — ٦٠ = ١١٤٠ھ تقریباً سنہ نکال لیا۔[٥] عسکری مترجم تاریخ ادب اردو نے سکسینہ کی کتاب میں یہ اضافہ کر دیا پھر بعد کے تذکرہ نگاروں نے اس سنہ کو قبول کر لیا حتیٰ کہ مرزا علی حسن نے میر تقی میر کے تذکرے

---

[١] [A History of Urdu Literature By Ram Babu (1927. 2nd Ed. 1940) P-67.]
١١٣٦ء

[٢]:۔ آبِ حیات۔ آزاد ص ٢٥٥؛ [٣]:۔ تذکرۂ ہندی ص ٧٦؛ [٤]: تذکرۂ کریم الدین ص ٢١٣؛

[٥] ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اور نصر نے پچاس سے متجاوز کے حساب سے (سنہ ١١٣٩ھ) سنہ ١١٣٦ھ قائم کیا ہے۔

سے میر محمد حسن کے حالات میر حسن کے سلسلے میں درج کرکے ایک اور دلیل اپنی حمایت میں حاصل کر لی۔ دتاسی تاریخ ادب ہندوستانی (جلد اول ص ۵۲۸ بعد) (یہ ترجمہ مظفر علی سید نے میری درخواست پر فرانسیسی سے انگریزی میں کیا ہے) میں لکھتے ہیں :-

At the end of the month of Zihijja 1200 A.H. Hasan was down with the malady in which he died; and in the first ten days of Muharram 1201 (Oct.-1786) he left this perishable world for the world eternal at the age of more than 50 years (cinquan-(te)

تذکرۂ کریم الدین میں بھی عمر پچاس برس سے زائد بتائی گئی ہے۔ اس پر انحصار کرکے آزاد نے حوالہ دے دیا ہے۔ بعد کے مورخوں نے جن میں محمود فاروقی بھی شامل ہیں اس سے ۱۲۰۱ — ۵۰ = ۱۱۵۱ھ درج کر لیا ہے۔ فاروقی اور آزاد کی تائید میں دتاسی سے قبل کا کوئی حوالہ راقم کی نظر سے نہیں گزرا۔ دوسرے گروہ کی تائید مصحفی کے معاصر بیان سے ہوتی ہے۔ مصحفی لکھتے ہیں :-

در شاہجہان آباد تولد یافتہ۔ بہ عمر دوازدہ سالگی قضا او را بطرف پورب انگندہ بقیۂ عمر در فیض آباد و لکھنؤ گذرانیدہ در سرکار نواب سالار جنگ بہادر ؎۱

مصحفی کی عمر کے اندازے کو اگر درست مانا جائے تو سنہ پیدائش ۱۱۴۰ھ کے قریب بنتا ہے اس حساب سے اودھ میں وارد ہونے کا سنہ ۱۱۵۲ھ کے قریب ہونا چاہیئے لیکن (جیسا کہ آگے چل کر ہم مفصل بحث کریں گے) یہ غلط ہے۔ مصحفی اور مرزا علی لطف کے سوا سب تذکرے یک زبان ہیں کہ حسن شروع جوانی میں فیض آباد و لکھنؤ آئے۔ اسے غلط

؎۱ :- تذکرۂ ہندی صفحہ ۶۸

قرار دینے کے ساتھ ہی مصحفی کا حسن کو ساٹھ سال سے متجاوز قرار دینا بھی باطل ٹھہرتا ہے عمر میں بعض اوقات ہم عصروں کے اندازے بھی غلط ہو جاتے ہیں مثلاً :-

(۱) صہبائی کی عمر کریم الدین نے ۱۸۴۷ء میں چالیس سال کے قریب بتائی ہے۔ حالانکہ اشپرنگر (جو خود صہبائی سے مل چکے ہیں) ۱۸۵۷ء میں ان کی عمر ساٹھ برس قرار دیتے ہیں[1]

(۲) مصحفی میر تقی میر کے بارے میں لکھتے ہیں :-

عمرش تخمیناً قریب ہشتاد است[2]

تذکرے کا آغاز ۱۲۰۱ھ سے قبل اور انجام ۱۲۰۹ھ میں ہوا۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ مصحفی نے یہ حال ۱۲۰۹ھ میں لکھا تو اس وقت میر کی عمر (ب ۱۱۳۵ھ) ۷۴ برس ہوگی۔ لیکن اگر چند سال (است) کہ از شاہجہان آباد بہ پورب رسیدہ۔ کا خیال کیا جائے تو یہ حال ۱۲۰۹ھ کے بہت قبل لکھا جانا چاہیئے[3]

(۳) شیفتہ آزردہ کے بارے میں ۱۸۳۶ء میں اس کی عمر ۵۰ برس کے قریب بتاتے ہیں بقول ڈاکٹر اشپرنگر ۱۸۵۳ء میں ان کی عمر ۷۰ برس سے زائد تھی[4]

(۴) کریم الدین مومن کے دوست ہیں۔ ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں مومن کی عمر چالیس برس بتاتے ہیں۔ مومن کا سال پیدائش ۱۲۱۵ھ ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۴۶ برس ہوگی۔ کریم الدین نے چھ سال کا دھوکا کھایا ہے۔

اس لئے ہمارے خیال میں مصحفی کو یہاں بھی اندازہ لگانے میں دھوکا ہوا ہے۔ ہمیں میر حسن کے اپنے بیان کو بنیاد مان کر آگے چلنا چاہیئے ان کا اپنا بیان ہے:۔

---

[1] :- اردو۔ جلد ۲۹ شمارہ نمبر ۱۔ جنوری ۱۹۵۰ء ص ۹۱ فٹ نوٹ۔ مقالہ اردو تذکرے از ڈاکٹر ریاض الحسن

[2] :- تذکرہ ہندی ص ۲۰۰ :۔ [3] تذکرہ ہندی ص ۲۰۲ :۔ [4] :- رسالہ اردو فٹ نوٹ ص ۹۶ :۔

شروع جوانی از گردش روزگار بد ہنجار کہ ہر گز بہ کسے وفانہ کردہ است بطرف لکھنؤ و فیض آباد رسیدم[1]۔

آغازِ شباب، کتنی عمر کو قرار دینا چاہیئے؟

(۱) فتح علی حسینی گردیزی "تذکرہ ریختہ گویاں (۱۱۶۶ھ) میں خانِ آرزو اکبر آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں :-

از ابتدائے بہارِ جوانی جا بہ شاہجہان آباد چمن بنیاد گزیدہ[2]۔

سروِ آزاد (غلام علی آزاد ۱۱۶۶ھ) میں آرزو کی دہلی میں آمد کے بارے میں خود آرزو کے حوالے سے لکھا ہے :-

ولادتِ شیخ در منتہائے ۱۱۰۱ھ واقع شد۔۔۔۔ در اوائل سلطنت محمد فرخ سیر بجز ہشتے از خدماتِ گوالیار مامور گردید و در سنہ اثنتین و ثلثین و مائۃ والف (۱۱۳۲ھ) بہ دار الخلافہ آمد[3]۔

گردیزی نے ۱۲ برس کی عمر کو آغازِ بہارِ جوانی قرار دیا ہے۔ اگر ڈاکٹر منوہر سہائے انور[4] کی تحقیقات پر بھروسا کیا جائے تو آرزو ۱۰۹۹ھ میں پیدا ہوئے (بحوالہ سفینۂ خوشگو) اس حساب سے ۳۳ برس کو آغازِ جوانی قرار دیا ہے۔

(۲) یقین کے بارے میں چمنستانِ شعرا میں شفیق (۱۱۷۵ھ) نے لکھا ہے :-

حکیم بیگ خان روزے بافقیر نقل می فرمود کہ انعام اللہ خان را در سنہ تسع و ستین و مائۃ والف (۱۱۶۹ھ) ملاقات نمودم ۔۔۔۔ اشعارِ خود بسیار خواند و استعمال تریاک با وجودِ صغرِ سن کہ (۳۰) سی نخواہد بود بحدے

---

[1]:- تذکرہ شعرائے اردو ص ۵۲،۵۳ ۔۔ [2]:- ص ۲ ۔۔ [3]:- سروِ آزاد ص ۲۲۲، ۲۲۸

[4]:- تحقیقی مقالہ برخان آرزو قلمی پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۔۔

داشت کہ تمام رنگِ رویش رنگِ کہربا گرفت ہے۔[1]

تیس سال کے قریب عمر کو شیفتہ صغر سنی قرار دے رہے ہیں۔

(۳) جرأت کے بارے میں مجموعۂ نغز میں (۱۲۲۱ھ) قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں:-

افسوس کہ در عین عنفوانِ شباب چشم جہاں بینش از نورِ بینائی بے آب گشتہ ہے۔[2]

سخن شعراء (۱۲۹۱ھ) میں عبدالغفور نساخ لکھتے ہیں:-

انیس برس کی عمر میں چیچک کے عارضے میں ان کی بصارت زائل ہو گئی تھی ہے۔[3]

بزمِ سخن (۱۲۹۸ھ) میں سید علی حسن خان لکھتے ہیں:-

در نوزدہ سالگی بصارتش زائل گشتہ ہے۔[4]

تذکرہ طورِ کلیم (۱۲۹۸ھ) میں سید نورالحسن خان لکھتے ہیں:-

در عمرِ نوزدہ سالگی بصارتش زوال گرفتہ ہے۔[5]

یہاں انیس برس کو عین عنفوانِ شباب قرار دیا گیا ہے۔

(۴) تاباں کے بارے میں میر تقی میر نکات الشعراء (۱۱۶۵ھ) میں لکھتے ہیں:-

نوجوان بامزہ بود ۔۔۔ آخر آخر کہ اوائلِ جوانیٔ او بود۔ ایں قدر مداومتِ شراب کردہ کہ ملاقاتِ ہمہ یاراں موقوف شد ۔۔۔ آخرالامر ہماں شد کہ گفتہ بود حاصل آفتابِ عمرِ او زود بلبِ بام رسید ہے۔[6]

جوانی بود در نہایتِ حسن و جمال ہے۔[7]

---

[1]: صفحہ ۱۶۳ ۔ [2]: ۔ [3]: جلد اول صفحہ ۱۵۵ ۔ [4]: صفحہ ۱۰۲ ۔ [5]: ۔ [6]: صفحہ ۲۴ ۔
[5]: ۔ صفحہ ۲۴ ۔ [6]: ۔ صفحہ ۱۰۸، ۱۰۹ ۔ [7]: قائم صفحہ ۵۳ ۔

در عینِ عنفوانِ جوانی خاکِ مالِ فلک خورد۔[1]

فقیر آں یوسفِ ثانی را بہ سبب نہ بودن در آں دورہ کہ در عینِ جوانی گرگِ اجلش او را (خورد) ندید۔۔۔۔ اما تصویر آں۔۔۔ بملاحظہ رسید[2]

آفتابِ تابانِ عمر او در فروعِ شبِ جوانی پنہاں گردید۔[3]

ہوش سنبھالتے ہی جملۂ نادری دیکھا۔ اس کا ذکر دیوان میں کیا ہے۔ وفات ۱۱۶۴ھ۔ ولادت غالباً ۱۱۳۰ھ ہے[4]

اگر ولادت کی یہ تاریخ صحیح ہے تو وفات کے وقت تاباں کی عمر ۳۴ برس کی ہوگی بعض مورخ ۳۰ برس اور بعض ۳۵ برس کے حق میں ہیں۔ ۱۱۵۳ھ میں حاتم نے ان کی زمین میں غزل کہی (اس طرح گرم آج چمن میں آج وہ گل چشم سے۔ دیکھتے جس کے مرے جاتے رہے گُل چشم سے) نیز حاتم کا ایک اور مقطع ہے :- ؎

فیضِ صحبت کا تری حاتم عیاں ہے خلق میں
طفلِ مکتب تھا سو عالم بیچ تاباں ہو گیا

یہ میر شاکر ناجی کی زمین میں ۱۱۵۵ھ میں کہی گئی۔ اس وقت تک تاباں کی عمر اتنی ضرور ہونی چاہیئے کہ اساتذہ اس کی زمینوں میں شعر کہہ سکیں اور اس کا تذکرہ اپنے اشعار میں کر سکیں۔ اس لئے سنۂ پیدائش کو درست ماننے میں کوئی امر مانع نہیں۔

(۵) میر حسن۔ اجمل کے حال میں لکھتے ہیں :-

عینِ جوانی۔۔۔۔ الحال مسند نشین حضرت شاہ خوب اللہ اوست[5]

---

[1] :- گردیزی ص۱۳۱ :- [2] :- مصحفی ص۸۹ :- [3] :- میر حسن تذکرۂ شعرائے اردو ص۳۵ :- [4] :- فائق۔ مقالہ در معارف :- [5] :- تذکرہ شعرائے اردو ص۱۲ :-

شاہ اجمل اپنے بڑے بھائی کی وفات پر (۱۱۸۷ھ) مسند نشین ہوئے (بحوالہ مسرت افزا ترجمۂ اجمل) شاہ اجمل کی تاریخ پیدائش "خورشیدم" (۱۱۶۰ھ) سے نکلتی ہے۔ (ایضاً) حسن نے اجمل کا حال ۱۱۸۷ھ اور ۱۱۸۹ھ کے مابین لکھا۔ عین جوانی ان کے نزدیک ۲۴ برس یا ۲۶ برس کے قریب ہوگی۔

(۶) میر حسن کلیات (مملوکہ عبدالعلیم نبیر کوٹی) میں شجاع الدولہ کی وفات پر لکھتے ہیں :

تو چھوڑ گیا جہانِ فانی افسوس   تجھ بن یہ ہماری زندگانی افسوس

سب ایک طرف ہے پھر شجاع الدولہ   افسوس غرض تری جوانی افسوس[1]

شجاع الدولہ ۲۲ رجب ۱۱۴۴ھ کو پیدا ہوئے ہیں[2] اور ۲۲ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ کو وفات پائی۔ اس حساب سے وفات کے وقت وہ ۴۴ برس چار ماہ کے تھے[3] گویا میر حسن کے نزدیک ۴۴ برس کا آدمی جوان ہے۔

(۷) آغازِ شباب کے بارے میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :-

لاہور آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد گیا تھا اور پھر اب گیا۔ اس لئے انجمن کی تقریر میں، میں نے کہا۔ لاہور پہلے اس وقت آیا تھا جب میرا آغازِ شباب تھا۔ اور اب آیا ہوں جب انجامِ شباب ہے کہ عمر کا توسن رحلۂ اربعین سے بھی دو تین قدم آگے بڑھ گیا ہے[4]"

آغازِ شباب ۲۵ برس اور انجامِ شباب ۴۳ برس کے قریب ہوگا۔

(۸) جناب قاضی عبدالودود صاحب سے استفسار کیا گیا وہ رقمطراز ہیں :-

---

[1] :- ورق ۴۹۲ :۔ [2] :- سیری دا ستوا۔ شجاع الدولہ جلد اول ص۱ :۔ [3] ایضاً ص۵۷

[4] :- مئی ۱۹۲۷ء معارف۔ شذرات۔ بحوالہ مقالہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی بعنوان علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی ۱۹۵۶ء ص۱۴ :۔

"میرا خیال ہے کہ میر حسن کی پیدائش ۱۱۵۰ھ کے لگ بھگ ہوئی اور غالباً آپ کو بھی اس سے اتفاق ہوگا۔ میر حسن خود لکھتے ہیں کہ "شروعِ جوانی" میں لکھنؤ وفیض آباد..... "شروعِ جوانی" کسے کہیں گے؟ میں نے کئی آدمیوں سے اس کے متعلق دریافت کیا ہے۔ سب نے کہا ہے کہ تئیں چوبیس برس سے زیادہ پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔[1]

(۹) محسن۔ میر نے عمر بیس سال بتائی ہے (نکات ترجمۂ محسن) قائم انہیں "جوانے است نوخاستہ" کہتے ہیں[2]۔

میر نے حالات غالباً ۱۱۶۵ھ میں لکھے ہیں، قائم کا تذکرہ ۱۱۶۸ھ میں مکمل ہوا۔ بیس بائیس سال کی عمر عنفوانِ شباب ہے۔ میر حسن بھی اسے جوان لکھتے ہیں[3]۔ اس حساب سے محسن کا حال اگر ۱۱۸۹ھ میں بھی لکھا گیا ہو جب بھی وہ ۴۴ برس کے ہوتے ہیں۔

(۱۰) انشا کے حال میں حسن نے جوانی کا ذکر کیا ہے (ص ۱۹) یہ حال ۱۱۸۹ھ سے قبل لکھا گیا (نسخۂ ورود میں موجود ہے) اگر ۱۱۸۹ھ میں بھی لکھا گیا جب بھی انشا کی عمر ۱۸ برس ہوئی (انشا بعہد سراج الدولہ پیدا ہوئے تھے)

(۱۱) افسوس کو حسن نے جوان رنگین کہا ہے (ص ۲۱) پ تقریباً ۱۱۵۲ھ[4] حال غالباً ۱۱۸۸ھ میں لکھا (تا نہ ملازمتِ سالار جنگ کا ذکر) اس حساب سے ۳۶ برس کے قریب عمر ہوگی۔

(۱۲) دل کے حال میں حسن جوان لکھتے ہیں (ص ۱۰) دل برادرِ بزرگ جوشش تھے جوشش ۱۱۵۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے[5]۔ اگر ایک سال قبل بھی پیدا ہوئے ہوں اور حسن نے

---

[1] :۔ مکتوب بنام راقم (۳) ستمبر ۵۴ء :۔ [2] :۔ مخزنِ نکات ص ۵۸ :۔ [3] :۔ ص ۱۵۰ :۔ [4] بحث پچھلے باب میں :۔ [5] :۔ دیباچہ دیوانِ جوشش ص ۲۹ :۔

اگر ان کا حال ۱۱۸۵ھ میں بھی لکھا ہو جب بھی ۴۵ برس کے ہوتے ہیں۔

(۱۳) حسن نے قربان[۱] کو جوان بست سالہ لکھا ہے، ۱۹ سال سے ۲۵ برس تک کے لئے شروع جوانی کا اطلاق ہوتا رہا ہے۔ اس لئے اگر ۱۹ برس مانیں تو (۱۱۷۹-۱۹) = ۱۱۶۰ھ تاریخ پیدائش ہوگی، اگر ۲۵ برس قرار دیں تو (۱۱۷۹ - ۲۵ = ۱۱۵۴ھ) ہوگا۔ ۲۳ برس سمجھیں تو (۱۱۷۹ - ۲۳ =) ۱۱۵۶ھ اور ۲۴ ہو تو ۱۱۵۵ھ ہوگا۔ ۳۰ برس شمار ہوں تو (۱۱۷۹ - ۳۰ =) ۱۱۴۹ھ اس طرح سنین کا ایک سلسلہ ہاتھ آتا ہے جو ۱۱۴۹ھ سے چل کر ۱۱۶۰ھ تک جاتا ہے۔

لیکن یہ نتائج تعین زمانہ میں معاون نہیں، ہمیں اس کے لئے دلائل کا کوئی دوسرا سلسلہ اختیار کرنا پڑے گا بعد میں اس کی مدد سے ہم اپنے نتائج کو پرکھ لیں گے اور غلط یا صحیح ہونے کا جائزہ لیں گے۔

میر ضاحک (میر حسن کے والد) ۱۱۹۶ھ تک زندہ تھے[۲]۔ اس تاریخ کے بعد کے جتنے معاصر حوالے ملتے ہیں ان سب میں انہیں مرحوم کہا گیا ہے۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسی سال یا ذرا بعد فوت ہو گئے۔ سفینۂ ہندی میں وفات کے وقت ان کی عمر ۶۰ سال بیان کی گئی ہے:-

> ضاحک :- میر غلام حسین دہلوی سید و فقیر و بخوبی بے نظیر بود۔ در ہندی اشعار ضحک، آمیزی گفت برائے ہمیں ضاحک تخلص می کرد۔ طرزے کہ او اختیار کردہ از نوادر بود۔ اکثر بملاقات راقم می آمد۔ عمرش بہ شصت سال رسیدہ[۳]

۱:- صفحہ ۱۵۰ ۔ ۲:- الحال کہ ہزار و صد و نود و شش ہجری باشد شنیدہ شد در فیض آباد بجا رسنگی می گذراند۔ گلزار ابراہیم صفحہ ۱۶۲ ۔ ۳:- اقتباس از سفینۂ ہندی مصنفہ بھگوان داس قلمی نسخہ بانکی پور پٹنہ ورق ۷۰ ب، ۷۱ ا۔ اس حوالے کے لئے میں قاضی عبدالودود صاحب کا ممنون ہوں۔

بود طبع جواں داشت گاہے۔ شعرِ فارسی می گفت .....

اس حساب سے ضاحک کی پیدائش (۱۱۹۶ — ۶۰ =) ۱۱۳۶ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی[1] حسن اور ضاحک کی عمر میں کم سے کم فرق ۱۸ برس کا ہونا چاہیئے۔ اس طرح میر حسن کی پیدائش ۱۱۳۶ — ۱۸ =) ۱۱۵۴ھ کے قریب بنتی ہے (آگے چل کر ہم نے حسن کے فیض آباد آنے کا زمانہ ۱۱۸۹ھ اور ۱۱۸۱ھ کے مابین قرار دیا ہے) اس طرح فیض آباد آنے وقت ان کی عمر اندازاً (۱۱۸۰ — ۱۱۵۴ =) ۲۶ برس کے قریب ہوگی۔ عنفوانِ جوانی کی مد نظر میں اگر اسے رکھ کر دیکھا جائے تو غلط ہونے کا بہت کم امکان ہے۔ قاضی صاحب کا یہ خیال کہ تیس چوبیس سال تک عنفوانِ جوانی کا اطلاق ہو سکتا ہے جسن کی عمر کو اور بھی کم کر دے گا۔ لیکن عنفوانِ شباب کا یہ تعین ہمارے ماحول کی پیداوار ہے۔ قدیم حوالے ظاہر کرتے ہیں کہ عنفوانِ شباب کا اطلاق ۱۹ سے لے کر ۲۵ برس تک بخوبی ہوتا رہا ہے۔

---

[1] : ۔ قاضی عبدالودود صاحب اپنے مقالے میں اس نتیجے پر پہونچتے ہیں (میر ضاحک دہلوی۔ مطبوعہ علی گڈھ میگزین طنز و ظرافت نمبر ص۱۳۶) لیکن پھر اس میں ترمیم کرتے ہوئے کہتے ہیں "ہندی کے بیان کے بموجب سال ولادت ۱۱۳۶ھ کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ لیکن میرے قیاس کے مطابق میر حسن کی پیدائش ۱۱۵۰ھ میں یا اس کے لگ بھگ ہوئی ہے۔ میرے خیال میں ہندی نے عمر کا اندازہ کسی قدر غلط کیا ہے"۔ قاضی صاحب نے استدلال کا رخ بدل دیا ہے۔ سفینۂ ہندی کے بیان کو کسی مثبت دلیل کے بغیر غلط نہیں کہا جا سکتا۔ میر حسن کی پیدائش کا سنہ غیر متعین ہے اسے بنیاد بنا کر نسبتاً قطعی بیان کو نہیں ٹھکرایا جا سکتا تا وقتیکہ اس کے خلاف کوئی قطعی دلیل یا شہادت نہ مل جائے۔

قدما جوانی کا اطلاق ۵۰ کی عمر تک[۲] اور بوڑھاپے کا ساٹھ برس تک کرتے تھے۔[۳]
لیک اور قرینے سے ہمارے سنہ کی تائید ہوتی ہے۔ میر حسن کے دوستوں میں مرزا
بچھو فدوی اور میر شبیر علی افسوس قابلِ ذکر ہیں۔ فدوی[۴] کے حالات تذکرۂ شعرائے اردو
(میر حسن) اور تذکرۂ مسرت افزا میں ملتے ہیں۔ لیکن عمر کا اندازہ مشکل ہے۔

---

[۱]:۔ اوپر دیکھئے ؛؛ [۲]:۔ ۳۰ سال کی عمر کا آدمی جوان ہی تصور ہوگا بلکہ ۴۵ سال
والے کو بھی جوان ہی کہتے ہیں خصوصاً آج سے ۰۰ ۷ سال قبل (وحشی یزدی کے زمانے میں)
جب لوگوں کی عمریں سو سے متجاوز ہو جاتی تھیں۔ ۵ سال کی عمر کی وفات کو جوان مرگی تصور
کرنا بعید از قیاس نہ ہوگا (ڈاکٹر نذیر احمد مقالہ بر وحشی یزدی۔ معارف نمبر ۱ جلد ۔ ص[illegible])
نکات الشعرا میں جوان کا اطلاق سودا، درد، فغاں، حاتم۔ بیدار۔ سلام۔ نثار حسن۔ تمکین
ضیا اور میر۔ میر گھاسی پر ہوا ہے دوسرے تذکروں میں اطلاق :۔
ناسخ :۔ (مصحفی۔ ریاض الشعرا ص ۳۲۴) جوان ہیمیں۔۔۔ عمرش سی و ہفت سالہ
مجبور :۔ (ایضاً ص ۳۱۵) جوانِ ظریف ۔۔۔ پنجہل و پنج سالہ خواہد بود۔
قمر :۔ (ایضاً ص ۲۵۹) جوان ۔۔۔ از چہل متجاوز خواہد بود
موجد :۔ (انتخاب یادگار امیر مینائی ص ۳۶۷) چالیس برس کی عمر ہے جوانِ خوش خو۔
وزیر :۔ (تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۱۲) بیالیس برس کی عمر عین شباب ہیں۔
متاخرین کی نظر میں جوانی کا عالم ۴۵ برس تک رہا ہے۔ منوسطین میں میر وغیرہ کی نظر
میں ۵۰ برس تک جوانی کی در شمار کی جائے (کلب علی خاں فائق معارف جولائی ۱۹۵۳ء سودا
کی عمر ص ۶۸، ۶۹)

[۳]:۔ مشتاق: عمرش قریب شصت رسیدہ باشد۔ لیکن باین بزرگی عجز و انکسار پیش می آید
(تذکرۂ شعرائے اردو۔ میر حسن۔ طبع ثانی ص ۱۶۵)

[۴]:۔ فدوی کے لئے دیکھئے مرزا محمد علی فدوی (جلد اول) سید محمد حسین (طبع ۱۹۵۹ء) ص ۱۷ تا ۲۱ و ۴۵

البتہ میر شیر علی افسوس کے ساتھ میر حسن نوازش علی خان کی سرکار میں مصاحب تھے۔ دس برس تک روز کا ملنا جلنا دوستی اور ہم مجلسی تھی بلکہ آپس میں غزلیں بھی طرح ہوتی تھیں افسوس کی تاریخ پیدائش کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ نار نول کے رہنے والے تھے۔ محمد شاہ کے عہد میں :-

"افسوس کا دادا اپنے بیٹوں سید علی مظفر خان اور سید غلام علی خان کو لے کر دہلی آئے اور تینوں نے نواب عمدة الملک امیر خان کی ملازمت اختیار کی اس زمانے میں افسوس دہلی میں پیدا ہوئے ۔۔۔۔ خود افسوس نے لکھا ہے نواب عمدة الملک کی وفات کے تین چار سال بعد ان کے والد تلاشِ معاش کو نکلتے کے وقت ان کی عمر گیارہ برس کی تھی۔"[1]

عمدة الملک امیر خان انجام کی شہادت ۱۱۶۹ھ نہیں ہے[2] بلکہ ۱۱۵۹ھ (۲۲ ذی الحجہ ۱۱۵۹ھ) میں ہوئی[3]۔ اس لئے ہمارے حساب سے افسوس کی پیدائش اندازاً (۱۱۵۹+۴ = ۱۱۶۳ − ۱۱ =) ۱۱۵۲ھ میں ہوئی۔ دوستی اور ہم مجلسی کو پیشِ نظر رکھا جائے تو افسوس اور حسن کی ہم عمری ہمارے نتیجے (تاریخ تولد حسن) کی صحت پر دال ہے۔ ہماری رائے میں حسن ۱۱۵۲ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔

---

[1] :- میر علی افسوس۔ از سید محمد قادری حیدر آبادی رسالہ نگار جنوری فروری ۱۹۵۰ء ص ۵۴، ۵۵ ۔۔ [2] :- جیسا کہ بتقلید گلشنِ ہند سید محمد قادری صاحب کا خیال ہے۔

[3] :- مسرت افزا (ترجمہ انجام) ص ۹ تاریخ شہادت "غم عمدہ" اور ادہ لوگو امیر خان ہوا۔ ۔

Later Mughals (Sarkar) Vol I. P. 22.

Roz Afzun Khan set an aggrieved servant of Amir Khan to stab him to death. (25 Dec. 1746)

لڑکپن :- دہلی کے قیام کی مفصل روداد کہیں نہیں ملتی۔ افسوس نے دیباچۂ سحر البیان میں جو حالات دیے ہیں ان سے کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ضروری اقتباس برٹش میوزیم کے نسخے اور آسی کے شائع کردہ مثنویاتِ حسن کی مدد سے پیش کیا جاتا ہے۔

(بزرگوں نے) دلی میں آکر پرانے شہر کا رہنا اختیار کیا۔ وہیں یہ بزرگ پیدا ہوا بلکہ سن تمیز کو پہنچا..... طبع اس کی موزوں طفولیت سے تھی شعر کی طرف رغبت رکھتا تھا۔ اکثر خواجہ میر درد کی صحبت سے مستفید شاہجہان آباد میں (اکثر[1]) لڑکائی[2] کے بیچ ہوا ہے[1]....

حسن خود بھی بچپن کی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں :-

چوں ایں ابجد خوانِ دبستانِ سخن در سن صغیر کہ ہنوز ایامِ صبا منقضی نشدہ بود بیتے گفتہ بود و آں ایں است۔ ؎

یک سخن گویم ترا بشنو زمن اے یارِ من
گر نخواہی رنج خود اے جاں مدہ آزارِ من

گفتہ بر صاحب سخنان ثابت گردیدہ[4] کہ ایں طفل البتہ موزوں است و از یں کلامے مقبول تر خواہد زد حاصل کہ السعیدُ مَنْ سَعِیدٌ فِی بَطْنِ اُمِّہٖ وَالشقیُّ مَنْ شقیٌّ فِی بطنِ اُمِّہٖ[5] ہر کرا حق سبحانہٗ تعالیٰ بہ

---

[1] :- مثنویاتِ حسن۔ دیباچۂ افسوس مرتبہ آسی ص ۱۶-۱۷۔ [2] :- یہ لفظ برٹش میوزیم کے نسخے میں ہے۔ آسی کے ایڈیشن میں نہیں۔ [3] :- یعنی لڑکپن (دریائے لطافت ص ۹۔ اردو ترجمہ از کیفی) [4] اس ٹکڑے کا ترجمہ مرزا علی حسن نے غزلیاتِ حسن غیر مطبوعہ میں دیا ہے "تو میرے (والد نے) سن کر کہا بے شک یہ لڑکا موزوں ہوگا" یہ ترجمہ کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ [5] یہ حدیث اصل میں یوں ہے:
السعیدُ ومن ھُوَ سعید ۃ فی بطنِ امہٖ والشقیُ من شقیٌ فی بطن امہٖ
(بشکریہ جناب عبد الحی صدیقی)

ہر کارے می آفرید از صغرسن میلانِ طبیعت او بسوئے اکتساب[1]
می کند و ایں امور کسبی[2] نیست بلکہ موہبی است۔ لہٰذا عارفانِ ربانی زبان
بطعن کسے نمی کشانید کہ نظرِ او شاں بر فاعلِ حقیقی است و شکایت
او تعالیٰ نمودن شرکِ عظیم عیاذ باللہ[3]۔

تعلیم :- حسن کی تعلیم کے بارے میں ان کے معاصر اور دوست شیر علی افسوس لکھتے ہیں :-
"اگرچہ علمِ عربی اسے مطلق نہ تھا، ہاں فارسیت تھی۔ بلکہ جستہ جستہ شعر یا کوئی رباعی
کبھو کہہ بھی لیتا تھا لیکن علمِ مجلس میں بے بدل اور شعرِ ہندی میں اکمل تھا۔[4]"
برٹش میوزیم کے نسخۂ کلیاتِ حسن میں یہ دیباچہ بعض جگہ مختلف شکل میں ہے۔ میرا خیال ہے
کہ برٹش میوزیم کے نسخے کا دیباچہ شیر علی افسوس کے اولیں مسودے کی نقل ہے۔ اس میں یہ
ٹکڑا یوں ہے :-

اگرچہ علم مہیا نہ تھا ہاں فارسیت تھی بلکہ جستہ جستہ شعر یا رباعی کہہ لیتا تھا
لیکن علمِ مجلس میں بے بدل اور شعرِ ہندی میں اکمل تھا۔[4]

درد کی شاگردی ؟ تذکرے میں حسن کم و بیش یہی بیان دیتے ہیں :-
از صغرسن میلانِ طبیعت ایں فقیر بہ طرف سخن بیش تر بود[5]۔

افسوس کے بیان سے ظاہر ہے کہ حسن نے درد کی صحبت سے فائدہ اٹھایا جس سے رموز العارفین
کے دیباچہ نگار گلزار ابراہیم کے حوالے سے لکھتے ہیں :-

"کہ بچپن میں انہوں نے اپنے والد سے درسی کتابیں پڑھیں، اور انہیں کے فیض

---

[1] :- اصل : اکتاب ۔ [2] :- واقعات انیس میں جو ٹکڑا دیا ہے اس میں "مکتبی"
[3] : اصل : "باللہ" دیباچۂ دیوان حسن، کلیاتِ حسن نسخۂ برٹش میوزیم ص ۲۳۲ [4] دیباچہ
مثنوی سحر البیان۔ مندرجہ مثنویاتِ حسن مرتبہ آسی ص ۱۷ ۔ [5] تذکرۂ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۵۳، ۵۴۔

تربیت سے شعر و سخن کا شوق ہوا۔ ابتدا میں اپنا کلام اپنے والد ہی کو دکھایا کرتے تھے جب مشق بڑھ گئی تو حضرت خواجہ میر درد کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ خواجہ صاحب کی نکتہ سنج اور علم نواز طبیعت کا ان پر گہرا اثر ہوا۔ انہیں کے فیض نے شاعری کا صحیح مذاق پیدا کر دیا اور اسی زمانہ سے ان کے کلام میں پختگی آگئی"[۱]

گلزارِ ارم کے جو اقتباس قاضی عبدالودود صاحب نے مہیا کئے ہیں۔ ان میں والد سے تعلیم حاصل کرنے کا ذکر نہیں لیکن یہ بھی کچھ بعید نہیں ہے کہ والد سے تعلیم حاصل کی ہو۔ اسی طرح مرزا علی حسن[۲] نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "غالباً ابتدا میں اپنے والد ہی سے اصلاح لیتے تھے اور ممکن ہے کہ فارسی کلام میں خواجہ میر درد سے بھی استفادہ کیا ہو۔[۳]" سید غلام امام لکھتے ہیں

He submitted his writings to his Father subsequently also to Khawaja Mir Dard for correction. (Anis and Shakespeare P2.)

آزاد اور کریم الدین دو ہاتھ آگے جاتے ہیں:۔

"جب تک دلی میں رہے پہلے اپنے والد سے پھر خواجہ میر درد سے اصلاح لیتے رہے"[۴]

"بچپن ہی سے اس کو شوق نظم کا تھا جب اس نے اس شوق کی ترقی چاہی خواجہ میر درد کی صحبت میں رہا جس سبب سے وہ اپنے ارادے پر مضبوط اور قائم رہا۔ حالت صبا دہلی میں گذرا"[۵]

یوں مرورِ ایا[م] سے افسوس کے بیان کے مبہم فقرے کو اولاد نے واضح مطلب پہنا لیا ہے۔ بہر حال امکان یہ بھی ہے کہ مصحفی ان کی مجالس میں شریک ہوتا رہا ہے۔ با قاعدہ اصلاح کی

---

۱ :۔ صفحہ ۳ :۔ ۲ سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے (تاریخ ادب اردو، اردو ترجمہ ۱۰۹، اصل بحث ۲۶) :۔ ۳ غزلیات حسن۔ حالاتِ زندگی مرتبہ مرزا علی حسن ص ۶ :۔ ۴ : آبِ حیات صفحہ ۲۵۳ :۔ ۵ تذکرہ کریم الدین صفحہ ۲۱۳ :۔

نوبت نہ آئی ہو۔

عشق :- "در عہد جوانی چناں افتد کہ تو می دانی" میر حسن بھی کسی معشوق کی زلف کے اسیر ہو گئے۔ گلزارِ ارم کی ابتدا میں وہ بیانِ حالِ دلِ زار و آوارہ شدن از دیار بہ دیارِ دہلی چھوڑ کر جانے کا حال لکھتے ہوئے کہتے ہیں :- [۱]

ہوا آوارہ ہندوستان جب سے ۔۔۔ قضا پورب میں لائی مجھ کو تب سے
لگا تھا ایک بت سے واں مرا دل ۔۔۔ ہوئی اس کی جدائی سخت مشکل
مری آنکھوں میں وہ عورت کھڑی ہے [۲] ۔۔۔ پیالی ہیں وہ چھتی سی جڑی ہے
اگرچہ واں سے میں آنے کو آیا [۱] ۔۔۔ ولے اس کی جدائی نے ستایا
چلا گاڑی میں یوں آیا میں ناچار ۔۔۔ قفس میں جس طرح صید گرفتار
غرض کرنے کو کی قطع منازل [۲] ۔۔۔ ولے ہر ہر قدم رہتا گیا دل
جب اس کی بات آجاتی ہے کچھ یاد ۔۔۔ جرس کی طرح میں کرتا ہوں فریاد
بہانہ رکھ جدائی کا وطن کی ۔۔۔ میں رو رو ندیاں کرتا تھا بن کی [۳]

سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے کہ سردار جنگ کے محل کی ایک عورت پر عاشق ہوئے لیکن اس کی تائید یا تردید کسی معاصر بیان سے نہیں ہوتی۔

متفرق حالات :- حسن میر مستقیم جرأت کے حال میں لکھتے ہیں :-

بندہ او را در صغر سن بہ شاہجہان آباد دیدہ ام بسیار خوش رو بود کہ بے اختیار دل را می ربود [۴]۔

---

[۱] :- مخزن پریس دہلی میں "آتے تو"۔ [۲] مخزن پریس دہلی کے ایڈیشن میں "کرتے تو"۔ [۳] مثنویاتِ حسن۔ آسی ص ۱۳۵، ۱۳۶۔ [۴] :- تذکرۂ شعرائے اردو ص ۲۳، ۲۴۔

بیدار کے حال میں لکھا ہے :-

"قریب چہار دہ سال شدہ باشد کہ فقیر اورا در لباسِ درویشی در شاہجہان آباد دیدہ بود طبع در دمند داشت[1]"

نثار کے حال میں ہے :-

"بندہ اورا در شاہجہاں آباد دیدہ بود۔۔۔[2]"

ولایت کے حال میں درج ہے :-

"بندہ در شاہجہان آباد اکثر آں بزرگ را در مجالسِ فقرا دیدہ در عالم پیری رخش مثل ماہ می درخشید۔۔۔ قریب دوازدہ سال شدہ باشد کہ برحمتِ الٰہی پیوست[3]"

دلائل کا پہلا سلسلہ، دہلی سے روانگی :- حسن اور ان کے والد ضاحک نے ایک ساتھ دہلی چھوڑی[4] لیکن کس سنہ میں؟ اس کا حال نہیں کھلتا۔ متفرق حالات کے ذیل میں جو اقتباسات دیے گئے ہیں ان میں سے تین کچھ رہنمائی کرتے ہیں یعنی بیدار ولایت اور نثار کے تراجم :-

تذکرۂ شعرائے اردو فیض آباد میں ۱۱۸۴ھ (بقول عرشی) یا ۱۱۸۵ھ[5] میں شروع کیا گیا اور اس کا پہلا نسخہ ۱۱۸۹ھ میں مکمل ہو گیا (تفصیل تصنیفات کے سلسلے میں آئے گی) بعد کو ۱۱۹۱ھ میں شائع کیا گیا (ترقیمۂ طبع ثانی) لیکن ۱۱۹۲ھ تک اضافے ہوتے رہے۔ (واضح کا حال ملاحظہ ہو) اگر بیدار کا حال ابتدائے تالیفِ تذکرہ کے وقت ہی لکھا گیا ہو تو حسن نے انہیں دہلی میں (۱۱۸۴ — ۱۴ =) ۱۱۷۰ھ کے قریب دیکھا ہوگا۔

---

[1]: تذکرہ شعرائے اردو ص ۲۱ :۔ [2] ایضاً ص ۱۸۱ :۔ [3] ایضاً ص ۱۸۷ :۔
[4] تفصیل آگے آئے گی :۔ [5] دیباچۂ دستور الفصاحت عرشی ص ۴۳ تا ۲۹ :۔

میر نے ۱۱۶۵ھ میں اپنا تذکرہ مکمل کیا اور بیدار کے حال میں اس کی فقیرانہ وضع کا ذکر نہیں کیا۔[1] البتہ "قائم نے ۱۱۶۸ھ میں جب اس کا ذکر کیا تو درویشانہ زندگی کے آغاز کا حوالہ دیا۔[2] گویا بیدار کو حسن نے ۱۱۶۸ھ یا اس کے بعد اور گمان غالب یہ ہے کہ ۱۱۷۰ھ میں دیکھا۔ ولایت کو انہوں نے کب دیکھا ہوگا۔ اس کا اندازہ ولایت کے سنہ وفات سے ہو سکتا ہے۔ میر علاؤالدولہ اشرف علی خان اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

"درحین تالیف تذکرہ، در سنہ یک ہزار و یک صد و ہفتاد و ہشت درسن ہفتاد و ہشت سالگی بمرض اسہال موصل بحق گردید"[3]

ولایت کی وفات ۷۸ برس کی عمر میں ۱۱۷۸ھ میں ہوئی حسن نے ولایت کا حال اپنے تذکرے میں (۱۱۶۸ + ۱۲ =) ۱۱۹۰ھ میں لکھا ہوگا۔ لیکن دہلی کے بعد ان کی ملاقات ان سے نہیں ہوئی۔ اشرف علی خان اشرف کے حالات کے سلسلے میں بارغ معانی میں ہے کہ:-

"اشرف علی خان اشرف تخلص ---- چچلی ---- احمد شاہ مکحول شد ---- عالمگیر ثانی را بر سریر سلطنت نشاندند ---- رونق دربار شاہی نماند۔ علاوہ احمد شاہ ابدالی بہ تسخیر ملک شتافتہ انواع خرابی رسانید ایشاں نیز بہ لکھنؤ آمدہ در دولت خانۂ میر ولایت اللہ خان ---- کہ بندگی موروثی بہ خدمت آں جناب داشتند اقامت نمودند۔"[4] ..

اس سے ثابت ہے کہ میر ولایت اللہ لکھنؤ میں فوت ہوئے۔ علی ابراہیم کا بیان ہے کہ میر قائم کے جھگڑوں کے زمانے میں میر ولایت اللہ سے ملاقات ہوئی تھی:۔

---

[1]:۔ نکات الشعراء ص ۱۳۲ ۔ [2]: مخزن نکات ص ۶۳ ۔

[3]:۔ بحوالہ مقدمۂ دستور الفصاحت مرتبہ عرشی ص ۶۳ ۔

[4]:۔ معاصر ۸ ص ۷۹،۷۸ فٹ نوٹ ۔

"ایں خاکسار را بنگام فترات نواب میر محمد قاسم خان مرحوم بآں سید عالی مقدار اتفاق ملاقات رو دادہ۔۔۔ در سن کہولت بعہد دولت نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ مرحوم رحلت نمودہ[1]۔"

حملۂ ابدالی (جمادی الاول ۱۱۷۰ھ) میں اشرف نے لکھنؤ میں ولایت کے ہاں اقامت اختیار کر لی تھی۔ حسن نے ظاہرا ولایت کو ۱۱۷۰ھ سے پہلے دہلی میں دیکھا ہوگا لیکن بہت پہلے نہیں کیونکہ ولایت اس وقت بوڑھے ہوتے چاہئیں۔

عبدالرسول نثار کے بارے میں میر تقی میر لکھتے ہیں کہ دہلی میں مقیم ہے[2]۔ ۱۱۶۹ھ میں جب قائم نے اس کا حال لکھا تو وہ امروہہ جا چکا تھا[3]۔ مصحفی تذکرۂ ہندی میں لکھتے ہیں[4] کہ فقیر نے اسے ابتدائے شاعری میں قصبۂ امروہہ میں دیکھا تھا۔ مصحفی غالباً ۱۱۶۱ھ کے قریب پیدا ہوئے[5]۔ ابتدائے شاعری ۱۱۸۰ھ قرار دی جا سکتی ہے مصحفی نے انہیں ۱۱۸۰ھ کے متصل امروہہ میں دیکھا ہوگا۔ قائم نے اپنے تذکرہ میں بعد میں بھی اضافے کئے ہیں۔ عرشی صاحب کے دلائل کو مان لیا جائے[6] تو قائم نے ۱۱۶۵ھ تک اپنے تذکرے میں اضافے کئے اگر نثار کا حال ۱۱۶۷ھ کے قریب لکھا گیا ہے تو پھر میر حسن نے یا تو نثار کو دہلی میں ۱۱۶۵ھ اور ۱۱۶۸ھ کے مابین دیکھا یا پھر ۱۱۶۵ھ اور ۱۱۶۶ھ کے مابین دیکھا ہوگا۔

فراق :- فراق کے حال میں مترجم تاریخ ادب اردو (عسکری) لکھتے ہیں :-
"حکیم ثناء اللہ خان المتخلص بہ ثنا ہدایت اللہ خان ہدایت کے بھتیجے تھے

---

[1] : گلزار ابراہیم ص ۲۵ :. [2] نکات الشعراء ص ۱۴۳ :. [3] مخزن نکات ص ۶۶ :.
[4] : ص ۲۵۴ :. [5] "مصحفی اور اس کا کلام" پر مقالۂ راقم۔ ماحول ۲ ص ۱۵۱
[6] :- مقدمۂ دستور الفصاحت ص ۵۲ :.

"۔۔۔۔ میر حسن اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ میرے سامنے انھوں نے تحصیل علم کی اور جب میں شاہجہان آباد میں تھا تو مجھ سے اور ان سے مراسم دوستی و محبت بہت تھے[۱]۔"

یہ بیان درست نہیں۔ ان کے حالات میں حسن نے لکھا ہے :۔

"در شاہجہان آبادی ماند شنیدہ ام کہ شعر خود بہ خدمتِ خواجہ میر درد می گذرانند"

عسکری صاحب کو مغالطہ ہوا ہے ۔

ان قیاسات کے ساتھ ایک منفی دلیل بھی دی جا سکتی ہے ۔

فغاں :۔ فغاں کے حال میں حسن نے ذاتی ملاقات کا ذکر نہیں کیا۔ فغاں احمد شاہ کے آخری زمانے میں دہلی سے اودھ چلے گئے[۲]۔ مبتلا جیسا کہ تذکرہ تاباں سے معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں خود دہلی میں موجود تھے۔ اس لئے ان کا بیان عشقی سے زیادہ وقیع ہے کہ جانے کا زمانہ اوائل عہد احمد شاہ قرار دیتا ہے۔ عشقی کا یہ بھی بیان ہے کہ فغاں شجاع الدولہ کا ساتھ چھوڑ کر بیچ[۳] عظیم آباد چلے گئے اگر یہ نتیجے[۴] صحیح ہو تو قیاس ہو سکتا ہے کہ حسن ۱۱۷۰ھ تک اودھ نہیں پہنچے۔ حسن اور ضاحک ۱۱۷۰ھ کے بعد یا ۱۱۷۶ھ کے بعد کسی سنہ میں اودھ کی طرف چلے گئے ہوں گے۔ اب دہلی کی تباہی کو بھی دیکھ لینا چاہیئے ۔

(۱) دہلی کی تباہی کے مواقع :۔ دہلی کی تباہی اور اودھ والوں کی قدردانی

---

۱ :۔ ص ۱۹۱ :۔ ۲ :۔ چنانچہ مبتلا گلشن سخن میں یہی اطلاع دیتے ہیں۔ بحوالہ حواشی دستور الفصاحت مرتبہ عرشی ص ۶۵ :۔ ۳ :۔ ایضاً ص ۶۵ بحوالہ نشتر عشق :۔

۴ :۔ آگے چل کر اس مدت کو ہم اور بھی قطعی کرنے کی کوشش کر سکیں گے :۔

کے سبب مندرجہ ذیل مواقع شعراء وادبا کی نقلِ مکانی کے ہو سکتے ہیں :۔

(۱) نادر کا حملہ ۱۱۵۱ھ[1]

(۲) (i) سورج مل کا دہلی پہ حملہ سید واڑہ بیجل مسجد وغیرہ محلوں کی بربادی (۱۷۵۳ء) = ۱۱۶۶ھ[2]۔

(ii) صفدر جنگ کی معزولی اور اودھ کو واپسی = ۱۱۶۶ھ

(۳) دہلی میں عماد الملک کے ظلم و ستم کا آغاز اور لوگوں کی زندگیاں غیر محفوظ (ابتدا ۲ جون ۱۷۵۴ء) = ۱۱۶۷ھ۔

(۴) احمد شاہ کا مکحول ہونا۔ دہلی میں لاقانونی اور لوٹ مار (جون ۱۷۵۴ء سے اگست ۱۷۵۵ء تک[3] = ۱۱۶۷ھ

(۵) عاقبت محمود کی دہلی میں آمد اور گلی کوچوں میں لڑائی (۹۰۸ اپریل ۱۷۵۴ء) اور شکست[4] = ۱۱۶۷ھ

(۶) ابدالی کا حملہ اور دہلی میں خوف و ہراس۔ داخلہ۔ ظلم و ستم اور غارت گری۔ (۱۷۵۷ء)[5] ۱۱۷۰ھ۔

(۷) راگھو کا حملۂ دہلی اور لوگوں کی تباہ حالی (۱۷۵۸ء)[6] ۱۱۷۱ھ

---

[1]:۔ ۱۳ فروری ۱۷۳۹ء دہلی میں داخلہ ۹ مارچ، قتلِ عام، مئی ۱۷۳۹ء کو واپس 75, 63, 62,
Later Mughals. Irvine. Vol. II pp. 361

[2]:۔ The fall of the Mughal Empire Vol. I (p. 271.)

[3]:۔ جلد دوم ایضاً ص ۲۲/۱۹ :۔

[4] Shujaud Daula - Srivastava. Vol. I PP. 21, 22

[5] ایضاً جلد دوم ص ۶۱، ۶۸، ۷۰، ۷۱ :۔ [6] ایضاً ص ۱۰۹ :۔

(۸) باہو کا حملہ دہلی[۱] (۳ اگست ۱۷۶۰ء) ۱۱۷۳،۱۱۷۴ھ اور دہلی میں بھوک کا دور دورہ[۲]۔

(۹) ابدالی کا دوسرا حملہ دہلی ۱۱۷۳ھ) واپس ۱۱۷۴ھ تاریخ "مراجعت قندھار نمود"[۳]

(۱۰) سورج مل جاٹ کا حملہ، دہلی (۱۱۷۶،۱۱۷۷ھ) جاٹ گردی جواہر کا حملہ دہلی[۵] (۱۸ نومبر ۱۷۶۴ء) ۱۱۷۸ھ

(۱۱) دہلی پر مرہٹوں کا قبضہ[۶]۔ اور شاہ عالم کو الہ آباد سے بلانا (۹ فروری ۱۷۷۱ء) ۱۱۸۴ھ۔

(۱۲) مرہٹے دہلی کو نجف خاں کے اثر سے خالی کرتے ہیں۔ پرانے قلعے کی لڑائی۔ شاہ عالم مرہٹوں کے قدموں میں (۱۷ دسمبر ۱۷۷۲ء) ۱۱۸۶ھ[۷]

(۱۳) ذوالفقار الدولہ نجف خان کی وفات پر لوگوں کا دہلی چھوڑنا[۸]۔ ۸ جمادی الآخر ۱۱۹۶ھ "ایں تربتِ نجف" تاریخ وفات[۱۰]۔

اودھ کی تاریخ سے بھی لوگوں کے فیض آباد پہنچنے کی اطلاع ملتی ہے۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں ۱۱۷۹ھ میں یہ سلسلہ شروع ہوا حتیٰ کہ ۱۱۸۳ھ کے بعد بھی بے شمار لوگ فیض آباد میں پہنچے[۱۱]۔ عقدِ ثریا میں تقیؔ کے حال میں ایرانیوں کے رواج کا فیض آباد

۱: ایضاً ص ۱۶۸۔ ۲: ایضاً ص ۱۸۹۔ ۳: واقعات دار الحکومت جلد اول ص ۶۶۳۔ ۴: واقعات جلد ص ۶۶۳۔ ۵: سرکار جلد اول ص ۳۲۹۔ ۶: ایضاً جلد سوم ص ۲۲،۲۳۔ ۷: ایضاً جلد دوم ص ۵۔ ۸: عماد السعادت ص ۱۴۴۔ ۹: واقعات دار الحکومت دہلی جلد اول ص ۱۴۴ فٹ نوٹ۔ ۱۰: نیز عقدِ ثریا ص ۵۳ (ترجمۂ میر) دہلی کے اجڑنے کا ذکر۔ ۱۱: فرح بخش جلد اول ص ۱۱۱، جلد دوم ص ۹۔

میں مصحفی نے پتا چلایا ہے[1]۔ اور اگر شیر علی افسوس[2] کے بیان پر اعتبار کیا جائے تو اودھ کی طرف ادبا کا جانا صفدر جنگ ہی کے زمانے سے شروع ہو جاتا ہے۔

(ب) یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ بعض شعراء کس کس زمانے میں اودھ پہنچے ہیں۔

(i) سعادت خان برہان الملک سے حشمت اور تحسین[3] متعلق تھے۔

(ii) صفدر جنگ سے متعلق شعراء مندرجہ ذیل تھے:۔

ہاتف[4]۔ اور متقین[5]۔

(iii) شجاع الدولہ کے ساتھ

ذرہ[6]۔ آرزو[7] اور دیوانہ[8]۔

(iv) سالار جنگ سے متعلق:۔ بہار[9]

(ج) اب ان شعراء کی فہرست پیش کی جاتی ہے جن کے دہلی چھوڑنے کے سنین قطعی یا قیاسی طور پر معلوم ہو سکتے ہیں۔

(۱) عاجز:۔ عارف علی خاں میر لکھتے ہیں ۱۲ سال ہوئے دہلی میں تھا اب دکن میں ہے[10]۔ میر کا تذکرہ ۱۱۶۵ھ میں مکمل ہوا۔ اندازاً ۱۱۵۳ھ میں یا اس سے کچھ بعد دہلی چھوڑی ہوگی۔

(۲) عزلت:۔ سروِ آزاد میں ہے ۱۱۶۴ھ میں دہلی گیا اور اب تک وہیں ہے[11] ترجمۂ تذکرۂ گردیزی سے معلوم ہوتا ہے ۱۱۶۲ھ کے مابین دہلی

---

[1]:۔ ص ۴۶ :: [2]:۔ و آرائش محفل ص ۱۲۱ :: [3] عقد ثریا ص ۱۸، ۲۱ :: [4] عقد ثریا ص ۶۳ :: [5] ایضاً ص ۱۵ :: [6] ایضاً ص ۲۵ :: [7] ایضاً ص ۷ :: [8] ایضاً ص ۲۶ :: [9]:۔ عقد ثریا ص ۱۶ :: [10]:۔ ص ۹۶ :: [11] سرو آزاد ترجمۂ عزلت ::

چھوڑی ہوگی۔ اس مدت کو تنگ کہا جاتا ہے۔ عزلت دکن جانے سے پہلے علی ویردی خاں حاکم بنگالہ کے پاس مقیم رہا۔ اور اس کی وفات پر دکن گیا[1]۔ علی ویردی بقول مولفین کیمبرج ہسٹری[2]۔ ۱۹ اپریل ۱۷۵۶ء میں ہوا۔ گویا عزلت دہلی سے ۹ رجب ۱۱۶۹ھ سے قبل نکل چکے تھے

(۳) محمد امان اللہ غریب[3]:- میر کہتے ہیں[4]۔ دو سال ہوئے بنگالے کی طرف گیا تقریباً ۱۱۶۵ھ[2] سے ۱۱۶۴ھ میں دہلی چھوڑی ہوگی[2]۔

(۴) قائم :- اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں اب دہلی سے جا رہا ہوں[5]۔ شاید ۱۱۶۶ھ کے لگ بھگ دہلی چھوڑی (سودا سے قبل فرخ آباد گئے)

(۵) خانِ آرزو :- محرم ۱۱۶۱ھ[5]

(۶) فغاں :- اس پر بحث ہو چکی ہے ۱۱۶۷ھ کے اواخر میں دہلی چھوڑی۔

(۷) سودا :- ۱۱۶۴ھ[6]

(۸) قدرت اللہ :- حملۂ درّانی کے وقت دلی چھوڑی[7]۔ ۱۱۷۰ھ یا ۱۱۷۳ھ۔

(۹) اشرف علی علاء الدولہ :- ۱۱۷۰ھ[8]

(۱۰) وفا :- ۱۱۶۰ھ میں دلی آیا اور شانزدہ سال بعد وطن واپس لوٹ گیا[9]۔ اس حساب سے ۱۱۷۶ھ میں واپس لوٹا۔

(۱۱) ہدایت اللہ ہدایت :- ۱۱۶۴ھ میں دہلی چھوڑی[10]

(۱۲) تن سکھ رائے شوق :- ۱۱۷۰ھ

---

[1] حواشی گلشن گفتار مبنی بر گلزار ابراہیم:: [2] جلد ۲ ص ۱۳۱ :: [3] ص ۱۳۹ :: [4] ص ۷۷ ::
[5] عرشی مقدمۂ دستور الفصاحت ص ۳۹ :: [6] عرشی مقدمۂ دستور الفصاحت ص ۵۰ :: ۱۱۶۵ھ بقول فائق یا پھر ۱۱۶۹ھ ہمارا اندازہ :: [7] مجموعۂ نغز ص ۱۲۳، ۱۲۴ :: [8] معاصر ۱ ص ۶۸، ۶۹ ۔ فوٹ [9] مصحفی عقدِ ثریا ص ۵۹ :: حسرت افزا ص ۱۳۱ :: [11] عرشی مقدمۂ دستور الفصاحت ص ۱۶ ::

(۱۳) فدوی بچھو :- ۱۱۷۰ھ یا ۱۱۷۳ھ حملۂ ابدالی میں دہلی چھوڑی۔[1]

(۱۴) جرأت :- ۱۱۷۹ھ سے قبل "بعہدِ شجاع الدولہ لکھنؤ آیا"۔[2]

(۱۵) میر :- ذی الحجہ ۱۱۷۳ھ کے قریب برسانہ کی طرف سے کاماں گئے تھے۔ دہلی واپس لوٹے ۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ آئے۔[3]

(۱۶) کافر :- ۱۰ ربیع الاول ۱۱۷۴ھ اور ۱۱۷۶ھ کے درمیان دہلی چھوڑی۔[4]

(۱۷) قمرالدین منت :- ۱۱۹۱ھ سے پہلے لکھنؤ میں پہنچ چکے تھے۔[5]

(۱۸) مصحفی :- ۱۱۹۸ھ[6] ::

دہلی کی بربادی کے ساتھ فیض آباد کی آبادی وابستہ ہے۔ سعادت خاں برہان الملک کے عہد میں بھی شعراء دہلی کو چھوڑ کر اودھ کی طرف گئے صفدر جنگ کا قیام اول دہلی میں رہا۔ پھر جب ۱۱۶۶ھ میں وہ دہلی چھوڑ گئے اور ایرانی پارٹی کی جگہ تورانی پارٹی عماد الملک کی سرکردگی میں برسرِ اقتدار آئی تو شیعہ شعراء و ادبا کے لئے اودھ سے بہتر جگہ کون سی ہو سکتی تھی۔ جب شجاع الدولہ برسرِ حکومت آئے تو شعراء کی قسمت اور بھی جاگی' ایرانیوں کے دور دورے کے ساتھ برِ صغیر کے مختلف گوشوں سے بھی ادباء و فضلاء اودھ کی طرف جانے لگے خاص طور پر ۱۱۷۹ھ کے بعد جب فیض آباد کا نصیبہ جاگا اور ادھر دہلی ابدالی حملوں، مرہٹہ گردی، جاٹ گردی اور دوسری سیاسی کشمکشوں کی آماجگاہ بنی تو ادباء و شعراء کثیر تعداد میں فیض آباد کو جائے امن سمجھ کر ادھر لپک پڑی۔ لے دے کر چند سہارے ہی تو رہ گئے تھے۔ مرشد آباد۔ فیض آباد۔ پٹنہ۔ فرخ آباد۔ ٹانڈہ یہی شعراء کے مسکن تھے

---

[1] مجموعہ نغز جلد دوم ص۱۴ :: [2] تذکرۂ کمال بحوالہ بیاضِ فائق :: [3] فائق۔ مقالہ بعنوان میر تقی میر :: [4] مسرت افزا ص ــ :: [5] گلشن ہند ص۲۳۸ :: [6] عقدِ ثریا ترجمۂ بیتاب ::

اس لئے دلی کی گلیاں ویران ہوتی گئیں اور یہ شہر لٹنے گئے۔ پھر جب حکومت آصف الدولہ کے ہاتھ آئی اور فیض آباد کا سرمایہ لکھنؤ کی گلیوں میں لٹنے لگا تو شعراء کے لئے کشش کا سامان ہو گیا۔ اسی زمانے میں ذوالفقار الدولہ کے اقتدار کے سبب دلی میں شیعوں کا پلہ بھاری ہو گیا لیکن اس کی وفات کے بعد آصف کی قدردانی میر جیسے استاد کو بھی دلی سے چلنے پہ مجبور کر دیتی ہے۔ اس سارے زمانے میں جو سنہ ۱۱۵۱ھ سے سنہ ۱۱۹۶ھ تک کا ہے شعراء کے ترکِ دہلی کا دور سمجھنا چاہیئے۔ بعض ادوار البتہ ضرور ایسے تھے (جیسا کہ شعراء کی فہرست سے ظاہر ہے) جب نقل مکانی کی رفتار زیادہ تیز رہی (۱) سنہ ۱۱۵۱ھ کے آس پاس (۲) سنہ ۱۱۶۹ھ کے قریب (۳) سنہ ۱۱۷۰ھ اور سنہ ۱۱۷۳ھ کے لگ بھگ (۴) سنہ ۱۱۷۹ھ کے بعد (۵) اور نجف خاں کی وفات کے بعد یعنی سنہ ۱۱۹۶ھ کے بعد۔

نتیجہ نمبر ۲ :- حسن کی ترکِ دہلی کا زمانہ پہلے دور میں ممکن نہیں[۱]۔ دوسرا دور بھی خارج از بحث ہے[۲]۔ اب رہ گیا کہ سنہ ۱۱۷۰ھ اور سنہ ۱۱۷۳ھ کے ابدالی حملوں کے وقت یا سنہ ۱۱۷۹ھ کے آس پاس ممکن ہے۔ پانچواں دور بھی قابلِ اعتنا نہیں کیونکہ میر حسن شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد میں یقیناً موجود تھے[۳]۔ اس لئے حسن کی دہلی سے روانگی یا تو ابدالی حملوں کے بعد ہوئی یا پھر جاٹ گردی کے وقت۔ اس منزل سے آگے داستان کا یہ رخ نہیں جاتا۔ لامحالہ ہمیں کہانی کو دوسرے سرے سے دیکھنا پڑے گا۔ تاکہ دونوں سروں کو ملا کر کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔

دلائل کا دوسرا سلسلہ - ورودِ لکھنؤ :- خواجہ باسط، صمصام الدولہ

---

[۱] اس وقت ہمارے اندازے کے مطابق وہ پیدا بھی نہیں ہوئے۔ [۲] جیسا کہ فیض آباد کے سلسلے میں آئندہ بحث سے نیز قیاسات کی پہلی کڑی سے ثابت ہے۔ [۳] تذکرۂ شعراء میں قدم قدم پر اسکا ثبوت ملتا ہے۔

امیرالامرا کے بھتیجے تھے۔ انہوں نے میر تقی میر کا تعارف اپنے بھائی[1] سے غالباً ۱۰ ذی قعدہ ۱۱۵۱ھ (تاریخ وفاتِ امیرالامرا بعمر ۸۰ برس) سے ایک آدھ سال قبل کرایا۔ میر کا روزینہ لگ گیا جو امیرالامرا کی وفات تک انہیں ملتا رہا[2]۔ سفینۂ ہندی میں، خواجہ باسط کے بارے میں ہے کہ "چوں دہلی موردِ آفات شد بحسبِ تمنائے ... شجاع الدولہ ... واردِ لکھنؤ شدہ دہمیں جا رحلت فرمود[3]"۔ یہاں انہوں نے ستر سال کی عمر میں ۱۱۷۸ھ میں وفات پائی مادۂ تاریخ "شیخ مومنین باسط[4]"، صفدر جنگ اور عماد الملک کے معرکے میں خواجہ باسط کا مکان لوٹ لیا گیا تھا[5]۔ باسط غالباً اس وقت اودھ گئے ہیں

میر حسن نے اپنے کلام نظم و نثر میں خواجہ باسط کا ذکر دو دفعہ تذکرۂ شعرائے اردو میں اور ایک بار گلزارِ ارم میں کیا ہے۔ تین رباعیات کلیات میں ہیں جو باسط سے متعلق ہو سکتی ہیں۔ تذکرہ کے اقتباسات ہیں:۔

> "میر حامد نصیری۔ درویشِ گوشہ نشین۔ از مریدان حضرت میر نصیر دام افضالہ، کہ الحال جانشینِ حضرت خواجہ محمد باسط نور اللہ مرقدہٗ ہستند۔ غرض ہماں جا بہ دروازۂ پیرِ خود از سرا عتقاد بسرمی برد[6]۔ مدہوش صاحب ہوش دگوش میر بچی جان المتخلص بہ مدہوش نبیرۂ حضرت خواجہ محمد باسط قدس سترہٗ جوانے ست خوش رو ... با فقیر بسیار آشنا ست:۔"

---

[1] کچھ میر کے بارے میں۔ قاضی عبدالودود صاحب نقوش اگست ستمبر ۱۹۵۳ء ص ۲۲،۲۱،۲۰:۔

[2] ایضاً بحوالہ ذکرِ میر ص ۶۲، ۶۳:۔ [3]:۔ ایضاً بحوالہ سفینۂ ہندی از بھگوان داس:۔

[4]:۔ ایضاً بحوالہ تالیفِ محمدی از محمد علی خان عاصی:۔ [5] تاریخ اودھ نجم الغنی جلد اول ص ۲۰۹ و سرکار جلد اول ص ۲۶:۔ بیتھمن ۵:۔ [6] ص ۱۲۵:۔

گلزارِ ارم میں ہے :-[1]

مگر یہاں ہے تو جائے خواجہ باسط | کہ تھی موزوں بہ سے خواجہ باسط
رکھے حق اس کو یہ وہ آستاں ہے | کہ دلی جس کی دہلی کا نشاں ہے
خوشا یہ ذوق و شوقِ عندلیباں | سرودِ مجلس و حالِ عزیزاں
نمونوں میں یہ ہے ہندوستاں کے | ورق ہے یہ مرقّع کا وہاں[2] کے

دیوان حسن کے نسخہ مملوکہ عبدالعلیم شیر کوٹی میں ہے :-

مفلس کی ملے با کہ غنی کی صحبت | بھانے کی نہیں ایسی کسی کی صحبت
کھلتا ہو دل اس کا داں جہاں بند ہو جی | دیکھی ہے حسن نے باسطی کی صحبت[3]
ہو کیونکہ حسن نہ دل میں جائے باسط | تھی اس کی بساط یہ برائے باسط
ہیں جیسے فدا ہوں باسطی پر اسطرح | جسطرح کہ باسطی فدائے باسط[3]
بندہ اوس کیمیا پہ ہوتا ہے ہلاک | اکسیر جو ہو کے آپ کو سمجھے خاک
گو وصف یہ ہے کس میں مگر ایک میں ہے | ہے بندہ علی باسطیؔ سید پاک[4]

میاں جگنو (جگن) کے حال میں گلزارِ ابراہیم میں لکھا ہے کہ وہ شیر افگن باسطی تخلص کے خالہ زاد تھے[5]۔ میر حسن، جگن (جگنو) کے حال میں شیر افگن کا ذکر بغیر تخلص کرتے ہیں[6]۔ اور تذکرے میں باسطی تخلص کا کوئی شاعر بھی موجود نہیں۔ آخری رباعی سے اشارہ ملتا ہے

---

[1]: گلزارِ ارم۔ مثنویات مرتبہ آسی ص ۱۴۵، ۱۴۶ :. [2] ورق ۵۹ ا :. [3] ورق ۶۰ ا :. [4] ورق ۶۰ ب :. [5] گلزار ارم ص ۱۰۱۔ ا۔ د۔ نسیم (خواجہ میر درد کا خاندان احمد جمیل کالج میگزین خاص نمبر ص ۱۴۵) ذکا کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ میاں جگن روشن الدولہ کے داماد شیر افگن کا خالہ زاد بھائی تھا۔ یہ بیان گلزار ابراہیم کے بیان کے خلاف ہے اس حساب سے میاں جگن شیر افگن باسطی کے نانا ہوئے۔ گلزار کا بیان قابلِ ترجیح ہے :. [6] تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۴۳ :.

کہ اس باسطی کا نام "بندہ علی" (پہلے مصرع میں مصرعِ چہارم کی رعایت سے "بندہ" کا لفظ لکھا ہے) یہ خواجہ محمد باسط سے الگ شخص ہیں۔ اور "فدائے باسط" ہیں یعنی ان کے مرید ہیں (رباعی ۲)

۱۔د۔نیم اپنے مقالے میں[۱] باسطی کا حال تاریخ سلطانی، صبح گلشن، سیر ہندوستان اور نشترِ سخن کے حوالے سے لکھا ہے۔ بندہ علی باسطی میر حبیب اللہ کے بیٹے اور عزت اللہ خان شیر افگن جدِ امجد علی مولف تاریخ مظفری کے دختر زاد تھے۔ سیاسی ابتری کی بنا پر لکھنؤ چلے گئے اور وہیں جا کر انہوں نے شاہ عبدالباسط سے بیعت کی تھی۔ شاعر تھے شاعروں کے مربی تھے۔ ان کے مفصل حالات مصحفی نے عقدِ ثریا میں دیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"باسطی، کہ بندہ علی خان نام دارد و مخاطب بہ شیر افگن خان نبیرۂ دختری نواب شیر افگن خان بانی پتی و پسر نواب عزت خان و دامادِ روشن الدولہ کہ سلسلۂ ایشان منتہی مشہور بہ نعمت اللہ ولی، مولدش شاہجہان آباد است۔ اوائل عمر کتب فارسی را بطورِ بزرگ زادگان پیش یکے از دانشمند (کذا) استفادہ نمودہ۔ چوں موزونیت جبلی داشت و اکثر بہ شعر گفتن مشغول می بود بخدمتِ استادِ فاضل و شاعر کامل میر محمد افضل ثابت الہ آبادی کہ اصلش از اکبرآباد است، غزلہائے خود را برائے اصلاح می فرستاد و نگین مہرش این مصرعہ کندہ بود مصرعہ:۔ "شیر افگن خان مریدِ ثابت است"۔ و این دلالت دارد بر فرطِ اعتقادش و آن روزہا تخلص سبقت بود۔ نصحائے ایران مثل بابا فغانی و نظیری او جمع نمودہ می گویند دیوان مرزا قلی میلی از وقتِ او در ہندرائج گشتہ۔ بتائیدِ ربانی و فیضِ کتاب ہائے خودش

---

[۱]:۔ اورنٹیل کالج میگزین۔ فروری و مئی ۱۹۵۸ء خواجہ میر درد کا خاندان:۔ ۸ ص ۱۲۲ (متن فٹ نوٹ)

دیوانے بترتیب دادہ چوں بجسب انجوررو جلاے وطن کردہ روزے در بنارس شرف اندوز ملازمت شیخ محمد علی حزیں گردیدہ و دیوانِ خود را بملاحظہ ایشاں در آوردنظراین کہ برحسن و قبح او مطلع فرمایند، شیخ فرمودند کہ از اول تا آخر شستنی است، برائے موزونیت، طبع گاہ گاہے فکر رباعی مضائقہ ندارد و چنانچہ ہم چنیں کرد و ازاں وقت بسبب، ایں کہ مرید خواجہ محمد باسط اکبرآبادی شدہ بود باسطی تخلص قرار داد و ہر گاہے کہ میر شمس الدین فقیر بعزم زیارت عتبات عالیات از دہلی بہ لکھنؤ سفر کرد۔ نواب مذبور خود را بشاگردیش در آوردہ بر گفتن رباعی اکتفا داشت، کلامش بیشتر در مرثیہ سید الشہدا علیہ السلام و مدح ربانی ائمہ اطہار است و ازلیکہ صاحب ثروت، بودہ در شاہجہان آباد شعرائے آنجا از قسم صلہ وغیرہ رعایات بیشتر کردہ عمرش قریب ہشتاد و خواہد بود در لکھنؤ دریک ہزار یک صد نود و نہ ہجری بجوار رحمت الٰہی پیوستہ[1]"

حسن کی تینوں رباعیاں انہیں کی شان میں ہیں۔ دوسری رباعی میں خواجہ باسط کا ذکر ضرور ہے لیکن مصرعہ ثانی میں "تھی" کا لفظ ان کی موت کی خبر دے رہا ہے۔ اسی طرح گلزارِ ارم اور تذکرے کے اقتباسات بھی انھیں وفات پائے ہوئے ظاہر کرتے ہیں، نیز حسن لکھنؤ میں اس وقت پہنچے ہیں جب اس شہر میں کوئی دلکشی نہیں رہی تھی۔

نتیجہ ہے[2]:-

جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں
نہ دیکھا کچھ بہارِ لکھنؤ میں

ان سے قیاس ہوتا ہے کہ حسن لکھنؤ میں ۱۱۸۰ھ میں یا اس کے بعد پہونچے۔ جب کہ

---

[1]:- عقدِ ثریا صفحہ ۱۵ :- [2]:- گلزارِ ارم صفحہ ۱۳ :-

ولایت اور باسط فوت ہو چکے تھے نیز اس وقت لکھنؤ کی ویرانی کا آغاز ہو چکا تھا۔

(۲)

دلائل کا تیسرا سلسلہ فیض آباد: - اس سے بھی زیادہ قطعی فیض آباد کا سفر ہے۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری (ابواللیث صدیقی) اور میرحسن اور ان کے خاندان کے شعراء (محمود فاروقی) میں اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لکھنؤ کے دبستان میں لکھا ہے:-

"خود (میرحسن) لکھتے ہیں کہ شروعِ جوانی میں ترکِ وطن کر کے لکھنؤ اور فیض آباد آیا۔ مولف گل رعنا کا خیال ہے کہ اس وقت بارہ تیرہ سال کی عمر ہوگی۔ وفات ۱۲۰۱ھ میں ہوئی اور اس وقت عمر تقریباً پچاس سال کی تھی اس حساب سے ۱۱۶۳ھ یا ۱۱۶۴ھ میں پورب آئے ہوں گے"

اسی طرح میرحسن اور ان کے خاندان کے شعراء میں میرحسن کے والد میرضاحک کے حال میں لکھا ہے:-

میرضاحک نے دلی کو ۱۱۶۳ھ یا ۱۱۶۴ھ کے لگ بھگ چھوڑا۔ وہ فیض آباد نواب صفدر جنگ کے عہد میں وارد ہوئے تھے"

میرحسن کے خاندان کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ضاحک پہلے فیض آباد میں آئے اور میرحسن بعد کو وارد ہوئے چنانچہ مرزا علی حسن لکھتے ہیں:-

"میرانیس کے گھرانے والوں کا بیان ہے کہ ضاحک، پہلے فیض آباد گئے تھے

۱:- لکھنؤ کا دبستانِ شاعری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ ۱۹۵۵ء ص ۹۳۔ ۲:- میرحسن اور ان کے خاندان کے شعراء راولپنڈی ص ۲۴۔

میر حسن بعد میں آئے تھے[1]۔

لیکن یہ روایت درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ میر حسن کے دوست میر شیر علی افسوس جنہوں نے اپنی زندگی کے دس سال ان کی رات دن کی صحبتوں میں گذارے، سحر البیان کے دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

"بعد برہم ہونے سلطنت کے شہر مذکور (دہلی) سے مجبوراً اپنے والد کے ساتھ صوبۂ اودھ میں آیا، سکونت فیض آباد میں اختیار کی۔ علاقۂ روزگار نواب سالار جنگ، بہادر مرحوم کی سرکار میں بہم پہنچایا[2]۔"

ہمارے نزدیک یہی بیان قابلِ قبول ہے۔ میر حسن کے خاندان کی روایت درست نہیں معلوم ہوتی۔

جناب ابواللیث صدیقی اور محمود فاروقی صاحب کے بیان کئے ہوئے سنین پر کئی اعتراض ہو سکتے ہیں، مثلاً :۔

(۱) ۱۱۶۳ھ اور ۱۱۶۴ھ کا زمانہ نواب صفدر جنگ کا زمانۂ حکومت ہے۔ نواب صفدر جنگ اس زمانے میں اپنا مستقل قیام فیض آباد میں نہیں بلکہ دہلی میں رکھتے ہیں۔ ۲۹ رجب ۱۱۶۷ھ میں عماد الملک کی سازش سے یہ معزول ہوئے اور ناکام ہو کر اودھ کی طرف چلے گئے[3]۔ جب صفدر جنگ دہلی میں ہوں تو فیض آباد کے عروج کا امکان ذرا کم ہے، خاص کر جبکہ نواب سالار جنگ کا خاندان بھی ابھی اودھ نہ پہنچا ہو۔

---

[1] :۔ غزلیات میر حسن۔ لکھنؤ ۱۹۲۲ء مقدمہ ص ۱۰۔ [2] :۔ دیباچہ سحر البیان لکھنؤ ۱۹۲۵ء ص ۱۷۔ [3] :۔ تعلیقات وقائع عالم شاہی (فراق) عرشی۔ رام پور ۱۹۴۹ء ص ۱۲۳۔

(۲) اگر بیدار کا حال آغازِ تذکرہ کے وقت ہی لکھا گیا ہو، تو ۱۱۹۲ھ کے قریب لکھا گیا ہو گا۔ اس حساب سے میر حسن نے دہلی میں ۱۱۸۰ھ کے قریب بیدار کو دیکھا ہو گا۔ میر حسن اگر ۱۱۸۰ھ تک دہلی میں تھے تو ۱۱۶۳ھ اور ۱۱۶۴ھ میں ان کا فیض آباد ہونا ممکن نہیں۔

(۳) میر حسن نے اپنے سفرِ فیض آباد کا حال مثنوی گلزارِ ارم میں دیا ہے، اور اپنی آمد کے وقت فیض آباد میں انگوری باغ، موتی باغ، لال باغ، چوک اور ترپولیہ کا حال لکھا ہے۔ اور شہر کا رونق کا نقشہ کھینچا ہے ۱۱۶۳ھ یا ۱۱۶۴ھ میں نہ فیض آباد اتنا آباد تھا اور نہ ابھی یہ پل اور یہ باغات تعمیر ہوئے تھے :

تذکروں کے اقتباسات :- اب دوسرے تذکروں کا جائزہ لینا بھی بے موقع نہ ہو گا۔

رام بابو سکسینہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :-

On the down fall of Delhi, Hasan went with his father to oudh .... He went to Fyzabad which was at that time the capital of the Nawabs of oudh, and entered the service of Nawab Salar Jung Bahadur .... Safdar Jung too was a Poet.

ترجمۂ تاریخِ ادبِ اردو (عسکری) میں ہے :-

"دہلی کی تباہی کے بعد اپنے والد کے ہمراہ فیض آباد روانہ ہوئے۔ راستہ میں تھوڑے عرصہ تک ڈیگ میں قیام کیا۔ ایک مرتبہ شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ

حہ۱ :- اقتباس مناسب موقع پر دیا جا چکا ہے :-

حہ۲ A History of urdu Literature. 1940 - ed. P - 67

سفر کیا۔[۱]

سید احمد[۲] قادری کہتے ہیں :۔

"احمد شاہ ابدالی کی یورش اور مرہٹوں کی تباہ کاریوں کے باعث دہلی اجڑ گئی تو یہاں کے اکثر ارباب کمال نے ترک وطن کر کے لکھنؤ اور بنگالہ کا رخ کیا۔ اس شرفا گردی میں میر حسن اور ان کے والد میر غلام حسین ضاحک بھی مجبوراً دہلی سے لکھنؤ چلے آئے۔ ترک وطن کے وقت میر حسن کا عین شباب تھا ...... یہ زمانہ نواب شجاع الدولہ بہادر (۱۱۶۷ھ تا ۱۱۸۹ھ) کی حکومت کا تھا۔"[۲]

سری رام مولف خمخانۂ جاوید لکھتے ہیں :۔

"عالم شباب میں مع والد بزرگوار فیض آباد میں آ کر آباد ہوئے۔"[۳]

یحییٰ تنہا کہتے ہیں :۔

"یہاں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ میر حسن دلی چھوڑ کر فیض آباد گئے اور بعد ازاں لکھنؤ میں مقیم ہو گئے۔"[۴]

ڈاکٹر محی الدین زور روح تنقید حصہ دوم ص ۲۷۱ پر لکھتے ہیں :۔

"لیکن افسوس کہ زمانہ نے ان یادگار زمانہ صحبتوں (میر درد کی) سے کافی طور پر (میر حسن کو) متمتع ہونے کا موقع نہ دیا۔ نظام الملک آصف جاہ فتح جنگ بہادر کا دلی سے منہ موڑنا تھا کہ مرہٹے بلائے بے درماں بن کر ٹوٹ پڑے اب احمد شاہ پر درانی قہر خدا کی شکل میں نازل ہوتا ہے۔ دلی گے گگی

۱؎ ص ۱۰۹ :۔ ۲؎ :۔ دیباچہ رموز العارفین ص ۱۲ :۔ ۳؎ :۔ خمخانۂ جاوید جلد دوم ص ۴۳۰ :۔ ۴؎ :۔ مراۃ الشعراء جلد اول ص ۲۷۵ :۔

کوچوں کی قسمت میں لکھا تھا کہ ایک اور مرتبہ نادر گردی کا سماں دیکھیں۔ جتنے شریف گھرانے صرف وضع داری کی خاطر اب تک دہلی ٹھہرے ہوئے تھے اس بربادی کے بعد خانہ بدوش ہو کر نکلے تھے۔ چنانچہ میر حسن نے بھی اپنے والد میر ضاحک کے ساتھ دہلی کو الوداع کیا اور فیض آباد کے قدردان نواب سالار جنگ اور ان کے بیٹے سرفراز جنگ کی خدمت میں پہنچے۔[۱]

تاریخ نظم و نثر اردو (باقر) میں لکھا ہے:۔

"دہلی کی تباہی کے بعد اپنے والد کے ساتھ فیض آباد چلے گئے۔ کچھ مدت وہاں رہ کر لکھنؤ آئے اور وہیں پیوند زمین ہوئے۔"[۲]

گذشتہ لکھنؤ میں شرر لکھتے ہیں:۔

"(غلام حسن حسن) بچپن ہی میں اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے تھے"[۳]

یادگار شعرا (ترجمہ فہرست کتب خانۂ اودھ اشپرنگر ترجمہ طفیل احمد) میں ہے:۔

"حسن اوائل عمر میں اودھ چلے گئے"[۴]

اردو ادب کی تاریخ (نسیم قریشی) میں ہے:۔

بارہ برس کے سن میں والد کے ساتھ فیض آباد گئے۔[۵]

گل رعنا عبدالحیٔ میں ہے:۔

"بارہ برس کے سن میں والد کے ساتھ فیض آباد آئے کچھ مدت وہاں رہ کر لکھنؤ میں آ بسے۔"[۶]

حسرت موہانی لکھتے ہیں:۔

---

[۱]:۔ ص ۲۷۱ :۔ [۲] ص ۱۰۹ :۔ [۳] ص ۸۲ :۔ [۴] ص ۶۲ :۔

[۵] ص ۷۹ :۔ [۶] گل رعنا (طبع سوم) ص ۲۳۵ :۔

"بزمانۂ نوعمری شاہجہان آباد میں میر درد سے غزل کی اطلاح لیتے ہیں پھر جب فیض آباد میں آباد ہوئے تو ضیا الدین ضیا اصلاح دیتے تھے"[1]

محی الدین زور کہتے ہیں :-

"اگرچہ وہ دہلی میں پیدا ہوئے لیکن کم سنی میں ہی اپنے والد کے ساتھ فیض آباد چلے گئے تھے"[2]

آزاد آب حیات میں رقمطراز ہیں :-

"عالم شباب میں والد کے ساتھ فیض آباد گئے"[3]

ایک دوسری جگہ آزاد فرماتے ہیں :-

"سلطنت کی تباہی نے ان (میر ضاحک) سے دلی چھڑوائی اور فیض آباد کو آباد کیا"[4]

عبدالغفور نساخ کے سخن الشعراء میں مذکور ہے :-

"شروع جوانی میں فیض آباد میں جا کر نواب سردار جنگ کے رفیقوں میں داخل ہوئے تھے"[5]

شیفتہ کے گلشن بے خار میں لکھا ہے :-

"وے بدہلی از عدم بوجود آمدہ در ریعانِ جوانی بجانب مشرق رفتہ۔ در فیض آباد خوانِ فیضِ نواب سردار جنگ خلفِ نواب سالار جنگ بہادر کامیاب بود"[6]

---

[1] بحوالہ سید امجد علی اشہری (حیات انیس) ص ۱۱-۱۲ ؛ [2] تاریخ ادب اردو دکن ۱۹۴۰ء ص ۹۷ ؛
[3] آب حیات ۔ دوازدہم ایڈیشن ص ۲۵۳ ؛ [4] ایضاً ص ۱۸۲ ؛
[5] سخن الشعراء ۔ نول کشور ص ۱۳ ؛ [6] گلشن بے خار ۔ نول کشور ایڈیشن طبع ثانی ص ۵۷ ؛

گلشنِ ہند (مرزا علی لطف) میں ہے :-

"صغر سن سے وارد لکھنؤ میں ہوئے"[1]

اب معاصر شہادتیں ملاحظہ فرمائیے۔ مجموعۂ نغز (قدرت اللہ قاسم) :-

"مولدش ہندوستان جنت نشان است در مبد واڑہ، دہلی کہنہ تولدش واقع شدہ۔ گردش دورِ دوّار ویرا بدیار مشرق انداختہ۔ در فیض آباد ملازم سرکار سردار جنگ خلف الرشید نواب سالار جنگ گشتہ"[2]

سعادت خان ناصر (۱۲۶۱ھ بعد میں اضافے) لکھتے ہیں :-

"دوازدہ سالگی میں شاہجہان آباد سے لکھنؤ میں آیا"[3]

مبتلا گلشن سخن میں فرماتے ہیں :-

"از دہلی سفر گزیدہ واردِ لکھنؤ گشتہ۔ با نواب سالار جنگ و خلف الیشاں نوازش علی خان می گذراند"[4]

مصحفی تذکرۂ ہندی میں کہتے ہیں :-

"در شاہجہاں آباد تولد یافتہ و بہ عمر دوازدہ سالگی قضا او را بطرف پورب افگندہ بقیۂ عمر در فیض آباد و لکھنؤ گذرانید، در سرکار نواب سالار جنگ بہادر"[5]

---

[1] گلشن ہند انجمن ترقی اردو ۱۹۳۴؁ء ص ۱۱۸ ج ۲۔ مجموعۂ نغز پنجاب یونیورسٹی ۱۹۳۳؁ء ص ۲۰۲۔ [3] اقتباس بحوالہ تذکرہ ناصر، قاضی عبدالودود صاحب مقالہ تذکرہ ناصر میں میر حسن اور ان کے اخلاف کے تراجم رسالہ سب رس (دکن) نومبر دسمبر ۱۹۵۶؁ء ص ۹۔ [4] بحوالہ فٹ نوٹ۔ دستور الفصاحت عرشی رامپور ۱۹۴۳؁ء ص ۸۔

[5] تذکرۂ ہندی۔ انجمن ترقی اردو ۱۹۳۳؁ء ص ۶۔ یہ بیان پہلے بھی درج کیا جا چکا ہے لیکن سلسلۂ کلام کے لئے اعادہ ضروری ہے۔ مرزا اعلیٰ حسن مصحفی کے بیان پر یوں تبصرہ کرتے ہیں "گیارہ سال کا لڑکا اور عاشق کے جنجال میں پھنسا ہو اسو یہ بات قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی"۔ ادب لطیف فروری ۱۹۵۲؁ء

باغ معانی میں معاصر بیان ہے :-

" میر غلام حسن، حسن تخلص دہلوی ولد میر غلام حسین، جوان خوش اختلاط، صاحب طبیعت، با مولف آشنا است، مدتہا شد از شاہجہان آباد آمدہ حالا در فیض آباد کہ بہ بنگالا شہرت دارد مع والد خود مقیم است۔[1]"

میر حسن تذکرۂ شعرا میں اپنے بارے میں بیان کرتے ہیں :-

" شروع جوانی از گردش روزگار بد ہنجار کہ ہرگز بہ کسے وفا نہ کردہ است بطرف لکھنؤ و فیض آباد رسیدم۔[2]"

علی ابراہیم گلزار ابراہیم میں میر حسن کے خط کے حوالے سے لکھتے ہیں :-

" مدتیست از دہلی وارد لکھنؤ گشتہ نواب سالار جنگ و خلف الیشاں می گذرانم۔[3]"

دیوان کے دیباچے میں صرف اس قدر لکھا ہے :-

" چوں از گردش روزگار بہ لکھنؤ رسیدم، رباعی گفتم بزبان فارسی ---
چوں در فیض آباد ---- رسیدم بخدمت میر حبیب ---- و میر ابراہیم ---
صحبت گزیدم۔[4]"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن نے نہ خود اپنے فیض آباد آنے کی تاریخ دی ہے۔ نہ کسی معاصر نے۔ مصحفی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن بارہ سال کی عمر میں فیض آباد آئے۔

---

[1] فارسی تذکرے اور ریختہ گو شعراء، مقالہ قاضی عبدالودود صاحب مطبوعہ نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۶ء جلد ۸ شمارہ ۲ صفحہ ۱۱ :: تذکرہ شعرائے اردو، انجمن ترقی اردو ۱۹۴۰ء ص ۱۵۳ (یہ بیان بھی پہلے درج ہو چکا ہے لیکن اعادہ ضروری ہے) :: [3] مع گلشن ہند ص ۱۱۸ :: [4] بحوالہ واقعات انیس۔ احسن لکھنوی ص ۲۱۰ ::

وفات کے وقت ان کی عمر بقول مصحفی ساٹھ سال سے متجاوز تھی۔ سنہ ۱۲۰۱ھ ان کا سالِ رحلت ہے۔[1] اس سے اندازہ لگایا جائے تو میر حسن سنہ ۱۱۴۰ھ کے قریب پیدا ہوئے اور سنہ ۱۱۵۲ھ کے قریب فیض آباد میں آئے ہوں گے۔ لیکن یہ غلط ہے اور اس پر بھی وہی مذکورہ بالا اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ اس وقت تک شجاع الدولہ کے ساتھ ابھی سالار جنگ کی ہمشیرہ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔[2] سالار جنگی خاندان ابھی دہلی ہی میں تھا۔ نیز میر حسن ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مصحفی کو تذکرہ لکھتے وقت سحر البیان کے ہیرو اور میر حسن کی عمر میں التباس ہوا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ پرانے تذکروں میں صرف میر علی لطف نے صغر سن کا لفظ استعمال کیا ہے۔ باقی سبھی تذکرہ نگار شروع جوانی لکھتے ہیں۔ مصحفی کو مشتبہ سمجھنا چاہیئے۔

میر حسن کا اپنا بیان ہے کہ بچپن یا صغر سن میں شاعری شروع کی اور شروع جوانی میں فیض آباد آیا اور یہی زمانہ فیض آباد کے عروج کا ہے۔ خود گلزار ارم میں کہتا ہے:

جو نہیں داخل ہوا میں اس نگر میں — کھلا جنت کا دروازہ نظر میں
عجب معمورۂ آباد پایا — مثالِ گل ہر اک دل شاد پایا[3]

تاریخ فرح بخش میں شجاع الدولہ سے پہلے کا حال یوں درج ہے:-

They say that when Nawab Burhanul-
Mulk was appointed to the governor-
ship of the oudh subah by the Emperor,

---

[1] تذکرہ ہندی صفحہ ۹۵ ۔ [2] یہ شادی سنہ ۱۱۵۹ھ میں ہوئی۔ نجم الغنی تاریخ اودھ حصہ اول صفحہ ۱۲۰۔ عماد السعادت (سید غلام علی خاں) کانپور سنہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۲۶ ۔

[3] گلزارِ ارم صفحہ ۱۴۶، ۱۴۷ ۔

he pitched his tent and court on the top of an eminence on the bank of Ghagra, four miles to the west of the home stead of Haveli Khass (F.N. Haveli Awadh.) After a few days he constructed a bangla, that is a wooden hut with a thatched roof, in which to pass the rainy season. Round it he raised a mud wall on all four sides, with a bastion on each corner like a fort. He made the enclosure so long and so wide as to leave plenty of room for cavalry, infantry and artillery, stables and other establishments. As he had no special fancy for masonary the female-quarters were also built of mud ....

Hence his place of residence was called Bangla. After his death it came in the time of Safdar Jung

to be called Faizabad. Round about this enclosure some Mughal chiefs laid out gardens and used to come out to them for airing and amusement: but Diwan Atama Ram's sons laid out a long bazar or market with rooms and shops out side the enclosure on the west side, near the gate known as Delhi Darwaza and erected residential buildings. Out side the enclosure Ismail-Khan risaldar also built another open bazar and a market place, which he named after himself. In the same way odd houses sprang up irragularly here and there belonging to traders &c ....
Inside the fortified enclosure there were also cavalry officers of every rank. After Nawab Safdar Jung's death all was spoiled and ruined. Shujaud-Daula made Luchnow his

permanent residence.[1]

صفدر جنگ کے زمانے میں جو تھوڑی بہت ترقی فیض آباد کو ہوئی وہ ۱۱۶۱ھ سے پہلے ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد پانچ سال اس نے دہلی میں بسر کئے۔ بعد میں صرف تھوڑا عرصہ زندہ رہا اور ۱۱۶۶ھ میں شجاع الدولہ وارثِ تخت و تاج ہوا جس نے ۱۱۶۷ھ سے ۱۱۷۹ھ تک کا زمانہ لکھنؤ میں بسر کیا۔[2] ۱۱۷۹ھ میں فیض آباد کی قسمت جاگی اب شجاع الدولہ نے اسے آباد کرنے کی ٹھانی منشی فیض بخش کہتے ہیں۔[3]

So in 1179 A.H. (1765 A.D.) when he returned

---

[1] Memoirs of Delhi and Faizabad Vol. II. PP. 23

[2] : ایضاً ص ۳۴ .:.

[3] :- چہار گلزار شجاعی (ہرچرن) کے حوالے سے ان عمارت کی تعمیر کی حقیقت شجاع الدولہ جلد دوم میں ص ۴۸، ۴۹ و ص ۳۱، ۳۲، ۲۰، ۲۲ پر درج ہے۔ ۱۷۶۶ء میں تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۷۶۸ء کے وسط میں نئی عمارات اور باغات اور چڑیا گھر کی تکمیل ہوئی۔ ۲۵ جولائی کو شجاع الدولہ نے سرکاری طور پر اپنی والدہ، بیوی اور دوسری خواتینِ حرم کی معیت میں ان عمارات کی سیر کی۔ باغوں میں مینا بازار لگا وہاں سے اشیاء بھی خرید کی گئیں نواب بیگم اتنی خوش ہوئی کہ اس نے تقریباً ۵ ہزار روپے محل کے ملازموں میں تقسیم کئے ص ۴۹۔ جنوری ۱۷۷۳ء تک نیا قلعہ اور محلات ابھی زیرِ تعمیر تھے۔ (ص ۲۴۵) شہر کی چاردیواری کی تکمیل ۱۷۷۲ء میں ہو گئی (ص ۲۴۴) شاہ عالم ۲۰ فروری ۱۷۶۹ء کو جب فیض آباد آیا تو اس نے لال باغ میں قیام کیا۔ ۲۵ فروری کو بادشاہ فیض آباد سے الہ آباد روانہ ہوا۔ (ص ۱۱۶) .:.

-urned to his dominions, he went to Faizabad and made it his residence. He began to recruit cavalry and infantry, to organize artillery and procure English muskets, and to erect good buildings. He built a new fort on a grander scale, on the walls of Burhan-ul-Mulk's old citadel and raized the houses of the Mughals. He ordered some of his private retainers to build houses for themselves outside the enclosure. The vast plain extending for more than two miles on each side of the fort was reserved, and rou-nd it was dug a deep trench. In the middle of this plain all his retainers and miliatry officers built themselves residences and outoffices as spacious as they desired. Night and day crowds after crowds

of every race, kept coming here so that the space, great as it was, became too confined for the residents, and each tried to find a place before the other. After some years, in addition to the enclosing wall of the fort, there were two other large walls constructed by way of city defences; one enclosed on three sides a great area, two miles long by two miles broad on the east, west and south; the other was between the fort and the outer wall and a mile long. In the same year were built the Tripolieh, which is situated in the chauk bazar running from the south gate of the fort to the Allahabad turn pike, so broad that nearly ten bullock carriages can easily abreast in it.

کچی فصیل پہ برسات میں چھپر ڈال دیئے جاتے تھے۔ شہر کے اندر خوشحالی کے پورے آثار نمایاں تھے۔ چھ اہم باغوں میں سے چار باغ شہر کے اندر واقع تھے۔ صفدر جنگ کا بنایا ہوا باغ۔ گلاب باڑی اور شجاع الدولہ کے بنائے ہوئے تین باغ، انگوری باغ، موتی باغ اور لال باغ۔ قلعے کے اندر تھا اور چار دیواری کا ایک حصہ اسی میں صرف ہوا تھا۔ موتی باغ چوک بازار میں تھا۔ لال باغ سب سے اہم تھا اس میں لالے کے پھول اگے ہوئے تھے۔ صوبے بھر میں اس کی شہرت تھی۔ شام کو لوگ اس میں سیر کے لئے بڑی تعداد میں داخل ہوتے تھے۔ شہر کے باہر دو رمنے بھی قابل ذکر ہیں۔ ایک مغرب میں تھا جو گرجی بیگ خان کی مسجد سے گپتار گھاٹ تک چلا گیا تھا۔ اس کے دو طرف کچی دیواریں تھیں اور تیسری طرف دریائے گھاگھرا۔ دوسرا رمنہ مشرق میں موضع جنورہ سے چھاؤنی گوشائیں تک دریا کے کنارے کی طرف بنا ہوا تھا۔ یہ چھ میل میں پھیلا ہوا تھا اور اس میں گیارہ گاؤں آباد تھے۔ شجاع الدولہ کو شہر کی آرائش کا بڑا خیال تھا ہر شام بیلچے والوں کو ساتھ لے کر نکلتا جہاں چھجے اور چبوترے آگے کو بڑھے ہوئے ملتے انہیں گروا دیتا۔ اس نے دو حکم بھی نافذ کئے۔ ایک کی رو سے لکھنؤ کی آبادی کو منتقل ہو کر فیض آباد میں آنے کا حکم تھا۔

In those days Shujaud Daula was intentionally engaged in the extention of Faizabad, and he ordered the Kot-wal of Lucknow to send all the ser-vants of government and the reside-nts of that city to Faizabad and to punish any one disobeyed the orders

to come. In fact, Mirza Nadir Ali, a relative of the begums, was killed for making some little delay, although he pleaded as an excuse the inability to procure carriage. The begum demanded satisfaction, but in vain. Thus the inhabited city expanded until it extended from Naurahi to Jalal-ud-din ganj, a distance of eighteen miles.

دوسرا حکم یہ تھا کہ :۔

وقدغن کردہ بود کہ زن شہر پیر باشد یا جواں یا دختر بے حکم حضور ازیں شہر بیروں نہ رود۔ تا رقعۂ پدروش فرنگی کہ بحکم حضور بہ رقعہ نویسی عزّ امتیاز داشت حاصل نشود۔ نہ گذارند کہ از دروازۂ شہر بگذرد۔ و دیگر اعزہ ہم تاکید بود کہ برائے زن عرض نکردہ باشند فی المثل اگر زوجۂ بہفت ہزاری ہم می خواست کہ از فیض آباد بہ اودھ کہ فاصلۂ نیم کروہ از شہر مذکور نداشت برود بردنش نگذاشتند الّا برائے مرد بد روشن حاصل می شد۔ اگر دو صد آدم در یک روز می خواستند کہ از شہر بدر آیند برائے ہر یک بمراکب و احمال و اثقال شاں بدست می آمد و محافظان متاع تنہا

---

[1] ایضاً دیباچہ صہ۱۱

بر دروازۂ مذکورہ نہ بودہ اند چار طرف بفاصلۂ چہار کردہ پیشتر از دروازہ ہم تعرضے بحال زن و مرد داشتند۔ از ایں سبب بے حصولِ دو رقعہ روانگیٔ مردہم۔ بہ ہیچ طرفے صورت نمی بست [1]؛

اس کے شہر آباد ہو گیا اور اس کی وسعت کا یہ حال تھا کہ جب ۱۸۳۲ء ہو میں منشی فیض بخش شہر کی طرف آیا تو ابھی چوک سے کئی میل کے فاصلے پر تھا اور شہر میں داخل نہیں ہوا تھا کہ جا بجا دکانیں اور جلسے دیکھے اس چہل پہل سے اسے خیال ہوا کہ چوک میں پہنچ چکا ہوں۔ میر حسن فیض آباد میں آئے تو انہوں نے بھی یہاں کی چہل پہل کو منشی فیض بخش سے کسی طرح کم نہیں پایا۔ لکھنؤ اس زمانے میں برباد تھا۔ بہ

جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں ۔۔۔ نہ دیکھا کچھ بہارِ لکھنؤ میں ۔۔۔۔
سیہ گل سے گلی یوں تر رہے ہے ۔۔۔ بغل جس طرح حبشی کی بہے ہے ۔۔۔۔
زبس افراط ہے یاں بھیڑیوں کا ۔۔۔ سدا دھڑکا ہے یوسف طلعتوں کا
سحر تک شام سے رہتا ہے دھڑکا ۔۔۔ مبادا بھیڑیا لے جائے لڑکا
بھلا اس طرح سے آرام کد ہو ۔۔۔ رہے یاں وہ جو کوئی لاولد ہو [2]

اب فیض آباد چلیے:

پر دیکھی میں نے جب کیفیتِ شہر ۔۔۔ مرے اک روز جی میں آئی لیکن لہر
کہ کیجیے سیر فیض آباد جا کر ۔۔۔ چلا میں واں سے اپنا دل اٹھا کر
جو نہیں داخل ہوا میں اس نگر میں ۔۔۔ کھلا جنت کا دروازہ نظر میں
عجب معمورۂ آباد پایا! ۔۔۔ مثالِ گل ہر اک دل شاد پایا!
وہ انگوری وہ موتی باغ دیکھا ۔۔۔ ارم جس کے حسد سے داغ دیکھا ۔۔۔۔

---

[1] عمادالسعادت ص ۱۰۶ :: [2] گلزارِ ارم ص ۱۴۲، ۱۴۳ ::

کھلا بازار اور رستے کشادہ ۔۔۔ بیاضِ جدولی ہو جیسے سادہ۔۔۔
جو کوئی شام کو واں چوک جاوے ۔۔۔ شبِ راحت کا دن کو حظ اٹھاوے
سرِ بازار واں ترپولیا ہے ۔۔۔ کہ جوں دروازۂ جنت کھلا ہے۔۔۔
کہے ہے باولی پی سرد پانی ۔۔۔ یہی ہے زندگانی کی نشانی۔۔۔
نظر بازار سے آگے بڑھی جب ۔۔۔ عجوبا اور اک آیا نظر تب
عجائب لال باغ اک طرف دیکھا ۔۔۔ کہ جنت کو رہا جس کا پریکھا۔۔۔
ہزاروں خانگی اور کسبی آکر ۔۔۔ کریں ہیں سیر لالہ دل لگا کر۔۔۔
جہاں تک چشم کی حدِ نگاہ جائے ۔۔۔ ہزاروں کوس لالہ ہی نظر آئے۔۔۔
وہ سیرِ رمنہ اپنے حسبِ دلخواہ ۔۔۔ وہ نوحؑ اور شیثؑ پیغمبر کی درگاہ
وہ پنجشنبہ کا درگاہوں میں جانا ۔۔۔ ہزاروں واں پریزادوں کا آنا
نہانوں کا اودھ کی سیر کرنا ۔۔۔ ہر اک کا فرقے غم میں جا کے مرنا
کہیں گپتار[1] ہیں جانا گپت ہو ۔۔۔ بہانا عشق کے دریا میں ڈل[2] کو۔۔۔

لال باغ۔ موتی باغ۔ چوک بازار ترپولیا۔ انگوری باغ ۱۱۷۹ھ میں شجاع الدولہ نے تعمیر کرائے۔ اس لئے میرحسن یقیناً اس سن کے بعد فیض آباد میں پہنچے۔ وہ خود آگے جا کر کہتے ہیں:۔

نہیں بنگلہ یہ جنت کا ہے بنگلا ۔۔۔ ہر اک بستی ہے جس کے آگے جنگلا

---

۱ آسی لکھتے ہیں غالباً گپت کاشی سے مراد ہے جس کا کسی کو پتہ نہیں۔ یا پچھلے کی جگہ یہ درست نہیں۔ اس سے مراد گپتار گھاٹ ہے جس کا ذکر فیض بخش نے بھی کیا ہے۔ یہ مقام باغ دلکشا کے پاس واقع تھا (فرح بخش ص ۲۱۵ جلد دوم)۔ ۲ گلزارِ ارم صد ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۹۔

یہ فیض آباد یاں جس نے بسایا بہشت اس کی عوض دیجو خدایا
جہاں جس سے ہوا آباد و معمور شجاع الدولۂ مرحوم و مغفور[1]

میر حسن فیض آباد کی معموری کو شجاع الدولہ کے زمانہ کی پیداوار مانتے ہیں۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں میر حسن کی فیض آباد میں موجودگی تذکرۂ میر حسن کے بعض بیانات سے ثابت ہے مثلاً سودا کے حال میں وہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں :۔

الحال در سرکارِ نواب شجاع الدولہ بہادر بوسیلۂ فنِ شاعری سرفراز است۔ ۔ ۔ ۔ اکثر فقیر در خدمتِ آں بزرگوار می رسد بسیار کرم می فرماید[2]،

گویا حسن ۱۱۸۸ھ سے قبل فیض آباد میں آ چکے تھے۔ اسی طرح مثنوی در شادیِ آصف الدولہ سے فیض آباد میں ان کی موجودگی ۱۱۸۲ھ میں ثابت ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ میر حسن فیض آباد میں ۱۱۷۹ھ اور ۱۱۸۳ھ کے درمیان وارد ہوئے۔ میر امانی کے حال میں میر حسن لکھتے ہیں :۔

با فقیر آشنا بود۔ ۔ ۔ ۔ ازیں جا بسببِ پریشانیِ روزگار بطرفِ مرشد آباد رفت[3]

میر امانی کے مرشد آباد پہنچنے کی تاریخ "گلشنِ ہند" میں یوں دی گئی ہے :۔

"۱۱۸۱ھ گیارہ سے اکیاسی ہجری میں وارد مرشد آباد ہوئے تھے[4]"

اگر مرزا علی لطف کا یہ بیان صحیح ہے اور اگر "ایں جا" سے مراد فیض آباد ہے (اور میرے خیال میں اس سے مراد فیض آباد ہی ہے) تو پھر میر حسن کے فیض آباد

---

[1] گلزارِ ارم صفحہ ۱۶۱ ؛۔ [2] تذکرۂ میر حسن صفحہ ۸۲ ؛۔ [3] ایضاً صفحہ ۱۵
[4] گلشنِ ہند صفحہ ۲۳ ؛۔

میں وارد ہونے کا زمانہ[۱] ۱۱۷۹ھ اور ۱۱۸۱ھ کے مابین قرار دیا جا سکتا ہے[۲]

(۳)

نتیجہ نمبر ۲ :- حسن لکھنؤ میں غالباً ۱۱۹۰ھ میں یا اس کے بعد پہنچے فیض آباد کا سفر انہوں نے ۱۱۷۹ھ اور ۱۱۸۱ھ کے مابین کیا۔ دہلی میں ان کا قیام ۱۱۷۰ھ تک بعض قیاسات کی رو سے نظر آتا ہے۔ اب داستان کے دونوں سروں کو ملانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہماری راہنمائی گلزارِ ارم کے اندراجات کرتے ہیں۔

دہلی سے فیض آباد کا سفر:-

سید احمد اللہ قادری لکھتے ہیں :-

"جس وقت دہلی سے روانہ ہونے لگے تو اپنے استاد حضرت خواجہ میر درد کی خدمت میں حاضر ہو کر ذیل کی رباعی پیش کی اور ان سے نہایت حسرت وافسوس کے ساتھ وطن کو خیرباد کہنے کی اجازت چاہی ؎

جاناں ز تو امید نگاہے دارم   امید نگاہے ز تو گاہے دارم

۱؎ :۔ "این جا" سے مراد فیض آباد ہی ہے۔ میر حسن نے امانی کے حال میں اس کی وفات کا ذکر کیا ہے جو ۱۱۸۶ھ میں ہوئی۔ امانی کا حال اس حساب سے ۱۱۸۶ھ کے بعد لکھا گیا۔ شیر علی افسوس کے بیان کے مطابق میر حسن ۱۱۸۹ھ تک فیض آباد میں سالار جنگ کے ملازم ہو چکے تھے۔ اور اگلے دس سال شیر علی افسوس کے ہمراہ سالار جنگ کی ملازمت میں رہتے ہیں۔ ۱۱۸۹ھ سے پہلے جو شجاع الدولہ کی تاریخ وفات ہے میر حسن فیض آباد میں قیام پذیر تھے ۱۱۹۰ھ کے لگ بھگ سالار جنگ کے ہمراہ لکھنؤ گئے۔ امانی ۱۱۸۱ھ میں عظیم آباد جا چکے تھے۔ اس لئے امانی سے ان کی آشنائی فیض آباد میں ہو سکتی ہے۔ پس ہمارے خیال میں "این جا" سے مراد فیض آباد ہی ہے :۔

۲؎ :۔ آگے چل کر ہم اسی مدت کو اس باب کے آخر میں اور بھی مختصر کریں گے :۔

ما گشتۂ چشم سرمہ سایت ہستیم — نے نالہ و نے فغاں نہ آہے دارم[1]

رباعی میر حسن کی ضرور ہے لیکن باقی واقعات جو اس سے متعلق قرار دے گئے ہیں کسی طرح درست نہیں۔ معاصر بیانات خاموش ہیں۔ بس اتنا پتا چلتا ہے کہ گلزارِ ارم میں اپنے اولیں معاشقے کا ذکر کرنے کے بعد (جو دہلی میں ہوا) روانگی کا تذکرہ کرتے ہیں :-

اگرچہ واں سے میں تنہا نے کو آیا — ولے اس کی جدائی نے ستایا
چلا گاڑی میں یوں آیا میں ناچار — قفس میں جس طرح صیدِ گرفتار
غرض کرنے تو کی قطع منازل — ولے ہر ہر قدم رہتا گیا دل....
بہانہ رکھ جدائی کا وطن کی — میں رو رو ندیاں کرتا تھا بن کی ..
کسی سے کہہ نہ سکتا تھا میں احوال — کہ تھی شرم و حیائے عشق دنبال
مثالِ شمع جی دیتا تھا کھپ کھپ — گرے پڑتے تھے آنسو میرے ٹپ ٹپ
ہر اک میدان تھا اس اشک سے گل — گئی برسات میں وہ اپنی منزل
کسی رہ میں نظر پڑتا تھا جب باغ — میں اپنے دل کے لگتا دیکھنے داغ
رہا میں ڈیگ میں آکر کئی ماہ — چلا واں سے رضائے حق کے ہمراہ[2]

حسن دہلی سے ڈیگ پہونچے۔ سفر گاڑی (بیل گاڑی) پر کیا۔ یہ زمانہ برسات کا تھا۔ ڈیگ میں پہونچ کر کئی ماہ قیام کیا پھر آگے چلے۔ گوڑگاؤں اور بھرت پور وغیرہ کا موسم پنجاب ہی کی طرح ہوتا ہے[3]۔ سفر کی ابتدا جولائی کے شروع میں ہوگی۔ شروع کی قید اس لئے ہے کہ اس علاقے میں .. ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

---

[1] دیباچہ امور العارفین صـ۳ :۔ [2] مثنویات مرتبہ آسی صـ۱۳۵، ۱۳۶ :۔ [3] :۔ یہ اطلاع مجھے امتیاز علی صدیقی سے جو گوڑگاؤں میں اودرسیر رہ چکے ہیں ملی۔ ڈیگ بھرت پور سے چوبیس میل کے فاصلے پر دلدلوں میں واقع ہے۔ امپیریل گزیٹیر میں محل وقوع ۲۸۰ ۲۷ عرض بلد اور ۲۲ ۷۷ طول بلد دیا گیا ہے۔

جھیلیں اور تالاب بہت ہیں۔ اور سال کا زیادہ عرصہ ڈیگ، کا علاقہ ارد گرد سے کٹا رہتا ہے[1]۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ میر حسن کو وہاں کئی ماہ قیام کرنا پڑا تا کہ راستے کھل جائیں اور سفر ہو سکے پھر آگے روانہ ہوئے:۔

مکن پور کو چھڑی چلتی تھی واں سے	اٹھے ہم ساتھ اس کے اس دکاں سے
بہ مشفق میر سیف اللہ جو ہیں!	اور ان کے بھائی نور اللہ جو ہیں
یہ دونوں اس سفر کے آشنا ہیں	اگرچہ ان دونوں مجھ سے جدا ہیں
انہوں میں اور ہم میں ایک مدت	ہم گذری ہے اک عالم کی صحبت
مدارس قافلے کا تھا چھڑی پر	چلے ہم وہاں سے چھڑیوں ساتھ ہو کر
زبس میوات کا اکثر تھا عالم	عجائب مہو شاں تھیں اس میں باہم[2]

مکن پور[3] میر حسن شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ گئے ہیں، چھڑیوں کے قافلے دوسرے شہروں سے بھی چلا کرتے تھے چنانچہ دہلی سے شاہ مدار کی چھڑی ۲ جمادی الاول میں چلتی تھی اور مکن پور ۱۷ جمادی الاول کو پہونچا کرتی تھی[4] یہ زمانہ حضرت بدیع الدین شاہ مدار کے عرس کا ہے

---

[1] :۔ The Imperial Gazetteer of India. ed. 1888 Vol. 8 under Dig.

[2] :۔ مثنویات صفحہ ۱۲۶/۱۲۷ ۔[3] مکن پور بامیم و کاف تازی ہر دو مفتوح و لون ساکن و با ئے فارسی و واو معروف و رائے ساکن در آخر (ہفت تماشا، قتیل صفحہ ۵۹) ۔ یہ جگہ کانپور کے ضلعے میں اور قنوج کے توابع میں سے ہے (India of Aurangzeb P. 25)[26] یہ مقام قنوج سے ۱۷ کروہ کے فاصلے پر ہے۔ (مفتاح التواریخ۔ بیل صفحہ ۱۱۵) بحوالہ اردن (Later Mughals- Vol. I P 219) یہ جگہ کانپور سے ۴۲ میل شمال مغرب میں ہے:۔

[4] India of Aurangzeb. Sarkar. ed. 1901, P 124
Tr. of Chahar Gulshan of Chaterman.)

اور حسن کے قافلے کو بھی مکن پور ۱۷ جمادی الاول کو پہونچنا چاہیئے۔ شاہ مدار کو ماننے والے فرقۂ مداریہ کہلاتے ہیں۔ بدیع الدین شاہ مدار کا زمانہ سلطان حسین شرقی کا دورِ حکومت (1401 — 1440 A.D) ہے۔ قاموس المشاہیر میں ان کا سنۂ وفات ۲۰ دسمبر ۱۴۳۶ء مطابق ۸۴۰ھ دیا ہے۔ یہیں کی مفتاح التواریخ میں خانقاہ کے مجاور کے حوالے سے قطعہ تاریخ دیا ہے "تاریخ رو ساکن بہشت" (۸۳۱ھ) سے نکلتی ہے۔ ایک دوسرے قطعے کے اعتبار سے بیدائش ۷۱۶ھ اور وفات جمعے کی رات بجائے ۱۷ جمادی الاول ۸۴۰ھ ہے۔ حسن کو مکن پور میں ۱۷ جمادی الاول کو پہونچ جانا چاہیئے۔ دن کو سفر ہوتا رات کو آرام کیا جاتا ہے راستے میں ان کے دوستوں میں سے ایک کو کسی ہمجولی سے محبت ہوگئی ہے۔ حسن اپنے اس دوست سے اپنا غم کہتے اور وہ ان سے اپنا غم کہتا۔ مکن پور میں ایک رات قیام رہا۔ ؎

مکن پور میں رہے ہم رات کی رات	اسی کی زلف کی کرتے رہے بات...
سبھی سوتے تھے اور ہم دونوں بیدار	جرس کی طرح اس غم سے دل افگار
یہ دھڑکا تھا کہ اب ہو دیں گے راہی	یہ کشتی یہاں سے کھاویگی تباہی
سحر ہو دیں گے اس گنگا سے ہم پار	یوں ہی رہ جائے گا دل اپنا جی دار

بچھڑیوں کے قافلے سے جدا ہو کر میر حسن پورب کے قافلے کے ہمراہ روانہ ہوئے ؎

چلا جب قافلہ پورب کا وہاں سے	جدا ہونے لگے ہم کارواں سے...

۱؎ قاموس المشاہیر جلد دوم ص۹ وغلط نامہ ص۹) ۲؎ ۲۰ دسمبر ۱۴۳۶ء = ۱۷ جمادی الاول ۸۴۰ھ ؛ ۳؎ بحوالہ کتاب ہذا ص۱۱۶ ؛ ۴؎ اردو ص۲۱۹

) میں ہے کہ وفات ۱۸ جمادی الاول ۸۴۰ھ میں ہوئی یعنی ۲۹ نومبر ۱۴۳۶ء کو

۵؎ : گلزار ارم ص۱۳۰ ؛ ۶؎ گلزار ارم ص۱۳۱ :؛

بچھڑ کر ہم بتوں سے آپڑے یہاں | مثالِ عمرِ رفتہ وے رہے وہاں[1] ....
جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں | نہ دیکھا کچھ بہار لکھنؤ میں[2]
سوائے تودہ خاک اور پانی | یہاں ہر جنس کی دیکھی گرانی[3]

سفر کی مدت اور فاصلہ:- دہلی سے آگرے تک سات دن کی مسافت ہوا کرتی تھی[4]۔ ۱۱ ذی قعدہ ۱۱۲۴ھ کو جہاں دار شاہ نے جب فرخ سیر کے مقابلے کی ٹھانی تو جن منزلوں پر قیام کیا ان کے نام یہ ہیں۔ تالاب کشن گنج۔ تلپت۔ فرید آباد۔ سیکری۔ پلول۔ آگرہ[5]۔ اسی طرح جہانگیر جب ۱۰۱۵ھ میں شہزادہ خسرو کی بغاوت فرو کرنے کے لئے روضہ اکبر (سیکری ۳ کروہ از آگرہ) متھرا (بیست کروہ از آگرہ)[6] ہوڈل۔ فرید آباد۔ دہلی پہنچے۔ سرجادو ناتھ سرکار نے اورنگ زیبی عہد کی سڑکوں کی تفصیل دیتے ہوئے آگرے سے دہلی تک کی سڑک کے بارے میں لکھا ہے۔ دہلی (سرائے عرب سے) بارہ پُلا۔ سرائے مہابت خان۔ تالاب کشن داس (ترکمان دروازۂ دہلی سے ۱۱ میل کے فاصلے پر) سرائے جلیبا دی خاں (؟) بدرپور (غالباً عدان پور) سرائے خواجہ بختاور۔ فرید آباد (بلب گڑھ سے ساڑھے پانچ میل) سیکری (پرتھالہ سے تین میل) پرتھالہ (بھگولا سے تین میل) بھگولا (پلول سے ۴ میل) سرائے پلول۔ کھیڑا (بہمنی سے ۲½ میل) بہمنی۔ میزل ؟ (بانچھڑی سے ۴½ میل) خانہ کٹھڑہ (کٹھیالہ) (بانچھڑی سے ۴ میل)۔ بانچھڑی (ہوڈل سے ۳½ میل) ہوڈل (کوسی سے ۸ میل) سرائے کوسی (دیوتانہ سے ۲½ میل) دیوتانہ (چھٹہ سے ۳ میل) سرائے چھٹہ۔ اکبر پور (متھرا سے ۱۲ میل) متھرا۔ نورنگ آباد (فراہ سے ۹½ میل) سرائے کُڈلر (جندی پور سے

---

[1] گلزار ارم ص ۱۴۲ ؛ [2] گلزار ارم ص ۱۴۲ ؛ [3] :- ایضاً ص ۱۴۳ ؛ [4] ارون جلد اول ص ۲۲۶ ؛ [5] ایضاً ص ۲۲۲/۲۲۳، ۲۲۴ ؛ [6] توزک جہانگیری ص ۲۶ تا ص ۲۸ ؛

۵ میل) گنتو گھاٹ (جمنا کے کنارے) جنڈی پچھ قراہ سے تین میل) سرائے فرح (۱۳ میل سکندرہ سے) سکندرہ (آگرہ سے ۵ میل) آگرہ ۔:

سرکار نے پیدل چلنے والوں کے لئے تمام منزلیں گنا دی ہیں۔ حسن گاڑی پر گئے ہیں۔ انہیں آگرے تک سات دن لگنے چاہئیں۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ وہ اس بڑی شاہراہ پر متھرا تک گئے۔ متھرا سے ڈیگ کی طرف سڑک جاتی ہے۔ متھرا سے ڈیگ تک اندازاً ۲۶ میل کا فاصلہ ہے[1]۔ اگر آگرہ پہونچ کر گئے ہوں تو آگرہ سے بھرت پور سڑک جاتی ہے۔ بھرت پور سے کمبھیر اور کمبھیر سے ڈیگ۔ لیکن اس حالت میں لمبے سفر کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اغلب یہ ہے کہ متھرا سے ڈیگ گئے ہوں گے۔ کئی ماہ قیام[2] کے بعد وہ ڈیگ سے کمبھیر، بھرت پور اور آگرہ گئے ہوں گے یا پھر ڈیگ سے واپس متھرا، اور متھرا سے آگرہ۔ پل سے دریا کو عبور کر کے مکن پور کا راستہ واضح ہے۔ جہاندار شاہ اور فرخ سیر کے درمیان مذکورہ بالا لڑائی کی تفصیل اس راستے کی نشاندہی کرتی ہے۔ فرخ سیر ۱۲ ذی قعدہ ۱۱۲۴ھ کو مکن پور میں تھے[3]۔ ۱۵ ذی قعدہ کو Mahamandan سے چلے ... اسکے بعد[4] راج گیر، راج گیر سے جلال آباد (۱۹ ذی قعدہ) سکندرہ (۲۰) رنگ پور (۲۱) عامی پور Asmauli (۲۲) بسنت پور (۲۳) کلیان پور (۲۴) اٹاوہ سے[5] (۲۵) فاضل آباد (۲۷) Khanmarmanna (۲۸) سرائے مرلی دھر (۲۹) شکوہ آباد (۱ ذی الحجہ) فیروز آباد (۲) علی نگر (۴) عماد پور (۵) سرائے بیگم۔ گوگھاٹ۔ سرائے روز بہانی (سکندرہ کے پاس) میوات پور (یہاں سے دریا عبور کیا) اور آگرہ سے[6] آگرہ سے مکن پور تک کی منزلیں بھی معلوم ہو گئیں۔ یہاں میر حسن ۱۷ جمادی الاول

---

[1] احوالِ غالب۔ مقالہ از غلام رسول مہر صفحہ ۱۳۲ ۔: [2] کئی ماہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ مدت ایک سال سے ہر حالت میں کم ہونی چاہیئے ۔ [3] اروِن جلد اول صفحہ ۲۲ ۔: [4] آگرہ سے ۲۳ میل کے فاصلے پر ہے ۔: [5] ایضاً صفحہ ۲۲۰ تا ۲۲۸ ۔:

کو پہونچے۔ یہاں سے اگلے روز وہ لکھنؤ کی طرف روانہ ہوئے۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہاں سے ملیح آباد گئے ہوں گے۔ درمیان میں کون کون سی منزلیں ہیں۔ ان کا پتا نہیں ملیح آباد سے آگے لکھنؤ تک سڑک جاتی ہے۔ چنانچہ امپیریل گزیٹیر (۱۸۸۸) میں[1] جو مختلف اطراف کی سڑکیں دی گئی ہیں۔ ان میں اس سڑک کی تفصیل یہ ہے۔ ملیح آباد سے موہان ہوہان سے رائے بریلی۔ سلطان پور۔ دیوا۔ کرسی اور لکھنؤ۔ یعنی شہر حسن کی منزلوں کے خاصے حصے کا تعین ہوجاتا ہے۔ اب اس راستے کی قیاسی تفصیل یہ ہے دہلی سے متھرا۔ متھرا سے ڈیگ۔ ڈیگ سے آگرہ۔ آگرہ سے اٹاوہ۔ اٹاوہ سے مکن پور۔ مکن پور سے ملیح آباد (درمیانی منزلیں نامعلوم) ملیح آباد سے لکھنؤ۔

تبصرہ اور فیصلہ: حسن کے سفر کی تین تاریخیں ہو سکتی ہیں۔ (۱) محرم ۱۱۷۷ھ کو حسن دہلی سے چلے۔ (۲) ۱۷ جمادی الاول مکن پور میں اور لکھنؤ میں ۱۱۷۷ھ یا اس کے بعد (۳) ۱۷ جمادی الاول کو مکن پور اور لکھنؤ میں ۱۱۷۹ھ کے بعد جب کہ لکھنؤ پایۂ تخت نہیں رہا تھا اور فیض آباد میں عمارات بننی شروع ہوگئی تھیں۔ اول پہلی قیاسی تاریخ کو لیا جاتا ہے۔ دلی سے ڈیگ تک سفر برسات میں شروع کیا گیا۔ گویا دہلی سے اندازاً انہیں ۱۸ جولائی میں چلنا چاہیئے۔ ان باتوں کا خیال رکھ کر اگر قیاسات کو مرتب کیا جائے تو وہ صحت کے قریب ہوں گے (۱) حسن اگر جولائی ۱۷۶۳ء (ذی الحجہ ۱۱۷۶ھ یا ابتدا محرم ۱۱۷۷ھ) میں چلے تو ہفتے ڈیڑھ ہفتے میں ڈیگ پہونچ سکتے ہیں۔ وہاں بارشوں کا زور ہوگا۔ مکن پور انہیں ۱۷ جمادی الاول ۱۱۷۷ھ تک (۲۴ نومبر ۱۷۶۳ء) پہونچنا چاہیئے۔ فاصلہ تقریباً ۱۹۰ یا ۱۹۵ میل ہے۔ اندازاً بارہ میل روز بھی طے کیا جائے تو ۱۵ یا سولہ روز میں انہیں یہ

---

[1] زیرِ عنوان لکھنؤ جلد ہشتم صفحہ ۴۹۹ تا ۵۰۰۔

سفر کرنا چاہیئے۔ اس لئے اگر اکتوبر میں ڈیگ سے چلتے ہیں تو ان کا ڈیگ کا قیام چار ماہ ہوگا۔ اس پر "کئی ماہ" کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ اندازہ اس اعتبار سے خلاف قیاس نہیں۔ مکن پور سے ۱۷ یا ۱۸ جمادی الاول کو چل کر لکھنؤ پہونچنے میں قیاساً ایک ہفتہ لگا ہوگا۔ گویا جمادی الاول ۱۱۷۷ھ کو وہ لکھنؤ آگئے۔ یہ قیاس ہمارے نتیجہ ۲ کے خلاف ہے۔ حسن ۱۱۷۸ھ یا اس کے بعد لکھنؤ پہونچے اس لئے ذی الحجہ ۱۱۷۶ھ یا محرم ۱۱۷۷ھ والے قیاس کو غلط قرار دیا جا سکتا ہے (۲) اب قیاس کی ابتدا جولائی ۱۷۶۳ء (محرم ۱۱۷۷ھ) سے کرنی چاہیئے اس مہینے ڈیگ میں ڈیگ میں قیام اندازاً چار ماہ رہا ۱۷ جمادی الاول ۱۱۷۸ھ (۱۳ نومبر ۱۷۶۴ء) کو مکن پور پہونچے اور اسی مہینے لکھنؤ جا پہنچے یہ قیاس نتیجہ نمبر ۳ کے عین مطابق ہے۔ اسی طرح نتیجہ نمبر ۲ میں سے پہلا خیال غلط اور دوسرا صحیح ثابت ہو جاتا ہے۔ نتیجہ نمبر ۱ جس کی رو سے حسن کے سفر کو ۱۱۷۵ھ یا ۱۱۷۶ھ کے بعد قرار دیا گیا تھا ٹھیک بیٹھتا ہے۔ (۳) میر حسن اگر محرم ۱۱۷۹ھ میں نکلے تو اسی مہینے میں ڈیگ آئے جہاں تقریباً چار ماہ قیام کیا ہوگا ۱۷ جمادی الاول ۱۱۷۹ھ میں مکن پور آئے اور اسی ماہ لکھنؤ پہونچے ہوں گے۔ ہمارا یہ تیسرا قیاس بھی مذکورہ بالا چاروں سلسلوں کے عین مطابق ہے۔

اس طرح طرف آخری دو قیاس ہی حقائق کی روشنی میں قابلِ قبول نظر آتے ہیں

(۴)

پس منظر:۔ اب ان تاریخوں کا جائزہ اس دور کے سیاسی پس منظر میں بھی لے لینا چاہیئے۔ پہلے دہلی اور ڈیگ کے حالات دیکھئے۔ محمد شاہ (متوفی ۱۷۴۸ء) کے بعد

ما (حسن حملۂ ابدالی یا جاٹ گردی کے بعد وہاں سے نکلے)

سے دہلی کی تاریخ الجھنوں اور پریشانیوں کی طویل داستان بن جاتی ہے ۔ احمد شاہ کی تخت نشینی (۱۷۴۸ء) سے اس کی قید بلکہ اندھا کئے جانے تک (۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ قید ۔ ایک ہفتہ بعد اندھا کیا گیا عماد الملک کا عروج ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رہا ۔ اور وہی درحقیقت سیاہ و سفید کا مالک تھا ۔ عالمگیر ثانی کو تخت نشین کرنے کے بعد عماد کی شخصیت اور بھی منہ زور ہوگئی ۔ دہلی میں ابتری کا آغاز ہوا ۔ شاہزادہ عالی گوہر کے خلاف سازش کی گئی (۲۶ مارچ ۱۷۵۸ء) اور آخر شہزادہ پورب کی طرف جانے پر مجبور ہوگیا۔[۲]

آخر عماد الملک نے ۸ ربیع الاول ۱۱۷۳ھ[۳] میں عالمگیر ثانی کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا اور دہلی سے بھاگ نکلا کیونکہ ابدالی کا سایہ دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا اور مرہٹے بھی زور پکڑ چکے تھے ۔ ادھر الہ باد کے پاس کھتولی کے مقام پر ۴ جمادی الاول ۱۱۷۳ھ (۲۴ دسمبر ۱۷۵۹ء[۴]) میں شاہ عالم کے لقب سے شہزادہ عالی گوہر بادشاہ بن گیا ۔ ادھر احمد شاہ ابدالی بلا کی طرح نازل ہوا اور پانی پت کی لڑائی (۱۷۶۱ء) کے بعد دہلی پر قبضہ کیا[۵] شاہجہان ثانی کے لقب سے محی الملت بن محی السلطنت کو عماد الملک پہلے ہی بادشاہ بنا گیا تھا[۶] ۔ ابدالی نے نجیب الدولہ کو امیر الامرا بنایا اور خود ۱۶ شعبان ۱۱۷۴ھ کو (۲۳ مارچ ۱۷۶۱ء) واپس قندھار چلا گیا ۔ دہلی میں نجیب الدولہ کی مطلق العنانی کا آغاز ہوتا ہے ۔ نجیب کے اختیار کا زمانہ ۱۷۶۱ء سے ۱۷۷۰ء تک سمجھنا چاہیئے اگرچہ جواں بخت نائب شاہ تھا اور شاہ الہ آباد میں انگریزوں

---

[۱] ۔ حواشی عرشی ۔ وقائع عالم شاہی ص ۱۴۶ ۔ [۲] ۱۹ مئی ۱۷۵۸ء (- Fall of Mughal Empire P. 119 [۳] ۹ جمادی الاول ۱۱۷۱ھ عرشی دیباچہ نادرات شاہی ص ۱۱ بہ لکھنؤ میں وارد ہونے کا سنہ ہے ۔ [۴] = ۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء سرکار جلد دوم ص ۱۵۲ ۔ [۵] نادرات شاہی ۔ دیباچہ ص ۱۴ ۔ [۶] وقائع عالم شاہی ص ۸ ۔ [۷] نادرات شاہی جلد ۱۹

کے رحم وکرم پر دن گذار رہا تھا حقیقت میں دہلی کے اندر مختارِ کل نجیب الدولہ تھا. نجیب کی وفات (۳۰ ؍ اکتوبر ۱۷۷۰ء = ۱۱ رجب ۱۱۸۴ھ) اور شاہ عالم کی دہلی میں واپسی کے درمیان صرف ۱۴ مہینے کا فصل ہے (۶ جنوری ۱۷۷۲ء) اس لئے ایک لحاظ سے یہ سارا دور نجیب الدولہ کا دور کہلانا چاہیئے. دہلی کو اس زمانے میں بھی امن کا سانس نصیب نہ تھا اگرچہ مرہٹوں کا زور وقتی طور پر ٹوٹ گیا تھا لیکن اب جاٹ ابھرنے لگے. بھرت پور کے جاٹ راجہ سورج مل نے دہلی پر دھاوا بول دیا (جمادی الآخر ۱۱۷۷ھ یا دسمبر ۱۷۶۳ء) سورج مل کے بارے میں مفتاح التواریخ میں ہے:[۲]

"درسنہ ہزار و یک صد و ہفتاد و ہفت ہجری شاید کہ ماہ جمادی الثانی راجہ سورج مل جاٹ کہ مالک ڈیگ وکمہیر و بھرت پور بود از چندے قلعۂ آگرہ را نیز گرفتہ بود.[۳] در شاہجہان آباد آمدہ با نجیب الدولہ جنگ و پیکار آغاز نہاد تا آنکہ روزے از ضرب کلہ بندوق کشتہ شد. القصہ چوں سورج مل کشتہ شد پسرش راجہ جواہر سنگھ بعد از چند اوقات جہت انتقامِ خونِ پدر ملہار راؤ مرہٹہ و نواب عماد الملک را ہمراہ گرفتہ با لشکرِ عظیم دہلی را تا چہار ماہ محاصرہ نمودہ جنگید تا آنکہ نجیب الدولہ عاجز آمدہ باز عرض بحضور احمد شاہ ابدالی فرستادہ. شاہ را از کابل حرکت داد. چوں جواہر سنگھ آمد آمدِ احمد شاہ را شنیدہ مشوش شدہ بتوسطِ ملہار مرہٹہ با نجیب الدولہ مصالحہ کردہ بہ ڈیگ معاودت نمود. و این سانحہ در اواخرِ سال یک ہزار و یک صد و ہفتاد و ہفت و شروعِ ہفتاد و ہشت ہجری در ایامیکہ نواب شجاع الدولہ

۱: سرکار جلد دوم ص ۲۷۵ :. ۲: نادراتِ شاہی - دیباچہ ص ۱۹ :. ۳: ص ۳۴۵ :.

۴: سرکار جلد دوم ص ۳۲۴ ۱۲ جون ۱۷۶۱ء :.

و شاہ عالم برائے کمک نواب قاسم علی خان بطرف بنگالہ رفتہ بودند بوقوع پیوستہ "

جاٹوں کے ان حملوں کی تفصیل یہ ہے کہ سورج مل جاٹ نے سرائے صدر کے مشرق میں بھاگل کے شمال کی طرف دہلی سے ۱۰ میل جنوب مشرق میں لڑائی کی[1] - معرکہ ۲۵ دسمبر ۱۷۶۳ء کو سہ پہر کے وقت ہوا جس میں سورج مل مارا گیا[2] - یہ موت اچانک تھی فوج تتر بتر ہو گئی - لیکن ابھی ان کا دھڑ کا اتنا تھا کہ نجیب الدولہ نے تعاقب نہیں کیا اور نجیب آباد چلا گیا - اس دوران میں سکھوں نے دو آب پر حملہ کیا اور نجیب کو ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا[3] - ادھر جواہر سنگھ راجہ تو ہو گیا لیکن اس کے سردار ابھی اس کی مخالفت کر رہے تھے - اس لئے ابھی اسے اپنے علاقہ میں ہی اقتدار جمانا تھا - جب اس نے نجیب الدولہ سے باپ کا بدلہ لینے کا ارادہ کیا تو کوئی سردار بھی آمادہ نہ تھا[4] - لیکن جب اسے سورج مل کی بیوی (جواہر کی سوتیلی ماں) ہنسیا سے روپیہ مل گیا تو سردار بھی تیار ہو گئے - اب تیاری شروع ہوئی - سورج مل نے دو سال سے فوجوں کو تنخواہیں نہیں دی تھیں اب ان کا حساب چکایا گیا - اور ملہار راؤ سے بھی حمایت کے لئے گفتگو کی گئی جس میں کئی مہینے لگ گئے - نجیب کو سب کارروائی کا پتا چل گیا اور اس نے بھی مرہٹوں سے گفتگو شروع کر دی - لیکن جواہر سنگھ روپے کا لالچ دے کر ملہار کو اپنے ساتھ لگانے میں کامیاب ہو گیا - اب جواہر نے دو آب کی جو چوکیاں پچھلی لڑائی میں نجیب نے چھینی تھیں واپس لے لیں (اپریل ۱۷۶۴ء)

---

[1] سرکار جلد دوم صفحہ ۴۳۳ فٹ نوٹ :: [2] ناکامی کے سبب کے لئے دیکھئے واقعات دارالحکومت دہلی جلد اول صفحہ ۶۶۳ :: [3] سرکار جلد دوم صفحہ ۴۳۴ :: [4] ایضاً صفحہ ۴۳۴ :: [5] ایضاً صفحہ ۴۳۹ ::

اور ملب گڑھ کو مرکز بنا کر تیاری شروع کی۔ دہلی پر مغربی کنارے سے نومبر ۱۷۶۴ء کے اوائل میں حملہ کیا گیا۔ ملہار راؤ بھی اس کی حمایت میں آ گیا۔ ۱۵ نومبر ۱۷۶۴ء کو یہ حملہ ہوا[۱]۔ دونوں طرف کے ایک ہزار آدمی کام آئے اب جواہر قلعہ فیروز شاہ کی طرف بڑھا اور ملہار کنی کاٹ کر الگ کھڑا ہو گیا اگلے دن لڑائی ہوئی اور پھر ۱۸ نومبر کو جمنا کا مشرقی کنارہ عبور کر کے جواہر کی فوجوں نے دہلی پر بمباری شروع کی یہ بمباری ۱۴ دن تک جاری رہی[۲]۔ اسی دوران میں مرہٹوں سے بدظن ہو کر جواہر نے سکھوں سے صلح کی امداد کو آ گئے۔ اور ۲۵ جنوری ۱۷۶۵ء کو زبردست لڑائی ہوئی[۳]۔ لیکن جنگ بے نتیجہ رہی اب نجیب اور جاٹوں میں صلح کی سلسلہ جنبانی ہوئی اور مرہٹوں نے دو عملی کا ثبوت دیا۔ یہ معاملہ فروری کے پہلے ہفتے تک چلتا رہا۔ عماد الملک جو جاٹوں کے ساتھ ان کی فوج میں تھا دھوکا دینے لگا اور اس نے بھی خفیہ مراسم نجیب سے پیدا کرنے شروع کیے[۴]۔ ۱۱ فروری ۱۷۶۵ء کو عماد اور نجیب ملے[۵]۔ عماد آخر ۲۲ فروری کو نجیب سے صلح کر کے دہلی آ گیا (یکم رمضان تھی) اسی طرح ملہار بھی نجیب سے آملا۔ آخر جواہر سنگھ ۱۶ فروری کو شہر سے نقصان اٹھا کر لوٹ گیا۔ خبر آئی کہ ابدالی پھر نجیب کی امداد کے لئے آ رہا ہے

"سنہ ہفتم جلوس شاہ عالم مطابق سنہ یک ہزار یک صد و ہفتاد و ہشت خبر ابدالی گرم شد"[۶]

---

[۱] صفحہ ۳۲۰ :. [۲] ۔ [۳] صفحہ ۳۲۹ :. [۳] صفحہ ۲۴۱ (مقام نخاس اور سبزی منڈی کے پاس پہاڑی پر :. [۴] :۔ صفحہ ۳۴۲ :. [۵] :. صفحہ ۳۴۳ :. [۶] :۔ سرگذشت نواب نجیب الدولہ صفحہ ۵۱ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی :.

اس لئے ملہار نے بھی دہلی سے بھاگنے کی ٹھانی اور عماد نے بھی کوچ کا ارادہ کیا۔ دونوں ۲۵ فروری کو دہلی سے نکل کھڑے ہوئے۔ سکھ بھی یہ خبر سن کر جواہر کا ساتھ چھوڑ کر اپنے وطن کو لوٹے۔ جواہر اس ناکامی پر بہت بگڑا اور ملہار کو روپیہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس طرح عمادالملک کو بھی اس نے ڈیگ سے نواب فرخ آباد کے پاس چلتا کیا (مئی ۱۷۶۶ء) اب جواہر اپنے علاقے کے انتشار کو دور کرنے میں لگ گیا۔

تبصرہ :- قیاس ۱ :- ۱۱۸۰ھ تک ہم نے دہلی اور اس کے نواح (ڈیگ) کی تاریخ کا جائزہ لے لیا اب اگر میر حسن کے سفر کی قیاسی تاریخوں کو اس تاریخ کی روداد میں رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ محرم ۱۱۷۹ھ (جولائی ۱۷۶۴ء) تک سورج مل کا حملۂ دہلی ختم ہو چکا تھا اور جواہر اس کا بیٹا اپنے وطن واپس لوٹ آیا تھا۔ اس لئے اب تک دوآب کی چوکیاں بھی واپس لے لی تھیں۔ اور نجیب الدولہ سے باپ کی موت کا بدلہ لینے کا پختہ ارادہ کر کے مرہٹوں سے نامہ و پیام بھی شروع کر چکا تھا۔ میر حسن اس زمانے میں ڈیگ کی طرف گئے ہیں۔ ان کے ڈیگ آجانے کے بعد بارشوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ ربیع الاول ۱۱۷۹ھ میں جواہر سنگھ دہلی پر حملہ آور ہوتا ہے اور میر حسن کمن پور کے قافلے کے ساتھ روانہ ہو جاتے ہیں ::

قیاس ۲ :- حسن اگر محرم ۱۱۷۹ھ میں دہلی سے چلے ہیں تو اس وقت جون کا مہینہ ہے۔ دہلی پر جواہر کا حملہ ختم ہو چکا ہے وہ اپنے وطن واپس لوٹ

۱۔ عمادالملک احمد خان بنگش کے پاس ۲۰ مئی ۱۷۶۶ء کو پہونچا۔ سرکار جلد سوم فٹ نوٹ ص ۲۴۲ مبنی بر مکتوبات وکیل مرہٹہ ::

آیا ہے۔ عماد الملک بھی ڈیگ سے بھاگ چکا ہے۔ میر حسن دہلی سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ڈیگ میں آتے ہیں۔ بارشوں کا زمانہ یہاں بسر ہوا ہے۔ ۱۷ جمادی الاول ۱۱۶۹ھ کو حسن مکن پور آئے اور پھر یہاں سے اسی سال لکھنؤ پہونچ گئے۔

اب اودھ کا حال بھی سنئے :-

اودھ کی حالت یہ تھی کہ شجاع الدولہ بنگال میں انگریزوں اور میر قاسم کی کشمکش دیکھ رہا تھا۔ قاسم کی جگہ انگریزوں نے میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا تھا۔ اوائل ۱۷۶۳ء (اواخر ۱۱۷۶ھ) میں شجاع نے اپنے علاقے میں الہ آباد کے قریب ڈیرے ڈال دیئے اور بیک وقت انگریزوں اور میر قاسم سے مراسم پیدا کئے۔ شاہ عالم۔ شجاع الدولہ اور میر قاسم کی ملاقات ۲۲ جنوری ۱۷۶۴ء (رجب ۱۱۷۷ھ) کو ہوئی اور معاہدہ ہوگیا۔ ۲۴ مارچ ۱۷۶۴ء (رمضان ۱۱۷۷ھ) کو میر جعفر کو نیابتِ بنگال کی سند عطا کی گئی۔ شروع مارچ ۱۷۶۴ء میں الہ آباد سے شجاع، میر قاسم اور شاہِ عالم بنارس پہونچے (۲۰ مارچ) ۲۵ اپریل کو اس علاقے پر اپنے قبضے کا اعلان کیا اور ۲۶ کو فوج بھی دریا عبور کر کے آگئی۔ ۸ اپریل کو کوچ ہوا۔ ۲۳ داؤدنگر ۲۸ پھلواڑی (پٹنہ سے سات میل) انگریز پہلے ہی پہونچ چکے تھے، شاہ عالم اور میر قاسم، شجاع سے دل برداشتہ ہو چکے تھے۔ مجبوراً ساتھ دیا۔ پنج پہاڑی کا معرکہ انگریزوں سے ۳ مئی ۱۷۶۴ء (ذی قعدہ ۱۱۷۷ھ) کو ہوا جس میں شجاع الدولہ زخمی ہوا۔ بیس دن پٹنہ کے اردگرد شجاع الدولہ مع فوج گھومتا رہا۔ پھر شجاع آرہ چلا گیا (سات میل کے فاصلے پر) اودھ میں انگریزی دستہ لوٹ مار کرنے لگا ۱۴ یا ۱۵ جون کو شجاع اپنے علاقے کی طرف آیا۔ ایک ہزار گاؤں برباد کر کے انگریز جا چکے تھے اب شجاع فیض آباد جانے کی بجائے بکسر کی طرف آیا (جون کے تیسرے ہفتے میں) بعد بارش کے مہینے میں یہیں قیام کا ارادہ کیا۔ سون سے کرم ناسا تک کے علاقے پر اپنا قبضہ

جما چکا تھا۔ اس کا انتظام اپنے افسروں کے سپرد کیا اور پٹنے میں مقیم میر جعفر اور انگریزوں سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔ الہ آباد سے اپنے بال بچے بھی بکسر منگا لیے انگریزوں نے شجاع کے دشمنوں کو اکسانا شروع کیا کہ اودھ پر حملہ کر دیں اور دوسری طرف اس کی فوج کے آدمیوں میں سے بعض کو ترغیب دی کہ اسے چھوڑ کر انگریزوں سے آملیں۔ ادھر شجاع الدولہ نے ۸ جون کو میر قاسم سے زبردستی روپیہ حاصل کیا اور اسے وسط اگست ۱۷۶۴ء میں گرفتار کر لیا۔ انگریزوں نے اواخر ستمبر ۱۷۶۴ء میں رہتاس گڑھ چھین لیا۔ آپس میں صلح کی گفت و شنید بھی جاری رہی اور لڑائی کی تیاری میں بھی انگریز لگے رہے ۲۲ اکتوبر ۱۷۶۴ء (ربیع الآخر ۱۱۷۸ھ) کو انگریزی فوج بکسر پہونچ گئی۔ شجاع نے ۲۲ اور ۲۳ کی درمیانی شب بال بچے لکھنؤ بھیج دیے۔ ۲۳ کی صبح کو لڑائی ہوئی (بکسر کی لڑائی) شجاع نے شکست کھائی۔ میر قاسم کو کھلا چھوڑ دیا کہ جدھر چاہے نکل جائے اور خود بھاگ کر بنارس پہونچا (۲۸ اکتوبر۔ بنارس سے چنار گڑھ (۱۵ میل) الہ آباد جا کر تیاری شروع کی، ۷ نومبر کو انگریز بنارس پہونچے اور قبضہ کر لیا۔ شاہ عالم اب ان کے رحم و کرم پر تھا۔ بلونت سنگھ جاگیردار کو وہاں کی زمینداری پر بحال رکھا اور اسے انگریزوں نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ شاہ عالم سے بھی معاہدہ ہو گیا۔ ۳ دسمبر ۱۷۶۴ء کو انگریزوں نے چنار پر دو حملے کئے۔ دونوں ناکام رہے۔ منرو جب ۷ دسمبر کو بنارس پہونچا تو شجاع اور انگریزوں میں صلح کی گفت و شنید شروع ہوئی۔ ادھر اودھ میں جاگیردار باغی ہو گئے اور فیض آباد میں فسادات ہوئے۔ شجاع الدولہ نے الہ آباد سے اپنے بچے دسمبر ۱۷۶۴ء میں لکھنؤ بھیج دیے اور بنارس کی طرف حملہ کرنے کے لئے بڑھا۔ جنوری کے دوسرے ہفتے میں (۱۷۶۵ء) شیو پور پہونچا (بنارس سے پانچ میل) ۱۸ جنوری ۱۷۶۵ء کو

شجاع الدولہ کا انگریزوں سے مقابلہ ہوا، شجاع نے شکست کھائی۔ پھر شجاع جلال پور (۶ میل بنارس سے) گیا۔ میجر فلیچر نے تعاقب کیا۔ چون پور کے مقام پر معرکہ (۲۰ جنوری ۱۷۶۵ء) نجف خان رہیل کھنڈ سے آکر انگریزوں کی حمایت میں فوج لے آیا۔ ۸ فروری ۱۷۶۵ء کو الہ آباد پر قبضہ کیا۔ چنار گڑھ بھی اس دن میجر سٹبرٹ نے فتح کیا۔ اب شجاع الدولہ بھاگا اور رہیل کھنڈ گیا۔ تاکہ رہیلوں اور مرہٹوں کی مدد سے انگریزوں کا مقابلہ کرے۔ بال بچے ساتھ لئے اور ۳۱ جنوری ۱۷۶۵ء (۸ شعبان ۱۱۷۸ھ) کو لکھنو سے نکلا، شہر میں ہراس پھیل گیا اور بہت لوگ بھاگ گئے۔ شجاع صرف چند آدمیوں کے ساتھ ۱۴ فروری ۱۷۶۵ء کو چل چکا تھا۔ بینی پرشاد حاکم اودھ انگریزوں سے مل گیا۔ پھر بھاگ کر شجاع کے پاس چلا گیا۔ (۲۵ مارچ) اور جنرل کارنک نے فیض آباد پر قبضہ کر لیا اس طرح لکھنو پر بھی قبضہ ہوا۔ ادھر روہیل کھنڈ میں روہیلوں نے ٹالا۔ بریلی میں بچے چھوڑ کر شجاع نے آدمی جمع کئے اور لڑنے کے لئے نکلا۔ نجیب الدولہ آقائے دہلی نے جاٹوں سے جنگ کے عذر سے جان چھڑالی۔ اس کا معتمد ہمت بہادر بھی ملازمت چھوڑ کر جاٹوں کا ملازم ہو گیا۔ فرخ آباد والوں نے بھی کوئی امداد نہ کی۔ ۳ مئی ۱۷۶۵ء کو رہ جہاں آباد کے مقام پر شجاع اور نجف خان میں معرکہ ہوا۔ نجف نے شکست کھائی۔ یہاں مرہٹوں اور شجاع میں بھی ان بن ہو گئی اور شجاع مزید امداد لانے کے خیال سے واپس بریلی لوٹا۔ وہاں اسے روہیلوں سے کورا جواب ملا۔ ادھر مرہٹوں نے کالپی پر ہلہ بول دیا۔ میجر فلیچر انگریزی فوج لے کر جاجھو پہونچا اور مرہٹوں نے ۲۲ مئی ۱۷۶۵ء کو انگریزوں سے شکست کھائی، ادھر شجاع الدولہ رہیلوں سے بھی مایوس ہو گیا اور اس نے اپنے آپکو انگریزوں کے رحم و کرم پر دینے کا فیصلہ کیا۔ انگریز ۱۲ اگست ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم سے بنگال،

بہار[۱] اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کرتے ہیں - ۱۶ اگست ۱۷۶۵ء کو الہ آباد میں شجاع الدولہ سے ان کا معاہدہ ہو جاتا ہے[۲]۔

تبصرۂ قیاس ۱ : میر حسن کے دہلی سے چلتے وقت شجاع الدولہ الہ آباد کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ پنج پہاڑی کا معرکہ ہو چکا ہے۔ جس میں شجاع زخمی ہوا۔ اودھ میں لوٹ مار کا آغاز ہے۔ بارش کے زمانے میں جب حسن ڈیگ میں ہے، شجاع الدولہ بکسر میں ہے۔ بکسر کی لڑائی میر حسن کے مکن پور پہونچنے سے پہلے ہو چکی ہے (حسن ۱۷ جمادی الاول ۱۱۷۸ھ کو یعنی ۱۳ نومبر ۱۷۶۴ء کو مکن پور پہونچے) بکسر کا معرکہ ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو پیش آیا۔ شجاع الدولہ نے اپنے بال بچے دسمبر ۱۷۶۴ء میں لکھنؤ بھیج دیے اور خود بنارس کی طرف حملہ کرنے کے لئے بڑھا۔ اس وقت میر حسن غالباً لکھنؤ پہونچ چکے ہیں۔ جون پور کے معرکے کے بعد شجاع الدولہ لکھنؤ آیا اور ۳۱ جنوری ۱۷۶۵ء (۸ شعبان ۱۱۷۸ھ) لکھنؤ سے بال بچے لے کر روہیل کھنڈ کی طرف نکل گیا۔ لکھنؤ پر انگریزی قبضہ ہو گیا جب ۱۶ اگست ۱۷۶۵ء میں یعنی ۲۷ صفر ۱۱۷۹ھ معاہدہ ہو گیا تو یہ علاقہ شجاع الدولہ کو واپس ملا۔ ۱۱۷۹ھ میں اس نے فیض آباد کو دارالخلافہ بنایا۔

اعتراضات : قیاس نمبر ا پر دو اعتراض ہو سکتے ہیں:

(۱) حسن لکھنؤ اس وقت پہنچ رہے ہیں جب کہ یہ ابھی دارالسلطنت ہے۔

---

[۱] یہ حصہ سری واستوا کی کتاب شجاع الدولہ کی پہلی جلد کے صفحات ۱۹۰ تا ۲۹۵ کا خلاصہ ہے :۔ [۲] Indian History Congress Allah - abad session 1938. Proceedings P.558. The Treaty Allahabad (1765) by Dr. A.L. Srivastava.)

حالانکہ انہیں دیرانی کے زمانے میں یہاں پہونچنا چاہیئے۔

(۲) اس وقت لکھنؤ سے لوگ بھاگ رہے ہیں کیونکہ ۸ شعبان ۱۱۷۸ھ کو شجاع الدولہ کے روانہ ہونے سے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا ہے اور لوگ بھاگنے شروع ہو گئے ہیں۔ اس لئے اس کا امکان کم ہے کہ ایسے میں حسن لکھنؤ میں قیام پذیر ہوئے ہوں۔

قیاس نمبر ۲ :۔ میر حسن محرم ۱۱۷۹ھ کو اگر دہلی سے چلے ہوں تو اس وقت تک شجاع الدولہ کی قسمت کا فیصلہ نہیں ہوا۔ اودھ اس کے ہاتھ سے نکلا ہوا ہے، ڈیگ کی طرف میر حسن کے روانہ ہونے کا سبب یہ بھی ہوگا۔ ڈیگ میں چار ماہ کے قریب قیام رہا۔ اس دوران میں صفر ۱۱۷۹ھ کو شجاع الدولہ کا انگریزوں سے معاہدہ ہو گیا اور اودھ اسے واپس ملا۔ بارشوں کے خاتمہ پر حسن ۱۷ جمادی الاول ۱۱۷۹ھ کو مکن پور میں تھے اسی ماہ لکھنؤ آئے۔ شجاع الدولہ غالباً اس سے قبل لکھنؤ کو ترک کر کے فیض آباد جا چکے تھے اور شہر کی آبادی عمارتوں اور باغوں کی تعمیر میں مصروف تھے۔ ان کی روانگی نے لکھنؤ کو خاصا بے رونق کر دیا تھا۔ لکھنؤ آ کر میر حسن کے خاندان نے کم از کم ایک برسات حزر و بسر کی ہے جو ۱۱۷۹ھ کا آخر اور ۱۱۸۰ھ کی ابتدا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو میر حسن کو جمادی الاول ۱۱۸۰ھ میں یا اس کے بعد فیض آباد جانا چاہیئے۔

تبصرہ اور خلاصہ :۔ قیاس نمبر ۲ ہمارے نزدیک صحیح ہے کیونکہ اس پر مرقومہ بالا دونوں اعتراض بھی نہیں ہو سکتے۔ نیز قیاسات کے اولیں سلسلے بھی اس پر پورے اترتے ہیں۔ اگر یہ طریق استدلال صحیح ہے تو میر حسن

مث: گلزار ارم۔ مثنویات۔ مرتبہ آسی ص ۱۲۵ :۔

محرم ۱۱۷۹ھ میں دہلی سے چلے۔ چار ماہ ڈیگ میں قیام کیا ۱۷ جمادی الاول کو کمن پور میں تھے۔ اسی ماہ کے آخر تک لکھنو پہونچے ہوں گے یہاں برسات گذاری، پھر جمادی الاول ۱۱۸۰ھ میں یا اس کے بعد فیض آباد میں ان کا جانا ہوا۔ جب شجاع الدولہ تر پولیہ۔ لال باغ وغیرہ تعمیر کر چکے تھے فیض آباد جانے کا سنہ اور بھی محدود ہو جاتا ہے۔ میر حسن جمادی الاول ۱۱۸۰ھ اور ۱۱۸۱ھ کے مابین فیض آباد گئے۔

باب چہارم

قیام لکھنؤ و فیض آباد

(۱)

قیامِ لکھنؤ:- میر حسن اپنے قیامِ لکھنؤ کے بارے میں دیباچۂ دیوان میں لکھتے ہیں

> غرض از گردشِ روزگار بہ لکھنؤ [1] رسیدم گفتم زبانِ فارسی کہ شیخ صاحب نوراللہ مرقدہ، [2] از زبانِ حضرت قبلہ گاہی ابداللہ ظلہ، شنیدہ بحقِ ایں عاصی دعا فرمودند [3]

---

[1] مائیکروفلم: "اکنوں"۔ واقعاتِ انیس اور غزلیاتِ میر حسن (غیر مطبوعہ) میں "لکھنؤ"۔

[2] واقعات فٹ نوٹ۔ شیخ ناسخ یا شیخ علی حزیں یہ صریحاً غلط ہے۔ مرزا علی حسن کا خیال ہے خواجہ باسط ہونگے حسن نے ان کا ذکر گلزارِ ارم میں بھی بڑے پیارے انداز سے کیا ہے لیکن گمان غالب یہ ہے حسن ان کی وفات کے بعد لکھنؤ آئے۔ یہاں اس سے مراد کوئی اور شخص ہونگے۔ لکھنؤ میں شیخزادوں کے دو خاندان تھے (گذشتہ لکھنؤ شرر ——) انہیں میں سے کوئی شخص ہونگے۔ شیخ عبدالرضا متین کا بھی لکھنؤ میں قیام رہا ہے (العقد ثریا ص۱۰۱) لیکن وہ عہد قاسم علی خان میں بنگال چلے گئے۔ اور وہیں ۱۱۷۵ھ میں وفات پائی (خزانۂ عامرہ ص۴۲۷) اس لئے ان کے ذکر کا امکان بھی نہیں۔

[3] مائیکروفلم: "فرمودہ اند"۔

[د شاید ایں نتیجۂ دعائے سلہ] آں بزرگِ عالی قدر باشد کہ توفیقِ سخن یافتم۔ د آلا من کجا و ایں گفتگو ہا [کجا ؟] [رباعی سلہ] ایں است

جانان ز تو امیدِ نگاہے دارم ۔ امیدِ نگاہے ز تو گاہے دارم
ما گشتہ بہ چشمِ سرمہ سائیت ہستیم سلہ ۔ نے نالہ و نے فغاں سلہ نہ آہے دارم

د شعرے نیز بہ ایں (طور ؟) بود :

اے شمع مپرس سرگذشتم ۔ خاموش کہ من ز سرگذشتم

فیض آباد سلہ اور شاگردی ضیاء چوں در فیض آباد حضرت اللہ تعالیٰ عن الآفات

رسیدم بخدمت میر حبیب اللہ سلہ برادر زادۂ [شاہ سلہ] سجن قدس اللہ سرہٗ کہ

سلہ مائی کرو فلم میں سیاہی پھری ہوئی ہے۔ بیاضِ فائق اور واقعاتِ انیس میں اس طرح ہے۔

سلہ یہ مائی کرو فلم میں نہیں ہے۔ اضافہ واقعاتِ انیس سے کیا ہے۔

سلہ مائی کرو فلم میں غلط ہے وہاں "سرمہ سائم" لکھا ہے۔

سلہ حیات میں "فغان"، مائی کرو فلم میں بھی اسی طرح۔ بیاضِ فائق میں "افغاں"

سلہ حال کے محقق ان کا قیام محلہ گلاب باڑی میں بیان کرتے ہیں [محمود فاروقی ص۳۷] معاصر شہادتوں سے جائے قیام کا حال نہیں کھلتا۔

سلہ مائی کرو فلم اور بیاضِ فائق میں عن موجود۔ واقعاتِ انیس میں غائب

سلہ میر حبیب اللہ پدرِ بندہ علی باسطی ؟

سلہ مائی کرو فلم میں یہ لفظ نہیں ہے۔

در دلیش معروف اند و میر ابراہیم نور اللہ مضجعہٗ برادرِ ایشاں نیز مشہور اصحبت گزیدم [1] زادہ ہائے طبعِ خود رامی نمودم ، اگرچہ سیدِ مسطور

---

[1] متن کے حال میں ایک خلیفہ ابراہیم کے قیام لکھنو کا ذکر مصحفی نے کیا ہے (عقدِ ثریا ص۵۱) خلیفہ محمد ابراہیم کا ذکر احمد علی سندیلوی نے مخزن الغرائب میں بھی کیا ہے (قلمی، شیرانی کلیکشن پنجاب یونیورسٹی لائبریری ورق ۲۹ و ب) خلیفہ محمد ابراہیم ۱۰۸۰ھ میں دلی میں پیدا ہوئے جوانی میں عالمگیر کی فوج سے منسلک تھے۔ اور فتح اللہ خوستی کے پروردگان میں سے تھے۔ میر جلال الدین بدخشانی کے مرید ہوئے اور انہیں سے خرقہ و خلافت حاصل کی۔ ان کی بشارت سے شہزادہ محمد معزالدین کو اپنے باپ کی وفات کے تین سال بعد بادشاہت ملی مشائخ چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ، شطاریہ اور قلندریہ سے بھی خلافت حاصل تھی ۲۵ برس لکھنؤ میں قیام کیا۔ مولانا روم کی مثنوی کا ساتواں دفتر بھی تصنیف کیا جس میں چھ ہزار اشعار ہیں۔ احمد علی سندیلوی نے خلیفہ کے بیٹے سے یہ مثنوی لے کر دیکھی اس میں قوافی کا زیادہ لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ "اکثر جا منوجہ قافیہ نشدہ اند" (تلخیص ترجمۂ ابراہیم) تذکرہ، وزیر روشن (۱۲۹۷ھ) میں ہے کہ خلیفہ ابراہیم نے لکھنو کے محلہ مکارم نگر میں مسجد اور خانقاہ کی بنیاد رکھی تھی اور بیس برس وہاں رہے ہیں اور پھر وہیں وفات پائی تھی (ص۱۵ طبع ۱۲۹۷ شاہجہانی پریس بھوپال) لیکن یہ خلیفہ ابراہیم ۱۱۷۰ھ سے قبل فوت ہو چکے تھے۔ عطا اللہ خاں اعلیٰ تخلص ان کے مرید تھے اعلیٰ کے حال میں باغ معانی میں ہے "در ایں اوقات کہ ہزار و یک صد و ہفتاد و چہار ہجری ست سنش از پنجاہ متجاوز است۔ در مراتب تصوف مربوط و مرید خلیفہ ابراہیم علیہ رحمۃ است" (نوائے ادب، اپریل ۱۹۵۷ء ص۱۰) یہ خلیفہ ابراہیم کہلاتے تھے میرے خیال میں میر ابراہیم سے جدا شخص ہوں گے۔

موزوں ندارند لیکن سلمہ اللہ تعالیٰ در فہمیدنِ ممتاز سنجیدگاں اند، و بزرگاں فہمیدنِ شعر را بہ از گفتن جائز داشتہ اند، شعر گفتن گرچہ در سفتن بود بلکہ فہمیدن بہ از گفتن بود دُر و زے بفرمائشِ آں شفیق ریختہ انشا کردم کہ در فصاحتِ زباں دانانِ ہند فصیح [تر ؟] آمد از آں باز چوں زبانِ خود گفت (کذا) ؎۱ از فارسی گذشتہ آنچہ بدل آمد گفتم۔ لیکن اصلاحِ حروف و معنی (معانی ؟)، بخدمتِ میر صاحب ضیائے بزمِ سخندانانِ بزمِ آتش زنِ کالونِ (کذا) سوختہ دروناں، میر ضیاء الدین حسین آداام افضالہٗ کہ (ضیاء) تخلص ؎۲ دارند گرفتم

اس اقتباس سے ہمارا قیاس یہ ہے کہ حسن زیادہ تر اس سے پہلے فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ میر حبیب اللہ کے کہنے کے بعد عام طور پر اردو میں شعر کہنے لگے اصلاح کی نوبت ضیاء کے سامنے آئی۔ ضیاء کی شاگردی کا اقرار ان نے کئی جگہ کیا ہے۔

حاصل کہ از صغر سنِ میلانِ طبیعتِ ایں فقیر بہ طرفِ سخن بیشتر بود،

؎۱ یہ فقرہ الجھا ہوا ہے۔ مرزا علی حسن کا خیال ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ "فیض آباد" میں پہونچا تو ان کو کلام دکھایا۔ ایک دن ان کی فرمائش سے ریختہ میں شعر کہا جو نہایت فصیح تھا جب سے بجائے فارسی کے اپنی زبان میں شعر کہنے لگا۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن نے فیض آباد آکر ریختہ گوئی شروع کی [غزلیاتِ حسن ص۱۲] (در زبانِ خود گفتم" یا" اد گفت در زبانِ خود گو")

؎۲ مائی کرو فلم میں تخلص غالباً دوسری روشنائی سے سنہری لکھا ہوگا۔ فلم میں نہیں آسکا۔ (دیباچہ دیوان حسن۔ مائی کرو فلم کلیاتِ حسن ص ۲۳۳، ۲۳۴)

بارے حق تعالیٰ دریں فن کم وبیش موافق ظرف استعداد و قبولیت بخشید، اصلاحِ سخن از میر ضیاء سلمہ اللہ، تعالیٰ گرفتہ ام [1]

دیوانِ حسن میں بھی ہے:

گفتگو اپنی برابر کب ضیا کے ہو سکے فرق ہوتا ہے بہت شاگرد اور استاد میں [2]

دیوان میں ضیاء کا ذکر دو اور جگہ بھی ہوا ہے:۔

کیا کہیں پوچھ مت بقولِ ضیاء	ایک دم ہیں سو والپسیں ہیں ہم
کیا کہیں ہم حسن بقولِ ضیاء	جس طرح سے کہ اب یہاں ہیں ہم
داغ ہیں کاروانِ رفتہ کے	نقشِ پائے گذشتگاں ہیں ہم [3]

افسوس لکھتے ہیں:

مشقِ سخن اس نے اسی ملک میں میر ضیاء الدین ضیاء تخلص سے کہ ہم مشق مرزا رفیع سودا اور میر تقی میر کے تھے کی تھی، سوائے ان کے مرزائے مرحوم سے بھی ان کی غیبت میں اکثر اوقات صلاح لی تھی. چنانچہ اس کا اقرار راقم کے سامنے کیا ہے [4]

لیکن اولیں مسودے کی نقل میں ہے:

مشقِ سخن اس نے اسی ملک میں میر ضیاء الدین ضیاء تخلص سے کی کہ ہم مشق مرزا رفیع سودا اور میر تقی میر کے تھے کی تھی لیکن میدانِ سخن میں

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو صہ ۵۹

[2] غزلیاتِ حسن (مرزا علی حسن) صہ ۲ (دیوانِ حسن۔ نولکشور صہ ۶۳، دیوانِ حسن صہ ۵۷)

[3] دیباچہ سحر البیان. مثنویاتِ حسن صہ ۱۷، ۱۸)

ان صاحبوں سے توسنِ طبع کو بڑھائے گیا[1]

شاگردیٔ سودا :- افسوس کا اقتباس دیا جا چکا ہے۔ حکیم قدرت اللہ قاسم مجموعۂ نغز میں لکھتے ہیں :-

شاگردِ رشید میر ضیاء الدین ضیاء است و از خدمتِ سرآمدِ شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا ہم استفادہ نمودہ

گمانِ غالب یہ ہے کہ سودا کے فیض آباد آنے سے قبل حسن ضیاء سے اصلاح لیتے تھے۔ ضیاء پھر فیض آباد سے راجہ شتاب رائے کے ہاں پٹنے میں چلے گئے اور ان کی غیر حاضری میں حسن نے سودا سے اصلاح لی۔ مصحفی میر حسن کے حال میں لکھتے ہیں :

---

[1] (دیباچۂ سحر البیان) کلیاتِ حسن مائی کرو فلم) سید احمد اللہ قادری لکھتے ہیں "اسی زمانے میں (یعنی بعہدِ شجاع الدولہ) میر ضیاء الدین ضیاء جو اردو کے نامور شاعر ہوئے ہیں کچھ عرصہ سے فیض آباد میں مقیم تھے۔ میر حسن نے فیض آباد آنے کے بعد ان سے اپنے کلام میں اصلاح لینی شروع کی۔ تھوڑی مدت کے بعد میر ضیاء یہاں سے عظیم آباد جا کر مہاراجہ شتاب رائے کے فرزند راجہ کلیان سنگھ کے متوسل ہوئے جس کے باعث سلسلۂ شاگردی منقطع ہو گیا ...... میر ضیاء جب عظیم آباد چلے گئے تو اس کے کچھ عرصہ بعد مرزا سودا اپنے قدردان نواب احمد یار خاں بہادر غالب جنگ کے فوت ہو جانے سے (۱۱۸۵ھ) فرخ آباد کو خیرباد کہہ کر فیض آباد چلے آئے اور نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں ملازم بنے۔ اس موقع سے میر حسن نے فائدہ اٹھایا اور اپنا کلام مرزا سودا کو دکھانے لگے" (دیباچہ رموز العارفین ص ۳، لم)

شعرِ خود را از نظر میر ضیاء الدین ضیاء کہ در آں ایام الیشاں از مستعدانِ زمانہ دریں دیار بودندی گذرانید۔ بعد ازاں در دورِ مرزا رفیع شد در زبانِ ریختہ چناں کہ زیادہ بر آں دریں دیار رواج یافت بحکم قوتِ ممیزہ قدم بر جادۂ مستقیم اساتذۂ مسلم الثبوت یعنی خواجہ میر درد مرزا رفیع سودا و میر تقی میر گذاشتہ [1]

اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں:۔

(۱) سودا فیض آباد میں حسن کے بعد پہونچے۔

(۲) سودا کے پہونچنے کے بعد اساتذۂ ثلاثہ کی پیروی میں حسن نے اپنا اندازِ سخن بدلا۔

پہلے نتیجے کی مزید تائید سودا کے حال میں بھی ہوتی ہے مصحفی اپنے پہلے سفر کے دوران میں جب فیض آباد میں پہونچے ہیں تو سودا سے ملے یہ ۱۱۸۵ھ یا ۱۱۸۶ھ کے لگ بھگ کی بات ہے:

فقیر در عہدِ نواب شجاع الدولہ بہادر روزے برائے دیدنِ ایں بزرگ۔ بخدمتش رسیدہ بود بہ پردرشِ سگانِ ابریشم پشم شوقِ تام داشت۔۔ ۔۔۔۔ نوابِ مرحوم و مغفور نیز بودن او را در سرکارِ خود بسیار غنیمت دانستند [2]

دوسری طرف ضیاء کے حال میں لکھا ہے۔

بندہ او را ندیدہ [3]

---

[1] تذکرۂ ہندی ص ۶۸

[2] تذکرۂ ہندی ص ۱۲۶

[3] تذکرۂ ہندی ص ۱۴۴

گمان ہے کہ ضیاء اس وقت تک فیض آباد سے جا چکے تھے اور دورِ سودا کا آغاز ہو چکا تھا۔ تذکرۂ حسن سے اس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ ضیاء شجاع الدولہ کی زندگی ہی میں (متوفی ۱۱۸۸ھ) فیض آباد سے جا چکے تھے۔ ترجمۂ احسن کے ضمن میں ہے:

> اوائل استفادہ از میر ضیاء حاصل کردہ الحال شعرِ خود را پیشِ رفیع می گذرانند ...... بہ وسیلۂ شاعری در سرکارِ نواب شجاع الدولہ سرفراز است [۱]

قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ ضیاء ۱۱۸۴ھ تک فیض آباد سے جا چکے تھے۔ میر حسن نے ۱۱۷۹ھ اور ۱۱۸۱ھ کے مابین شاگرد ہو کر ۱۱۸۴ھ تک اصلاح لی ہوگی۔ [۲]

نئی طرز:- سودا کا دور دورہ ہوا، اور ضیاء کی "غیبت" میں سودا سے اصلاح لی۔ اور طرزِ سخن بھی بدل لی۔ اس تبدلِ ذوق کے باب میں خود کہتے ہیں:-

> لیکن طرزِ ایشان (ضیاء) از من سرانجام نیافتہ۔ بر قدمِ دیگر بزرگان، مثالِ خواجہ میر درد صاحب، کہ در دمندی و بزرگی ہائے او شان عالمگیر است، از کلام دردِ او شان جگرِ عالمے فیض رسانِ درد و ذاتِ بابرکاتِ اوشان میانِ درد لیشان (چوں) فرید عہد۔ دیگر صاحبِ وقت (وقتے؟) رفیع منزلت مرزا محمد رفیع (سودا) سلمہ اللہ تعالیٰ [کہ از رائے صائب زیادہ ناطق اند] نظیر نظیری وجانِ قدسی اشعارِ اوشان است، میر محمد تقی ہمشیرزادۂ شیخ سراج الدین خانِ آرزو کہ سراجِ محفلِ شعراء بودہ دانہ صرصرِ زمانہ خاموش گردیدہ نور اللہ مرقدہٗ کہ تخلص [میر] دارند [و]

---

[۱] تذکرۂ ہندی ص ۱۶ [۲] تفصیل مناسب مقام پر درج ہے

بابا فغانی را در نالۂ خود نیہ (کذا) می خوانند وصیت فطرت اوشاں طنطنہ در جہاں افگندہ [و] دیگرے بخیالِ خود قائم نکردم کہ وضع آں را پسندم و دل بگفتارِ آں [ہا؟] بر نبندم حق تعالیٰ ایں ہر سہ ما چوں موالیدِ ثلاثہ تا جہان ست قائم دارد [1]

لیکن طرزِ اوشاں از من کما حقہٗ سرانجام نیافت، بہ قدمِ دیگر بزرگاں مثلِ خواجہ میر درد و میرزا رفیع سودا، و میر تقی پیروی نمودم [2]

روابط:۔ فیض آباد میں حسن کے جن لوگوں سے روابط تھے۔ ان میں اہم افراد کے نام یہ ہیں:۔ میر حبیب اللہ۔ میر ابراہیم (بحوالہ دیباچۂ دیوانِ حبیب اللہ کا حوالہ گلزارِ ارم میں بھی ہے) میر کلو [3] (بحوالہ گلزارِ ارم آسی ص۱۶۲) رجب بیگ (ایضاً ص ۱۶۲) میاں اسرار (یا میاں اسراری. گلزار مرتبہ آسی مثنویات ص۱۶۰ [4])

تذکرۂ شعرائے اردو میں مندرجہ ذیل شعراء سے حسن کی ذاتی واقفیت ہے۔

الم (ص۱۲) اشرف (ص۲۳) امانی (ص۱۵) احسن (ص۱۶) اثر (ص۱۹) افسوس (ص۲۰) اعظم (ص۲۴) رلیا سنگھ (ص۳۹) جرأت (ص۴۲) حسن (ص۴۹) حسن خواجہ (ص۴۹) خوش دل (ص۶۲) زار (ص۷۶) سودا (ص۸۳) سوزاں (ص۹۳) شاعرہ ص۹۶

---

[1] دیباچۂ دیوان۔ مائکروفلم۔ کلیاتِ حسن [2] تذکرۂ شعرائے اردو

[3] میر کلو فاضل؟ یا میر کلو شاعر؟ [4] عجیب بات ہے کہ مائکروفلم برٹش میوزیم میں میاں اسراری سے متعلق ۱۳ شعر موجود نہیں ہیں۔ اسرار بھی دہلی سے فیض آباد گئے تھے جیسا کہ ترجمۂ جوہر سے معلوم ہوتا ہے (تذکرۂ شعرائے اردو ص۳۲) جوہر نے دہلی میں خانہ جنگی میں وفات پائی تھی (گلزارِ ابراہیم ص۹۹)

صبر (ص ۹۹) ضیاء (ص ۱۰۰) فدوی (ص ۱۲۰) فخر (ص ۱۳۵) قربان (ص ۱۳۵)
محسن (ص ۱۵۰) محترم (ص ۱۶۲) محمد علی خاں (ص ۱۶۷) محبت (ص ۱۷۴)
مشتاق (ص ۱۷۵) نثار محمد پناہ (ص ۱۸۱) واقف (ص ۱۹۰) وہم (ص ۱۹۵)
یاس (ص ۲۰۶)

معرکۂ سودا و ضاحک :۔ یہ معرکہ غالباً ۱۱۸۶ھ اور ۱۱۸۷ھ کے مابین پیش آیا [1] ۱۱۸۸ھ میں، وفاتِ شجاع الدولہ سے قبل سودا کا حال جب حسن نے لکھا تو جھگڑے کا ذکر تک نہیں کیا۔ بلکہ سودا کی تعریف کی ہے۔ بعد میں جب حسن لکھنؤ پہونچے ہیں تو کچھ عرصہ ترکِ شعر گوئی کے بعد سودا کی ترغیب پر ہی انہوں نے غزل کہی جس کا مقطع ہے :

گیا تھا بھول سب کچھ میں تو بنگلے کی جدائی میں
غزل یہ مجھ سے کہوائی حسن سودا نے کہہ کہہ کر [2]

اور ۱۱۹۵ھ میں سودا کی وفات کے بعد حسن نے یہ شعر بھی کہا :

حسن سودا زباں اپنی میں خلاّقِ معانی تھا
کرے اب کیا سخن کی کوئی خلاّقی تکلف ہے [3]

سودا کی ہجو (دو ٹی تو کسی طور کمی کھائے مچھندر) کے جواب میں ایک ہجو کلیاتِ حسن میں بھی ہے۔ جو کلیات کے متعدد قلمی نسخوں میں ملتی ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ یہ ہجو غلطی سے حسن کے دیوان میں داخل ہو گئی ہے۔ درحقیقت ضاحک کی ہوگی۔

---

[1] مقالہ قاضی عبدالودود صاحب۔ میر ضاحک ص ۱۳۶ [2] غزلیاتِ میر حسن غیر مطبوعہ مرتبہ علی حسن ص ۹ [3] ایضاً ص ۵۹ (تفصیل آ چکی ہے) [4] مقالہ میر ضاحک۔ علی گڑھ میگزین طنز و ظرافت نمبر ص ۱۲۴

مشاعرہ:۔ فیض آباد میں ان کے مکان پر مشاعرہ بھی ہوا کرتا تھا۔ نثار کے حال میں خود لکھتے ہیں :

پیشتر کہ بہ فیض آباد می ماند اکثر در فقیر خانہ بہ روز مشاعرہ می آمد اگرچہ در آں ایام شعر نمی گفت لیکن گوشِ دل بر سخن ہائے رنگیں داشت [1]

اس طرح نثار کے حال میں ہے

"محمد پناہ خاں نثار تخلص...... با فقیر بسیار دوستی دارد پیشتر کہ بہ فیض آباد می ماند اکثر در فقیر خانہ بروزِ مشاعرہ می آمد..... ہمراہِ نواب بیرم خاں الحال در شاہجہاں آباد مقیم است [2]

قیاس چاہتا ہے کہ فیض آباد میں ان کا مکان اتنا بڑا ضرور ہوگا کہ اس میں مشاعرہ ہو سکے۔ مثنوی در ہجوِ حویلی (حویلی جو دو روپے کرائے پر لی تھی) اغلب یہ ہے کہ لکھنؤ میں لکھی۔

ہجو عظیم کشمیری:۔ میر شیر علی افسوس دیباچۂ سحر البیان میں لکھتے ہیں کہ "سوائے اس کے بردباری اور ملنساری ان کی (حسن کی) خلقت میں تھی۔ کسی کو میں نے اس عزیز سے شاکی نہیں پایا [2] اور بیزار نہیں دیکھا [3]"

لیکن کلیاتِ حسن میں ہجوِ عظیم کشمیری موجود ہے قیاس ہے کہ یہ ہجو درحقیقت مرزا علی کے خلاف ضاحک کی کہی ہوئی ہے۔

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۸۱ [2] تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۸۱)

[2] مائی کرو فلم میں "پایا" کی جگہ "دیکھا"

[3] مثنویاتِ حسن۔ آسی ص ۱۷ مائی کرو فلم میں یہ ٹکڑا نہیں ہے۔

آصف الدولہ کی شادی پر مثنوی: کلیاتِ حسن میں ایک مثنوی در شادی آصف الدولہ" درج ہے جس میں شجاع الدولہ کے حینِ حیات میں آصف الدولہ کی شادی کا مفصل تذکرہ ہے۔ کتبِ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ آصف الدولہ کی شادی شجاع الدولہ کے عہد میں ۱۱۸۳ھ میں ہوئی۔ یہ مثنوی اُسی موقع پر لکھی گئی۔ مثنوی شائع ہو چکی ہے۔

ملازمت: ۔ کلیاتِ حسن میں ہے:۔

در ایامیکہ نواب سالار جنگ بہادر از فیض آباد تشریف بردہ ہمراہِ بندگانِ عالی متر یک مہم افاغنہ شدند حسب اتفاق بمجرد رسیدنِ ایشان فتحِ عظیم بر افاغنہ دست داد ۔ سر حافظ رحمت خاں آوردند۔ بعد از چندے بندگانِ عالی بارِ رخصتِ ایشاں را بطرفِ فیض آباد فرمودند۔ بندہ رخصتِ ملازمت ایں رباعی گفتہ گذرانیدہ ا۔

اے آمدنِ تو راحتِ احباب است ۔ در عہدِ تو در دو غم نایاب است
رفتی و ز رفتنت درِ فتح کشادہ ۔ گویا قدمت کلیدِ فتح الباب است [۲]

اس اقتباس کو تاریخی شواہد سے دیکھنا چاہئیے۔

حافظ رحمت خاں سے شجاع الدولہ کی لڑائی ۱۱ صفر ۱۱۸۸ھ مطابق ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء سنیچر کے دن صبح کے وقت کٹرہ کمال زئی خاں اور فریدپور

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے شجاع الدولہ جلد دوم ص ۱۵۹، ۱۶۰ (۲ نومبر ۱۷۷۰ء سابق ۹ نومبر کو مہندی، ۱۲ نومبر کو شادی) عماد السعادت ص ۱۰۳، ۱۰۴) تفصیل تصنیفات کے ضمن میں درج ہے [۲] مائی کر و فلم [۳] تاریخِ اودھ نجم الغنی جلد دوم ص ۱۴۲

کے درمیان لاکھی کھیڑے کے میدان میں ہوئی۔[1] شجاع الدولہ لال ڈانگ سے غرہ شعبان ۱۱۸۸ھ کو واپس لوٹے۔ راستے میں سنجل کے مقام پر ۲۶ رجب ۱۱۸۸ھ کو محبت خاں پسر حافظ رحمت خاں ان سے ملا۔[2] پانچویں شعبان کو شجاع الدولہ لکھنو آئے۔ رمضان کا مہینہ وہیں بیماری میں بسر کیا جب اپنی موت کا یقین ہو گیا تو ۸ شوال کو فیض آباد کی طرف کوچ کیا اور ۱۲ شوال کو فیض آباد میں داخل ہوئے (تاریخ اودھ نجم الغنی ص ۲۸۵) اور یہیں ۲۴ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۴ء ۲ بجے رات وفات پائی۔[3] یا ۲۳ ذی قعدہ (تاریخ فرح بخش) میر حسن نے سالار جنگ کے ہاں ۱۱ صفر ۱۱۸۸ھ کے بعد اور ۲۴ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ سے قبل ملازمت کی۔

شیر علی افسوس لکھتے ہیں :-

راقم کو اس سے دوستی دلی تھی کبھو (کبھی[4]) رنجش خفگی (خفگی رنجش[5]) باہم نہیں ہوئی۔ حالانکہ اسی سرکار میں نہیں بھی نوکر اور اسی صاحب زادے کا ہم نشین تھا۔ دس برس تک دن رات ایک جگہ رہے۔ بلکہ اکثر آپس میں غزلیں ہم[6] طرح ہوئیں اور صحبتیں شعر کی رہیں۔۔۔۔ آخر چرخ تفرقہ پرداز نے باہم تفرقہ ڈالا۔ اتفاقاً میرا روزگار سنہ گیارہ سو ننانوے میں صاحب عالم مرزا جواں بخت کی سرکار میں ہوا۔[7]

---

[1] قیصر التواریخ جلد اول ص ۸۵ [2] قیصر التواریخ جلد اول ص ۸۸ (عیسوی سنین کے لئے دیکھئے اس کتاب کا باب اول۔ [3] مائی کروفلم میں کبھی لکھا ہے [4] مائی کروفلم میں اس طرح ہے [5] مائی کروفلم میں "ہم" نہیں ہے [6] (دیباچہ سحر البیان)

ملازمت کا زمانہ (۱۱۹۹ – ۱۰ =) ۱۱۸۹ھ بنتا ہے۔ اگر شروع ۱۱۹۹ میں جدا ہوئے تو پھر وہی ۱۱۸۸ھ ہوگا۔

اس ملازمت کے بارے میں لوگوں نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ حسن کا اپنا بیان ہے :۔

بارے کم و بیش از قدر دانیٔ نواب فلک جناب سالار جنگ بہادر، دام اقبالہٗ بہ لب نان رسیدہ۔ در خدمت مرزا نوازش علی خاں بہادر محبت گزیدم کہ خلف ارجمند اوست چنانچہ تا حال بہ ہر نوع گزران می نمایم۔۔۔۔ حق تعالیٰ عمر ایشاں را تا جہاں است مع فرزندان قائم دارد [1]

لوگ اس آخری فقرے کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ طبقات الشعراء میں کریم الدین نے صرف اتنا لکھا ہے۔

نواب سالار جنگ اور مرزا نوازش علی خاں بہادر صفدر جنگ (کذا) کے مصاحبوں میں رہا [2]

حاشیہ آرا ایک قدم آگے نکل گئے :۔

میر حسن پہلے نواب سالار جنگ اور ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے میر نوازش علی خاں کی سرکار سے متوسل رہے [3]

آسی بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں :۔

فیض آباد میں نواب سالار جنگ بہادر برادر بہو بیگم صاحبہ کی

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو ص ۵۲ [2] کریم الدین۔ طبقات ص ۲۱۳ [3] میر حسن اور ان کے خاندان کے شعرا ص ۱۶

سرکار میں ملازم ہوئے بعد ازاں ان کے بیٹے مرزا النوازش علی خاں کی مصاحبت میں بھی رہے۔ (مثنویاتِ حسن ص ۳)

سالار جنگ نے میر حسن کی وفات کے بعد ۱۲۰۱ھ میں وفات پائی۔[1] در حقیقت انہوں نے اپنے "بڑے بیٹے"[2] کی مصاحبت کے لئے میر حسن اور افسوس کو ملازم رکھا تھا۔

ملازمت کی نوعیت: نصیر حسین خیال نے مدت ہوئی ایک شگوفہ چھوڑا تھا:۔

(نواب عمدۃ الملک) کی نگرانی میں ایک انجمن بھی قائم تھی جس میں وقت کے فضلاء و زباندان شریک ہوتے۔ الفاظ و محاورات پر بحث ہوتی اور بڑے رگڑے جھگڑوں اور چھان بین کے بعد اس انجمن کے دفتر میں وہ تحقیق شدہ الفاظ محاورات درج ہوتے اور پھر سارے ہندمیں اس کی نقل بھیجی جاتی ..... اس دفتر میں حاتم و ضاحک بھی تھے ..... جب دہلی کے بعد فیض آباد میں سالار جنگیوں کے شوق نے اس دفتر کو پھر قائم کیا تو ضاحک و میر حسن کو اس سے خاص تعلق تھا۔[3]

اس لطیفے کو رام بابو سکسینہ نے "تاریخ ادب اردو" میں نمایاں جگہ دی ہے۔ اور میر حسن اور میر خلیق کو اس محاورات و ضرب الامثال کے دفتر کا ملازم قرار دیا ہے۔[4]

مرزا علی حسن[5] اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ "یہ خدمت بھی ان کے سپرد تھی کہ سالار

---

[1] تاریخ فرح بخش جلد دوم ص ۲۳ [2] شیر علی افسوس کا دیباچہ مظہر البیان ص ۱۷

[3] داستانِ اردو ص ۷۶، ۷۷، [4] ایضاً ص ۱۲۶ نیز اردو ترجمہ ص ۲۱۵ [5] ایضاً ص ۱۲ غزلیات میر حسن

جنگی محلوں میں بیگمات جو زبان بولتی تھیں اسے قلم بند کریں"۔ محمود فاروقی بھی ان کے ہمنوا ہیں[1] بلکہ فاروقی صاحب کے خیال میں میر حسن اس دفتر کے میر منشی مقرر ہوئے۔ اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ معاصر حوالے صرف نوازش علی کی مصاحبت کا اقرار کرتے ہیں۔

سالارِ جنگ:۔ سالار جنگ کے بزرگوں میں مرزا حسن بعہدِ عالمگیر ایران سے ہند آئے۔ شوستر کے رہنے والے تھے۔ آکر شہزادہ محمد اعظم کی ملازمت کی۔ عالمگیر سے بھی تقرب حاصل کیا اور داروغۂ باورچی خانہ کے عہدے تک پہونچے ان کے بیٹے غلام علی خاں تھے۔ غلام علی کے بیٹے اسحٰق خاں کچھ عرصہ عسرت میں زندگی بسر کرتے رہے۔ قہرمانِ ایران (نادر) کی آمد سے قبل دربارِ شاہی تک عمدۃ الملک امیر خاں (انجام) کی مصاحبت کے سبب رسائی حاصل کی۔ نادر کی واپسی کے بعد عمدۃ الملک، کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کا رتبہ بھی بڑھا۔ دیوان خالصہ ہوئے اور خطاب موتمن الدولہ پایا۔ ان کے تین بیٹے تھے ایک بیٹی بڑا لڑکا نجم الدولہ تھا۔ منجھلا مرزا علی خاں چھوٹا سالار جنگ اور سب سے چھوٹی بہو بیگم تھیں۔ (والدۂ آصف) ظلِ سبحانی محمد شاہ موتمن الدولہ اور اس کی اولاد پر مہربان تھا۔ تورانی اثر سے نکلنے کے لئے محمد شاہ نے انہیں اور صفدر جنگ کو ملانے کی کوشش کی۔ صفدر جنگ کے بیٹے شجاع الدولہ کی شادی بہو بیگم کے ساتھ کرادی (۱۱۵۸ھ) اس کے بعد شجاع الدولہ کے زمانے میں دونوں گھرانے ایک جان دو قالب ہو گئے۔[2]

---

[1] ص ۲۴۔ میر حسن اور ان کا خاندان۔

[2] عماد السعادت ص ۳۴، ۳۵

سالارِ جنگ کا شجرہ یہ ہے

- مرزا علی حسن
  - غلام علی خاں
    - اسحٰق خاں شوستری (موتمن الدولہ) متوفی ۱۱۵۳ھ
      - افتخار الدولہ مرزا علی دلاور جنگ (منجھلا)
        - دختر زوجۂ صفائی (عقدِ ثریا ص ۳۶)
        - احمد علی شوکت جنگ سوزاں
          - مظفر علی خاں بریاں (ریاض الفصحا ص ۴۲)
        - مرزا محمد تقی ہوس (ریاض الفصحا ص ۳۲۶)
          - مرزا علی نقی جنوں (ریاض الفصحا ص ۶۹)
      - مرزا انجم الدولہ اسحٰق خاں موتمن الدولہ متوفی ۱۳ ستمبر ۱۷۵۰ء (۱۱۶۳ھ) (بڑا)
      - رشید خاں سالار جنگ متوفی ۱۲۰۱ھ (چھوٹا)
        - زین العابدین مرزا میڈھو سرسبز
        - نوازش علی خاں سردار جنگ
        - قاسم علی خاں متوفی ۱۲۳۶ھ
          - حسین علی خاں (قیصر التواریخ ص ۱۴۷)
            - مہدی علی خاں (قیصر التواریخ ص ۱۴۸)
            - مرزا فدا علی خاں (قیصر التواریخ ص ۱۴۸)
          - محمد علی خاں
      - بہو بیگم (سب سے چھوٹی)

نوٹ: حسین علی کا پوتا نصرت تخلص شاگردِ آتش (نوائے ادب مقالہ، کچھ الشا کہا رہے ہیں)

نجم الدولہ خیلے رشید وسعید و عفیف۔ خلیق و اشراف پرست بود۔ خدا آتش بیامرزد۔ و مرزا علی خاں ہم بقدم برادر بزرگ سالار جنگ اند کے عیاش بودہ است لیکن ادرا نیز حالاتی بود کہ صاحب ایں حالات را درعرف دہلی می گو۔ از نجم الدولہ دخترے بود از بطنِ لولی کہ بظفر الدولہ بند علی خاں پسرِ بزرگ مرزا علی خاں کہ خدا شد دادہ شد اولادِ مرزا علی خاں احمد علی خاں شوکت جنگ (سوزاں تخلص تھا ان کا) معغوز بود۔ ودر اولادِ سالار جنگ ہر چہ ہست قاسم علی خاں است ۔ لہ

شعرا کے قدر داں تھے چنانچہ میر تقی میر کو بھی دربار اودھ میں انہوں نے ہی بلایا تھا (سنہ ۱۱۹۶ھ) دریائے لطافت میں دہلی کے اہلِ زبان ادبا کے ذکر میں انشا لکھتے ہیں :۔

فصیحوں میں محمد اسحٰق خاں موتمن الدولہ اور ان کے تینوں صاحبزادے نجم الدولہ اور افتخار الدولہ نواب مرزا علی خاں اور نواب سالار جنگ اور ان کے عیاش طبع ہونے کی وجہ سے دہلی کے لطیفہ گو خوش کلام اور پری پیکر ان کی صحبت میں جمع تھے ۲ے

سالار جنگ کا موسیقی کا شوق بھی زبان زدِ عام تھا۔ چنانچہ موجودہ دور کے محقق اسرار حسین لکھتے ہیں :۔

انچھا برس کلاونت جو ابنائے تان سین سے تھا اس سے (سالار جنگ)

لہ عماد السعادت ص ۱۳۶ ؎ ذکرِ میر ص ۱۳۹

۲ے اردو ترجمہ دریائے لطافت ص ۱۲۵

گوئے سبقت لے گئے تھے اور اس درجہ کمال پیدا کیا کہ قوالوں اور کلاونتوں سے حصۂ شادی وغمی بمقتضائے ظرافت وعلم و کمال لیتے تھے۔ [۱]

ان دلچسپیوں کے علاوہ خوش خوری میں بھی اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے:۔ باورچی کی تنخواہ بوجہ اس کے کمال کے بارہ سو روپے ماہوار تھی۔ خاص نواب صاحب کے لئے وہ ایسا بھاری پلاؤ پکاتا تھا کہ سوا ان کے کوئی ہضم نہ کرسکتا تھا۔ یہ باورچی عہدِ شجاع الدولہ میں فیض آباد میں تھا۔ [۲]

ان کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں:۔

۱۔ نوازش علی خاں سردار جنگ۔ بڑا بیٹا تھا۔ بعہد غازی الدین وفات پائی [۳]

۲۔ قاسم علی خاں (متوفی ۱۲۳۲ھ) [۴]

۳۔ مرزا زین العابدین عرف مرزا مینڈھو سر سبز تخلص [۵]

اس کے علاوہ نجم الغنی نے دو نام اور بھی دئیے ہیں:۔

۴۔ مرزا جما۔ جن کی بیٹی سے شمس الدولہ کی شادی ہوئی۔ [۶]

۵۔ مرزا چھجو جس کی مختار الدولہ کی لڑکی سے شادی ہوئی۔ [۷]

---

[۱] سبزۂ سبز خوبانِ اودھ ص۵۸ [۲] بتقدیم سبزہ و سبزہ خوبانِ اودھ سید اسرار حسین خاں طبع اول ۱۹۳۶ء ص۱۴۵ [۳] نجم الغنی۔ تاریخ اودھ جلد چہارم ص۱۳۷ [۴] ایضاً ص۱۳۷۔ قیصر التواریخ جلد اول ص۱۴۷ [۵] اس عرف کے دو آدمی اس زمانے میں تھے۔ دوسرے کا تخلص امیر اور نام امین الدولہ معین الملک ناصر جنگ بہادر تھا یہ شجاع الدولہ کے بیٹے تھے ان کے حالات کے لئے دیکھئے تاریخ اودھ نجم الغنی جلد دوم ص۳۰۵ قیام دہلی کے لئے مجموعۂ نغز جلد اول ص۱۷ (مجموعۂ نغز جلد اول ص۲۹۲، تذکرۂ ہندی ص۱۱۸ مصحفی چار سال اس کے ملازم رہے تھے [۶] تاریخ اودھ۔ نجم الغنی جلد چہارم ص۱۴۵ [۷] ایضاً جلد سوم ص۱۳۴)

میں یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ یہ دونوں عرف مذکورہ بالا لڑکوں کے ہیں یا ان سے جدا اشخاص کے ہیں۔ سالار جنگ کی ایک بیٹی دولت النسا بیگم تھی جو مختار الدولہ کے بیٹے اقبال الدولہ سے مختار الدولہ کی حیات میں منسوب ہوئی اور اس کی وفات کے بعد (وفات مختار الدولہ) بیاہی گئی۔[۱۲] سالار جنگ شجاع الدولہ کے تقریباً ہم عمر تھے۔[۱۳] شجاع الدولہ کی شادی چودہ برس کی عمر میں ہوئی اور آصف الدولہ (ب ۱۱۶۱ھ) سترہ سال کی عمر میں ان کے ہاں پیدا ہوئے۔ اندازاً نوازش علی آصف الدولہ کے ہم عمر ہوں گے۔ قاسم علی خاں نے ۴۵ برس کی عمر میں وفات پائی "۱۱۸۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔"[۱۴]

میر حسن نوازش علی خاں کے مصاحب تھے۔ نوازش علی خاں کا پورا نام مولوی کریم الدین نے نوازش علی صفدر جنگ دیا ہے۔ کریم الدین نے دتاسی کی تاریخ میں کمپوزیٹر کی غلطی سے دھوکا کھایا ہے۔[۱۵] بعض ادیبوں نے سرفراز جنگ بھی لکھا ہے یہ بھی صحیح نہیں۔ وہ سردار جنگ کہلاتے تھے۔ چنانچہ تذکرۂ شعرائے اردو اور دیباچۂ دیوان کے علاوہ میر حسن نے مندرجہ ذیل مواقع پر بھی انہیں اسی طرح یاد کیا ہے:

در تعریف بسنت

بہار اب کے زور ہی (کذا) مزا لائی ہے عجب یہ شگوفہ نیا لائی ہے

ٹک اک دیکھیو اسکو سردار جنگ کہ یہ رنگ کیا کیا نیا لائی ہے

---

[۱۳] ایضاً جلد سوم ص ۱۲۱ [۱۴] شجاع الدولہ از ڈاکٹر سری واستوا جلد اول ص ۵ [۱۵] معاصر ۱ ص ۱۵۹ [۱۵] دتاسی کی تاریخ ادب ہندی و ہندوستانی جلد اول ص ۵۲۹ جہاں R کی جگہ F چھپ گیا ہے)

ترے واسطے دستہ دستہ لبنت ہتھیلی پہ سرسوں جما لائی ہے [1]

در مدح نوازش علی خاں

ہر ذرہ ترے در کا ہے ہم چشمِ آفتاب ازبسکہ تجھ پہ (آنکھ) علیؑ ولی کی ہے

کیوں کر نہ ہو جہان میں مشہور تیرا نام سردار جنگ تجھ (پہ) نوازش علی کی ہے [2]

فرقہ :۔ سالار جنگ کا خاندان شیعہ تھا۔ حسنؔ نے بھی اپنے کلام میں جابجا شیعہ عقاید کا اظہار کیا ہے :۔

وہ ہیں جو یا حسین انہیں کا غلام رہ دل کو نہ اپنے معتقدِ بایزید کر [3]

بعد از نبی امام علی پیشوا علی مختارِ کل خدائیؑ پہ نامِ خدا علی

بیت خدا و قوتِ بازوئے مصطفیٰ زوجِ بتول ابنِ عمِ مصطفیٰ علی

احکامِ حق علی ہی سے جاری ہے ہر طرف حاکم ہے حکمِ حق سے غرض جابجا علی

بھاتا ہے دل سے مصرعِ واقف مجھے حسنؔ داتا مرا کریم مرا مرتضیٰ علی [4]

رسولِ پاک کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں :۔

برحق ہے بعد اسکے وصی اسکا مرتضیٰ حق کو نہ مانے جو کوئی ہے وہ حرام کا

شیرِ خدا کا جس کا تولد ہوا ہے واں واجب ہے سجدہ اس لئے بیت الحرام کا

میں دوستدارِ پنجتن و اہل بیت ہوں بندہ ہوں جاں نثار ہوں بارہ امام کا [5]

مثنوی سحر البیان کی ابتدا میں حمد اور نعت کے بعد حضرت علی کی منقبت میں انہیں اشعار لکھے ہیں اور پنجتن کی توضیح یوں کی ہے :۔

---

[1] قلمی نسخہ مملوکہ عبد العلیم شیر کوٹی ورق ۹ ۴ ب [2] الیفاً ورق ۵۰ و [3] دیوان غزلیات غیر مطبوعہ ص ۹ [4] کلیاتِ حسنؔ مملوکہ عبد العلیم شیر کوٹی ورق ۳۳ و)

[5] غزلیات۔ نولکشور ص ۳ (کلیاتِ حسنؔ مملوکہ عبد العلیم شیر کوٹی ورق ۲ ب)

نبی و علی فاطمہ اور حسن ــــ حسین ابن حیدر یہ ہیں پنجتن [۱]

اس طرح مثنوی گلزارِ ارم کی ابتدا میں منقبت ہے :۔

علی اسکا وصی شیرِ دلاور ــــ اکھاڑا جس نے اک حملے میں خیبر ....

نبی کی آل کا جو ہو رہے ہے ــــ خدا بندہ اسے اپنا کہے ہے [۲]

رموز العارفین میں ہے :۔

وہ جو پیرو اسکے ہیں اور دوستدار ــــ چار یار و چار یار و چار یار

ان کا ہیں مداح ہوں گے یا ذوالجلال ــــ پنجتن کے فضل سے کر دے نہال [۳]

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں :۔

اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو میر حسن شیعہ نہیں تھے یا اپنے عقیدے میں شدید نہ تھے ۔ ایک غزل میں اسی قسم کے اشعار ملتے ہیں :

اصحاب پاک اسکے بظاہر ہیں گو جدا ــــ باطن میں پر ہے ایک ہی مظہر کریم کا

صدیق نادل اہل حیا مرتضیٰ علی ــــ چاروں سے مقصد ایک ہے طبع فہیم کا ارحم [۵]

محمود فاروقی کہتے ہیں :

یہ غلط فہمی اس شعر سے پیدا ہوئی ہے :

وہ جو پیرو اسکے ہیں اور دوستدار ــــ چار یار و چار یار و چار یار

دراصل میر حسن نے چار یار و چار یار و چار یار سے بارہ اماموں کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے ان کے عقیدت کی شدت میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوتی ۔ [۶]

---

[۱] مثنویات مرتبہ آسی) [۲] ایضاً ص ۱۳۹) [۳] ان کا ہوں مداح ہیں یا ذوالجلال (مائکروفلم) [۴] ایضاً ص ۱۶۵ [۵] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۱۰۳ [۶] میر حسن اور انکے خاندان کے شعراء ص ۷۷)

اس تمام بحث کے باوجود یہ ظاہر ہے کہ رموز العارفین کی تصنیف کے وقت ان کا جھکاؤ مولانا روم کی طرف زیادہ رہا ہے۔ نیز انہوں نے میر درد جیسے بزرگوں کی صحبت سے فائدہ اٹھایا جو سُنی تھے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ حسن اپنے عقاید میں غالی نہیں تھے۔ حضرت علی اور امام حسین کے منقبت کلیات میں موجود ہیں۔ نوحہ کا ایک نمونہ انشا کی دریائے لطافت میں دیکھیے :-

تم تو سر دینے رن میں سدھارے فاطمہ کے پیارے حسینا
آج آفت ہے گھر میں تمہارے فاطمہ کے پیارے حسینا [1]

کیفی کے ترجمۂ دریائے لطافت سے یہ شعر خارج ہے اس پر قاضی عبدالودود صاحب نے اعتراض کیا تھا۔ [2] قاضی صاحب اسے مرثیہ کا شعر قرار دیتے ہیں جو درست نہیں یہ نوحے کا ٹکڑا ہے۔ میر حسن مرثیہ نگاری کا شوق بھی رکھتے تھے مگر اس کا کوئی نمونہ ہم تک نہیں پہونچا۔ کہتے ہیں :-

اکثر بفرمائشِ نواب معلی القاب (سالار جنگ) مرثیۂ امام علیہ السلام نیز بہ گفتن می آید۔ ازاں کہ طبع عالیٔ آں بزرگوار در ہمہ فن بلند افتادہ است علی الخصوص در علمِ موسیقی کہ از حصر و بیان بیرون است۔ سوز ہائے مرثیہ طرح می نماید و این حسنہ برائے آخرت است۔ اجرہٗ الی اللہ۔ و سردار جنگ نیز ہمیں طور درین فن ذہنِ رسا و گوش شنوا دارند [3]

سالار جنگی خاندان اس شوق کے سلسلے میں مشہور ہے چنانچہ "نواب قاسم علی خاں نغمہ و سرود اور مرثیہ خوانی میں داؤدِ ثانی تھے۔" [4]

---

[1] نسخۂ انجمن ترقی اردو طبع ۱۹۱۶ء ص ۲۱۲ [2] معیار مارچ ۱۹۳۶ء ص ۸۲
[3] تذکرۂ شعرائے اردو ص ۵۷ [4] قدیم ہنر و ہنر دانِ اودھ ص ۸۵)

آتش :۔ اسی زمانے میں حسن کے مکان کو ایک بار آگ لگ گئی جس میں ان کا شعری اثاثہ ضائع ہو گیا۔ چنانچہ دیوانِ حسن کے دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

دمن شعرہائے آبدار کہ بہ ہزار جانکنی جمع نمودہ ام۔ آتشے کہ بہ کلبۂ فقیر افتاد سراپا سوختہ مگر بر زبانِ محبان کہ باقی بود ازاں بارِ دیگر گرد آوردہ پس آنچہ آنچہ طبع زادہ (زادہ طبع را) معروف نمودہ توقع از صاحبانِ معنی دارم کہ ہرگاہ بر نسبتے (کذا) معانی و الفاظ نگاہ کنند از بلندیٔ حوصلۂ خود قلم رد (برآں ؟) بکشند۔ اگر توفیق باشد (در) اصلاحِ آں کوشند کہ در منزلت (منزلت ؟) دین سعی ہا نمودہ اند و سخن نہ کردہ اِلّا باللّٰہِ (علیہ) توکل و اللہ (الیہ) مآب۔ [1]

تذکرۂ شعرائے اردو میں لکھتے ہیں :۔

غزلے گفتہ بودم کہ در سہ بحر خواندہ می شد آتش کہ بہ خانہ افتاد سوختہ شد۔ چناں چہ یک مطلع قلمی نماید [2]

کلیاتِ میر حسن میں فردیات کے اوپر یہ نوٹ درج ہے کہ جو غزلیں گھر کو آگ لگنے سے ضائع ہو گئیں ان کے بعض شعر جو یاد رہے درج کئے جا رہے ہیں (حسن کا اصل فقرہ اس مقالے میں کہیں اور درج کیا جا چکا ہے)

فیض آباد میں دریا کے کنارے ایک آگ لگی تھی جس پر لچھمی نرائن منشی جواہر علی خاں کے رقعات میں ص ۳۹ پر ایک نثر پارہ پایا جاتا ہے۔ آگ سے محمد عطا خاں کے مکانات جل گئے تھے اور کشتیاں بھی نذرِ آتش ہوئی تھیں۔ تاریخِ اودھ میں بھی ایک

---

[1] مائی کروفلم برٹش میوزیم ص ۲۳۴، ۲۳۵

[2] (ص ۵۹)

آگ کا ذکر ہے ثابت خانیوں کے ہنگامے میں ہمت بہادر اور امراؤ گیر گوسائیں نے ثابت خانیوں کے چھپر دں کو آگ لگا دی تھی۔[1] یہ ہنگامہ غالباً ۱۱۸۴ھ کے قریب پیش آیا۔ حسن کے گھر کا محلِ وقوع اور آگ کی تفصیل موجود نہیں۔ موجودہ مواد کی بنا پر قطعی طور پر کوئی رائے دینا ممکن نہیں۔

دوسرے فنون :- حسن کے والد موسیقی کا بڑا ذوق رکھتے تھے حسن ان کے بارے میں لکھتے ہیں" در فہمیدِ علم موسیقی گوش شنوا" حسن کے علم مجلس میں بے بدل ہونے کا تذکرہ افسوس نے دیباچۂ سحر البیان میں کیا۔ موسیقی یا کسی اور خصوصیت کا ذکر نہیں کیا۔ یہی حال مصحفی کا ہے۔ دورِ حاضر کے نقادوں میں ڈاکٹر ابواللیث حسن کی موسیقی دانی کے مقر ہیں۔ غزلیات اور مثنوی سحر البیان اور گلزار ارم میں بعض اصطلاحات اور بعض سازوں کے نام بھی آتے ہیں مثلاً :-

آج مطرب پسر گلے میں ترے ۔۔۔ اور ہی ڈھب کی تان پڑتی ہے[2]

ہر چند صدا ایک ہے پر ساتھ دوئی کے ۔۔۔ جو زیر میں آواز ہے سو بم میں نہیں ہے[3]

ان اشعار سے موسیقی کے علم سے واقفیت معلوم ہوتی ہے لیکن سحر البیان میں جن سازوں کے نام لئے گئے ہیں آجکل میں ۱۹۵۸ء میں ایک خاتون کا مقالہ شائع ہوا تھا جس میں دعوے کیا گیا تھا کہ حسن موسیقی کے سازوں کی ساخت سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔

کھیلوں میں چوپڑ[5] گنجفہ (غزلیات نولکشور پریس ص ۲۹، ۱۱۴) شطرنج

---

[1] تاریخِ اودھ نجم الغنی جلد دوم ص ۱۶۹، [2] مارشح ۱۷۷۰ء (شجاع الدولہ جلد دوم ص ۱۳۱) [3] دیوانِ حسن۔ نولکشور پریس ص ۱۳۶ (دیوان غزلیات غیر مطبوعہ ص ۱۴۶)
[4] دیوانِ غزلیات غیر مطبوعہ ص ۱۰، ۶۰ - دیوان غزلیات نولکشور ص ۳۲)
[5] (ایضاً ص ۷۴، ۱۳۵)

۔۔۔چوسر (غزلیات ۔علی حسن ص ۶۰) اور کیجبتین کا تذکرہ (ص ۱۰۱) بھی کلام میں موجود ہے ۔مرزا علی حسن ان کی خوش نویسی کی تعریف کرتے ہیں دانہوں نے یہ بیان اغلب ہے کہ سکسینہ کی تاریخ ادب اردو سے لیا ہے ۔ اردو ترجمہ ص ۱۰۸ "میر حسن اپنے زمانہ کے نامی گرامی شاعر جیّد عالم اور مشہور خوش نویس تھے" اسی طرح باقر بھی تاریخ نظم و نثر اردو میں رقمطراز ہیں : میر حسن اپنے زمانے کے مشہور فاضل اور خوش نویس تھے ص ۱۶۳) لیکن کوئی معاصر بیان نہیں ہے اس لئے ہم اس پر کوئی رائے دینے سے قاصر ہیں ۔ لہ

دیوان :۔ میر حسن تالیف تذکرہ کے وقت تک اپنے حال میں لکھتے ہیں :

فقیر دریں مدت قریب ہفت ہشت ہزار بیت گفتہ باشد دیک ترکیب بند دیک رموز العارفین گفتہ است کہ مقبول دل ہا گردیدہ مشہور است و دو سہ بند او اواخر قلمی خواہد شد ۔۔۔ (۱۱۹) کریفلم برٹش میوزیم)

تذکرے کی تکمیل (جیسا کہ تصنیفات کے ضمن میں ہم بتائیں گے) ۱۱۸۹ھ میں ہو چکی تھی دیوانِ غزلیات کے شروع میں ایک دیباچہ بھی ہے (جس کے اقتباسات سے ہم نے جا بجا فائدہ اٹھایا ہے) اس دیوانِ غزلیات کا نصف حصہ نولکشور پریس سے شائع ہو چکا ہے ۔ کچھ غزلیں مرزا علی حسن نے لکھنؤ سے شائع کیں باقی ہنوز غیر مطبوعہ ہے (تصنیفات کے ذیل میں دیکھئے) شیر علی خاں سرخوش کا خیال ہے کہ میر حسن نے دیوان ۱۱۹۲ھ میں بمقام فیض آباد مرتب کیا ۔ لہ

لہ اگر شیرانی صاحب کے مخطوطے کو حسن کی اپنی تحریر مانا جائے تو پھر انہیں خوش نویس تسلیم کرنا درست نہ ہوگا ۔

لہ تذکرہ اعجاز سخن ص ۱۶۴)

لیکن قطعیت سے سنہ کا ذکر کسی قدیم تذکرے میں نہیں دیکھا گیا۔ شپرنگر نے دیوان حسن کے ایک نسخے کا ذکر کیا ہے جس کے آخر میں ۲۵ ذوالحجہ ۱۱۹۲ھ درج ہے (فہرست ص ۶۰۹) اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیوانِ حسن ۱۱۹۲ھ سے قبل مرتب ہو چکا تھا۔

رموز العارفین: حسن نے ۱۱۸۸ھ میں لکھی۔ ابتدائے مثنوی میں لکھتے ہیں

عارفوں کی بسکہ رمزیں ہیں لکھیں	نام اس کا ہے "رموز العارفین"
جب بھرا دُرِّ معانی سے طشت	تھے ہزار و یک صد و ہشتاد و ہشت
تھا مہینہ نیک اور سالِ سعید	جب ہوئی تحریر بہ گفت و شنید [۲]

مثنوی کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا یہ خیال کہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے[۳] درست نہیں [۴]

وفاتِ شجاع الدولہ: شجاع الدولہ کی وفات (۲۳/۲۴ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ) میر حسن نے چند رباعیاں بھی کہیں مثلاً

جس روز کہ تو جہانِ فانی سے گیا	دل سب کا نشاط و کامرانی سے گیا
کیا ذلیت کا لطف اے شجاع الدولہ	تجھ بن تو مزا ہی زندگانی سے گیا

٭

جس روز کہ تو خاک میں سویا ہوگا	رو رو کے نہ کس نے جی کو کھویا ہوگا
ماتم (میں) تری آہ شجاع الدولہ	وہ کون بشر ہے جو نہ رویا ہوگا

---

[۱] مائی کروفلم برٹش میوزیم [۲] (مثنویات مرتبہ آسی)

[۳] (ادبی دنیا۔ اشاعتِ خاص ۱۹۵۱ء ص ۹۰ بعنوان میر حسن کی شاعری)

[۴] (تفصیل تصنیفات کے ذیل میں)

دینے تو دیا فلک نے صدمہ یہ حسن | پر ابر کے رونے سے یہی تھا روشن
یہ دیکھ کے ماتم شجاع الدولہ | اوس نے بھی لیا تھا اپنے موہنہ پر دامن [1]

*

اس موقع پر نئے فرمانروا کو بھی دعا دی ہے :-

اس غم کو کہاں تلک لکھے گا تو حسن | ظاہر ہے جو کچھ ہوا ہے یہ رنج و محن
اب مانگ دعا تو آصف الدولہ کی | یہ اوس کا چراغ ہے رہے نت روشن [2]

*

تذکرہ :- تذکرۂ شعرائے اردو غالباً ۱۱۸۴ھ میں شروع کیا اور اسے ۱۱۸۹ھ تک مکمل کر لیا۔ [3] ۱۱۹۱ھ میں ترقیمہ لگایا جس کا ضروری اقتباس یہ ہے :-

الحمد للّٰہ والمنۃ کہ ایں تذکرہ من تالیفِ فقیر، پروردۂ آغوشِ رنج و محن، میرِ حسن در تاریخِ یک ہزار و یک صد و نود و یک ہجری بہ اتمام رسید [4]

(لیکن تذکرے میں بعد تک اضافے بھی ہوتے رہے ہیں جس کا مفصل ذکر آگے آئے گا)

دوسرا عشق :- انہوں نے فیض آباد میں عشق بھی کیا :-

نہیں بتوں سے یہ جو کافر ہیں اس اودھ کے | کعبہ سمجھ کے میرے اس دل کے گھر کو ڈھایا [5]

---

[1] ورق ۳۴ ب و ۴۴ ب نسخہ مملوکہ عبدالعلیم شیر کوٹی) [2] (ایضاً ورق ۴۴ ا) [3] تفصیل تفتیشات کے ذیل میں) [4] (تذکرۂ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۲۰۸) [5] دیوانِ حسن نولکشور ص ۱)

گلزارِ ارم میں ہے:

یہ فیض آباد یہاں جس نے بسایا | بہشت اسکے[1] عوض دیجو خدایا
جہاں جس سے ہوا آباد و معمور | شجاع الدولہؒ مرحوم و مغفور
یہ دیکھی سیر میں نے وہاں کی جبکہ | وطن کا دل سے سب جاتا رہا غم
رہا القصہ میں وہاں[2] گھر بنا کر | اُسی عشرت کدے کے پاس جاکر
وہاں بھی میں نے اک محبوب پایا | نہایت دل کو وہ مرغوب پایا
کہوں کیا اس کے اوصافِ حمیدہ | نہایت دلفریب اور شوخ دیدہ
نئی طرزوں سے میرے دل کو پھیرا | بھلایا غم قدیمی اس نے میرا
غرض دل دے کے اپنا ہاتھ اسکے | رہا آرام سے میں ساتھ اسکے
نہ تھی معلوم مجھ کو یہ جدائی | قضا پھر لکھنؤ میں مجھ کو لائی[3]

(۳)

لکھنؤ:- اس کا قیام لکھنؤ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ثابت ہے:

(۱) حیران۔ الحال در لکھنؤ استقامت دارد ..... با فقیر بسیار دوستی دارد[4]

(۲) قدرت۔ بندہ وے را یک بار در مشاعرہ بہ لکھنؤ دیدہ ام[5]

(۳) قانع۔ از مدتے در لکھنؤ استقامت دارد۔ روزے بخدمت میرزا رفیع سودا سلمہ اللہ

---

[1] آسی کی مثنویات میں "اسکی" ہیں نے مخزن ایڈیشن کو ترجیح دی ہے [2] وہاں میں (مخزن ایڈیشن میں) [3] مثنویاتِ حسن۔ آسی ص ۱۶۱ [4] تذکرہ حسن ص ۵ [5] ایضاً ص ۱۳۳

آمدہ بود فقیر ہم دراں جا نشستہ بود [1]

۴۔ حسن۔ بقیہ عمر در فیض آباد و لکھنؤ گذرانیدہ در سرکارِ سالار جنگ .... ممتاز بودہ [2]

۵۔ ایں نفر (مصحفی) .... فراغت حاصل کردہ مہم تالیفِ تذکرۂ ہندی در پیش آمد .... دماغِ آں نہ بود اما بہ تکلیف میر مستحسن خلیق خلفِ میر حسن کہ باشارۂ پدرِ بزرگوارِ خود کلام خود را نظرِ فقیر می گذرانید .... (بندہ) طوعاً و کرہاً قدم دریں بادیۂ پُرخار گذاشت [3]

۶۔ مثنوی گلزارِ ارم (۱۱۹۲ھ) کے خاتمے سے قیامِ لکھنؤ ثابت ہے

۷۔ حسن نے صاحبِ گلزارِ ابراہیم کو اپنے حالات لکھنؤ سے خود بھیجے تھے (غالباً ۱۱۹۶ھ میں) گلزارِ ابراہیم ص ۱۱۸ (ملخص) حسن نے انہیں لکھا "در تنبیت از دہلی وارد لکھنؤ گشتہ بہ نواب سالار جنگ دخلفِ ایشاں .... می گذرانم"

۸۔ لکھنؤ میں وفات پائی [4]

۹۔ جواہر علی خاں (فیض آباد) کی تعریف میں مثنوی لکھی ہے جس کا ابتدائی شعر ہے

فلک کی یہ تھا کچھ روش سے بعید   کہ دو سال ہو مجھ کو بنگلے میں عید [5]

---

[1] ایضاً ص ۱۳۶ [2] تذکرۂ ہندی ص ۴۸ [3] تذکرۂ ہندی ص ۳
[4] دیباچۂ شیر علی افسوس ص ۱۹
[5] مطبوعہ معیار مئی ۱۹۳۶ء ص ۱۴۴

۱۰۔ ایک غزل کا مقطع ہے

گیا تھا بھول سب کچھ میں تو بنگلے کی جدائی میں
غزل مجھ سے یہ کہوائی حسن سودا نے کہہ کہہ کر [۱]

دورِ حاضر کے محققوں نے قیام کے بارے میں مختلف آرا پیش کی ہیں:

(۱) بارہ سال کے سن میں والد کے ساتھ فیض آباد آئے۔ کچھ دنوں بعد لکھنؤ منتقل ہو آئے۔ یہیں ساری عمر گذار دی [۲]

(۲) ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی (دہلی کا دبستانِ شاعری) کہتے ہیں:
بارہ برس کی عمر میں فیض آباد آئے.... کچھ مدت بعد بعہدِ آصف الدولہ لکھنؤ میں آ گئے۔

(۳) جب نواب آصف الدولہ نے حکومت کا مستقر بجائے فیض آباد سے لکھنؤ گیا تو کچھ عرصہ کے بعد ان کو مجبوراً کہیں رہنا پڑا [۳]

(۴) ۱۷۷۵ء (۱۱۸۹ھ؟) میں نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا تو یہ بھی فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے۔ اور یہیں کچھ دنوں کے قیام کے بعد.... انتقال کیا [۴]

(۵) آخری عمر میں میر حسن کا عموماً قیام لکھنؤ میں رہتا تھا.... [۵] نواب آصف الدولہ کے عہد میں میر حسن کا آنا جانا لکھنؤ میں شروع ہو گیا تھا بلکہ آخری عمر میں تو عموماً قیام بھی یہیں رہتا تھا۔ چنانچہ لکھنؤ کی سرزمین ہی ان کا مدفن بنی [۶]

---

[۱] دیوان حسن۔ علی حسن ص۹ [۲] اردو ادب کی تاریخ۔ انیم قریشی ص۷۹
[۳] غزلیاتِ حسن۔ مرزا علی حسن ص۱۴ دیباچہ [۴] مثنویات آسی دیباچہ ص۳ [۵] میر حسن اور انکے خاندان کے شعرا۔ محمود فاروقی ص۱۴ [۶] ایضاً ص۸۴

(۶) سالار جنگ کے نوکر ہو گئے پھر لکھنؤ گئے [1]

(۷) دہلی چھوڑ آنے کے بعد میر حسن فیض آباد اور بعد ازاں لکھنؤ میں جا کر مقیم ہوئے [2]

(۸) احسن واقعاتِ انیس میں لکھتے ہیں:

آصف الدولہ نے جب لکھنؤ کو مستقل دار الریاست قرار دیا تو ضاحک اور میر حسن کی آمد و رفت تعلقاتِ شاہی کی وجہ سے لکھنؤ میں جاری ہوئی مگر مستقر فیض آباد ہی کو سمجھنا چاہیئے [3]

(۹) مولانا صلاح الدین (ادب لطیف اکتوبر ۱۹۵۱ء بعنوان میر حسن) لکھتے ہیں

جب نواب آصف الدولہ تخت نشین ہوئے اور انہوں نے لکھنؤ کو اپنا دار السلطنت قرار دیا۔ تو یہ (حسن) بھی یہیں آن بسے اور آخر دم تک یہیں رہے [4]

سالار جنگ مربیِ حسن نے کب فیض آباد کو ترک کر کے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی؟ تاریخ اودھ (نجم الغنی) میں لکھا ہے کہ شجاع الدولہ کی وفات (۲۳ یا ۲۴ ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ) کے وقت سالار جنگ جنازے کے ساتھ تھے [5] ۲۵ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ کو مختار الدولہ سید مرتضیٰ خاں کو خلعت نیابت ملا۔ [6]

[1] حیاتِ انیس۔ اثیری ص۱ [2] ایضاً۔ بیانِ حسرت موہانی ص۱۳ [3] واقعاتِ انیس ص۲۳ [4] ص۵ [5] جلد سوم ص۹ [6] ایضاً ص۱۵ لیکن منشی فیض بخش کا بیان ہے سات دن کے بعد آٹھویں دن آصف نے دربار کیا۔ اور مرتضےٰ خاں کو نائب بنایا (تاریخ فرخ بخش ص۱۳)

آصف الدولہ کی ماں اور دادی کے دخل سے ناراض ہو کر مختار الدولہ نے نواب کو مشورہ دیا کہ مہدی گھاٹ چلیں [1] ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۸۸ھ کو مہدی گھاٹ روانہ ہوئے [2] اور اب آصف الدولہ نے ماں سے مزید روپے کا تقاضا کیا [3] اور سالار جنگ کے توسط سے گفت و شنید ہوئی [4] چنانچہ ۴ لاکھ روپیہ بھیجا گیا [5] یہ روپیہ ایک ماہ میں خرچ ہو گیا دسویں محرم کے بعد مرتضیٰ خاں فیض آباد بھیجا گیا [6] اور مرزا علی کی وساطت سے سلسلہ جنبانی ہوئی [7] ۴ لاکھ روپیہ دیا گیا۔ جو قرض تھا اس کے لئے باقاعدہ "سند" لکھائی گئی [8] چار پانچ مہینے گھاٹ پر گذارے گئے [9] جب گرمیوں کا زمانہ ختم ہو گیا اور بارشوں کا موسم آیا تو مہدی گھاٹ سے لکھنؤ کی طرف کوچ ہوا [10] قیام کے دوران میں آصف الدولہ کے ماموں سالار جنگ اور دوسرے سردارانِ قدیم اس وقت لشکر میں موجود تھے [11]

محمد احد علی صاحب (۱۹۱۲ء) لکھتے ہیں :-

"بہ اختلافِ روایات ۱۷۷۹ء یا ۱۷۸۰ء میں امارت کے سارے کارخانے لکھنؤ میں آگئے۔ فیض آباد سونا ہو گیا اور لکھنؤ کی آبادی کی بنیاد پڑی" [12]

---

[1] ایضاً ص۲۹ [2] ص۳۰ [3] ص۳۱ [4] تاریخِ فرح بخش ص۲ جلد دوم [5] ایضاً [6] ایضاً [7] سالار جنگ لشکر میں اور نواب مرزا علی خاں فیض آباد میں موجود تھے (تاریخ اودھ جلد سوم ص۱۵) [8] ایضاً ص۲۱ [9] ایضاً ص۲۲ [10] ایضاً ص۲۴ [11] تاریخ اودھ نجم الغنی جلد سوم ص۲۳۹، ۲۴۰ [12] شباب لکھنؤ ص۱۸

معاصر مورخ صاحب تاریخ فرح بخش [1] کا بیان ہے

THE INFLUENCE OF MU'AZIZ KHAN, MIR MOHARRAM KHAN, SALAM ULLAH KHAN AND MIRZAJANI AND OTHERS KNEW NO BOUNDS---- ALTHOUGH NAWAB SALAR JANG, ASAFUD-DAULA'S MATERNAL UNCLE, AND OTHER NOBLES AND COURTIERS OF LONG STANDING, WERE STILL IN THE CAMP AND WERE PERPLEXED TO THINK WHAT ALL THIS WOULD LEAD TO, NONE OF THEM MADE ANY MOVE..... HAD SALAR JANG, WHO WAS IN THE CAMP, AND MIRZA ALI KHAN, WHO WAS IN FAIZABAD, RAISED THE SLIGHTEST ALARM AND SET THEMSELVES TO MANAGE THE PROVINCE AND THE ARMY, IN CONJUNCTION WITH THE OFFICERS OF THE CAMP, THERE WOULD HAVE BEEN NO SUCH ANARCHY AND RUIN, BUT OWING TO THEIR PERSONAL COWARDICE AND PROFLIGATE PURSUITS, THEY WERE SO DEMORALIZED THAT ALL THEY COULD DO WAS TO GIVE THEIR DAUGHTERS IN MARRIAGE TO MUKHTAR UD DAULA'S SONS.

[1] صـ ۲۳، ۲۸

جو اُمرا فیض آباد میں رہ گئے :۔ فیض آباد چھوڑنے کے بعد آصف الدولہ نے چند دستے فیض آباد کی حفاظت کے لئے چھوڑے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ شہر کی تمام دولت اور شان و شوکت لکھنؤ میں منتقل ہوتی چلی گئی۔ چھاونیاں۔ کارخانے۔ ہاتھی۔ چھکڑے حکومت کے کارندے۔ افواج شاگرد پیشہ سب اہل و عیال اور مال اسباب سمیت چلے گئے تھے یوں فیض آباد کی بربادی کا آغاز ہو گیا[1] لکھنؤ میں پہنچ کر جان برسٹو مختار الدولہ، بسنت علی خاں اور نواب سالار جنگ فیض آباد بھیجے گئے۔ تاکہ بیگمات سے مزید روپیہ لائیں[2] چنانچہ لاکھ روپے نقد دیئے گئے، باقی ۳۶ لاکھ کی اشیاء ملیں[3] آخر شعبان ۱۱۸۹ھ کو آصف الدولہ مع لاؤ لشکر لکھنؤ سے مہدی گھاٹ اور دریا عبور کر کے اماوہ روانہ ہوئے[4] جہاں مختار الدولہ کے قتل کی سازش ہوئی اور وہ ۶ صفر[5] ۱۱۸۹ھ کو قتل ہو گئے اور آصف الدولہ کا مستقل قیام لکھنؤ میں ہو گیا۔

آرائش محفل[6] میں لکھنؤ کی آبادی کی جو صورت آصف الدولہ نے کی اس کی پوری تصویر دی گئی ہے۔ اگلے سات سال آصف الدولہ اور بہو بیگم (والدۂ آصف) کے درمیان انتہائی کشیدگی کے ہیں[7] ان کو الٹ سے سالار جنگ کا لکھنؤ کو لشکر کے ساتھ روانہ ہو جانا ثابت ہے۔ جو لوگ فیض آباد میں رہ گئے ان کی تفصیل منشی فیض بخش نے تاریخِ فرح بخش میں دی ہے :۔

---

[1] ایضاً ص ۲۵ تاریخِ اودھ جلد سوم ص ۵۲ [2] تاریخ فرح بخش ص ۲۵
[3] ایضاً ص ۲۵ [4] تاریخ اودھ جلد سوم ص ۶۱ [5] تاریخِ اودھ جلد سوم ص ۱۰۳ ۲۷ محرم ۱۱۸۹ھ دیا ہے۔ میں نے معاصر بیان کو ترجیح دی ہے۔
[6] شیر علی افسوس ص ۱۲۰، ۱۲۱ تا ۱۲۵ [7] فرح بخش ص ۲۹

(۱) نواب صدر النسا بیگم (والدۂ شجاع الدولہ) مع ۵۰۰ محافظ سپاہی اور کچھ علماء۔ طبیب، امرا اور دلی کے خاندانوں کی اولاد۔ ان کے علاوہ بہت سے خواجہ سرا بھی تھے۔ مثلاً محرم علی خاں ناظر مطبوع علی خاں۔ التفات علی خاں میاں سخن فہم، میاں جاوید بہرہ یاب۔ دانا۔ بختاور۔ تیز ہوش۔ شفقت بیگم پکھراج اور کوئی ایک ہزار آدمی جوان سے وابستہ تھے۔

(۲) جناب عالیہ متعالیہ نواب بہو بیگم (والدۂ آصف الدولہ) ان کے خواجہ سراؤں میں نواب ناظر جواہر علی خاں۔ اس کے ماتحت کوئی ۸ یا ۱۰ ہزار آدمی۔ بہار علی خاں۔ اس کے ماتحت تین ہزار سپاہی (محلات کے منتظم اس کے علاوہ تھے) شکوہ علی خاں ایک کمپنی اس کے ماتحت تھی۔ بسنت علی خاں۔ دس بیس سپاہی اس کے ساتھ تھے ان کے علاوہ خواجہ سرا مثلاً میاں ادراک۔ فراست۔ عقلمند۔ یاقوت خانی۔ عقلمند کپتان میاں خرم۔ نکہت۔ سہیل۔ داراب علی خاں میاں طرب، نجابت۔ خوش دل۔ یاقوت خورشید، سخاوت۔ بشارت روز افزوں زمرد تحلی۔ زمرد دارابی۔ خوش چشم، ذوالفقار میاں دولت۔ عشرت۔ وغیرہ ان کے علاوہ گاڑی بان۔ غلام اور دوسرے ملازم بھی تھے۔

(۳) بنی خانم صاحبہ۔ نجم الدولہ کی بیوی جسے ۵ ہزار روپیہ وظیفہ ملتا تھا۔ اس کا بھی اپنا عملہ تھا۔

(۴) نواب ظفر الدولہ۔ نواب مرزا علی خاں کا بڑا بیٹا۔

(۵) میر حسین علی خاں جو نواب بیگم کا داماد کر کے مشہور تھا۔

(۶) ہنگا بیگم

(۷) باندی بیگم

(۸) امینہ بیگم

(۹) برہان الملک کی بڑی بیگم کی اولاد

(۱۰) نواب محمد قلی خاں شہید کی بیویاں اور بیٹے۔

یہ فہرست تاریخ فرح بخش جلد دوم صفحہ ۶۲ تا ۶۳ سے تیار کی گئی ہے آگے چل کر منشی فیض بخش لکھتے ہیں [1]

BY THE CONTINUED RESIDENCE OF THESE NOBLES, THE SPLANDOUR OF FAIZABAD WAS STILL UNDIMINISHED; ...... THE PEOPLE OF THE CITY, OWING TO THE LARGE DEMAND CREATED BY THESE NUMBERS, IMPORTED ALL KINDS OF GOODS WITH FEELING OF ASSURANCE; AND THEY SOLD THEM AMONG THESE HOUSEHOLDS AND ESTABLISHMENTS AND LIVED PROSPEROUSLY. ALTHOUGH THE SHOPS OF TRADERS AND ARTISANS WERE NOT TO ANY GREAT EXTENT DESERTED, YET THE HOUSES OF THE CAVALRY OFFICERS AND

---

[1] صفحہ ۶۳، ۶۴

THE CANTONMENTS, WHICH FORMED A LARGE PART OF THE CITY, WERE FORSAKEN AND BECAME RUINED. THE LANDHOLDERS ROUND ABOUT, FINDING THE LAND UNOCCUPIED, BROKE IT IN TO FIELDS AND CULTIVATED IT AS BEFORE, AND CULTIVATORS' HOUSES BEGAN TO SPRING UP AMONG THE FIELDS. WERE ANY ANY ONE WHO HAD LEFT THE CITY SHORTLY AFTER SHUJA UD DAULAH'S DEATH, TO RETURN A FEW YEARS LATER, IT WOULD SEEM TO HIM ALMOST A DESERT. THUS THE CITY REMAINED FOR SEVEN YEARS.

میر حسن لکھنؤ میں :- میر حسن لکھنؤ میں بھی سالار جنگ کے متوسلین میں شمار ہوتے تھے [1] اس لئے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ نوازش علی خاں کی مصاحبت کی خاطر حسن بھی ان کے ساتھ ہی فیض آباد سے لکھنؤ نہ آگئے ہوں۔ حسن کے والد کا قیام البتہ فیض آباد ہی میں رہا [2]

---

[1] تذکرہ اردو دیباچہ افسوس (اقتباس دیئے جا چکے ہیں)
[2] گلزار ابراہیم (ترجمۂ ضاحک)

تنخواہ وغیرہ: سالار جنگ کی سرکار سے جو کچھ ملتا تھا۔ اتنا نہ تھا کہ بہ آسانی زندگی کر سکتے۔ اس لئے عزیبت سے زندگی بسر ہوتی رہی۔ اپنے حال میں خود لکھتے ہیں:۔

بارے کم و بیش از قدر دانیٔ نواب ...... سالار جنگ بہادر

...... بہ لبِ نان رسیدہ درخدمتِ میرزا نوازش علی خاں .....

صحبت گزیدم کہ خلفِ ارجمندِ اوست۔ چناں چہ تا حال بہ ہر نوع

گذران می نمائیم [1]

اس میں کم و بیش "اور بہر نوع گزران می نمائیم" کے الفاظ اس عزیبت کی داستان کہہ رہے ہیں۔ گلشنِ ہند کا مولف مرزا علی لطف جو صغر سنِ میں نواب آصف الدولہ کے ملازموں میں مع رسالہ سرفراز تھا [2] حسن کے حال میں کہتا ہے:

نواب سالار جنگ اور خلف ان کے میر نوازش علی خاں سردار جنگ

کی رفاقت میں اوقات انہوں نے ساتھ عزت اور عزیبت کے بسر

کی ہے [3]

دیوان میں بھی یہی نوحہ چلتا ہے۔

جذبے سرد سامانیٔ حسن ہم نے جہاں میں ۔۔۔ افسوس کہ کچھ اور سرانجام نہ پایا [4]

ہو جو قسمت میں پریشانی تو وہ جائے کہاں ۔۔۔ گو خدائی کے ہنر اہلِ ہنر جمع کریں [5]

ہے غنیمت جو اس زمانے میں ۔۔۔ اپنی تنخواہ پائے جاتا ہے

ورنہ بے روزگاریوں کا غم ۔۔۔ ایک عالم کو کھائے جاتا ہے [6]

---

[1] تذکرۂ شعرائے اردو ص ۵۹ [2] ص ۱۱ [3] گلشنِ ہند ص ۱۱۸

[4] غزلیات۔ نولکشور ص ۱۸ [5] غزلیات۔ علی حسن ص ۱۸

[6] غزلیات۔ علی حسن ص ۶۰

محمد وحین :- کلیات میں سالار جنگ اور سردار جنگ کی تعریف میں قصائد و رباعیات ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک غزل مسلسل سالار جنگ کے بیماری سے شفا پانے پر کہی گئی ہے۔ جس کی ابتدا یوں ہے :-

ہر ایک دل کو ہے ایذا تری اذیت سے
ہر ایک جان کو راحت ہے تیری راحت سے

آگے بیماری کا ذکر بھی آتا ہے :-

ہوئی تھی پچھلے دنوں میں جو تجھ کو کسلِ مزاج
پڑا تھا سب کو سروکار درد و محنت سے

اور پھر :

خدا بہ عیش و سلامت رکھے تجھے نواب
کہ اک جہان کو صحت ہے تیری صحت سے
ترا خطاب ہے سالار جنگ فخرِ جہاں
جہاں کو فخر ہوا ہے یہ تیری خدمت سے[1]

اسی بیماری سے صحت یابی پر ان کے ہاں رباعیات بھی ہیں :

چو طبعِ مبارکِ تو صحت ورزید
این سال کسے رسا لیا گشت سعید
گوئیم بتکرار مبارک باشد
امروز برائے دوستاں ست دو عید

✱

عید آمد و شیشہ ہم چو مست آوردم
یعنی دلِ پر عیش کہ مست۔ آوردم
در تہنیتِ عید بہ پیشِ خدمت
گلدستۂ تسلیم بدست آوردم

---

[1] غزلیات۔ علی حسن ص ۵۰

ایں عید کہ با بسنت آمد و مسان — دانی نہ چہ رو گشت چنیں بندہ نواز
چو مطرب ہند با ہزاراں نغمہ — آورد بہار پیشِ تو عیدِ نیاز

★

با مژدۂ عمر و دولت ایں سالِ سعید — از بہرِ خدا و مصطفیٰ بر تو رسید
ایں سالِ ہزار سال آید بر تو — ہر شب چو شبِ برات ہر روز چو عید[1]

★

جب سے کہ خدا نے تجھکو بخشی یہ شفا — ہم کو بھی تو مرضِ مفلسی سے تو چھڑا
اس علتِ فقر کے لئے لے نواب — ٹھنڈا انہیں شربتِ دینار پلا

★

کلیات میں ایک جگہ نوٹ ہے:

پر سخنورانِ شاطر و دانشورانِ ماہر پوشیدہ نماند کہ روزے در مجلسِ نوابِ فلک جناب سالار جنگ بہادر بہ تقریب شادیٔ مرزا قاسم علی خاں دام اقبالہٗ جمیع طوائف اہلِ نشاط جمع بودند، شخصے از یارانِ عاصی نظر علی نامی نیز حاضر بود۔ گفت کہ می تواند کہ طوائفے کہ دریں جا حاضر اند۔ بطورِ ایہام ہر یک را علیحدہ تعریف نماید چوں طبیعت بندہ ہم حاضر بود چند اشعارِ ریختہ یا دگاری (کذا) لعرختہ ظہور بطورِ فردیات آمدہ[2]

کلیاتِ حسن (مملوکہ عبدالعلیم شیرکوٹی) میں مذکورہ بالا فارسی عبارت نہیں ہے

---

[1] ۳۰۴ (قلمی نسخہ مملوکہ عبدالعلیم شیرکوٹی) [2] کلیاتِ میر حسن (مائیکرو فلم)

لیکن یہی فردیاتِ بعنوان " در تعریفِ طوائف بنام ہر یک علیحدہ " دی گئی ہیں اس میں مندرجہ ذیل طوائفوں کے نام ہیں۔

راجہ۔ جیونی۔ جلالو۔ ماہ رتن۔ فیضو۔ نخفی۔ پنّا۔ مصری
نور بخش۔ مانی۔ حمیت۔ دردانہ۔ ادجاگر۔ الٰہی بخش۔
گوجری۔ ناجی۔ نورن۔ فیض بخش۔ دددلی۔ داصلا۔ چودی
دولت آبادی۔ نوراً (کذا) ظہوراً (کذا) دل وجانی۔
(دل جانی ؟) سبزہ۔ چیت لگن۔ کاکو۔ مستم یار۔ اوجاگر۔
(دوبارہ) رکھی۔ نادرا (کذا) کریم بخش۔ برفی۔ مصری۔
(دوبارہ) راجہ (دوبارہ)

مرزا قاسم علی خاں ۵۴ برس کی عمر میں ۱۲۳۶ھ میں فوت ہوئے۔ اس لئے پیدائش بقول قاضی عبدالودود ۱۱۸۰ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔ شادی کے لئے کم از کم عمر ۱۷ برس تو ہونی ہی چاہیئے۔ قیاس چاہتا ہے کہ شادی لکھنؤ میں ہو نیز یہ طوائفیں لکھنؤ میں مقیم ہوں۔ مرزا قتیل اپنے رقعات میں لکھنؤ کی طوائفوں میں سے جگیا۔ امیر بخش۔ بی بی مغلو بی بی گلو کا نام لیتے ہیں[۱] کلیاتِ انشا میں امیر بخش طوائف پر شعر موجود ہیں[۲]

گلزارِ ارم :- ۱۱۹۲ھ میں میر حسن نے مثنوی گلزارِ ارم لکھی۔ اس زمانے کے عام رواج کے مطابق گلزار " ذ " سے لکھا ہے[۳] اور اس میں

---

[۱] مقالۂ راقم ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۲۸ء ص ۱۷ [۲] کلیاتِ انشا ص ۳ [۳] مجموعۂ نغز اور باغِ معانی (اقتباس ترجمۂ سودا معاصر حصہ ۲ ص ۱۱۰

تاریخ تالیف برآمد ہوتی ہے

مدتِ ملازمت :۔ ۱۱۹۶ھ تک میر حسن کی ملازمتِ سالار جنگ نظر آتی ہے، اس کے بعد کے حالات کا پتا نہیں چلتا۔ اسی زمانے میں سالار جنگ کی مالی حالت کچھ خراب ہو گئی تھی، کیونکہ آصف الدولہ نے حیدر بیگ کے ورغلانے پر سالار جنگ کی جاگیر ضبط کر لی۔ لیکن سالار جنگ نے یہ وار بغیر احتجاج برداشت کیا [۱] آصف اس بات پر اس لئے لگ گیا کہ اسے کمپنی کو دینے کے لئے روپے کی ضرورت تھی [۲] اور حیدر بیگ کی سازش کا سبب یہ تھا کہ دو سال قبل سالار جنگ (۱۱۹۴ھ) حیدر بیگ کو انگریزوں کی اجازت سے معزول کر کے خود نائب سلطنت ہونا چاہتے تھے اور اس کا علم حیدر بیگ کو حسن رضا خاں سے ہو گیا تھا [۳] ایسی صورت میں مالی پریشانیوں کا ہونا بعید از قیاس نہیں۔ حسن کے دوسرے ساتھی شیر علی افسوس دیباچہ سحرالبیان میں ۱۱۹۹ھ تک سالار جنگ کی سرکار میں اپنی موجودگی بتاتے ہیں۔ لیکن اندازاً ۱۱۹۴ھ میں افسوس کی مالی حالت بڑی خراب ہو چکی تھی۔ مسرت افزا میں ہے :

میر شیر علی، افسوس۔ افسوس کہ از چندے فلکِ پلنگ فطرت بروباہ بازی اورا در شاخِ گوزنِ افلاس آو یختہ و ناخنِ کینہ جوئی رشتۂ اقتدارش گسیختہ۔ اکنوں در بلدۂ لکھنؤ بسر می برد [۴]

---

[۱] تاریخ فرح بخش جلد دوم ص ۱۲۰ [۲] ایضاً ص ۱۱۵ [۳] ایضاً ص ۸۴، ۸۵
[۴] مسرت افزا ص ۲۴، ۲۵

اس زمانے تک غالباً دامن سالار جنگ سے وابستگی رسمی ہو چکی ہو گی اور معاوضہ یا تنخواہ کبھی کبھار ہی ملتی ہو گی۔ ورنہ اپنے ممدوح کے حینِ حیات میں سحر البیان کا لکھنا اور اسے آصف الدولہ[1] سے بغرضِ معاوضہ منسوب کرنا اور سالار جنگ کا اس میں ذکر تک نہ کرنا عجیب معلوم ہوتا ہے۔

سحر البیان:۔ سحر البیان ۱۱۹۹ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور مصحفی، ماہر اور قتیل نے اس کی تاریخیں کہیں۔ قتیل کے ایک شاگرد سدا سکھ نیاز نے حسن کے اس کارنامے میں اپنے استاد کی اصلاح کا ہاتھ بھی دکھایا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں[2]

میر حسن در تمام عمر خود در مثنوی کہ زیادہ از دو ہزار و پانصد بیت نخواہد بود صرف کرد۔ مرزا قتیل بسیار اصلاح دادہ اند[3]

لیکن اس کی تائید میں اور کوئی معاصر بیان نہیں ملتا۔ یقین ہے کہ محض استاد کی دھاک بٹھانے کے لئے نیاز نے ایسا لکھ دیا ہو[4]

---

[1] اس زمانے میں مشہور تھا۔ جسے نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ

[2] کاروان جلد دوم سال ۱۹۳۴ء ص ۱۶ تا ص ۵۳ مقالہ ڈاکٹر محی الدین زور بعنوان مرزا قتیل اور مثنوی بدرِ منیر[3] زور بحوالہ تنبیہ الجاہلین مصنفہ سدا سکھ نیاز ۱۲۳۶ھ[4] مجموعۂ تحقیقاتِ علمیہ کے حوالے سے سدا سکھ نیاز کا یہی اقتباس سید احمد اللہ قادری نے بھی دیباچۂ رموز العارفین میں دیا ہے اور لکھتے ہیں "میر حسن نے آخری ایام میں مشہور فارسی گو شاعر مرزا قتیل سے بھی مشورۂ سخن کیا تھا۔ اور ان سے اپنے کلام میں کبھی کبھی اصلاح لی خاص کر مثنوی سحر البیان کی نظر ثانی میں قتیل نے زیادہ حصہ لیا (ص ۱۶) آگے چل کر پھر لکھتے ہیں۔ اس مثنوی (سحر البیان) میں اکثر جگہ مرزا قتیل دہلوی نے اصلاح دی۔ اس میں فارسی ترکیبیں محاورے و فقرے جو نظر آتے ہیں، وہ مرزا قتیل کے فیضانِ علم کا نتیجہ ہیں (ص ۱۷)

افسوس کا بیان : افسوس کا بیان ہے :
صلے کا اس کے (سحرالبیان کے) ماجرا یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک
آصف الدولہ (بہادر[1]) مرحوم نے ایک دوشالہ خاص اپنے
اوڑھنے کا دستِ بقچہ میں سے نکلوا کر مصنف کو[2] عنایت کیا۔
رتبہ اس کا البتہ بڑھا پہ دل گھٹ گیا۔ اس لیے کہ مطلب دلی
حاصل نہ ہوا۔ لیکن یہ کھوٹ صرف طالع کی ہے۔ کیونکہ مال کھرا۔
خریدار اتنا بڑا اور سودا خاطرخواہ نہ ہو۔ بلکہ گھاٹا آیا[3]
قدرت اللہ شوق کو کثیر معاوضے کی غلط اطلاع ملی ہے۔ طبقات الشعرا کے
ایک نسخے میں لکھا ہے

مثنوی او کہ تحفۂ بے نظیر و بدرِ منیر گفتہ ومقبولِ عوام و
خواص گردیدہ شہرت کمال وارد و چند ہزار روپیہ صلۂ آں وزیر
الممالک دادہ[4]

لیکن دوسرے قدیم تر نسخے میں مثنوی کا ذکر موجود نہیں ہے مبتلی طبقاتِ سخن
میں لکھتے ہیں[5]

---

[1] مائی کروفلم میں "بہادر" بھی لکھا ہے [2] مائی کروفلم میں "کو" رہ گیا
ہے [3] دیباچۂ افسوس، مثنویاتِ حسن۔ آسی ص ۱۲ [4] اس اقتباس
کیلئے قاضی عبد الودود صاحب کا ممنون ہوں [5] سطور ذیل میں حسن کے
ان اشعار کی طرف اشارہ ہے :

لظر سے توجہ کی دیکھا جدھر — دیا مثلِ نرگس اسے سیم و زر
سخاوت یہ ادنی اسی اک ایس کی ہے — کہ اک دن دو شالے دیے سات سے

ہر گاہ بحضورِ نواب وزیر طرح کردہ گزرانیدُ از صلاتِ گرانمایہ بہرہ ور گردیدُ مگر جائیکہ در مدح نواب از انعام داکرام ہشت (ہفت ؟) صد (دد) شالہ درزدری (؟) طرح ساختہ بندگان حضور چنداں مسرور نشدند بلکہ فرمودند کہ ایں فرو ترین مرتبۂ مدح است [1]

سید احمد اللہ قادری کا بیان ہے کہ جب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو دارالخلافہ بنایا تو "میر حسن بھی بیداریٔ بخت کی امید بھی فیض آباد سے لکھنو آ گئے۔ رفتہ رفتہ بادشاہ تک رسائی بھی ہو گئی۔ اور بادشاہ کو مہربان دیکھ کر مثنوی سحر البیان لکھنی شروع کی ۱۱۹۹ھ میں ختم کر کے اس کو نواب آصف الدولہ بہادر کے ملاحظہ میں پیش کیا [2] اس بیان میں "بیداریٔ بخت کی امید میں" "رفتہ رفتہ رسائی بھی ہو گئی" اور "مہربان دیکھ کر مثنوی لکھنی شروع کی" قادری صاحب کا اضافہ ہیں اور معاصر بیانات اس بارے میں قطعی خاموش ہیں۔ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں سعادت خاں ناصر ۱۲۶۱ھ لکھتے ہیں :۔

"سردار جنگ . . . . کی سرکار میں معزز و محترم رہا۔ بسبب تقاضائے جوانی محل کی ایک عورت سے . . محبت ہوئی . . . . . بہ پاسِ خاطر معشوقہ مثنوی بے نظیر تصنیف کی . . . . . نواب قاسم علی خاں نے مثنوی سنی فرمایا کہ . . . . میں تمہاری طرف سے حضور نواب آصف الدولہ . . . . کے جاؤں گا۔ مصنف نے بخیال اس کے مبادا اور کسی کے نام سے حضور میں پیش ہو مثنوی کے دینے سے انکار کیا بعد چندے میر حسن معہ (کذا) مثنوی اور کسی کی تقریب سے حضور میں پہونچے۔

---

[1] ترجمۂ حسن۔ رد ٹوگراف از نسخۂ برلن [2] دیباچہ رموز العارفین صہ

نواب سابق الذکر کہ افسانۂ رفتہ سے آزردگی رکھتے تھے.... بول اٹھے:

یہ جو کہتے ہیں کہ "اک دن دو شالے دیئے سات سے، حضور نے تو ہزارہا دوشالے آنِ واحد میں بخش دیئے شاعری میں مبالغہ ہو.... یہاں بیان واقع میں کمی ہے۔ نواب نامدار کا اس کے سننے سے (دِل) اچاٹ ہوا۔ یہ فقط کم نصیبی میر موصوف کی تھی کہ ایسے حاتمِ دوراں سے ناکام و محروم رہا" [۱]

سحر البیان میر حسن کا عمر بھر کا سرمایہ ہے اور ۱۱۹۹ھ میں تکمیل کو پہونچا [۲] آصف الدولہ کے مطبخ کی تعریف میں مثنوی (خوانِ نعمت) اور خود اس کی شان میں حسن کا ایک قصیدہ بھی ملتا ہے۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ اسی زمانے کی تالیف ہوں۔ سحرالبیان کے شروع میں حسن مثنوی آصف الدولہ کے سامنے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ملک بارگاہا ملک در گہا	جدا میں جو قدموں سے تیرے رہا
نہ کچھ عقل نے اور نہ تدبیر نے	رکھا مجھ کو محروم تقدیر نے
پر اب عقل نے میرے کھولے ہیں گوش	دیا ہے مدد سے تری مجھکو ہوش [۳]

آفرین علی خاں:۔ آفرین علی خاں کی مدح والے قصیدے میں میر حسن نے اپنی خستہ حالی اور شاعری کی ناقدری کا رونا رویا ہے۔ ممکن ہے یہ قصیدہ بھی اسی خستہ حالی کے دور کی یادگار ہو۔ اس قصیدے میں میر حسن نے آفرین علی خاں کے خطاب بھی درج کئے ہیں:

یعنی کہ آفرین علی خانِ نامدار	مختار الدولہ اس کا خطاب [۱] و دلیر جنگ [۲]

---

[۱] سب رس نومبر دسمبر ۱۹۵۵ء، ص ۹، ۱۰ [۲] مثنوی کے آخر میں قطعہائے تاریخ قتیل و مصحفی و ماہر ملاحظہ ہوں [۳] مثنویات مرتبہ آسی ص ۱۲ [۴] کلیاتِ حسن مائکروفلم

ظاہر ہے کہ اسے مختار الدولہ کا خطاب ملنے کے بعد ہی یہ قصیدہ لکھا گیا ہوگا سنہ ۱۱۹۰ھ تک یہ خطاب آصف الدولہ کے وزیر اول کو حاصل تھا۔ ممکن ہے اس کے بعد آفرین علی خاں کو ملا ہو۔

جواہر علی خاں: ۔ ... نے جواہر علی خاں کے لئے بھی بعض چیزیں لکھیں، جواہر علی خاں جب وقت شجاع الدولہ کے ہاتھ لگا بہت چھوٹا تھا تربیت کے لئے نواب نے اخوند احمد علی کسمنڈوی کو مقرر کیا اُس کا عروج سنہ ۱۱۸۱ھ سے شروع ہوا [۱] جواہر بیگم کی دھتوں کا محافظ بھی تھا اور بعض محلات کا انتظام بھی اسی کے سپرد تھا۔ اس کا اقتدار روز بروز بڑھتا گیا۔ نواب کی مہر اور فوجوں کی تنخواہیں بھی اس کے سپرد ہوئیں جب شجاع الدولہ فوت گیا اور آصف الدولہ لکھنؤ آیا تو جواہر علی خاں بہو بیگم کی ملازمت میں ہی رہ گیا۔ تنخواہیں اور مہر چھن گئے۔ وزیر گنج اور اسمٰعیل گنج کے پرگنے بھی جاتے رہے۔ لے دے کر صرف سلون اور دو مرے مقامات اس کی تحویل میں رہے منشی فیض بخش نے سنہ ۱۱۸۸ھ سے سنہ ۱۲۱۴ھ تک اس کی ملازمت کی تھی اور اپنی کتاب تاریخِ فرح بخش میں اس کے مفصل حالات درج کئے ہیں۔ جواہر علی خاں کی عادات میں عجیب بات یہ تھی کہ جسم کبھی کھلا نہ رکھتا۔ صفائی کا خیال جنون کی حد تک تھا۔ کسی کو مجلس میں پان کھانے یا تھوکنے کی اجازت نہیں تھی۔ رنگین کپڑے بھی نہیں پہنتا تھا۔ نگاہیں ہمیشہ زمین پر لگائے رکھتا۔ رقص و سرود کی محفلوں سے بھی لگاؤ نہ رکھتا تھا۔

---

[۱] جب نصرت علی خواجہ سرا مرا اور جواہر علی خاں اس کی جگہ ناظر مقرر کیا گیا۔

صرف مصاحبوں کے مجمعے اور توپ خانے کا شائق تھا، پھر مرثیہ خوانی کی مجالس کا شوق رکھتا تھا۔ فیض آباد میں اسی کی کوششوں سے شیعوں میں جمعہ کی نماز کا آغاز ہوا۔ سبک روی کی ایجاد اور برسات میں استعمال کا دستور بھی اسی نے نکالا[۱]

۲۰ محرم ۱۱۹۶ھ کے بعد بہار علی خاں خواجہ سرا اور جواہر علی خاں خواجہ سرا کو آصف الدولہ وارن ہیسٹنگز سے ملنے کے لئے الہ آباد گئے تو انہیں بھی ساتھ لے گئے۔ وہاں سے ایک ماہ بعد لوٹے تو خواجہ سراؤں کو آزادی ملی اور یہ لوگ فیض آباد میں جاکر اپنے پرانے عہدوں پر بحال ہوئے ۱۲۰۵ھ میں جواہر علی خاں سخت بیمار ہوا لیکن بچ گیا۔ ۱۵ جمادی الثانی ۱۲۱۴ھ میں وفات پائی اور سات دن کے بعد بیگم نے اس کی جگہ داراب علی خاں کو داروغہ بنایا[۲] حسن نے اس کے لئے ایک قصیدہ ایک "مثنوی در تہنیت عید" اور مثنوی نقرِ جواہر لکھے ہمارے خیال میں مثنوی تہنیت عید ۱۱۹۹ھ میں لکھی گئی[۳] اسلوب کے اعتبار سے مذکورہ بالا تینوں چیزیں ایک ہی زمانے کی معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے عین ممکن ہے نقرِ جواہر اور قصیدہ اسی زمانے میں لکھے گئے ہوں جواہر علی خاں نے اپنا محل محرم ۱۱۸۹ھ میں تعمیر کیا (تاریخ فرح بخش ص ۲۱) یہ مثنوی اس تاریخ کے بعد لکھی گئی ہوگی۔ اس کا امکان ہے کہ مثنوی ۱۱۹۹ھ ہی میں لکھی گئی ہو۔

قصیدہ در مدح جواہر علی خاں" (ملال اور کمال والا قصیدہ) میں مندرجہ ذیل دو شعر بھی موجود ہیں:

نہیں بعید یہ سادات پروری سے ترے کہ میر احسن ابنِ حسن بھی ہووے نہال

---

[۱] مفصل حالات تاریخ فرح بخش جلد دوم ص ۲۶ تا ص ۵۹ [۲] ایضاً ص ۱۴۹ تا ص ۲۶۵
[۳] تفصیل باب پنجم میں دیکھئے۔

عرضی حسن کی ہے یہ آرزو کہ منگلے میں — تری امداد سے بنھی جائے وہ قدیمی چال [۱]

اگر پہلے شعر کا مصرعۂ ثانی درست ہے، تو پھر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن نے اپنے بڑے بیٹے میر حسن خلق کو جواہر علی خاں کی سرکار سے وابستہ کرانے کے لئے درخواست کی ہے۔ خلق سنہ ۱۱۸۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ان کی عمر اس وقت اتنی ہونی چاہیئے کہ بطور شاعر جواہر علی خاں کی سرکار سے متعلق ہو سکیں، گمان غالب یہ ہے کہ یہ قصیدہ سنہ ۱۱۹۹ھ ہی کے لگ بھگ کہا گیا ہو۔ محمود فاروقی لکھتے ہیں" درحقیقت سنہ ۱۱۹۲ھ سے پہلے جواہر علی خاں ان کے محسنوں میں نہیں تھے۔ لیکن بعد میں انہوں نے میر حسن کی دامے درمے سخنے ہر طرح مدد کی [۲] ہمیں میر حسن کی تعریفی منظومات کا تو علم ہے لیکن جواہر علی خاں نے واقعی کوئی معاوضہ بھی دیا یا نہیں۔ اس کا حال معلوم نہیں اگرچہ اتنا قطعی ہے کہ جواہر کے ہاں شعراء و ادباء کا مجمع رہا کرتا تھا۔ اور قیاس چاہتا ہے کہ حسن اس کے خوانِ کرم کے بھی ذلہ ربا رہے ہوں

وفات: مسٹر شی حواشیٔ دستور الفصاحت میں لکھتے ہیں:-

لطف و اشپرنگر [۳] و انتخاب، رحلتِ حسن را در سنہ ۱۲۰۵ھ
(سنہ ۱۷۹۰ء) قاموس در سنہ ۱۲۰۱ھ معرض کردہ اما باتفاقِ
دیگر اہلِ تذکرہ سال، رحلتش ہماں سنہ ۱۲۰۱ھ (سنہ ۱۷۸۶ء) است
کہ در متن مذکور شدہ [۴]

---

[۱] کلیات۔ مائی کروفلم [۲] میر حسن اور ان کے خاندان کے شعرا ص ۱۵۳

[۳] اسپرنگر لکھتے ہیں کہ عشقی نے اپنے تذکرے میں کہا ہے کہ چار سال ہوئے۔ میر حسن نے وفات پائی ہے (اسپرنگر۔ فہرست ص ۲۳۳) یہ بیان مشکوک ہے اس لئے کہ اس تذکرے کا آغاز بہت بعد میں ہوا ہے۔ [۴] ص ۸۵ فٹ نوٹ۔

مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں لکھا ہے :

تا زندہ بود با فقیر بسیار رابطۂ دوستی درست داشت، در عشرۂ ماہ محرم رحلت اوست، عمرش از شصت متجاوز خواہد بود۔ فقیر تاریخ رحلتش چنیں یافتہ۔ تاریخ :

چوں حسن آں بلبلِ خوش داستاں
روازیں گلزار رنگ و بو بتافت
بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی
"شاعرِ شیریں زباں" تاریخ یافت [1]

میر شیر علی افسوس جو سنہ ۱۲۰۰ھ میں حسن سے جدا ہوئے اور بنارس چلے گئے بعد میں چلتے پھرتے کلکتہ گئے۔ کلکتہ کے دورانِ قیام میں دیباچۂ سحر البیان میں لکھتے ہیں :

بعد اس کے (۱۱۹۹ھ کے) اس بزرگ (میر حسن) کو آخر ذوالحجہ سنہ بارہ سے میں مرض الموت لاحق ہوا نداں ماہ محرم کہ سنہ بارہ سے ایک شروع ہو چکے تھے۔ کہ بتاریخ پانچویں ماہ محرم کے اس دارِ فانی سے اس نے سرائے جاودانی کو کوچ کیا اور شہر لکھنؤ میں مفتی گنج کے بیچ مرزا قاسم علی خاں بہادر دام ظلہ، کے باغ کے پیچھے مدفون ہوا [2]

لیکن دیباچے کی طباعت کے وقت اس میں مندرجہ ذیل ترمیم کر دی گئی :

بعد اس کے اس بزرگ کو آخر ذالحجہ سنہ بارہ سے ہجری میں مرض الموت لاحق ہوا نداں غرۂ محرم کو کہ سنہ بارہ سے ایک شروع ہو چکے

---

[1] تذکرۂ ہندی ص ۶۸، ۶۹ [2] مائکرو فلم برٹش میوزیم

تھے اس دارِ فانی سے اس نے سرائے جاودانی کو کوچ کیا اور شہر لکھنؤ میں مفتی گنج کے بیچ مرزا قاسم علی خاں بہادر دام ظلہ، کے باغ کے پیچھے مدفون ہوا [۱]

ان کا خیال تھا وفات ۵ محرم سنہ ۱۲۰۱ھ کو ہوئی۔ پھر (تحقیق سے) یہ اطلاع درست نظر نہ آئی ہوگی کہ غرۂ محرم (یعنی محرم کے مہینے کی پہلی تاریخ) قرار دیا مصحفی نے عشرۂ محرم (محرم کے پہلے دس دن) لکھا ہے۔ گمان ہو سکتا ہے کہ افسوس نے عشرہ کو غرہ لکھ دیا ہو۔ دورِ حاضر کے محققوں میں مرزا علی حسن نے عز لیات۔ غیر مطبوعہ کے دیباچہ میں یکم محرم الحرام سنہ ۱۲۰۱ھ لکھا ہے [۲] انہوں نے افسوس کے دیباچے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں سعادت خاں ناصر [۳] کا یہ بیان کہ میر حسن نے سلیمان شکوہ کے دربار میں "دل برا اپنا" کی طرح میں مطلع پڑھا۔ درست نہیں معلوم ہوتا۔ سلیمان شکوہ سنہ ۱۲۰۳ھ یا سنہ ۱۲۰۵ھ لکھنؤ آتے ہیں۔ اور میر حسن ان ہر دو سنین سے قبل وفات پا چکے ہیں۔

مدفن: ۔ قبر کا نشان بیسویں صدی کے ربعِ اول تک موجود تھا۔ چنانچہ خواجہ عبدالرؤف عشرت "آبِ بقا" میں کہتے ہیں :۔

"میر حسن کی قبر کا نشان ابھی تک باقی ہے مفتی گنج میں مدفون ہیں" [۴]

لیکن اب باقی نہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی یکم اگست سنہ ۱۹۵۷ء کو میرے استفسار پر لکھتے ہیں :

"میر حسن کی قبر کا کوئی نشان موجود نہیں"

---

[۱] دیباچہ افسوس، مثنویات مرتبہ آسی ص ۱۸، ۱۹ [۲] ص ۱۲ [۳] خوش معرکۂ زیبا سنہ ۱۲۶۱ھ [۴] آبِ بقا ص ۱۶۸

(۹)

لباس اور وضع قطع :۔ باپ بیٹے کی وضع قطع یہ ہے :۔
(میر ضاحک) قیامت ہنسوڑا اور ٹھٹھول تھا...... بظاہر
نہایت ثقہ اور متشرع۔ اکثر عمامہ عربی سبز سر پہ بندھا رہتا
تھا اور جامہ کم گھیر امل پتی کا گلے میں، ڈاڑھی متوسط لبیں لی ہوئی،
قد میانہ گندم گوں، لیکن میر حسن ڈاڑھی منڈواتے تھے، پر جامہ نیمہ
ان کا ویسا ہی تھا اور پگڑی کی بندش قدیم ہندوستانی زادوں کی
سی، قد لمبا تھا اور رنگ گندمی۔ ہر چند وضع تو ایسی تھی پر شوخ مزاج
اور لطیفہ گو وہ بھی تھے نہ ہزال و فحاش [۱]

دتاسی لکھتے ہیں [۲]

HE (ZAHIK) OFTEN PUT ON A GREEN TURBAN (IL METTAIT SOUVENT UN TURBAN VERT) IN THE MANNER OF ARABS, AND WORE A LARGE GARMENT (LARGE VETEMENT) HIS BEARD WAS NOT VERY LONG, HE KEPT IT UNDER HIS LIPS, HIS STATURE WAS

---

[۱] دیباچۂ افسوس بمثنویات آسی ص ۱۶، ۱۷ [۲] انگریزی ترجمہ از مظفر علی سید

(HISTOIRE DE LAX LITTERATURE HINDOUIE ET HINDOUSTANIE VOL. I. ED. 2 P. 529.)

MEDIUM, HE WAS TANNED (IL ETAIT BUSANE) AS FOR HASAN...... HE SHAVED HIMSELF (IL SE FAISAIT RASER); BUT HIS GARMENT WAS SIMILAR TO THAT OF HIS FATHER, EXCEPT THAT HE ARRANGED HIS TURBAN IN THE MANNER OF ANCIENT NATIVES OF HINDUSTAN (TANDIS, QU IL ARRANGEAIT SON TURBAN COMME LES ANEIENS NATIFS DE L' HINDOUSTAN) HE WAS TALL AND BROWN (BRUN).

کریم الدین کا بیان ہے :۔

واضح ہو کہ میر حسن اپنے باپ کے خلاف اس بات میں تھا کہ ڈاڑھی بالکل صفاچٹ کرواتا اور پگڑی اگلے وقت کے لوگوں کی سی باندھتا تھا۔ اور پوشاک اپنے باپ کی سی پہنتا تھا۔ قد اچھا بڑا تھا، رنگ سانولا وہ ظریف اور خوش خلق آدمی تھا۔ مگر بیہودہ اور کلام معیوب زبان سے کبھی نہ نکالتا تھا [1]

آزاد نے لکھا :

قد میانہ۔ خوش اندام۔ گورا رنگ۔ جملہ قوانینِ شرافت اور آئینِ خاندان میں اپنے والد کے پابند تھے۔ اتنا تھا کہ ڈاڑھی منڈواتے

---

[1] طبقات الشعراء صہ ۲۱۳

تھے ..... سر پہ بانکی ٹوپی۔ تن میں تن زیب کا انگرکھا۔ چھنی ہوئی آستین۔ کمر سے دوپٹہ بندھا سے[1]

ڈاکٹر ابواللیث کا خیال ہے:

ممکن ہے جو وضع آزاد نے لکھی ہے وہ آخر میں لکھنؤ کی معاشرت کے اثر سے اختیار کر لی ہو۔[2]

ہمارا خیال ہے کہ لکھنؤ کی معاشرت سے خد لیے سے میانہ نہیں ہو سکتا اور نہ رنگ گندمی سے بھورا اور بھورا سے گورا بن سکتا ہے۔ باقی رہا لباس تو اس میں تبدیلی کا امکان ہے۔ حسن کی تصویر آسی نے کسی قلمی نسخے سے حاصل کر کے اپنے مثنویات کے ایڈیشن میں دی ہے۔ اس میں لکھنوی معاشرت کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ یہی حال شاعروں کے البم[3] والی تصویر کا ہے۔

اولاد: - افسوس نے چار بیٹے بتائے ہیں اور کہا ہے کہ ان میں سے تین شاعر ہیں۔ شاعر بیٹوں کے نام یہ ہیں:

۱- میر متحسن خلیق[4]

۲- میر محسن محسن

۳- میر احسن خلق[5]

ریاض الفصحا میں مصحفی چوتھے بیٹے کے شاعر ہونے کا ذکر بھی کرتے ہیں:-

---

[1] آب حیات ص ۲۵۲ [2] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۹۶

[3] مرتبہ زوار زیدی [4] مصحفی تذکرۂ ہندی ص ۹۰ [5] دیباچۂ افسوس مطبوعہ میں میر حسن خلق لکھا ہے لیکن مائی کرو فلم میں میر احسن درج ہے۔ اسی طرح مصحفی نے بھی تذکرۂ ہندی ص ۸۹ پر احسن لکھا ہے۔

مخلوق۔ سید احسانِ حسن مخلوق خلفِ میر حسن مرحوم جوانِ شائستہ و باصلاحیت است۔ چوں بحکمِ موزونیٔ طبع کہ ارثِ خاندانِ اوست، از ایامِ ابتدائے شباب چیزے فکر کردہ۔ کلامِ خود را بہ برادرِ کلانِ خود نمودہ۔ بعہذا فکرِ مرثیہ و سلام ہم کردہ می کند۔ از چند سال از فیض آباد بہ لکھنؤ رسیدہ۔ رجوعِ مشورہ گاہ گاہے بہ فقیر ہم آوردہ تا امروز عمرش سی سالہ خواہد بود و ماورائے شعر و شاعری در فنِ افسانہ گوئی ہم رونقِ تمام پیدا کردہ از وست (۳۳ شعر) [۱]

اغلب یہ ہے کہ یہ حسن کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ البتہ ۱۲۱۸ھ تک ان کی شاعری کا چرچا نہ ہوا ہو تو عجب نہیں۔ ورنہ افسوس ان کی شاعری کا بھی ذکر کرتے۔

ابن امین اللہ طوفان اپنے تذکرۂ شعرا (۱۲۴۷–۱۲۵۱ھ) میں میر علی اوسط رشک کے حال میں لکھتے ہیں:-

از شاگردانِ معتمدِ حضرت شیخ عبداللہ ناسخ و از پسرانِ میر حسن دہلوی صاحبِ مثنوی [۲]

لیکن جیسا کہ مرتب نے لکھا ہے:-

رشک میر حسن کے بیٹے نہیں تھے۔ ترجمے کی عبارت میں غالباً کاتب کی غلطی ہے۔ رشک کے والد کا نام سید سلیمان تھا

---

[۱] ریاض الفصحا ص ۳۰۷

[۲] تذکرۂ شعرا ص ۹

(متوفی ۱۲۱۹ھ) دیباچۂ نفس اللغتہ ص ۱ [1]
اس لئے میر حسن کے چار ہی بیٹے سمجھنے چاہئیں۔

اولاد کا قیام: خلیق۔ محسن اور خلق کے بارے میں انیس کا ۱۲۱۸ھ میں بیان ہے کہ:

چار بیٹے فضلِ الٰہی سے اس کے اب تک موجود ہیں۔ تین شاعر ہو گئے۔ بود و باش انہوں نے فیض آباد میں اختیار کی۔ معاش نوکری پر ہے۔ چنانچہ میر مستحسن خلیق تخلص اور میر محسن محسن تخلص مرزا تقی بہو بیگم صاحبہ مادرِ آصف الدولہ مدظلہا کے داماد کے رفیق ہیں اور میر [ا] حسن خلق تخلص داراب علی خاں ناظر کے ساتھ ہے [۔ ہیں] [2]

مرزا تقی ۱۲۰۰ھ میں اپنی شادی کے بعد فیض آباد میں بس گئے اور وہاں ۱۲۳۰ھ تک قیام کیا۔ جب ان میں اور داراب علی خاں میں جھگڑا ہوا تو فیض آباد کو خیرباد کہہ کر ۱۲۳۰ھ میں لکھنؤ چلے آئے [3] اس سے خلیق کے قیام فیض آباد کی مدت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پہلے بھی مستحسن خلیق فیض آباد جاتے رہے ہیں۔ ہر سال آصف الدولہ کا ایک آدھ دن کا پھیرا ادھر ضرور ہوتا تھا اور لشکر بھی ساتھ جاتا۔ چنانچہ "زینت" کے حال میں مصحفی تذکرہ ہندی میں لکھتے ہیں [4]

---

[1] حواشی تذکرہ ص ۱۳۱ یہ اردو لغت خود رشک نے لکھا ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا (از الف تا ت) طبع ہو گیا ہے (حواشی تذکرہ ص ۱۳۵) [2] دیباچہ مثنویات مرتبہ آسی ص ۱۹، ۲۰ [3] تاریخ فرح بخش ص ۲۲۱، ۲۲۶ (یہ جھگڑا ساڑھے چھ مہینے جاری رہا تھا) الیضاً ص ۲۲۶ [4] ص ۲۸۰

نازک تخلص زینت نام در فیض آباد از میر مستحسن خلیق معلوم شده مشارٌ الیہ می گوید کہ ہرگاہ من ہمراہِ لشکر رفتم بسببِ الفتے کہ با من داشت ایں غزل نوشتہ فرستادہ بود ۔

کوچے میں کوئی سکے کوئی در پہ مرے ہے
انصاف بھی کچھ ہے تو یہ کیا ظلم کرے ہے الخ

بیٹوں کی عمریں ۔ خلیق کے سالِ پیدائش کا اندازہ قاضی عبدالودود صاحب نے معاصر (حصہ اول) میں تعینِ زمانہ سے تخت کر دیا ہے۔ مصحفی نے لکھا ہے کہ جب میں لکھنؤ میں تازہ وارد تھا خلیق کی عمر ۱۶ برس کی تھی۔ مصحفی ۱۱۸۹ھ میں لکھنؤ آئے گویا میر خلیق ۱۱۸۲ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔

میر خلیق کے بارے میں مصحفی یہ بھی لکھتے ہیں کہ :

"برادرِ خوردِ میر احسن خلق" [1]

اس لئے خلق عمر میں خلیق سے بڑے ہونے چاہئیں۔ خلق کے ترجمے میں مصحفی نے میر حسن کا ذکر بطور زندہ آدمی کے کیا ہے

کم کم خیالِ شعر می کند داز نظر پدرِ خود می گذراند [2]

تذکرۂ ہندی کا آغاز ۱۲۰۱ھ سے قبل ہوا اور تکمیل ۱۲۰۹ھ میں ہوئی [3] اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ یہ حال ۱۲۰۱ھ (وفاتِ حسن) سے قبل تحریر ہوا اگر ۱۲۰۰ھ کو ہی آغازِ تذکرہ کا سال شمار کیا جائے اس وقت خلق کی عمر بقول مصحفی ۱۹ سال تھی :

عمرش تا امروز نوزدہ سالہ است [4]

---

[1] تذکرۂ ہندی ص ۸۹ [2] ایضاً ص ۸۹ [3] اضافے بعد میں بھی ہوتے رہے
[4] ایضاً ص ۸۹

تو خلق ۱۱۸۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔ خلیق ۱۱۸۲ھ کے قریب اور خلق ۱۱۸۱ھ کے قریب پیدا ہوئے ہوں تو خلق میر خلیق کے برادرِ اکبر ہی بنتے ہیں۔

مخلوق کی عمر ریاض الفصحا میں تیس سال بتائی گئی ہے۔ اگر آغازِ تذکرہ کے وقت یہ حال لکھا گیا ہو تو ۱۲۲۱ھ کے قریب لکھا گیا ہوگا۔ اس حساب سے مخلوق ۱۱۹۱ھ کے قریب پیدا ہوئے ہوں گے۔

میر محسن کا حال البتہ نہیں کھلتا۔ خلق (پ ۱۱۸۱ھ تقریباً) سب سے بڑے تھے۔ میر خلیق (پ تقریباً ۱۱۸۲ھ) ان سے چھوٹے ہیں۔ خلیق اور مخلوق کی عمروں میں خاصا بُعد ہے۔ نیز شیر علی افسوس ۱۲۱۸ھ میں میر محسن کو مرزا تقی کا ملازم بتاتے ہیں اور شعرا کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔ لیکن مخلوق کی شاعری سے واقف نہیں۔ اس لئے قیاس ہے کہ محسن مخلوق سے عمر میں بڑے ہوں گے۔ ان کی پیدائش ۱۱۸۲ھ اور ۱۱۹۱ھ کے درمیان ہونی چاہیئے۔

اخلاف:۔ میر حسن کی اولاد میں خلیق نے شاعری میں زیادہ نام پیدا کیا۔ خلیق کے بیٹوں میں انیس زیادہ مشہور ہوئے اور مرثیہ گوئی میں کمال پیدا کیا۔ انیس کی اولاد میں میر نفیس معروف تھے۔ اگرچہ سلیس کے بیٹے میر جلیس بھی ایک حد قابلِ ذکر تھے۔ تاہم ان سے زیادہ معروف میر نفیس کے دو بیٹے عارف ہوئے۔ عارف کے لڑکے لائق زندہ ہیں اور لکھنؤ میں رہائش رکھتے ہیں۔ [۱]

---

[۱] ... شجرہ دیباچۂ رموز العارفین ص۷ از سید احمد اللہ قادری۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری (لیث) اور میر حسن اور ان کا خاندان (محمود فاروقی) اور بعض دوسرے ماخذ سے مرتب کیا گیا

میر حسن

- خلق
- خلیق (وفات ۱۲۶۰ھ)
  - انس (وفات ۱۳۰۲ھ)
    - دختر
      - فرزند حسن
    - وحید
  - مونس (وفات ۱۲۹۲ھ)
  - انیس (وفات ۱۵ دسمبر ۱۸۷۴ء و ۲۹ ذی قعدہ ۱۲۹۱ھ روز شنبہ)
    - نفیس (پ ۱۲۳۳ھ وفات ۱۳۱۸ھ)
      - دولہا صاحب عروج
      - دختر
        - عارف (وفات ۱۳۳۹ھ)
          - لائق (زندہ ہیں)
    - سلیس
      - میر جلیس (وفات ۲۲ جمادی الاول ۱۳۲۵ھ)
    - دختر
      - پیارے صاحب رشید (ولادت ۱۲۶۳ھ وفات ۱۳۳۳ھ)
    - میر عسکری رئیس
- محسن
- مخلوق
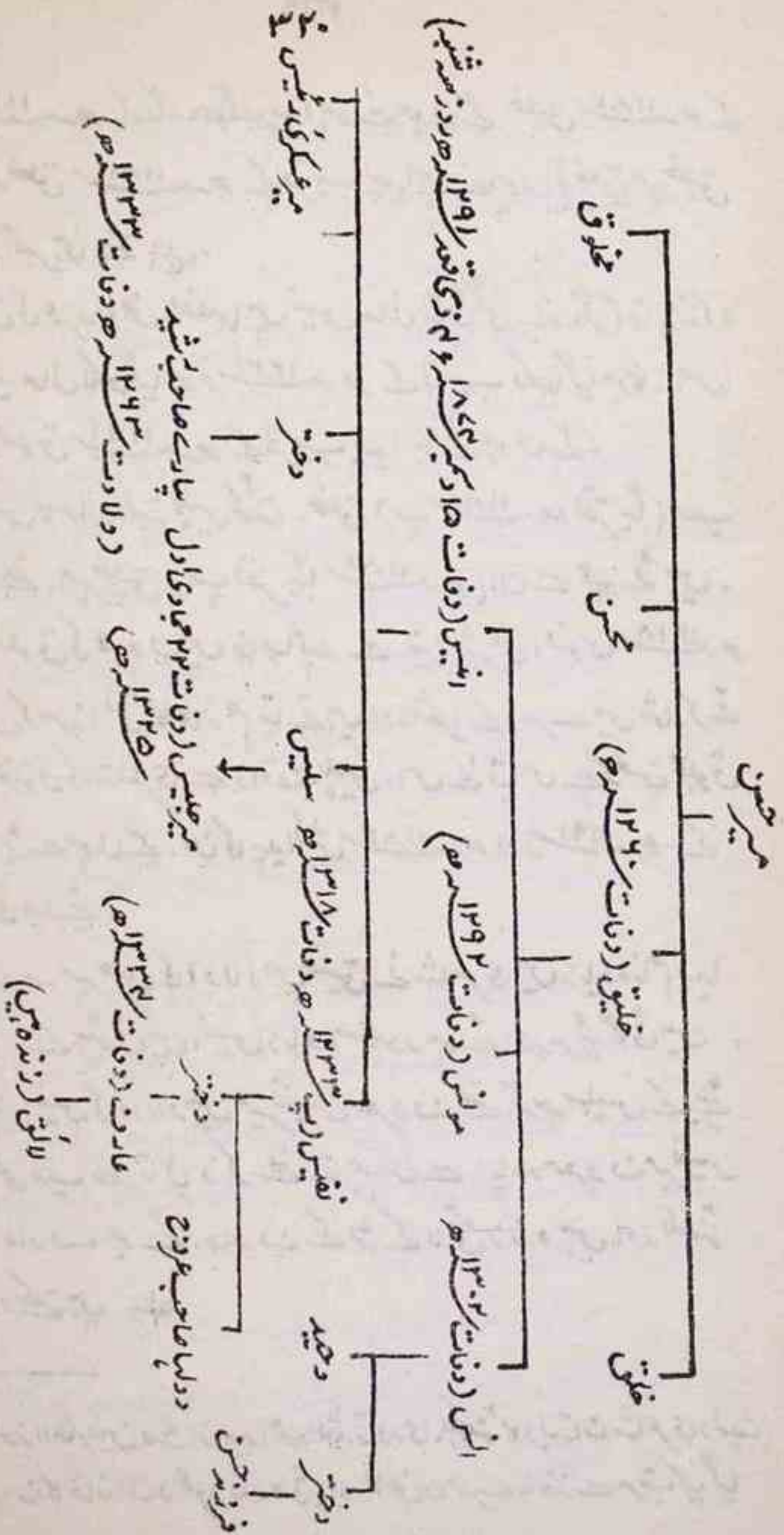
شاگرد: میر حسن کے آٹھ شاگردوں کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) محمد اعظم:۔ اعظم تخلص، عطار کا لڑکا تھا۔ بارہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگا۔ آوارہ ہوگیا اور شہر بہ شہر پریشان پھرتا رہا پھر آصف الدولہ کی سرکار میں ترک سواروں میں ملازم ہوا۔ اچانک ہیضے سے وفات پائی[۱]

۲۔ راجہ جسونت سنگھ پروانہ تخلص عرف کاکا جی۔ پسر راجہ بینی بہادر کا مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں اس انداز سے کیا ہے کہ شبہ ہوتا ہے کبھی میر حسن سے بھی اصلاح لی ہو[۲] متوفی ۱۲۲۸ھ[۳] لسان خ لکھتے ہیں:

"بعض تذکرہ والوں نے جوان کو میر حسن اور مصحفی کا شاگرد لکھا ہے اس پر اعتبار نہیں"[۴]

مصحفی نے خود کہا ہے کہ مجھ سے اصلاح لیتا ہے۔

۳۔ مروت؛ صغیر علی مروت۔ کبیر علی سنبھلی کا لڑکا تقلید میر حسن میں مثنوی لکھی اور چاہتا تھا کہ میر حسن کو دکھائے لیکن حسن فوت ہو گیا (۱۲۰۱ھ) آغاز شباب میں میر حسن کی ترغیب سے شعر کہتا تھا۔ جب رستم نگر میں اقامت کی تو جرأت سے اصلاح لینے لگا[۵]

۴۔ فرہاد۔ میر بر علی فرہاد فیض آبادی مقیم لکھنو لوگ میر حسن کا شاگرد کہتے ہیں

"خود کمتر اقرار می کند"[۶]

---

[۱] تذکرۂ شعرائے اردو میر حسن ص ۲۹ [۲] ص ۲۴۶ [۳] حواشی دستور الفصاحت ص ۱۱۱ [۴] سخن شعرا ص ۷۸ [۵] تذکرۂ ہندی ص ۲۴۶
[۶] ریاض الفصحا ص ۲۵۳

۵۔ ہوس:۔ نواب میرزا محمد تقی خاں ہوس۔ خلف میرزا علی خاں۔ آغازِ ریعانِ جوانی میں حسن سے اصلاح لیتا تھا۔ اس کی وفات کے بعد مصحفی سے اصلاح لینے لگا۔[1]

۶۔ احقر:۔ تخلصِ میرزا جواد علی نامی قزلباش لکھنؤ میں پیدا ہوا۔ نجفِ اشرف کی زیارت کی اور واپسی پر میر حسن کا شاگرد ہوا[2]

۷۔ نادر:۔ لالہ گنگا سنگھ۔ شاگردِ میر حسن[3]

۸۔ صاحب شعرالہند[4] نے تلامذۂ حسن میں خود میر حسن کے حوالے سے میر محمد علی وہم کو شاگردِ حسن لکھا ہے۔ لیکن تذکرۂ شعرائے اردو (میر حسن) میں وہم کے حال میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے شاگردی ظاہر ہو۔ حسن نے تو اسے اپنے دوستوں میں شمار کیا ہے[5]

۹۔ خلق۔ میر احسن۔ میر حسن کا بیٹا؛ اپنے باپ سے اصلاح لیتا ہے[6]

(۱۰) عاشق۔ میر برہان الدین شاگردِ میر حسن (محمد حسن؟)[7]

(نوٹ:۔ نمبر ۸ اور ۱۰ ہماری نظر میں مشکوک ہیں)

---

[1] ریاض الفصحا ص ۳۶۷ [2] مجموعۂ نغز جلد اول ص ۵۶ [3] تذکرۂ ہندی ص ۲۶۳ و اردو کے ہندو شعرا از عبدالسلام خورشید ص ۲۷ [4] جلد اول ص ۱۴۷ [5] ص ۱۹۵ [6] تذکرۂ ہندی ص ۸۹

[7] گلزارِ ابراہیم ص ۱۸۱

باب پنجم

تصانیف

میر حسن کے کلام کا تین حیثیتوں سے جائزہ لیا جا سکتا ہے

(۱) مطبوعہ کلام کی مقدار

(۲) قلمی نسخوں کا جائزہ

(۳) کلام کی سنہ وار تعین و ترتیب

سب سے پہلے مطبوعہ کلام کو لیا جاتا ہے۔

(۱)

مطبوعہ کلام

مثنوی شادیٔ آصف الدولہ: ۔ یہ "مثنوی میر حسن" (غیر مطبوعہ) کے عنوان سے معیار (پٹنہ)، مارچ ۱۹۳۶ء ص۱۲ تا ص۱۴ شائع ہو چکی ہے۔ اس میں کل ۹۵ اشعار ہیں۔ پہلا شعر ہے ؎

شام کو میں فکر میں بیٹھا تھا کل
یعنی تھی میرے تئیں فکر غزل

آخری شعر ہے ؎

ذرہ کی کچھ اس سے نہیں مجھ کو طرف
گر قبول افتد زہے عز و شرف

در بارہیہی مثنوی "ایک انگریز مستشرق کا سرقہ" کے عنوان سے قاضی عبدالودود صاحب نے مع ترجمات پامر معاصر (پٹنہ) حصہ اول صلا تا صلا شائع کی
"اڈورڈ ہنری پامر گذشتہ صدی کے مشہور مستشرقین میں تھے۔ اردو فارسی، عربی تینوں زبان میں ان کی نظم و نثر موجود ہے ..... چنانچہ ۱۳ اپریل ۱۸۷۴ء کے اودھ اخبار میں ان کا ایک طویل مضمون ہے جس میں ڈیوک آف اڈنبرا اور دختر زار روس کی شادی کا مفصل حال قلمبند کیا ہے۔ اس مضمون میں جا بجا اشعار بھی ہیں۔ جن کے متعلق انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ کس کے ہیں۔ لیکن ایک جگہ جو اشعار ہیں ان میں پامر کا نام آیا ہے۔ پڑھنے والے اگر اس سے یہ نتیجہ نکالیں کہ پامر نے انہیں اپنے زائیدہ طبع کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ تو بالکل بجا ہوں گے۔
باقی ماندہ اشعار میرحسن کی ایک مثنوی سے لئے گئے ہیں۔ جو ان کے قلمی کلیات میں موجود ہے۔ ذیل میں مثنوی بجنسہٖ درج کی جاتی ہے اور اشعار جن کے مقابل × بنا ہوا ہے پامر کے یہاں نہیں۔
پامر نے بعض اشعار میں تصرف بھی کیا ہے۔ اس کا پتا حاشی سے چلے گا"
(معاصر حصہ اوّل صلا)

شوق العاشقین:۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کا خیال ہے کہ یہ مثنوی مکمل طور پر کبھی شائع نہیں ہوئی۔[1] اس خیال کا اظہار انہوں نے معارف اکتوبر ۱۹۴۳ء میں بھی کیا تھا۔ چنانچہ اس کے جواب میں کلب علی خاں فائق رسالہ تصویر[2] رامپور میں مندرجہ ذیل تین نسخوں کی تفصیل دیتے ہیں۔

---

(۱) حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ (۲) جلد نمبر ۲ فروری ۱۹۴۴ء صلا بعنوان میرحسن کی مثنوی صلا تا ۳۰

(۱) مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۶۷ھ

(۲) مطبع کانپور کا نسخہ جس میں مثنوی قصیدۂ غوثیہ قصۂ محمود شاہ، پندِ طاہر۔ اعزاز نامہ اور قصۂ شاہِ روم بھی شامل تھے۔

(۳) مطبع کریمی بمبئی ۱۳۲۶ھ[1]۔ عبرت نامہ۔ قصیدہ غوثیہ۔ قصۂ محمود شاہ، پندِ طاہر۔ اعزاز نامہ۔ اور اللہ بس باقی ہوس کے ساتھ طبع ہوا۔ یہ نسخہ دوسرے نسخے کی نقل معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ اشعار دونوں کے مطابق ہیں شعرالہند میں جو اشعار مثنوی کے درج ہیں۔ مطبوعہ نسخوں میں اس کے خلاف درج ہیں۔ اور اس اختلاف میں دونوں نسخے متفق ہیں۔

اس مثنوی کے اور مطبوعہ نسخے بھی ہیں۔

(۴) نولکشور پریس سے مولانا عبدالباری آسی نے مثنویاتِ میرحسن کے زیرِ عنوان سحرالبیان کے ساتھ اسے بھی شائع کیا۔[2]

(۵) حیدرآباد دکن سے ۱۳۲۵ھ میں سید احمد اللہ قادری صاحب نے شائع کی اس اڈیشن کی کیفیت یہ ہے:۔

دیباچہ ص ۱ تا ۲۴۔ دیباچہ مصنف ص ۲۴ تا ۲۸ تعلیقات ص ۲۸۔ ماخذ ص ۲۹ تا ۳۰۔ رموز العارفین ص ۱ تا ۱۱۔

(۶) مطبع مجتبائی واقع دہلی میں مولوی عبدالواحد کے اہتمام سے ۱۳۰۸ھ میں شائع ہوئی۔ صفحات ۴۸۔ سرورق پر لکھا ہے کہ مع اضافہ حکایات صالحین و مناجات[3]

(۷) مطبع نامی واقع لکھنؤ میں قطب الدین احمد کے اہتمام سے ماہ جون

---

(۱) یار اول کا نوٹ ٹائیٹل پر ہے۔ (۲) مثنویاتِ حسن ایڈیشن ۱۹۴۲ ص ۱۶۳ تا ۲۴۳ (۳) نسخہ مملوکہ خلیل واودی

۱۸۹۲ء (۱۳۰۹ھ) شائع ہوئی ۔ نسخۂ مطبوعہ جو پیش نظر ہے ۔ ناقص الآخر ہے کل ۲۰ صفحے موجود ہیں ۔ متن مطبع مجتبائی کے عین مطابق ہے ۔ ہر صفحے پر تعداد اشعار بھی وہی ہے مکمل صورت میں ۲۴ صفحات پر مشتمل ہوگا۔[1]

اس کے علاوہ اس کے اقتباسات بھی بعض کتب میں دیے گئے ہیں مثلاً

(۱) شعر الہند ص ۲۱۰ تا ۲۱۲ (جلد دوم)

(۲) لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۱۰۱ تا ۱۰۳

(۳) میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعرا ص ۷۵ تا ۸۲

مثنوی کا پہلا شعر ہے :-

ہے سزاوارِ ثنا وہ کردگار
جس نے کی خلقت سے کثرت آشکار

مطبوعہ نسخے (آسی) میں آخری شعر ہے :-

دے حسن کو بھی الٰہی یہ دوا
اس مرض سے تاکہ ہو اس کو شفا

برٹش میوزیم کے مائکرو فلم میں آخری شعر یہ ہے ۔

مدعا اس سے نصیحت ہے تمام
اس لیے لکھا یہ قصہ والسلام

سید احمد اللہ قادری کے نسخے نیز مجتبائی نسخے میں حسن کا آخری شعر ہے :-

دے حسن کو بھی الٰہی یہ دوا
اس مرض سے تاکہ ہو اس کو شفا

مجتبائی نسخے میں اس کے بعد دو اضافہ شدہ حکایات بھی ہیں اور پھر مناجات ہیں دوسری حکایت کے آخر میں شاعر کا تخلص حمید اور مناجات کے آخر میں تخلص احمد درج ہے ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے حسن کی رموز میں اضافے بھی ہوتے رہے ہیں ۔

---

(۱) نسخہ مملوکہ خلیل زادہ دی ۔

دتاسی نے قصۂ کام روپ کے ساتھ حسن کا ایک نظم پارہ شائع کیا جس میں اخلاقی خیالات موجود تھے[1]۔ معلوم نہیں یہ رموز کا کوئی ٹکڑا ہے یا کسی اور مثنوی کی ابتدائی مناجات ہیں۔

گلزارِ ارم۔ ڈاکٹر ابو اللیث صاحب کا خیال ہے کہ یہ مثنوی ایک ہی بار شائع ہوئی۔ یہ بھی درست نہیں۔

(۱) مخزن پریس دہلی (۱۹۰۸ء) سے مثنویاتِ حسن کے زیر عنوان سحر البیان کے ساتھ شائع ہوئی ص ۱۳۹ تا ۱۶۷

(۲) نولکشور پریس سے ۱۹۴۵ء میں سحر البیان اور رموز العارفین کے ساتھ چھپی ص ۱۳۴ تا ص ۱۶۲

پہلا شعر ہے ؎

خداوندا کہوں میں کیا زبانی
کھلا ہے تجھ پہ سب رازِ نہانی

آخری شعر ہے ؎

زبس وصفِ گل و گلشن بہم ہے
سو اس کا نام گلزارِ ارم ہے

مثنوی در تہنیتِ عید قاضی عبدالودود صاحب نے مرتب کر کے معیار (پٹنہ) مئی ۱۹۳۶ء میں شائع کی ص ۱۲۴ تا ص ۱۲۵۔

پہلا شعر ہے :- فلک کی یہ تھا کج روی سے بعید
کہ دو سال ہو مجھکو بنگلے میں عید

---

(۱) دتاسی جلد اول ص ۵۲۸ بعد

آخری شعر ہے :-

دعا پر یہ کی مثنوی میں تمام
کہ ہے عید کی تہنیت اس کا نام

مثنوی قصرِ جواہر - یہ بھی معیار میں دو قسطوں میں شائع ہو چکی ہے[1]۔ اس کا پہلا شعر ہے -

ثنا رہے اس خالق پاک کو
دیا جس نے رتبہ کفِ خاک کو

آخری شعر ہے ؎

خدا اس گھرانے کو رکھے مدام
بہ حقِ محمد علیہ السلام

مثلثاتِ حسن معیار اپریل ۱۹۳۶ء میں ص ۱۱۵ پر مثلث شائع ہوئے[2]

ترکیب تضمین :- چند ایک معیار میں شائع ہوئے۔

تضمین بر غزلِ میرلا آجکل یکم جون ۱۹۴۷ء ص ۹ میں عبدالعلیم شرکوٹی نے شائع کرائی۔

تضمین بر غزلِ قائم :- اخبار کارنامہ لکھنؤ ص ۱۸ جلد ۴ نمبر ۴۶ [مدیر شیخ محمد تائب لکھنوی مجریہ ۱۸۶۵ء ۔ ۱۸۶۶ء] میں خمسہ میر حسن مرحوم بر غزلِ قائم" کے عنوان سے سات بند شائع ہوئے۔ قائم کی غزل کا مقطع ہے -

---

(۱) جون ۱۹۳۶ء و جولائی ۱۹۳۶ء صفحات ۲۵۱ تا ۲۵۵ بند ۲ تا ۳۱۰ (۲) چند ایک حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے بھی اپنے مقالے بھی دیئے ہیں۔ باقی ہنوز غیر مطبوعہ ہیں -

تا کجا آتا ہے تجھے رحم جوانی پہ تری
مر گئے ہاں اسی آزار میں بیمار بہت،

تبرکات غیر مطبوعہ (۱) - اس عنوان سے آج کل ۱۵ اپریل ۱۹۴۷ء میں عبدالعلیم نے ایک غزل شائع کرائی۔ مطلع ہے۔

جلوہ گر چہرہ ترا بالوں میں جو شب ہو گیا
مہ ترے مکھڑے کے آگے ماہ نخشب ہو گیا

لیکن مرزا علی حسن کے مرتبہ غزلیات حسن میں یہ غزل ص۸۲ پر موجود ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا۔

بادۂ کہن ماہِ نو، نومبر ۱۹۴۹ء میں اس عنوان کے تحت میر حسن کی غزلیات کا انتخاب دیا ہے۔ جو نولکشوری دیوانِ غزلیات پر مبنی ہے۔

انتخاب حسن مولانا حسرت موہانی نے انتخابِ سخن میں جزو دوم طبع اوّل۔ کانپور ۱۹۴۲ء تیسرے نمبر پر کلامِ حسن کا انتخاب دیا ہے۔ تعداد صفحات۔ انتخاب حسن ۱۲۔

کلام حسن : کلیاتِ حسن کے زیرِ عنوان مخزن اپریل ۱۹۱۰ء جلد ۱۹ نمبر ۱ ص۲۱ تا ص۲۵ پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں حسرت شروانی نے میر حسن کی چار غزلیں۔ متفرق اشعار۔ مثنویات۔ قطعات وغیرہ کے چند نمونے شائع کئے۔

دیوان غزلیات : (۱) نولکشور پریس کی طرف سے پہلی دفعہ دسمبر ۱۹۱۲ء میں میر حسن کی غزلیات کا ایک مجموعہ "دیوان میر حسن" کے نام سے شائع

---

(۱) غیر مطبوعہ

ہوا۔ جس میں حسن کی غزلیات کے دیوان کا تقریباً نصف حصہ موجود ہے۔ صفحات ۱۴۴۔

(۲) غزلیات میر حسن[1] اس عنوان سے مرزا علی حسن صاحب نے ۱۹۴۴ء میں سرفراز پریس لکھنؤ سے ایک مجموعہ شائع کرایا۔ جس میں ۵۹ غزلوں کے اشعار ہیں۔ (صفحات ۶۰)

انکشاف دیوان کی تاریخ میر حسن کے دیوان کے بارے میں محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

"دیوان اب نہیں ملتا ۔۔۔۔۔ آج نوبت یہ ہے کہ پانچ غزلیں بھی پوری نہ ملیں جو اس کتاب میں درج کرتا۔[2]"

اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان پانچ غزلوں میں آخری غزل حسن بخشی کی ہے جو میر حسن کے نام سے منسوب کر دی گئی ہے[3] آب حیات کے اس اقتباس پر صفیر بلگرامی لکھتے ہیں:

"مؤلف عرض کرتا ہے کہ جناب آزاد کا فرمانا بجا ہے مگر جو یندہ یابندہ بھی ہوتا ہے حقیر کے بزرگوں کے کتب خانہ میں ان سب حضرات کا کلام اور اکثروں کا دیوان موجود ہے۔ یہ سات غزلیں میر حسن کے سوائے اُن غزلوں کے جو جناب آزاد نے لکھی ہیں لکھتا ہوں۔ اور اُمید کرتا ہوں کہ شکریہ کے ساتھ جناب آزاد قبول فرمائیں اور آب حیات جو تیسری بار چھپے۔ اوس میں داخل کر دیں [آگے ساتوں غزلیں درج ہیں]

اس صدی کے آغاز کا ایک گلدستہ بعنوان گنجینہ رام پور سے بسر پرستی جناب

---

(۱) غیر مطبوعہ (۲) آب حیات ص۲۵۷ (۳) ملاحظہ ہو اردو کے چند اشعار قاضی عبدالودود نقوش نمبر ۵۷، ۵۸ ص ۱۶۹ تا ۱۸۲ (۴) جلوۂ خضر جلد اول طبع اول ۱۸۸۲ء ص ۱۸۳۔

صاحبزادہ سید شبیر علی خاں صاحب آنریری مجسٹریٹ شائع ہوا تھا۔ جسے اراکین بزمِ ادب ریاست رامپور نے شائع کیا (قیمت فی جلد ۳/) جس میں رامپوری شعرا کا طرحی کلام دیا ہے (تعدادِ صفحات ۳۲) اس میں سرورق کے اندر کے صفحے پر حسن، ممنون سلطان لکھنوی، امۃ اللہ خاں فرخ اور مرزا تقی ترقی کی غزلیں درج ہیں۔ حسن کی غزل کا پہلا شعر ہے ؎

مدت سے ڈھونڈتا تھا دلِ گم شدہ کو میں ناگاہ اس گلی میں ملا ایک بار دل (رقعاتِ شعاعم)

اسی طرح سرا پا سخن مرتبہ سید محسن علی[1] میں صلا پر پانچ شعر کی غزل (فریاد نہ سے ہاتھ سے بیداد نہ ہے ہاتھ سے) صلا پر پانچ شعر (چلتی نہیں زباں، بدلتی نہیں زباں) صلا ایک شعر ؎

نظر سے اس کے حسن گر تجھ کا یوں مثل مرشک
رہا نہیں مرا کچھ اعتبار آنکھوں میں

درج ہے۔ اس طرح "نسخۂ صحیح مجمع الاشعار" میں جو سید جمیل الدین مہتمم لارنس گزٹ میرٹھ نے (نومبر ۱۸۷۵ء) مطبع درخشانی میرٹھ سے شائع کیا اور جس کے ترقیمے کی عبارت یہ ہے۔

"۔۔۔۔۔ اگرچہ پہلے بھی یہ نسخہ کئی جگہ طبع ہوا۔ مگر جتنے نسخے دیکھے گئے کیا مطبوعہ دہلی اور کیا مطبوعہ لکھنؤ سب میں ایسی صریح غلطیاں پائی گئیں کہ کاتبوں کی غلطی اور تحریف سے رکن کے رکن ندارد تھے۔۔۔۔۔"

اس میں صلا پر غزلِ حسن موجود ہے جس کا مطلع ہے۔

کرنا شکوہ تو بے وسواس میں اس کے نہ آنے کا

---

(۱) نولکشور پریس طبع ۱۸۶۱ء

نہو وصل کا مرے دل میں گر اس کے روٹھ جانے کا[1]   (۴ شعر)

آخری سے پہلا ورق غائب ہے۔ آخری ورق پر یک لخت ترکیب بند کے ۶ بند دیے ہیں۔ آخری بند یہ ہے :-

ستم اٹھانے کو اس کے نہیں ہے زیادہ مجال
خدنگِ عشق سے سینہ تو ہو گیا غربال
پر اشک آنکھوں سے ٹپکنے لگے لہو کی مثال
نہ تاب ہم میں رہی ہے نہ دل میں ہے کچھ حال
بس اب حسن ہوا جاتا ہے کچھ کا کچھ احوال
کہاں تلک کوئی صدموں سے اس کے ہو پامال
خدا کند کہ زمن عشق دست بر دارد
وہ دہ [illegible] کہ دیگر شکست بر دارد

یہی ترکیب بند ایک اور جگہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ منو لال نے گلدستۂ نشاط مرتب کر کے مسٹر ہنری تھوبی پرنسپ کے نام معنون کیا۔ یہ گلدستہ کلکتے میں گورنر جنرل لارڈ جارج آکلینڈ کے عہد میں ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء موافق ۱۲۴۳ بنگلہ مطبع گلدستۂ نشاط میں طبع ہوا۔ گل سوم کے صفحہ ۱۲۸ پر میر حسن کا یہی واسوخت یا ترکیب بند درج ہے اس کا پہلا مصرعہ ہے :-

---

(۱) اسی طرح بعض مطبوعہ تذکروں میں بھی میر حسن کے بعض شعر پائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر صرف بیاضوں سے رجوع کیا جائے تو نور الحسن ابن نواب صدیق حسن خاں کی بیاض "طرازِ عشق" (مطبع نامی مفید عام آگرہ) میں ۴ شعر میر حسن کے موجود ہیں۔ (صفحہ ۲۷، ۲۸) لیکن ان اشعار سے زائد نہیں ہیں جو تذکروں میں عام طور پر ملتے ہیں۔

ہر ایک بزم میں اس کا ہے ذکر صبح و مسا

یہ ترکیب بند ص۲۸ سے ص۳۲ کے کالم نمبر ا تک جاتا ہے۔

اردو داں طبقے کے لئے دیوانِ حسن کی موجودگی کا پہلا واضح حوالہ ۱۹۱۰ء میں حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے ہاں ملتا ہے۔ اس کے بعد خمخانۂ جاوید میں سری رام نے دیوان کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر ۱۹۱۲ء میں دیوان کا کچھ حصہ دیوانِ میر حسن کے نام سے شائع ہو گیا۔

سحر البیان میر حسن کی سب سے زیادہ مقبول مثنوی ہے اور بہت دفعہ شائع ہو چکی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر محی الدین قادری زور ح تنقید حصہ دوم ص۲۸۲، ۲۸۴ پر مثنوی کے بعض مطبوعہ ایڈیشنوں کا ایک چارٹ دیتے ہیں۔ شمس بریلوی نے اپنے لکھنوی ایڈیشن میں زور کی فہرست میں اضافہ کر کے چارٹ بنایا ہے۔ ہم ان دو ماخذ کے علاوہ اور دوسرے ماخذ کی مدد سے ایک زیادہ مکمل فہرست پیش کرتے ہیں۔

تذکرہ شعرائے اردو پہلی دفعہ یہ تذکرہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی تصحیح و تنقید سے ۱۹۲۲ء میں انجمن ترقی اردو نے اپنی مطبوعات کے سلسلہ (عدد ۳۵) میں شائع کیا۔ اور کتاب مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ سے طبع ہوئی۔ دوسری دفعہ زیادہ صحت کے ساتھ اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مخطوطے سے مقابلہ کر کے اسی دیباچے کے ساتھ ترقی اردو ہند نے ۱۹۴۰ء میں شائع کیا۔

مطبوعہ کتابوں کی تفصیل اسی قدر ہے۔ سحر البیان کے ممکن ہے اور بھی بہت سے نسخے ہوں۔ جن ۳۸ مطبوعہ نسخوں کا ہمیں علم ہو چکا ہے (اور ان میں سے بعض ہماری نظر سے گذر بھی چکے ہیں) ایک چارٹ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

نمبر		سنہ ہجری	سنہ عیسوی	
۱	منثور ترجمہ بہادر علی حسینی بعنوان نثر بے نظیر		۱۸۰۲ء	اوراق ۸۴ م۔ دتاسی جلد اول صفحہ ۶۰۸ ترجمہ حسینی
۲			۱۸۰۳ء	طبع ثانی، سائز حروف ٹائپ ۸ [ایضاً]
۳	سحر البیان		۱۸۰۵ء	فورٹ ولیم کالج ایڈیشن۔ تعداد اوراق ۱۴۶ دتاسی جلد اول صفحہ ۵۲۸ ببعد۔
۴	"	۱۲۶۰ھ	۱۸۴۴ء	مطبع طبعی ناشر عبد الماجد۔ سحر البیان مع دیباچہ افسوس۔ سرنامے پر لکھا ہے کہ یہ مثنوی پانچ دفعہ پہلے بھی چھپ چکی ہے۔ [دیباچہ رموز العارفین بسید احمد اللہ قادری صفحہ ۴۳]
۵	"	۱۲۶۱ھ	۱۸۴۵ء	لکھنو۔ مصطفائی پریس ۱۰۸ صفحات ہر صفحے پر ۲۱ شعر۔ لیتھو۔ باڈلین لائبریری کیٹلاگ
۶	"	۱۲۶۲ھ	۱۸۴۶ء	لکھنؤ میمائی پریس۔ لیتھو [ایضاً]
۷	"		۱۸۵۰ء	بمبئی
۸	"		۱۸۵۰ء	دہلی بعنوان بدر منیر [باڈلین کیٹلاگ و دتاسی]
۹	"		۱۸۵۰ء	میرٹھ بعنوان مثنوی میر حسن [ایضاً]
۱۰	"	۱۲۶۹ھ	۱۸۵۲ء	کانپور۔ مطبع جعفری۔
۱۱	منثور ترجمہ حسینی		۱۸۶۲ء	طبع ثالثہ ترجمہ حسینی مرتبہ۔ [illegible] سائز حروف ۸ [دتاسی جلد اول صفحہ ۶۰۸]
۱۲	سحر البیان		۱۸۶۲ء	کانپور
۱۳	"		۱۸۶۳ء	آگرہ۔ دیوناگری حروف میں۔ سائز حروف ۸۔ [دتاسی جلد اول صفحہ ۵۲۸ ببعد]
۱۴	"		۱۸۶۹ء	لکھنؤ
۱۵	انگریزی ترجمہ از مسی ڈبلیو بانڈ لیل		۱۸۷۱ء	کلکتہ
۱۶	سحر البیان		۱۸۷۴ء	کانپور

۱۷	سحرالبیان	۱۸۷۶ء	میرٹھ
۱۸	"	۱۸۷۸ء	کانپور
۱۹	"	۱۸۷۹ء	سیتاپور
۲۰	ڈرامہ سحرالبیان رونق	۱۸۷۹ء	گجراتی زبان میں۔ بمبئی [باڈلین کٹالاگ]
۲۱	سحرالبیان	۱۸۸۲ء	لکھنؤ [نولکشور پریس]
۲۲	انگریزی ترجمہ کورٹ	۱۸۸۹ء	کلکتہ طبع ثانی۔ دی نثر بے نظیر۔ ایم ایچ کورٹ۔ بہادر علی حسینی کی نثر کا ترجمہ (ضمیمہ کٹالاگ برٹش میوزیم ص ۱۲۱)
۲۳	جمہسہ باطن	۱۸۹۲ء	
۲۴	انگریزی ترجمہ (کورٹ)	۱۸۹۵ء	
۲۵	" (ڈیننگ)	۱۹۰۱ء	کلکتہ
۲۶	سحرالبیان	۱۹۰۸ء	مخزن پریس دہلی
۲۷	"	۱۹۱۸ء	لکھنو۔ نولکشور پریس
۲۸	"	۱۹۲۵ء	"
۲۹	"	۱۹۴۱ء	لکھنؤ۔ مرتبہ آسی (ترقیمہ: مطبع ہذا میں بارھویں بار سحرالبیان کا نسخہ چھپا)
۳۰	"	۱۹۴۴ء	"
۳۱	"	۱۹۴۹ء	مرتبہ حامداللہ افسر
۳۲	"	۱۹۴۷ء	لکھنو۔ مرتبہ شمس بریلوی
۳۳	"	....	ادارہ مرکز، لاہور
۳۴	"	؟	مطبع مسیحائی شاہدرہ دہلی۔ بمبئی، بر نسخہ مطبع نظامی، واقع کانپور۔ قرائن سے ایسا ہی

نمبر	نام کتاب	سنہ	مقام	کیفیت
				صدی کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔ باہتمام محمد عبدالرحمان عرف رحمان بخش بعنوان سحرالبیان طبع ہوا مطبوعہ نسخے آخری اوراق غائب تعداد اوراق ۴۹ (نسخہ مملوکہ خلیل داؤدی)
۳۵	سحرالبیان	؟	؟	ناقص الاول تعداد صفحات ۵۶۔ مصور نسخہ۔ مطبع کا نام ندارد۔ آخر میں آغازِ حالِ مصنف کے تحت شیر علی افسوس کے دیباچے سے حالات کا خلاصہ دیا ہے۔ ص۵ پر شاہ عالم کی شبیہ اور ص۱۷ پر آصف الدولہ کی شبیہ دی ہے۔ آصف الدولہ کی شبیہ وہی ہے جو میر محمد ذاکر کی قیصر التواریخ کی طبع ثانی میں درج ہے۔ عجب نہیں نولکشور پریس کی کوئی اشاعت ہو۔ (نسخہ مملوکہ خلیل داؤدی)
۳۶	مثنوی میر حسن با تصویر	؟	؟	نولکشور پریس۔ سرورق پر میر حسن کی تصویر صفحات ۵۲ آخری ورق غائب۔ پنجاب پبلک لائبریری نمبر ۸۵۱۱۳۲ مث [تصاویر خلیل داؤدی صاحب کے نسخے مختلف ہیں]
۳۷	مثنوی میر حسن و با تصویر	؟	؟	در مطبع میرٹھ پریس بطبع مزین مطبوع طبائع اہل جہاں شد۔ سرورق پر میر حسن کی قلمی تصویر صفحات ۹۶ آغاز میں حالِ مصنف مشتمل چار سطر و لیکن دیباچہ میر شیر علی افسوس کا پبلک لائبریری کا نمبر ب ۲۴۴۳ – ۸۵۱۰۳۲ مث
۳۸	مثنوی سحرالبیان	۱۹۵۲ء		خواجہ بک ڈپو اردو بازار لاہور۔ صفحات ۱۴۳ پبلک لائبریری نمبر ۲۴۴۳ ب ۸۵۱۰۳۲ سحر

(۲)
قلمی نسخے

(۱) کلیات و دواوین میرحسن کے ۲۴ نسخوں کا علم ہوسکا ہے

(۱) خدا بخش لائبریری پٹنہ میں کلیاتِ حسن کا جو نسخہ ہے اس کی تفصیل یہ ہے [۱۲۵۴ھ] :-

"مشتمل بر ۱۹۲ اوراق ۔ ورق اب سے آغاز، حمدِ حق میں غزل (مصرع ۱ : "گر کیجیے رقم کچھ ترے وصفوں کے بیاں کا")

حاشیہ : قصیدہ منقبتِ علی (جو ہوئے حسن سے اس رنگ کے مضمون مناسب) ۔ قصیدہ منقبت امام حسن (گلشن میں جب سے تو نے دکھا نگار یا) ورق ۴ قصیدہ در مدحِ آصف الدولہ (جو کوئی ہووے نکتہ دانِ سخن) ۶ مدحِ سالار جنگ (نکالے کیونکر قدم اس کی زلف سے یہ اسیر) ۸ مدح آصف الدولہ (کون بدمست گل اندام چمن میں ہے مقیم) ۱۰ مدح جواہر علی خاں (ہوا ہے شب سے مہ تہنیت سے جام ہلال، (۱۳) مدح آفریں علی خاں مغفور (بیاں تنگ کیا ہے اس غمِ دوراں نے کارتنگ) ۱۵-۱۷ الف پر قصیدہ ختم ۔ اور اسی سے مثنوی (کروں پہلے توحید یزداں رقم ۔ شروع ۔ ختم بر ۹۷ ب اس میں مرقوم تمام شد ..... مثنوی ... در ۱۲۵۴ھ ۔

حاشیہ :- مثنوی (ہے سزاوار ثنا دہ کردگار) ۹۷ ..... مثنوی (ثنا پہلے اس خالقِ پاک کو) از ۱۱۸ ب تا ۱۳۰ ب مثنوی شادی (شام کو میں فکر میں بیٹھا تھا کل) از ۱۳۰ ب تا ۱۳۲ ب ۔ ہجو حویلی میر حسن ۱۳۳ تا ۱۳۸ ۔ مثنوی باورچی خانہ ۱۳۸ تا ۱۴۱ ۔ تعریفِ فیض آباد ۱۴۱ ب ۔ ۱۵۴ ۔ تہنیتِ عید جواہر علی ۔ ۱۵۴ و ۱۸۶ ۔ تقلیں از ۱۵۶ — ۱۵۸ ۔ یہ سب حواشی پر اور اس کے بعد

حواشی سادہ ۔

حواشی غزل کا خاتمہ ۱۳۴ ، شعر آخر (بھاتا ہے دل سے مصرعِ واقف مجھے حسن

دو نامرا کریم مرا سر نفضئ علی)

اس کے بعد فردیات از ۱۳۴ ۔ ختم ۱۳۵ ب ، رباعیات ۱۳۵ ب ۔ ۱۴۹ ب

مخمسات ۱۴۹ ب ۔ غزل قائم و میر محمد علی زار و شوکت جنگ و جامی و حزین و

میر (۵ غزلیں میر) د سواد و ایلی و مخمس در منقبت (بے گرگ فلک سخت بلا یا

اسد اللہ) مخمس ہجو شاطک (نہ خوف کر تو ..... مچھندر) خاتمہ ۱۷۰ ب

مسدس (ایک قصہ میں سنا ہے مردم سے یہ قضا را ۔ ختم ۱۷۰ ب واسوخت (ہر

ایک بزم میں ہے ان کا ذکر صبح و مسا) تا ۱۷۴ مثلثات ۱۷۴ ب ۔ ۱۸۸ ب ۔

ترکیب تضمین ایجاد حسن ۱۸۸ ب تا ۱۹۲ الف ۔ اسی پر ختم ۔

خاتمۂ کاتب یا مصنف یا دیباچہ ندارد " [1]

(۲) لکھنؤ میں کلیاتِ حسن کا ایک نسخہ مملوکہ سید محمد عباس صاحب ایم اے چوہدری

محلہ لکھنؤ [بحوالہ مکتوبات سید مسعود حسن رضوی ۔ ۳۰ جنوری ۱۹۵۵ء]

۳ (۱۴) "کتاب خانۂ عالیۂ رام پور دو نسخۂ خطبۂ کلیاتِ حسن را دارا ست کہ

یکے از انہا در رامپور بر دستِ محمد رحیم خطاط نستعلیق بموجبِ حکم نوابِ سید

احمد علی خاں بہادر در ۱۲۵۳ھ بہ اتمام رسید" [2]

ان نسخوں کی تفصیل عابد رضا خاں صاحب نے رامپور سے مہیا کی ہے ۔

دیوانِ حسن ع ۳۶۹ ، حاشیے پر قصائد اور ان کے خاتمے پر مثنویاں اور بیچ میں

غزلیات ، بے حد خوشخط لکھا ہوا ۔ دیوان مکمل ہے یعنی کوئی صفحہ غائب نہیں

---

(۱) مکتوب قاضی عبدالودود صاحب ستمبر ۱۹۵۵ء (۲) حواشی دستور الفصاحت ۔ عرشی ۔

قصائد - (۱) نہووے حسن سے اوس ماہ کے ہمعناں مہتاب - منقبت علی (۲) منقبت حسین : زنگار پا، شرار پا (۳) مدح نواب آصف الدولہ مرحوم، نکتہ دانِ سخن، روانِ سخن (۴) قصیدہ ڈ سالارِ جنگ مرحوم، اسیر - خبیر (۵) مدح نواب آصف الدولہ مرحوم، مقیم ـ مستقیم (۶) مدح جواہر علی خاں - ہلال، ملال - ۷ مدح آفرین علی خاں، کار تنگ

مثنویاں - (۱) کروں پہلے توحید یزداں رقم (۲) ہے سزاوارِ ثنا یہ کردگار [1] (۳) ثنا پہلے اس خالقِ پاک کو (۴) مثنوی شادی دشام کہ میں فکر میں بیٹھا تھا کل (۵) ہجو حویلی میر حسن (ہے احاطہ فلک کا یہ عجب سے) (۶) مثنوی در تعریف فیض آباد (خداوندا کہوں کیا میں زبانی) (۷) در مدحِ جواہر علی خاں در تہنیتِ عیار (فلک کی یہ تھا کچھ روی سے بعید) (۸) نقل (۹) نقل کلاونت (۱۰) نقل (فاحشہ)

غزلیات :- ابتدا : گہ کیجے رقم کچھ ترے وصفوں کے بیاں کا

تعداد ابیات = ۹ + (۲۵۲×۱۶) = ۴۰۳۲ + ۹

فردیات :- ۳۹ جس میں تعریف طوائف والی فردیات بھی شامل ہیں ۔

رباعیات - کل ۶ + (۱۱×۱۳) = ۱۴۹

متفرق - تعریف بسنت ۱۳ شعر - مدح نوازش علی خان ۴ شعر واسوخت - قائم - زار - شوکت جنگ - علی حزیں - میر، میر، میر، میر، میر، میر، میر، ایلی - مخمس در منقبت دیا اسد اللہ، مخمس در ہجو سودا دسکندر نامہ(بو قتار)

واسوخت : ہر ایک بزم میں ہے اوس کا ذکر صبح و مسا (۱۹ بند)

---

(۱) رموز العارفین

مثلث - ترکیب تضمین ایجادِ میر حسن : پانچ غزلیں اور -

آخر میں عبارت :- دیوانِ کلیات (کذا) میر حسن مع مثنویات بموجب حکم حضورِ پُر نور - نواب قبلہ فیاضِ زماں نواب احمد علی خاں بہادر دام اقبالہٗ بدستخط .... محمد رحیم اللہ بہ اتمام رسید ۱۲۵۳ھ کلیاتِ حسن ۳۷کل اوراق ۲۹۲

سرورق کی عبارت -- کلیاتِ میر حسن گزرانیدہٗ فرزند حسن نبیرہٗ میر انس - یکم جولائی ۱۹۰۶ء

مثنویاں (۱) رموز العارفین (۲) قصرِ جواہر - (۳) سحر البیان - (۴) مثنوی در ہجو حویلی کہ بکرایہ گرفتہ بودند - (۵) در تعریفِ باورچی خانہ - (۶) در تعریف فیض آباد در ہجو لکھنؤ (گلزار ارم) (۷) ہذا مثنوی فی تعریف جواہر علی خاں بہادر در تہنیتِ عید -

قصائد (۱) در مدح آصف الدولہ (منعم اکرم) (۲) جواہر علی خاں (ہلال، طلال) (۳) قصیدہ در مدح جناب امامِ حسن (زنگار یا اثریا) (۴) فی المدح آفریں علی خاں (کار تنگ) (۵) در مدح نواب آصف الدولہ (دانِ سخن، جانِ سخن) (۶) قصیدہ نعتیہ نور در مدح حضرت مرتضیٰ علی (ہم عنان مہتاب)

بہ آغاز "سخن پردازِ گلشنِ مقال ....."

آخری : "توقع از صاحبانِ معنی دارم کہ ہرگاہ بہ نسبتے (کذا) معاف +

غزلیات - اس کے بعد کئی ورق غائب ہیں غزل بیچ میں سے شروع ہو گئی ہے - پہلا شعر غزل کا نسخے میں یہ ہے -

اسی میں ناخوشی گر ہو تو تو (؟) اے ماہ مدت غم کھا
ترے کہنے سے اب میں (تو؟) نہیں دلدار رونے کا

[رونے کا ردیف]

دوسری غزل دیکھ کا، ع۳ تبسم تھا۔ ع۴ دیوان جاتا ع۵ وہ نہیں آنے کا۔
ع۶ خیال ہو اپنا ع۷ بے وفا نہیں ہوتا۔ ع۸ دھونہ سکا ع۹ غنچہ لا لا
وغیرہ ..... ابیات غزل صفحہ ۱۰۹ (کذا) سے ورق ۱۹۶ تک ہر صفحے پر ۱۶ شعر
اس حساب سے تقریباً ۱۶×۲×۸۸ شعر ہوتے ہیں۔

ترجیع بند (کذا)، پہلا مصرع: ہر ایک بزم میں ہو اس کا ذکر صبح و
مسا ۱۸ بند۔

مخمس:۔ قائم۔ نواب شوکت جنگ۔ محمد علی زار۔ حامی علی حزیں۔
رباعیات:۔ ۸۲+۱ { مع نوٹ بر رباعیات متعلق بہ فتح شجاع الدولہ }
فردیات:۔ [مع نوٹ راجع بہ آتشِ خانہ] ۱۶×۵۰=۸۰۰

مخمس:۔ میر (۵ غزلیں) سودا (ایک غزل) ہجو سکندر وسودا [حجفلہ]
رباعیات وغیرہ: تقریباً ۵۵+۳ فردیات+۵ فردیات+۵ فردیاتِ
ایہام+ ۲ شعر در موسمِ بہار برائے لسنت علی خاں (؟) + تضمین بر شعرِ
فارسی+۱۳ رباعیات اہلِ حرفہ
فردیات: طوائفوں کی شان میں مع نوٹ

ہجو: در ہجو مولوی ساجد (دو رباعیاں) ایک پانچ شعر کا مخمس۔ قطعہ در
تعریف نوازش علی خاں سردار جنگ۔ تہنیت عید ۳ شعر۔ شعر فارسی۔ از استادان
قدیم و جدید تضمین از فقیر میر حسن مثلث طور ۲۶۸
ترکیبِ تضمین (اس کو ہر جگہ تزئین لکھا ہے) "تازہ ایجادِ فقیر عفیہ عنہ،
دعفی عنہ) از غزلیات استاداں۔ مطلع رامربع ..... ایک غزل سعدی پر
+ ۳ شعر صائب پر۔

(۵) نسخہ کلیات [شمس بریلوی نے اپنے مرتبہ نسخہ سحر البیان کے فٹ نوٹ (حاشیہ

پہ ذکر کیا ہے)

(۶) نواب نصیر حسین خیال کے پاس بھی کلیات کا ایک نسخہ موجود تھا۔

(۷) کلیات حسن (بھیکم پور۔ حبیب گنج) حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اس کے اقتباسات مخزن اپریل ۱۹۱۰ء میں اور نسخے کی تفصیل رسالہ ہندوستانی بابت اکتوبر ۱۹۳۱ء میں دی تھی۔ یہ نسخہ ۱۲۵۶ھ کا مکتوبہ ہے۔ اور شروانی صاحب نے لکھنو سے خریدا تھا۔ رموز العارفین کے دیباچے میں سید احمد اللہ صاحب تفصیل دیتے ہیں۔ (۱) غزلیات (۲) فردیات [۴۰] (۳) رباعیات [۱۵۴] (۴) تضمین [۳] (۵) مخمس [۱۴] (۶) مسدس [۱] (۷) واسوخت [۱] (۸) مثلثات [۱۰۳] (۹) قصائد [۷] (۱۰) مثنویاں [۱۱] ایک تضمین مرزا صاحب کی غزل پر مصرع لگاکر بنایا ہے۔ مسدس میں عظیم کشمیری کی ہجو ہے واسوخت عام روش کے خلاف ضمن ہے۔ اور ہر بند کے لئے مختلف فارسی شعرا کے اشعار انتخاب کئے ہیں۔ قصائد کی تفصیل یہ ہے کہ (۱) لمعہ نور۔ امیر المومنین حضرت علی ۔۔۔۔ کی منقبت میں (۲) حضرت امام حسن ۔۔۔۔ کی منقبت میں۔ (۳) آصف الدولہ کی مدح میں (۴) سالار جنگ کی مدح میں (۵) نواب آصف الدولہ کی مدح میں (۶) نواب جواہر علی خاں کی مدح میں۔ (۷) نواب آدم علی خاں کی مدح میں [کذا] مثنویات گیارہ ہیں (۱) رموز العارفین (۲) گلزار ارم۔ (۳) سحر البیان (۴) جواہر علی خاں کے قصر جواہر کی تعریف (۵) آصف الدولہ کی شادی (۶) مکان کی ہجو (۷) خوان نعمت (۸) جواہر علی (کے لئے) تہنیت عید

---

(۱) دیباچہ رموز العارفین طبع حیدر آباد ص ۹ خیال نے اس پہ ایک سرسری مضمون حیدر آباد اولڈ بوائے میگزین میں لکھا تھا)

(۹) فحش ہے (۱۰) مذاقیہ ہے (۱۱) فحش - اخیر کی تین مثنویوں میں بھی چھوٹی چھوٹی حکایات مذکور ہیں [۱]

۸- کلیاتِ حسن - مملوکہ مرزا علی حسن لیکچرار ایڈورڈ کالج پشاور - مرتب غزلیاتِ حسن غیر مطبوعہ - انہوں نے اپنے نسخے کی تفصیلات مہیا کرنے سے انکار کر دیا - ان کے مقالے سے [۲] معلوم ہوتا ہے کہ کرم خوردہ اور خستہ حالت میں ہے نیز یہ کہ خاندانی نسخہ ہے - اس میں دیباچۂ دیوانِ حسن بھی موجود ہے غزلیاتِ مطبوعہ کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے - کہ اس نسخے میں کوئی ہجو موجود نہیں [۳]

(۹) کلیاتِ میر حسن دہلوی - نسخہ عبدالسلام $\frac{۸۵}{۸۸۵}$ اوراق ۲۲۶ سطور فی صفحہ ۱۹

تحریر سرورق — دیوان میر حسن در حصہ جناب بھائی صاحب [نام کسی کتاب فروش نے مٹا دیا ہے -] رفتہ بود حالا از برادر صاحب قیمت مبلغ دوازدہ روپیہ خرید کردہ شد المرقوم ۲۹ شہر رجب ۱۲۶۷ھ ورق ۱ الف کی پیشانی پر کسی کی بڑی مستطیل مہر بھی ہے -

تفصیل مندرجات (۱) ابتدا میں مثنویاں، حکایتیں، نقلیں ورق ۲ تا ۴۷ (۲) قصائد ۵۰ - تا 48 (۵) قصیدہ در منقبت حضرت علی (۲) قصیدہ در منقبت حضرت علی (۲) قصیدہ در مدح آصف الدولہ (۲) قصیدہ در مدح سالار جنگ (۵) قصیدہ در مدح آصف الدولہ (۲) قصیدہ در مدح جواہر علی خاں - (۷) قصیدہ در مدح آفرین علی خاں مغفور -

---

(۱) دیباچہ رموز العارفین ص۱، ص۱۱، ص۱۳ (۲) ادبِ لطیف فروری ۱۹۵۲ء ص۱۴ (۳) غزلیاتِ حسن غیر مطبوعہ ص۱۳

(ii) غزلیات ۱ ب، ۱۶۱ آخری غزل کا مقطع :

بھاتا ہے دل سے مصرع واقف مجھے حسن :: دتا مرا کریم ، مرا مرتضیٰ علی

(iii) فردیات ۱۶۳ (iv) رباعیات ۱۷۵ (v) مخمسات تا ۱۸۶ ۔

بر غزلیات قائم ، میر محمد علی زار ، نواب شوکت جنگ ۔ میر (۴ غزلیں) سودا ۔ فارسی شعرا جامی ، حزیں ، اہلی کی غزلوں پر بھی مخمسات لکھے ہیں ۔

مخمس در منقبت ۔ مخمس در ہجو (سکندر نامہ ؟) یہ عنوان کیسا ہے ؟ ؟

مقطع میں صراحتاً حسن کا تخلص درج ہے ۔

مفلس ہو دو حسن یار رکھتا ہو پاس پیسا

(vi) مسدسات ۱۹۸ (vii) ترکیب بند ، ہر ایک بزم میں ہے اس کا ذکر صبح و مسا ۔ ۱۹۹ ۔ ۲۲۵ (viii) مثلثات ۲۰۱ ۔ ۲۲۶ ۔ ترقیمہ : تمام شد بتاریخ یکم صفر المظفر ۱۲۶۷ھ ہجری نبوی ۔ نام کاتب درج نہیں ۔ ابتدائی ۸۴ اوراق ایک کاتب کے ہیں اور بقیہ یعنی قصائد سے آخر کتاب تک دوسرے کاتب کے ۔ آخر الذکر تحریر واضح اور خوبصورت ہے ۔

(۱۰) دیوان میر حسن دہلوی ۔ نسخہ سبحان اللہ <u>۸۹۱۶۴۳۱</u> اوراق : ۵۷ ، سطور ۸ ۔ ابتدا قصیدہ درمدح سالار جنگ سے ہوتی ہے ۔ یہ قصیدہ مکمل درج نہیں آخری شعر ذیل میں درج کرتا ہوں ۔ شکستہ یہاں تئیں ...... کلام کی تقریر ۔ پھر غزلیات ۔ پہلی غزل شب ہو گیا ... نخشب ہو گیا ۔ آخری غزل سا تھ سےنے کو ہائے رحم بر آتی نہیں ــــ نظر آتی نہیں ۔ اس کے بعد کتاب کی کتابت نامکمل رہ جاتی ہے ۔ اور صفحہ سادہ چھوٹ جاتا ہے ۔

(۱۱) کلیات میر حسن دہلوی ۔ یونیورسٹی اردو ادب : ۸۵ ۔ اوراق ۱۹۶ ، سطور ۱۷ ، غزلیات : ۱ ۔ ۱۳۷ ب ۔ فردیات وغیرہ تا ختم کتاب ۔

مکتوب رجب علی ؟ دو شنبہ بتاریخ چہار دہم شہر ذی الحجہ ۱۲۴۷ھ ؟ ؟
ترقیمہ کسی نے مٹا دیا ہے۔ ممکن ہے کاتب کا نام رجب علی ہو۔ سال کتابت
بھی صاف نہیں ہے۔

۱۲۔ کلیاتِ میر حسن ۔ برٹش میوزیم ۔ اس نسخے کا مائکرو فلم ڈاکٹر
مختار الدین احمد صاحب کی معرفت مہیا ہوا۔ سر ورق پر لکھا ہے :۔
کرنیل جارج ہملٹن صاحب بہادر کلیاتِ میر حسن لکھنوی نوشتہ ۱۲۵۹ھ
آخر میں نوٹ ہے : تمام شد کلیاتِ میر حسن مغفور بتاریخ بست (و) نہم ۔
شعبان المعظم ۱۲۵۹ھ ۔ کلیات کے محتویات حسبِ ذیل ہیں :۔
(۱) [دیباچہ شیر علی افسوس] (۲) (قصیدہ ناقص الاول در مدح سالار جنگ)
(۳) مثنوی شادی آصف الدولہ) (۴) (مثنوی رموز العارفین) (۵) (مثنوی
قصرِ جواہر) (۶) مثنوی سحر البیان) (۷) (مثنوی ہجو حویلی) (۸) مثنوی
خوان نعمت (مثنوی باورچی خانہ) (۹) مثنوی گلزارِ ارم (۱۰) مثنوی تہنیت
عید۔ (۱۱) (قصیدہ در مدحِ آصف الدولہ) منعم، نسیم (۱۲) قصیدہ جواہر علی خاں
ہلال کمال (تین صفحے) (۱۳) قصیدہ آصف الدولہ) نگار یا، بہار یا (دو صفحے)
(۱۴) (قصیدہ آفرین علی خاں) جنگ۔ رنگ (دو صفحے) (۱۵) قصیدہ آصف الدولہ
دبستانِ سخن۔ جہانِ سخن (تین صفحے) (۱۶) (قصیدہ لمعہ نور منقبت در
شانِ حضرت علی) عناں مہتاب، نہاں مہتاب (۱۷) دیباچہ دیوان حسن) تین

---

(۱) علی گڑھ کے ان تین نسخوں کے بارے میں اطلاعات ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو صاحب
نے مہیا کی ہیں۔ مکتوب ۲۲/۷/۵۸ عیسوی ((۲) نمبر ۶۹ بحوالہ کیٹلاگ ص ۳۶

صفحے) (۱۸) غزلیات (دیوان ردیف وار) آخر میں غزل منقبت سے بعد از علی امام علی پیشوا اعلی۔ (۱۹) ترکیب بند: ہر ایک بزم میں ہے۔ اس کا ذکر صبح و مسا (۱۹ بند) (۲۰) مخمسات) قائم (۷ بند) محمدؐ علی زار (۱۶ بند)۔ شوکت جنگ (۹ بند) جامی (۷ بند) حزیں (۱۱ بند) میر (علی الترتیب ۹، ۷، ۹، ۱۸ اور ۱۳ بند) سودا (۸ بند) منقبت ہے گر گِ فلک سخت بلایا اسد اللہ (۷ بند) (۲۱) (ہجویات) مخمس در ہجوِ سکندر شاعر (۱۴ بند) مسدس ہجو عظیم کشمیری [۹ بند] (۲۲) (مثنوی) ہجو قصائیؒ [۸ شعر]۔ (۲۳) مثنوی نقل کلاونت (۱۸ شعر) (۲۴) (مثنوی) نقلِ زن ناخشنر (۲۵ شعر) (۲۵) رباعیات (ردیف وار دیوان) (۲۶) خطاباتِ ایہام (۵ شعر) (۲۷) فردیات [۶ + ۲ شعر برائے لبذت علی خاں) تضمین شعر فارسی (دو عدد) (۲۸) رباعیات الحرف، ۱۳ رباعیاں (۲۹) (طوالکھوں پر اشعار) (۳۶ شعر) (۳۰) رباعیات ہجو مولوی ساجد [دو رباعیاں + ایک بند تضمین] (۳۱) در تعریف کبڈی [۲ رباعیاں] [بخط شکستہ] (۳۲) ایک قطعہ بخطِ شکستہ جو پڑھا نہیں جاسکا (۳۳) در تہنیتِ لبذت (تین شعر کا قطعہ) (۳۴) (مثلثات) [۲۷ اشعار کو مثلث کیا ہے] (۳۶) ترکیب تضمین ایجادِ میر حسن [۸ بند]

(۱۳) (۱۴) کلیات میر حسن کے دو مکمل نسخے مولوی عبدالحق صاحب کے کتب خانہ میں ہیں[1]۔ مولوی صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ ان کا کتاب خانہ کچھ دلی میں ۱۹۴۷ء میں ضائع ہو گیا۔ باقی بھارت سرکار نے ضبط کر لیا۔ اب ان کے پاس ایک نسخہ بھی نہیں ہے۔

---

(۱) دیباچہ رموز العارفین ص۱

(۱۵) کلیاتِ حسن جسے کاتب نے آخر میں "دیوان کلیاتِ حسن" کر کے لکھا ہے نسخہ رامپوری میں نقل ہوا۔ درمیان سے غزلیات کا اکثر حصہ غائب ہے۔ باقی کلام کے اوراق بھی بے ترتیب لگے ہوئے ہیں۔ مملوکہ عبدالعلیم شیرکوٹی صاحب۔ نسخے کا ترقیمہ حسبِ ذیل ہے۔

"دیوان کلیات میر حسن مع مثنویات بدستخطِ عاصی پر معاصی سکندر شاہ ساکن مصطفیٰ آباد عرف رامپور"

ورقِ اوّل پر حسبِ ذیل نوٹ کسی دوسرے ہاتھ سے مرقوم ہے "عطیہ۔ کنور رگھناتھ سنگھ رئیس بلدور ۱۳ دسمبر ۱۹۴۳ء۔ دیوان میر کلیات حکیم اسرار الٰہی ارشد"

(۱۶) کلیاتِ حسن۔ مملوکہ میر لائق علی[۲]

(۱۷) دیوان حسن۔ مملوکہ ذکی الحق صاحب (پٹنہ) جولائی ۱۹۵۲ء میں لکھنؤ سے دیوانِ حسن کا ایک نسخہ خرید کر لے گئے[۳]

(۱۸) دیوانِ حسن (مملوکہ) قاضی عبدالودود صاحب[۴]

(۱۹) مہری رام صاحب خمخانۂ جاوید کے پاس ایک قلمی نسخہ دیوانِ حسن کا تھا[۵]

(۲۰) دیوانِ حسن ۸۸ سبحان اللہ کلیکشن۔ مہری نواب۔ صفدر علی خلف

---

(۱) صرف ۹۲ اوراق موجود ہیں۔ اس نسخے سے ہم نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ (۲) اس کا ذکر قاضی عبدالودود صاحب نے ایک خط میں کیا ہے۔ (۳) مکتوب سید مسعود حسن رضوی ۱۱ اگست ۱۹۵۴ء (۴) تفصیلات ابھی تک حاصل نہیں ہوئیں۔ (۵) خمخانۂ جاوید جلد دوم ص ۱۳۱۔

محمد سعید ملتی بہ یکم صفر ۱۲۶۷ھ (بیاضِ فائق)
(۲۱) دیوانِ حسن ۵ء سبحان اللہ کلیکشن (بیاضِ فائق)
(۲۲، ۲۳) موتی محل لکھنو کی لائبریری میں دیوانِ حسن کا نسخہ جس کے صفحات ۴۶۸ تھے[1] لیکن دتاسی کی یہ اطلاع مکمل نہیں ہے۔ اسپرنگر نے اردو کٹالاگ میں دو نسخوں کا ذکر کیا ہے ایک دیوان کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دیباچہ آصف الدولہ اور سالار جنگ کی شان میں قصیدے۔ غزلیات اور متفرق کلام۔ دوسرے نسخے کا اندراج بہت اہم ہے۔

An other copy in the same collection, without Preface, written in a bad hand, with many era--sures and corrections, is apparently an auto-graph. At the end is written in red ink, but it is not certain whether in the same hand.

۲۵ ذوالحجہ پنجشنبہ ۱۱۹۲ھ در بنگلہ۔

"Faydhabad, Thursday, 25 th. Dzulhijj 1192";
the copy contains also some Persian Rubays.
(A Cat. of the Arabic, Persian and Hindustani MSS. of the Libraries of the kings of oudh. P.60; NO.625 H.P.)

(۲۴) دیوانِ حسن کتاب خانہ حبیب گنج میں "انتخابِ دیوانِ حسن" کا ایک قلمی نسخہ نمبر ۴۷/۴ ہے۔ جس پر "میر حسن کی غزلوں کا ایک نادر مخطوطہ" کے عنوان سے عابد رضا خاں رامپوری (بیدار) نے ایک مقالہ نگار دسمبر ۱۹۵۲ء میں لکھا (ص۴۲ تا ص۴۶) اور اسے

---

(۱) دتاسی جلد اول ص۵۲۸ ببعد

میر حسن دہلوی کی ملک ٹھہرا یا ہے حالانکہ یہ ایک رامپوری شاعر مرزا کاظم حسین حسن بن مرزا احسن۔ متوفی ۲۳ جمادی الآخر ۱۲۸۲ھ کا کلام ہے۔ کاظم حسین کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بھی ہے۔

(۲۵) دیوانِ حسن۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں دیوانِ حسن کے نام سے ؟ فی عدا پر ایک مختصر قلمی دیوان درج ہے۔ بغور دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ نقی ہوسس کا دیوان ہے۔

(ب) بیاضیں جن میں حسن کا کلام موجود ہے۔)

(۱) ۱۲۴۶ھ کا لکھا ہوا ایک قدیم قلمی مجموعہ جس میں ۱۳۲۱ غزلیں ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب کے کتب خانہ میں ہے۔ اس میں ۴۵ غزلیں حسن کی بھی ہیں[۱]

(۲) بیاضِ شعرائے اردو۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ آذر کلیکشن۔ مجموعہ اشعار جس میں مختلف شعرا کی غزلیات ہیں۔ نام کاتب و سنہ کتابت نامعلوم۔ اس میں میر حسن کی غزلیات بھی پائی جاتی ہیں[۲]

(۳) بیاضِ غزلیات ۲۳۹۰ [۷۰۴] میں اور شعرا کی غزلوں کے علاوہ حسن کی غزل بھی[۳] فہرست کتاب خانہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن میں زور لکھتے ہیں" غالباً یہ غزل محمد حسن خاں کی ہے۔ جو مدراس میں سرکارِ کمپنی کے مدرس تھے۔ جنہوں نے ۱۲۵۸ھ میں وفات پائی۔ مطلع:

کروں شکوہ تو ہے وسواس میں اس کے نہ آنے کا
نہ ہو دھڑکا مرے دل میں گر اس کے روٹھ جانے کا

مقطع — حسن تو ہر کسی سے حالِ دل کہتا پھرے ہے کیوں

---

(۱) بحوالہ مکتوب اگست ۱۹۵۵ء (۲) دیکھو ایکسیشن نمبر ۴۵۸۷ (۳) بحوالہ فہرست مخطوطات مرتبہ ابو الخیر عبد اللہ قلمی

عبث بدنام ہوگا اور نہیں کچھ اس میں پانے کا[۱]

یہ غزل میر حسن صاحب مثنوی سحر البیان کی ہے۔

(۴) بقول اسپرنگر توپ خانہ میں مثنوی خوانِ نعمت کے ساتھ میر حسن کی ۹ غزلیں بھی درج ہیں (فہرست ص۶۰۹)

(۵) ایک بیاض خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب کے پاس بھی ہے جس میں میر حسن کی غزلیں پائی جاتی ہیں (افسوس داؤدی صاحب نے یہ بیاض وعدوں کے باوجود نہیں دکھائی)

(ج) تذکرہ شعرائے اردو — (۱) نسخہ ندوۃ العلماء (کل ورق ۳۴۵)

(۲) نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال[۲] (۳) نسخہ مملوکہ قاضی عبدالودود صاحب جس کے آخر میں تاریخ تصنیف ۱۱۸۹ھ درج ہے[۳]

(۴) نسخہ رضا لائبریری رامپور: مصنف کا نسخہ معلوم ہوتا ہے[۴]۔

(۵) نسخۂ ذخیرۂ شیرانی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کاتب کا نام درج نہیں۔ سنہ کتابت ندارد۔ نسخہ اغلاط سے خالی نہیں۔ شیرانی صاحب کے رجسٹر میں اس کا نمبر ۴۹۶ ہے۔ اب ایکسیشن نمبر ۲۶ /۱۵۴۹ ہے۔

(۶) نسخۂ ذخیرہ شیرانی۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ناقص الاخر۔ کل اوراق ۲۶ حسرت کے حال پر رہ جاتا ہے۔ شیرانی صاحب نے اپنے رجسٹر میں اس نسخے کے بارے میں لکھا ہے: "انجمن ترقی اردو کے مطبوعہ نسخے کے ساتھ مقابلہ سے معلوم ہوا کہ یہ نہایت صحیح ہے۔ اور نسخہ مطبوعہ میں اصلاح کی گنجائش ہے[۵]۔"

---

(۱) فہرست مخطوطات بعنوان تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول۔ مرتبہ زور ص۲۸۸ (۲) نوٹ طبع ثانی کتاب مذکور ص۳۵ (۳) حواشی تذکرہ ابن طوفان ص۲۰ (۴) مقدمہ دستور الفصاحت ص۴۹ (۵) انجمن ترقی اردو کے تذکرہ شعرائے اردو کی اشاعت اول کن قلمی نسخوں پر مبنی تھی۔ اس کا حال نہ کھلا۔

(۳) **گلزارِ ارم** :- (۱) ایک خوشخط نسخہ عمدۃ العلماءؒ کے کتب خانے میں ہے [۱]
(۲) ایک خوشخط نسخہ ڈناسی کے پاس تھا [۲]
(۳) سنہ کتابت ۱۲۲۲ھ کتاب خانۂ انجمن ترقیٔ اردو کراچی [۳]

(۴) **خوانِ نعمت** : (۱) اس کا ایک قدیم نسخہ مولانا عبدالباری (مرحوم) کے کتب خانے میں تھا [۴]

(۲) اسپرنگر کی اطلاع ہے کہ توپ خانے میں آصف الدولہ کی تعریف میں میر حسن کی ایک مثنوی ہے جو تیس اوراق پر مشتمل ہے اور ہر صفحے پر چھ بیت ہیں۔ مثنوی کا پہلا شعر ہے
سہ لکھوں کیا میں ثنا دستے) حمد رزاق ÷ کہ گویائی کی طاقت ہے یہاں طاق [۵]
یہ مثنوی خوانِ نعمت کا پہلا شعر ہے۔

(۵) **سحر البیان** :- مثنوی سحر البیان کے ۵۲ نسخے اب تک معلوم ہو سکے ہیں۔ یہ مثنوی سب سے زیادہ مقبول تھی۔ نسخے ہر شہر میں خاصی تعداد میں مل سکتے ہیں۔ اس لئے مثنوی کے نسخوں کی یہ فہرست مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔
(۱) کتب خانہ لکھنؤ یونیورسٹی [۶] (۲)، (۳)، (۴)، (۵) (۶) پانچ قلمی نسخے کتب خانہ رضائیہ رامپور [۷] (۷) سبحان اللہ کلیکشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ نسخہ مکتوبہ ۱۲۰۶ھ (بیاض فالق) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں۔ "میرے پاس سحر البیان کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۲۰۶ھ ہے" [۸] میں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ وہ سبحان اللہ کلیکشن کے نسخے کا حوالہ دے رہے ہیں یا یہ ان کا ذاتی نسخہ ہے۔ جو اسی سنہ کا مکتوبہ ہے۔

---

(۱) گلِ رعنا ص ۲۳۵ (۲) ڈناسی جلد اوّل ص ۵۲۸ بعد (۳) بحوالہ مکتوب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء (۴) دیباچہ مثنویات ص ۱۳ (۵) فہرست مخطوطات ص ۶۰۹ (۶) بحوالہ مکتوب سید مسعود حسن رضوی۔ ۱۱ اگست ۱۹۵۱ء (۷) مرثی دستور الفصاحت ترجمہ میر حسن (۸) لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۳۵۸

ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو، علی گڑھ کے اس نسخے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔
مثنوی میر حسن دہلوی۔ یونیورسٹی اردو ادب: ۶۲ ابتدائی اوراق
غائب۔ تعداد اوراق معلوم نہیں۔ سطر ۱۵
ابتدا: جہاں فیض سے ان کے ہے کامیاب :: بنی آفتاب و علی ماہتاب
ترقیمہ: نسخہ کتاب مثنوی تصنیف میر حسن بتاریخ ۱۶ شعبان المعظم ۱۲۰۶ھ مکتوبہ شیو راج سنگھ برائے خاطر داشت لالا مان سنگھ۔

(۸) "مثنوی قصۂ بے نظیر و شاہ بدر منیر من تصنیف میر حسن علی دکنا) بدستخط بندہ تاراچند تحریر بتاریخ ۲۸ بساکھ ۱۹۱۶ھ" (ترقیمہ) یہ مثنوی داستان مسمی بنوں (فارسی) مصنفہ اندر سین (د محمد شاہ) کے ساتھ ایک ہی جلد میں اور اسی قلم سے لکھی ہوئی ہے مملوکہ محمد حسن صاحب صدیقی ہیڈ ماسٹر ڈی بی ہائی سکول گگھڑ۔ نسخے میں املا کے اغلاط بہت زیادہ ہیں۔

(۹) ورق ۹۹ آخری قطعہ ہائے تاریخ درج نہیں ہیں۔ بلکہ تین ورق خالی۔ کاغذ اور رسم الخط سے تیرھویں صدی کے آخر کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔ مملوکہ عبدالمجید گوجر گوجرانوالہ
(۱۰) پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے B کا ماخذ ما حسن کی وفات کے ۳۵ برس بعد لکھا گیا
(۱۱) " " " " C ۱۲۷۳ھ
(۱۲) مکتوبہ ۷ ار رجب ۱۲۲۶ھ علاقہ مالوہ میں لکھی گئی۔ (انڈیا آفس کیٹلاگ بلوم ہارٹ ص ۲۳)
(۱۳) مصور نسخہ سو عدد تصاویر، کاتب دیپ چند کھتری مکتوبہ ۲۰ اپریل ۱۸۲۱ء (ایضاً)
(۱۴) نمبر ۱۲۲ کاتب سید رضا حسن المکتوبہ ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۵۴ھ [ایضاً ص ۴۴]
(۱۵) نمبر ۲۲۵ ایک مجموعہ مثنویات جس میں ابتدائے ورق ۴۰ ب تک سحر البیان ہے مکتوبہ دہم ذی الحجہ ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۷ جلوس [ایضاً ص ۱۲۳، ۱۲۴]
(۱۶) نمبر ۷۰ (ترقیمے میں حسن کو مرحوم لکھا ہے) (برٹش میوزیم کیٹلاگ ص ۳۶)

(۱۷) ۱۷ اس پر ڈاکٹر Paughill کی ۱۲۱۲ھ کی مہر ہے (ایضاً)

(۱۸) بخطِ نستعلیق (باڈلین لائبریری کیٹلاگ کالم ۲۹۵ نمبر ۲۳۲۶ (۱۹))

(۱۹) سنہ کتابت ۱۲۰۹ھ [کتاب خانہ انجمن ترقیٔ اردو کراچی ۔ بحوالہ مکتوب مولوی عبدالحق صاحب ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء]

(۲۰) ۱۱۹۹ھ [ایضاً] (۲۱) سنہ کتابت درج نہیں ۔ [ایضاً]

(۲۲) سنہ کتابت درج نہیں [ایضاً] (۲۳) مصور نسخہ "بدستخط محمد منیر شاہ کتابت ہفتم جمادی الثانی ۱۲۳۱ھ در خطۂ کشمیر" (ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب کی معرفت یہ نسخہ دیکھنے کو ملا اب نیشنل میوزیم کراچی کی ملک ہے ۔) (۲۴) مصور نسخہ عجائب گھر لاہور

(۲۵) سحر البیان مع دیباچۂ افسوس ۔ مملوکہ مولوی محمد شفیع صاحب (اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۴۶ء) اس مصور نسخے کی تصاویر عجائب گھر کے نسخے سے ملتی جلتی ہیں ۔ مغلیہ مصوری کے انحطاطی دور کی یادگار ہے ۔ رنگوں کی ترتیب میں بے پروائی سے کام لیا ہے ۔ شبیہیں سکھوں سے مشابہ ہیں ۔ کل چھ رنگین تصویریں اور چند خاکے ہیں ۔ ایک دو جگہ خاکے بھی نہیں ہیں ۔ صرف خالی جگہ چھوڑ دی گئی ہے ۔ تعداد صفحات ۲۳۸ ترقیمہ ناتمام ہے نسخہ لاہور میں لکھا گیا ۔ اس کا متن بہت حد تک صحیح اور قدیم معلوم ہوتا ہے ۔

(۲۶) ناقص الطرفین نمبر ۱ آذر کلیکشن پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

(۲۷) نمبر ۱۱ کاتب فتح علی سنہ کتابت ۱۲۶۰ھ آذر کلیکشن [ایضاً]

(۲۸) نمبر ۲۱ مجدول سرخ ۔ جدید الخط (ایضاً)

(۲۹) نمبر ۲۷ مجدول سرخ ۔ ۵ سمت کاتب نامعلوم (بحوالہ فہرست مخطوطات مرتبہ ابوالخیر عبداللہ قلمی)

(۳۰) نمبر ۱۷ اوراق بدر منیر ۔ اسے آذر صاحب نے اپنی فہرست میں دیوان میر تقی میر بخط مصنف لکھا تھا ۔ ابوالخیر عبداللہ صاحب کی فہرست میں لکھا ہے کہ یہ بدر منیر کے اوراق ہیں ۔ (ایضاً) (۳۱) نمبر ۵۱۲ کاتب اقبال علی ۷ صفر ۱۲۸۰ھ شیرانی کلیکشن

پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور (بحوالہ فہرست ابوالخیر عبداللہ علمی)

(۳۲) نمبر ۴۹۹ - تاریخ ندارد (ایضاً)

(۳۳) نمبر ۱۴۰۲ فروری ۱۸۱۶ء بخطِ باگلشن بمقام بنارس (ایضاً)

(۳۴) ناقص الطرفین باعراب - نمبر ۱۸۶۲ (ایضاً)

(۳۵) نامکمل نسخہ - اوراق ۹۲ - نمبر ۱۹۸۴ حاشیوں پر تصحیح موجود ہے۔ مرتب فہرست مخطوطات (ابوالخیر عبداللہ) کی رائے میں مصنف کا نسخہ معلوم ہوتا ہے (ایضاً)

(۳۶) نمبر ۶۸ و ۵۱۶ - ۱۲۷۰ھ سے قبل کا نسخہ نوبہارِ عشق کے ساتھ ایک ہی جلد میں بندھا ہے[1]۔

(۳۷) نمبر ۶۹ ، ۱۴۷ - کاتب میر محسن علی ۱۴ جمادی الاول ۱۳۰۳ھ بمقام حیدرآباد دکن (ایضاً ص ۹۶)

(۳۸) نمبر ۷۰ ، ۵۱۸ کاتب غلام حسین ۱۲۲۳ھ بمقام بیدر (ایضاً ص ۹۷)

(۳۹) نمبر ۷۲ ، ۳۷۳ سنہ کتابت ۱۲۳۹ھ (ایضاً) ص ۲

(۴۰) (۴۱) (۴۲) "کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں سحرالبیان کے دو قلمی نسخے ہیں۔ ان میں ایک زیادہ قدیم خوشخط مطلا ہے جو ۱۲۰۸ھ یعنی مصنف کی وفات کے سات سال بعد لکھا گیا۔ دوسرا بھی قدیم ہے۔ جو مصنف کی وفات کے اکیس سال بعد ۱۲۲۲ھ ۱۸۰۷ء میں بمقام برہان پور مکتوب ہوا[2]۔ (برہان پوری نسخے کے) آخر

---

(۱) تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول مرتبہ محی الدین قادری زور - ادارۂ ادبیات حیدرآباد دکن کے کتب خانے کی فہرست (دکن ۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء) (۲) اس کے علاوہ ایک نسخہ اور بھی ہے۔ اس پر سنہ کتابت تحریر نہیں۔ لیکن منشی شیر علی افسوس کا دیباچہ ہے۔ دیباچہ شروع سے مکمل ہے۔ لیکن کاتب نے آخر کا کچھ حصہ حذف کر دیا ہے۔ دیباچہ کے خاتمے پر شعر درج ہے۔ یہ مہدت غنیمت ہے کر لے وہ کام کہ جس سے رہے تا ابد نیک نام۔ مگر صاحبِ مہر کا نام پڑھا نہیں جاتا البتہ مہر پر ۱۲۳۷ھ لکھا ہوا ہے۔

آخر میں حسبِ ذیل تاریخی قطعہ ہے۔ جو مطبوعہ نسخوں میں نہیں پایا جاتا۔

ہیں مرزا مغل میرے اک آشنا
یہ قصّہ مجلا مرے پاس لا

کہا اس کو ٹک تم مطالعہ کرو
کہ اس کے معانی پہ تم دل دھرو

یہ کہہ کر حسن نے کہانی کہی
یہی سچ کہ ہے طور اس کی نئی

کہی اس کی تاریخ یاروں نے مل
کہ جو تھے وہاں سب کے سب اہلِ دل

میاں مصحفی و رفیق و شفیق (وکذا)
کہ سید حسن کے ہیں دونوں رفیق

کہا تم کو ہے ذوق تاریخ کا
کہو خوش ہو تاریخ سے دل مرا

اس عاصی کو بھی ان کی خاطر عزیز
ہے خاطر سے بہتر نہیں کوئی چیز

سنو یارو اب مجھ سے تاریخ کو
برائے خدا اس کی ٹک داد دو

کہ تاریخ تعمیہ میں ہے کمال
وہ غافل جو رکھتا ہے اس کا خیال

بنائے زکا حسن بدر منیر
کہ تاریخ قصّہ کی ہے بے نظیر

ہزار آفریں اس کے ناظم کو ہو
الٰہی حسن کو رکھیو سرخرو[1]

ان میں سے نسخہ نمبر ۲ اور نمبر ۳ کا ذکر مرتب فہرست کتاب خانۂ آصفیہ نے بھی کیا ہے "قلمی نمبر ۱۶۱۔ سنہ کتابت ۱۲۲۲ھ و قلمی نمبر ۳۴ ۱۲۷۶ھ کا قلمی نسخہ گلزار نسیم اندر سبھا وغیرہ کے ساتھ ایک جلد میں بندھا ہوا ہے"[2]

(۲۴) ایک نسخہ سحر البیان[3]

---

(۱) بنائے زکا کہ الف است آں را دو کند و باقی عدد آں را گرفتہ یعنی عدد ز۔ک با عدد بے نظیر مخلوط سازد مدعا حاصل شود۔ یعنی تاریخ برمی آید زک بے نظیر ۱۱۹۹ھ (دیباچہ رموز العارفین۔ طبع حیدرآباد ۱۷ ص ۱۸ (۲) فہرست کتاب خانۂ آصفیہ سرکار عالیہ ۱۳۳۲ھ جلد دوم ص ۱۲۹۶ (۳) سیر نگر ص ۶۰۹ نمبر ۶۲۵ — H

(۴۴) کتاب خانہ پروفیسر وزیر الحسن عابدی میں دیوانِ سودا اور مثنوی گل و صنوبر کے ساتھ سحر البیان کا ایک ناقص الآخر نسخہ ایک جلد میں بندھا ہے۔

(۴۵) نمبر ۵ سحر البیان (قلمی) کتابت ۱۲۱۷ھ مصور نسخہ تعداد تصاویر ۲۹۔ دکنی اسکول کی تصاویر۔ (فہرست حیدرآباد کے عجائب خانے کی اردو قلمی کتابیں از نصیر الدین ہاشمی نوائے ادب اپریل ۱۹۵۵ء، ص ۴۲، ص ۴۳)

(۴۶) نمبر ۶ بخطِ نستعلیق دکنی اسکول کی ۵۰ تصاویر (ایضاً ص ۴۴)

(۴۷) نمبر ۷ بخطِ نستعلیق دکنی اسکول کی ۱۰ تصاویر (ایضاً ص ۴۴)[۱]

(۴۸) گارساں دتاسی کے کتاب خانے میں سحر البیان کا ۱۸۹۵ء کا مکتوبہ نسخہ موجود تھا۔[۲]

(۴۹) کتاب خانہ انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) میں سحر البیان کا ایک نسخہ ہے۔ (نمبر ۴۳/۱۴/۵۵۱/۸۹۱) کاتب غلام محمد خاں بہادر فرزند امام الملک مرحوم و مغفور سالِ کتابت ۱۲۴۹ھ اوراق ۸۰ ابتدا میں نثر اردو کا وہ مقدمہ بھی ہے جو شیر علی افسوس نے لکھا ہے۔ اس کا ابتدائی ورق موجود نہیں۔ الفاظ مشکول و مضبوط یعنی زبر زیر وغیرہ کا التزام ہے۔ حاشیے پر کاتب نے مندرجہ ذیل مثنوی نقل کی ہے۔ پہلے اور آخری شعر یہ ہیں۔

دلِ سوزاں نے اور نے چشمِ پُر نم	رکھ الٰہی آب دا تش میں مرا دم
الٰہی عاشقوں کی آبرو رکھ	انہوں کو دو جہاں میں سرخ رو رکھ[۳]

---

(۱) کتاب خانہ نواب سالار جنگ میں کئی باتصویر نسخے ہیں۔ (ہاشمی ص ۴۳)

(۲) نوائے ادب۔ بمبئی جنوری ۱۹۵۸ء، ص ۳۳ (۳) بحوالہ مکتوب ڈاکٹر مختار الدین مورخہ ۱۶ جون ۱۹۵۸ء۔

(۵۰) پنجاب پبلک لائبریری میں نمبر اط ۹ ۲۲۳ (۲) ۴۴ ، ۸۵۱ مث مثنوی میر حسن کرم خوردہ لوح و زرد اور سرخ رنگوں سے معمولی نستعلیق میں آخر ترقیمہ درج ہے۔ کاتب کا نام الٰہی بخش جو عطر سنگھ کا متوسل تھا سنہ ہجری ۱۲۳۰ھ درج ہے

(۵۱) مثنوی میر حسن دھلوی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا نسخہ) ضمیمہ یونیورسٹی اردو ادب : ۲ اوراق ۱۳۷ سطور = ۱۵ ۔ مکتوبہ عبدالستار ... ن الدین در ۱۲۶۱ھ ۔ یہ نسخہ مصور ہے۔ تصویریں معمولی۔

(۵۲) مثنوی میر حسن دھلوی [مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا نسخہ] ضمیمہ یونیورسٹی ادب اردو ۱ تعداد اوراق مندرج نہیں سطور = ۹ خوشخط ۔ پہلا صفحہ ناقص ۔ آخری شعر : معلم اتالیق و منشی ادیب ہر اک فن کے استاد بیٹھے ... یب پھر تصویر بنانے کے لئے سادہ جگہ چھوڑ دی گئی ہے ۔ نام کاتب وغیرہ درج نہیں۔

(ش) ایک اور مثنوی (۱) "مثنوی میر حسن غیر مطبوعہ" کے عنوان سے ۱۹۱۸ء کی اردو کانفرنس کی نمائش کتب میں جناب حشمت برنی نے ایک قلمی نسخہ پیش کیا جو ناقص الاول تھا۔ یہ مثنوی ایک دوسرے حسن کی ہے ۔ اور چھپ چکی ہے سنہ تالیف ۱۲۵۰ھ ہے۔ یعنی میر حسن صاحب سحر البیان کی وفات کے ۵۰ سال بعد یہ لکھی گئی ۔ پنجاب پبلک لائبریری میں اس کے دو مطبوعہ نسخے موجود ہیں۔ ایک نولکشوری پریس ... در ۱۸۸۱ء (صفحات ۷۵) نمبر ۳۴ ، ۸۵۱ گل ۔ دوسرا نسخہ ماہ نومبر ۱۸۸۳ء (مطابق ۱۳۰۱ھ (صفحات ۷۶) اول الذکر نسخے میں آخری اشعار یوں ہیں سے

جب ہوا اس مثنوی کا اختتام	تھے سنین ہجرت خیر الانام
اے برادر بالیقین بے ریب و شک	یک ہزار و دو صد و پنجاہ و یک
نام حق پر ختم کر اپنی کتاب	اے حسن واللہ اعلم بالصواب

(ح) رموز العارفین: ۔ (۱) جدید الخط نسخہ، مملوکہ سید احمد اللہ[1]

(۲) خوش خط مخطوطہ مملوکہ سید محمد حسین بلگرامی سابق صدر محاسب سرکار عالی۔ مکتوبہ ۱۱ محرم ۱۳۰۲ھ۔ اسی پر سید احمد اللہ صاحب نے اپنے اڈیشن کی بنیاد رکھی۔ [الیضاً]

جائزہ: ۔ ان قلمی نسخوں میں سب سے اہم مندرجہ ذیل نسخے ہیں :۔

(۱) دیوانِ حسن ... کے خیال میں مصنف کا خود نوشت ہے۔[2]

(۲) سحر البیان کا نسخہ جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی میں ہے اور حک و اصلاح کے آثار ہیں۔ یہ مصنف کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔

(۳) سحر البیان کا ۱۱۹۹ھ کا مکتوبہ نسخہ جو انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں ہے (۴) سحر البیان (مکتوبہ ۱۳۰۶ھ) سبحان اللہ کلیکشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۵) تذکرہ شعرائے اردو کا نسخہ جو رضا لائبریری رامپور میں ہے۔ عرشی صاحب کا خیال ہے کہ مصنف کا نسخہ ہے۔

(۶) رموز العارفین کا قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۳۰۲ھ جو سید محمد حسین بلگرامی (حیدرآباد دکن) کے کتب خانے میں ہے۔

(۳)
تعین زمانہ

ان تصانیف کے زمانے کا تعین بھی ضروری ہے :۔

دیوان اسلوب کے اعتبار سے دیوانِ حسن میں دو قسم کی چیزیں ملتی ہیں۔

---

(۱) دیباچہ رموز العارفین ص ۲۱ (۲) اس کے آخر میں ۲۵ ذی الحجہ ۱۱۹۲ھ درج ہے۔

ضیا کی طرز میں کہی ہوئی غزلیں اور سودا، میر، سوز، درد، حسرت وغیرہ کے انداز کی چیزیں۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ پہلی طرز کی چیزیں ۱۱۸۶ھ سے قبل کہی ہوں گی اور باقی غزلیں اس تاریخ کے بعد۔ تذکرے میں مثنوی رموز العارفین۔ ترکیب بند۔ (جسے اکثر نسخوں میں واسوخت کے نام سے یاد کیا گیا ہے) سات آٹھ ہزار ابیات کا ذکر ہے۔ ۱۱۸۹ھ تک اتنا اثاثہ ہو چکا تھا۔ سپرنگر کے بیان کو ملحوظ رکھا جائے تو دیوانِ حسن ۱۱۹۲ھ تک ترتیب بھی پا چکا تھا۔ اگرچہ دیباچے کی نوبت بعد میں آئی ہوگی۔ کلیاتِ حسن دماغی کرو قلم میں ایک غزل کے مقطع میں سودا کی وفات کے بعد اسے یاد کیا ہے۔ یہ غزل یقیناً ۱۱۹۵ھ کے بعد کہی گئی۔ غزلیات کے اشعار کی مجموعی تعداد آٹھ ہزار سے اوپر ہو تو تعجب نہیں۔

مثنوی در شادیٔ آصف الدولہ: جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے آصف الدولہ کی شادی پر یہ مثنوی کہی گئی ہے اور اس میں شجاع الدولہ کا ذکر بطور زندہ شخص کے کیا گیا ہے۔ آصف الدولہ کی شادی ۱۱۸۳ھ میں فیض آباد میں ہوئی تھی۔ اس لئے یہ مثنوی اس موقع پر کہی گئی۔

رموز العارفین: رموز العارفین کی تالیف کا سنہ حسن نے خود بھی مثنوی کے آغاز میں دے دیا ہے جو ۱۱۸۶ھ ہے۔ حبیب الرحمٰن خاں شروانی (متخلص بہ حسرت) رسالہ مخزن اپریل ۱۹۱۰ء میں رموز کا یہی سنہ دے کر لکھتے ہیں۔

"مثنوی سحر البیان کے انیس برس بعد رموز لکھی گئی" یہ درست نہیں۔ رموز ۱۱۸۶ھ میں اور سحر البیان ۱۱۹۹ھ میں تحریر ہوئی۔ رموز کی تالیف کا سنہ خود مثنوی میں موجود ہے:۔

جب بھرا دِۂ معانی سے یہ تشت ۔۔۔ تھے ہزار و یک صد و ہشتاد و ہشت ۱۱۸۸ھ

رباعیات: دیوان میں چند رباعیاں شجاع الدولہ کی وفات ۲۳/۲۴ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ)

بھی کبھی ہو بہو پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح ایک رباعی حافظ رحمت خاں پر شجاع الدولہ کی فتح کے بارے میں مع شانِ نزول درج ہے۔ (۱۱۸۸ھ) باقی ماندہ رباعیات کا تعین زمانہ ممکن نہیں۔

گلزارِ ارم:۔ یہ مثنوی ۱۱۹۲ھ میں کہی گئی ؎

زبس وصفِ گل و گلشن بہم ہے   سو اس کا نام "گلزارِ ارم ہے"[1]

فردیات: طوائفوں کی شان میں اشعار میر قاسم علی خاں کی شادی پر لکھے گئے۔ شادی کے وقت قاسم علی خاں اگر کم از کم ۱۴ برس کے بھی تھے جب بھی یہ اشعار ۱۱۹۴ھ کے قریب لکھے گئے ہوں گے۔ اسی طرح بسنت علی خاں خواجہ سرا کی تعریف میں مندرجہ ذیل دو شعر مع نوٹ موجود ہیں۔ "در موسمِ بہار برائے بسنت علی خاں گفتہ گزرانیدہ شد ؎

سرسوں نے اب خزاں سے تو خاطر بجمعت کی ٭ جاناکہ پاس ہے مرے پلٹن بسنت کی

حسن کا دوست جو ہو کیوں نہ ہو مشہورِ عالم میں ٭ باخلاقِ حمیدہ اور با اوصافِ پسندیدہ

یہ کلیاتِ حسن کے مائیکروفلم سے لئے گئے ہیں "قلمی نسخہ مملوکہ عبدالعلیم شیرکوٹی میں نوٹ درج نہیں اور پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ بھی اسی طرح ہے۔۔"

جاناکہ پاس ہے مرے دل میں بسنت کی

بسنت علی خاں خواجہ سرا بقول تاریخ اودھ[2] ۲۷ صفر ۱۱۹۵ھ میں بمقام اٹاوہ قتل ہوا۔ اشعار اس تاریخ سے قبل لکھے گئے ہوں گے اور عجیب نہیں اگر فیض آباد میں خانۂ حسن کی آتش زدگی سے قبل لکھے گئے ہوں۔ کیونکہ کلیات میں ان فردیات کا سات اور آٹھ نمبر ہے۔ اس سے قبل ۶ فرد ہیں ان کے اوپر مائیکروفلم میں

---

(۱) اس زمانے کے عام اطائف میں "گلزار ارم" سے تاریخ نکالی ہے۔ (۲) نجم الغنی جلد سوم صـ۹۷ تا صـ۱۰۷۔

نوٹ ہے: از فردیاتِ متفرقہ، مسودہ ہا کہ در آتش سوختہ شد۔ آنچہ بیاد آید [نوشتہ شد؟]

تذکرۂ شعرائے اردو: میر حسن کے تذکرۂ شعرائے اردو کا زمانۂ تالیف طبع اول کے دیباچے میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں :۔ "یہ تذکرہ میر حسن نے اس زمانے میں لکھا جب کہ دلی کو خیرباد کہہ کر فیض آباد میں سکونت پذیر تھے۔ چنانچہ خود اپنے حال میں لکھتے ہیں۔ "شروع جوانی از گردش روزگار ... بطرفِ لکھنو و فیض آباد رسیدم" تذکرہ ہذا میں میر صاحب نے جو فہرست اپنی تصانیف کی لکھی ہے اس میں "مثنوی رموز العارفین" ہے "گلزار ارم" نہیں ہے۔ رموز العارفین کا سالِ تصنیف ۱۱۸۸ھ ہے۔ اور گلزارِ ارم کا ۱۱۹۲ھ۔ رموز العارفین کی نسبت لکھا ہے کہ وہ مشہور ہو چکی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا" [۱]

طبع اول کی نوبت ۱۹۲۱ء میں آئی تھی۔ طبع ثانی ۱۹۴۰ء میں ہوئی اور متن کا مقابلہ بعض دوسرے قلمی نسخوں سے بھی کیا گیا ہے۔ جن میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا نسخہ قابلِ ذکر ہے طبع جدید میں بھی وہی قدیم دیباچہ من وعن شامل ہے۔ البتہ کتاب کے آخر میں ایک ترقیمہ اضافہ کیا گیا ہے۔ جس میں تذکرے کی تالیف کا کچھ اور حال معلوم ہوتا ہے۔

"الحمد للہ والمنۃ کہ این تذکرہ من تالیف فقیرِ حقیر، بہ دردہ رنج و محن، میر حسن در تاریخ یک ہزار و یک صد و نود و یک ہجری

---

(۱) مقدمۂ تذکرۂ شعرائے اردو طبع اول

بہ اتمام رسید۔"[۱]

ان اقتباسات پر بحث کرتے ہوئے محمود فاروقی صاحب "میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعراء" میں لکھتے ہیں " یہ تخمینہ[۲] اپنی جگہ پر درست ہے لیکن اب یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ میر حسن نے اپنا تذکرہ ۱۱۹۱ھ میں ختم کیا تھا۔"[۳]

رام بابو سکسینہ اپنی کتاب میں تذکرہ کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

The date of the composition is not mentioned but an examination of various dates mentioned in the body of the "Tazkira" points out 1194 A.H. (1780 A.D) as the approximate date of composition, when Sauda was seventy years of age."[۴]

مرزا محمد حسن عسکری اس اقتباس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں: "اس کا سالِ تصنیف کہیں مذکور نہیں مگر ان تاریخوں سے جو خود تذکرہ میں موجود ہیں۔ ۱۱۹۴ھ بہت قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اور یہ سن تھا جبکہ مرزا رفیع سودا کی عمر ۷۰ برس کی تھی۔"[۵]

مولانا عبدالباری آسی ۱۱۹۲ھ اور ۱۱۹۱ھ کے حق میں معلوم ہوتے ہیں

---

(۱) خاتمہ طبع ثانی (۲) تصنیف مابین ۱۱۸۸ھ، ۱۱۹۲ھ (۳) میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعراء ص ۲۴۸ (۴) A history of Urdu Literature p. 76 (۵) تاریخ ادب اردو طبع لاہور ص ۱۲۵۔

"اگرچہ سنہ تصنیف کا کہیں تذکرہ میں ذکر نہیں تاہم محققین کا خیال ہے کہ یہ ۱۱۹۱ھ یا ۱۱۹۲ھ کی تصنیف ہے۔ تاریخِ ادبِ اردو میں ۱۱۹۴ھ اور مقدمہ تذکرہ میں ۱۱۸۰ھ و ۱۱۹۲ھ لکھا ہے" [۱]

رام بابو سکسینہ کا استدلال سودا کے ترجمے پر مبنی ہے۔ سودا نے رجب ۱۱۹۵ھ میں وفات پائی۔ وفات کے وقت اس کی عمر بقولِ صاحبِ گلشن ہند و صاحب آبِ حیات ستر برس تھی۔ تاریخ ولادت ۱۱۲۵ھ ہو گی تو یہ حال ۱۱۹۴ء میں لکھا گیا ہو گا۔ کیونکہ تالیفِ تذکرہ کے وقت بقولِ میر حسن "سن شریفش بہ ہفتاد رسیدہ باشد" لیکن سکسینہ کا یہ خیال غلط ہے۔ کیونکہ میر حسن خود اسی اقتباس میں کہتے ہیں "الحال درسرکارِ نواب شجاع الدولہ بہادر بہ دستیاری سرفراز است" شجاع الدولہ بہ اتفاق مورخین ۱۱۸۸ء میں فوت ہوئے اس لئے سکسینہ کا قیاس درست نہیں ہے کہ میر حسن نے سودا کا حال ۱۱۹۴ء میں لکھا۔

مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے دستور الفصاحت کے دیباچے میں تذکرہ حسن کی تالیف کا زمانہ متعین کرتے ہوئے لکھا ہے

"خود میر حسن نے تکمیلِ تذکرہ کا سنہ ۱۱۹۱ھ قائم کیا ہے۔ اس سے یہ قیاس کرنا بجا ہے کہ کتاب کی تالیف و ترتیب کا کام ۱۱۹۱ء (۱۷۷۷ء) میں ختم ہو گیا تھا البتہ بعد میں کچھ مصنف نے اضافے کئے ہیں جن میں ایک شاہ فتح کی تاریخ وفات ہے — جو ۱۱۹۲ھ (۱۷۷۸ء) میں واقع ہوئی تھی"

اب اس کے سالِ آغاز کا مسئلہ باقی رہتا ہے۔ کتاب کے

---

(۱) دیباچۂ مثنویاتِ میر حسن ص ۲

مختلف مقامات سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ سب سے پہلے
"رموز العارفین" مصنفہ ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ء) کا ذکر ہے۔
جیسا کہ صدر یار جنگ بہادر نے ارشاد فرمایا ہے۔ اس کے
ماسوا احسن اور سودا کے حال میں لکھا ہے کہ یہ دونوں نواب
شجاع الدولہ بہادر کی سرکار میں ملازم ہیں۔ جس کے یہ معنی ہیں
کہ یہ حالات شجاع الدولہ کی زندگی میں لکھے گئے۔ شجاع الدولہ
۲۴ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ کو فوت ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ حالات اسی
تاریخ سے پہلے لکھے گئے ہوں گے۔ اسی طرح نواب محمدؐ یار خاں
بہادر "متوفی ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ کو" خدا قائم دارد" لکھا ہے۔
گویا ان کا حال بھی اس ماہ و سال سے پہلے لکھا ہے۔ اب یہ طے
کرنا چاہیے کہ نواب شجاع الدولہ اور نواب محمد یار خاں بہادر
کے انتقال سے کتنا پہلے کام شروع کیا۔ مرزا مظہر کے بارے میں
میر حسن لکھتے ہیں: "الحال بطرفِ متصل مراد آباد استقامت
دارد و ہماں جا وعظ می فرمایند"۔

مرزا مظہر علیہ الرحمۃ کے ایک خط میں ان کے سفرِ روہیل کھنڈ
کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس خط کو شاہ نعیم بہرائچی نے معمولات
مظہریہ میں نقل کیا ہے۔ مرزا علی صاحب اپنے مرید پیر علی کو لکھتے
ہیں: "آنچہ از عالم تدبیرِ معاش نوشتہ اند بجا است اما فقیر را
طاقتِ حرکت و دماغِ سیر و سیاحت ہرگز نماندہ۔ برائے پرداخت
یارانِ طریقہ کہ از اطراف ہجوم کردہ اند، آمدہ ام۔ بعد دو
ماہ بدہلی روم کہ متعلقان آنجا ہستند و از ہر طرف فتنہ قصدِ دہلی

می کند۔ بایں ہمہ دنیاداران این حدود با فقیر معرفتی ندارند، عقیدت معلوم — یاد ندارند کہ روزِ ملاقات این قصہ را باشما گفتہ ام کہ خانساماں بخشی، یعنی فتح خاں و سردار خاں را در تمام عمر خود گاہی ندیدہ ام و دوندے خاں را کہ ارادۂ ملاقاتِ فقیر داشت منع کردم کہ نیاید و حافظ رحمت خاں کہ پیشِ فقیر حاضر شدہ بود۔ صحبتِ او با فقیر نادرست افتاد۔ و پسرانِ علی محمدؐ خاں را ہرگز نمی شناسم۔ ربط کجا و سفارش معلوم"۔

اس خطے سے مقام کتابت پوری طرح متعین نہیں ہوتا۔ لیکن ایک خط بنام میر محمد معین صاحب یوں فرمایا ہے۔

"امروز کہ دہم شوال ست، بتقریبِ تعزیتِ حضرت خاں، صاحب یعنی والدِ بزرگوارِ شما کہ جامع ہزاراں مناقب بودند، و از انتقال ازیں عالم داغے یادگار گذاشتہ کہ لیس، در آنولہ حاضرم و لبعدِ توقفِ شبانہ روزِ فردا مراجعت بہ سنبھل خواہم نمود"

ان دونوں خطوط کے پڑھنے سے ہم اس نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں کہ (الف) میرزا مظہر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ سفر نواب دوندے خاں کی جیات میں واقع ہوا تھا۔ (ب) اس زمانے میں چاروں طرف سے فتنہ و فساد دہلی کا رخ کر چکا تھا۔ اس لئے مرزا صاحب دو ماہ کے بعد اپنے متعلقین کی خبر گیری اور حفاظت کے خیال سے دہلی واپس جانا چاہتے تھے۔ (ج) اور ۸ ر سے ۱۰ ر شوال تک آنولے میں قیام کر کے گیارھویں تاریخ کو سنبھل کی طرف سفر کرنے کا قصد تھا۔ اخبار الصنادید میں نواب دوندے خاں بہادر کی تاریخِ وفات ۳ محرم ۱۱۸۵ھ (۱۸ اپریل ۱۷۷۱ء)

بتائی گئی ہے ۔ لہٰذا میرزا صاحب کا سفرِ رہیل کھنڈ ۔ اس سنہ کے شروع ہونے سے قبل کا واقعہ قرار پاتا ہے ۔ جس فتنے کا میرزا صاحب نے اپنے مکتوب میں حوالہ دیا ہے ۔ اس سے مرہٹوں کی دِلّی پر چڑھائی مراد ہے ۔ انہوں نے ۱۱۸۳ھ (۱۷۶۹ء) میں بہت بڑے لشکر کی صورت میں دریائے چنبل عبور کرکے دہلی کا رخ کیا تھا ۔ مگر نواب نجیب الدولہ بہادر نے فرخ آباد کی تسخیر کی طرف متوجہ کر دیا تھا ۔ آغاز ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ء) میں یہ مہم مرہٹوں نے شروع کرکے قلعۂ شکوہ آباد روہیلوں سے لینے کے بعد صلح کر لی ۔ اسی سال غالباً رجب میں نواب نجیب الدولہ بہادر کا انتقال ہو گیا اور مرہٹے دہلی کی طرف بڑھے ۔ چنانچہ ۱۱۸۵ھ میں ضابطہ خاں دہلی چھوڑ کر چلے گئے ۔ اور اس پر مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا ۔ دہلی پر قبضہ کرکے مرہٹوں نے شاہ عالم کو الٰہ آباد سے بلا کر تخت نشین کیا اور اب ضابطہ خاں پر یورش کرکے سکرتال میں انہیں شکست دی ۔ اس سے یہ قیاس کرنا بے جا نہیں کہ ۱۱۸۴ھ میں مرزا صاحب آنولے یا سنبھل میں تھے ۔ چونکہ انہوں نے ۸ ر سے ۱۰ ر شوال تک آنولے میں قیام ظاہر کیا ہے اور تقریباً اسی زمانے میں مرہٹوں نے فرخ آباد کی مہم سر کی ہے ۔ اس لئے یہ سفر شوال ۱۱۸۴ھ (جنوری ۱۷۷۵ء) میں واقع ہونا چاہیے اور اس زمانے میں ان کا یہ لکھنا درست ہے کہ فتنہ دہلی کا قصد کر رہا ہے ۔ لہٰذا میں دو مہینے کے سفر کے بعد دہلی واپس جانا چاہتا ہوں ۔ اب اگر میر حسن نے ان کے حالیہ سفر کا ذکر کیا ہے ۔ تو اس حصے کی تالیف شوال ۱۱۸۴ھ یا اس کے قریب ہونی چاہیے ۔ اس کی تائید نعیم کے ذکر سے ہوتی ہے ۔ میر حسن نے اس کا حال اس انداز سے لکھا ہے کہ "یہ اس کی زندگی

کا یقین ہوتا ہے۔ مصحفی نے اپنے تذکرۂ ہندی گویاں میں لکھا ہے کہ سکرتال کی لڑائی کے بعد نعیم کا انتقال ہوا۔ مولوی قدرت اللہ شوق نے "تکملۃ الشعراء" میں بتایا ہے کہ ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء) میں رحلت کی۔ چونکہ سکرتال کی جنگ بھی اسی سال کا واقعہ ہے۔ اس بنا پر ان دونوں بیانوں میں کوئی تناقض نہیں پایا جاتا اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ میر حسن نے اس کا حال ۱۱۸۵ھ سے قبل لکھا ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ ۱۱۸۲ھ ہی کا واقعہ ہو جب کہ اس نے میرزا مظہر کا حال لکھا تھا۔

مزید تائید میں میر حسن کے اس جملے کو پیش کیا جا سکتا ہے جو مصحفی کے بارے میں لکھا ہے کہ "الحال در شاہجہاں آباد بہ پیشۂ تجارت بسر می برد" میری رائے یہ ہے کہ میر حسن نے جس زمانے میں یہ فقرہ لکھا ہے۔ مصحفی دلی سے نکل کر ٹانڈے اور وہاں سے لکھنؤ نہیں گئے تھے۔ اگر لکھنؤ کا سفر اختیار کر چکے ہوتے تو ناممکن تھا کہ مصنف اس کا ذکر نہ کرتا۔ مصحفی نے لکھنؤ کا یہ سفر ۱۱۸۵ھ میں سکرتال کی جنگ کے بعد اختیار کیا تھا۔ اس بنا پر یقین ہے کہ ان کا حال بھی ۱۱۸۲ھ کے لگ بھگ لکھا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں میر شمس الدین فقیر کے متعلق یہ فقرہ قابلِ توجہ ہے "درینولا بطرف کربلائے معلیٰ تشریف برده بود ہماں جا بجوار رحمت ایزدی پیوست"

فقیر کا انتقال اس سفر کی واپسی پر ۱۱۸۳ھ (۱۷۶۹ء) میں ہوا ہے "درینولا" ایسے ہی واقعے سے متعلق استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جو حال ہی میں ظہور پذیر ہوا ہو۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر ان کا حال بھی ۱۱۸۲ھ کے قریب لکھا ہوگا۔ ان دلائل کے پیشِ نظر میں یہ قیاس کرتا ہوں

کہ میر حسن نے ۱۱۸۲ھ (۱۷۷۰ء) میں یا اس سے کچھ پیشتر تذکرہ شروع کر کے ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) میں ختم کر دیا تھا۔ بعد کے اضافوں میں صرف شاہ فصیح کی تاریخ وفات ہے۔ جو ۱۱۹۲ھ میں واقع ہوئی تھی[1] عرشی صاحب نے میرزا مظہر جان جاں کے سفر روہیل کھنڈ کا سنہ ۱۱۸۴ھ مقرر کیا ہے۔ اور اس کی بنا پر میر حسن کے مندرجہ ذیل اقتباس کی تحریر کا زمانہ ۱۱۸۴ھ قرار دیا ہے: "الحال بطرف سنبھل مراد آباد استقامت دارد و ہماں جا وخنداں می فرماید"۔ لیکن کلمات طیبات (رقعہ ۲۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا مظہر جان جاں کو سنبھل جانے کا کئی سال سے اتفاق ہوتا رہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اقتباس بالا میں میر حسن نے ۱۱۸۶ھ کے سفر کا ذکر کیا ہو۔ اس زمانہ میں مظہر سنبھل میں تھے۔ اور وہاں سے دہلی آ گئے تھے۔ چنانچہ کلمات طیبات کے مکتوب بست و ششم[2] میں نواب ارشاد خاں کی شاہ عالم کے ساتھ دہلی واپسی (دیار از شکست ضابطہ خاں) کا ذکر موجود ہے نیز اسی میں ارشاد خاں کے ۱۳ ربیع الاول ۱۱۸۶ھ میں داخلہ دہلی اور خود ان کی انتقال کا حال بھی لکھا ہے۔ اس لئے ہمارے خیال میں مرزا مظہر کا حال ۱۱۸۶ھ کے لگ بھگ لکھا گیا۔ اسی طرح مصحفی کا حال میں ان کا یہ قیاس کہ ان کا ترجمہ ۱۱۸۶ھ کے لگ بھگ لکھا گیا۔ بغیر کسی شہادت کے قابل قبول نہیں۔ ہم یہ بھی قیاس کر سکتے ہیں کہ مصحفی کا حال اس کی دہلی میں واپسی کے بعد لکھا گیا ہو۔ نعیم اور شمس الدین فقیر کے بارے میں عرشی صاحب کے بیانات درست ہیں۔ اور اس کا قوی امکان ہے کہ ان دونوں کا ذکر ۱۱۸۲ھ کے لگ بھگ کیا گیا ہو۔ ان شعراء کے ساتھ حیرت کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے کہ حیرت کے حال

---

(۱) دیباچہ دستور الفصاحت صفحہ ۶۲ تا ۶۹ (۲) صفحہ ۶۷

میں میر حسن لکھتے ہیں ۔" مراد علی، حیرت تخلص متوطن مراد آباد طبع رسا دارد۔ خ
سلامت باشد[1]" ۔ مصحفی تذکرۂ ہندی میں کہتے ہیں ۔" فقیر اورا در آوانِ
آبادی لکھنؤ روزے در آنولہ دیدہ بود در ہمہ ایام شنیدم بطرفِ کوہ برائے کارے حسبِ الحکمِ
نواب ٹیپے رفتہ بود کہ آفتابِ زندگیش چند جا بلائے کوہ رو بغروب نہاد۔"[2]

مصحفی ۱۱۹۵ھ میں آنولہ میں تھے اور وہ خود لکھ رہے ہیں کہ حیرت اسی زمانے میں فوت ہوئے ۔ میر حسن نے حیرت کا ذکر بطورِ زندہ کیا ہے کہ ۱۱۸۵ھ سے قبل یہ حال لکھا گیا ہوگا ۔ تذکرۂ شعرائے اردو کے باقی شعرا میں سے جن کے سنینِ متراجم متعین کیے جا سکتے ہیں ۔ حسبِ ذیل ہیں :۔

(۱) احسن کے حال میں میر حسن لکھتے ہیں :۔" اوائل استفادہ از میر ضیا حاصل کردہ الحاصل شعرِ خود را پیشِ میرزا رفیع می گذراند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہ وسیلہ شاعری در سرکارِ نواب شجاع الدولہ سرفراز است۔"[3]

میر ضیا، اغلب یہ ہے کہ ۱۱۸۱ھ تک (آیہ میر حسن تک) فیض آباد پہنچ چکے تھے ۔ اور ۱۱۸۹ھ کے لگ بھگ عظیم آباد چلے گئے تھے ۔ اسپرنگر بحوالہ عشقی عظیم آبادی لکھتے ہیں کہ ضیا نے چالیس سال ہوتے پٹنے میں سکونت اختیار کی[4] ۔ عشقی کا تذکرہ بقول عرشی[5] ۱۲۲۴ھ اور ۱۲۳۳ھ کے درمیان لکھا گیا ۔ اگر ضیا، کا حال ۱۲۲۴ھ ار بحا میں لکھا گیا ہو تو عظیم آباد کی سکونت ۱۱۸۴ھ کے لگ بھگ اختیار کی ہوگی ۔ ۱۱۸۵ھ سے قبل ضیاء کے ترکِ سکونت کو اس قیاس سے بھی تقویت پہنچتی ہے ۔ کہ مصحفی فیض آباد جا کر سودا سے تو ملتے ہیں[6] لیکن ضیا سے کسی واقفیت کا کوئی

---

(۱) تذکرۂ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۱۵۹ (۲) تذکرۂ ہندی ص ۹۵ (۳) تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۶
(۴) یادگار الشعراء اردو ترجمہ اسپرنگر ص ۱۲۹ (۵) دیباچہ دستور الفصاحت (۶) تذکرۂ ہندی ص ۱۲۶ ۔

ثبوت نہیں دیتے۔ اگر ضیا وہاں ہوتے تو ضرور تھا کہ فیض آباد کے شعرا کے استناد سے بھی ان کا ملنا ہوتا۔ مصحفی تو اس کے بارے میں اسی قدر لکھتے ہیں "زندہ اور راند یادہ" [1] مذکورہ بالا اقتباس میں شجاع الدولہ کا ذکر بطور زندہ کیا گیا ہے شجاع الدولہ نے ۱۱۸۸ھ میں وفات پائی۔ احسن کا حال ۱۱۸۴ھ اور ۱۱۸۶ھ کے مابین لکھا گیا۔

(۲) اجمل کے بارے میں حسن رقم طراز ہیں: "الحال مسند نشین حضرت شاہ خوب اللہ[2]" اجمل اپنے بھائی کی وفات پر ۱۱۸۷ھ میں ہوئی مسند نشین ہوتے چنانچہ تذکرہ مسرت افزا میں ہے۔" او در صحبت سراسر برادر خود قطب العارفین قطب الدین اِلہ آبادی .... تربیت یافتہ .... بعد تشریف بردن برادر گرامی خود بہ بیت اللہ و انتقال وے در آں ارضِ مقدس بر مسند مشیخت و زینت بخشِ سجادۂ نیاگانِ خود شد[3]" (قطب الدین مصیب) در عشرۂ اولیٰ ماہِ شعبان سنہ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و شش .... متوکلاً علی اللہ از خانہ برآمد .... بیت اللہ رسید .... سلخ: سنہ یک ہزار و ہشتاد و ہفت ہجری بہ رحمت حق پیوست ... شاہ اجمل .... قطعۂ تاریخِ وفات وے .... بسلکِ نظم آوردہ ...[4]" اس حساب سے یہ حال ۱۱۸۷ھ کے بعد لکھا گیا۔

(۳) میر حسن افسوس کے بارے میں لکھتے ہیں: "الحال در سرکارِ نواب سالار جنگ بہادر سرفراز است[5]" افسوس سالار جنگ کی سرکار میں ۱۱۸۵ھ یا ۱۱۸۶ھ میں داخل ہوئے۔ خود دیباچۂ سحر البیان میں لکھتے ہیں۔ "راقم کو اس (میر حسن)

---

(۱) تذکرہ شعرائے اردو ص۱۲۵ (۲) تذکرہ شعرائے اردو ص۱۲ (۳) مسرت افزا ص۱۲
(۴) مسرت افزا ص۱۸۵، ۱۸۶ (۵) تذکرہ شعرائے اردو ص۲۱۔

سے دوستی زبانی تھی۔ کبھی رنجش خفگی باہم نہیں ہوئی۔ حالانکہ اسی سرکار میں جی بھی نوکر اور اسی صاحب زادے کا ہم نشین تھا۔ دس برس تک دن رات، ایک جگہ بچے ..... آخر چرخ تفرقہ پرداز نے باہم تفرقہ ڈالا۔ اتفاقاً میرا روزگار سنہ گیارہ سو ننانوے میں صاحبِ عالم مرزا جواں بخت کی سرکار میں ہوا[1]"

ان کا حال کم و بیش ۱۱۸۸ھ میں داخلِ تذکرہ کیا گیا۔ آخری حد ۱۱۸۹ھ ہے۔ ہم نے اوپر تذکرہ شعرائے اردو کی تالیف کی آخری حد ۱۱۹۱ھ پیش کی تھی جبکہ حسن نے اس کا ترقیمہ لکھا۔ ایک آدھ اضافہ بعد کا ہے۔ "لیکن قاضی عبدالودود صاحب کے پاس تذکرۂ شعرائے اردو کا ایک ایسا قلمی نسخہ موجود ہے جس کے خاتمے میں ۱۱۸۹ھ تاریخ تصنیف لکھی ہے۔ بعض نسخوں میں اس کے بعد کی بھی کچھ باتیں مندرج ہیں[2]"۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ ان کے نسخے میں افسوس کا حال موجود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ افسوس کا حال ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۸۹ھ کے مابین لکھا گیا۔

(۴) تذکرۂ شعرائے اردو میں محمد اشرف کے حال میں ہے:-

"بہ دارو غگیٔ اخبارِ فرنگیٔ جان برسٹو صاحب سرفراز است[3]"

جان برسٹو بہاری گھاٹ پر آصف الدولہ سے بطور ریذیڈنٹ آکر ملے تھے۔ اسی زمانے میں ریذیڈنٹ ہو کر آئے تھے۔ ۲۰ ربیع الاول ۱۱۸۹ھ کو ایک عہد نامے پر دستخط بھی کیے[4] چونکہ اشرف کا حال قاضی عبدالودود صاحب کے نسخے میں بھی موجود ہے۔ لازماً ۱۱۸۹ھ ہی میں داخلِ تذکرہ کیا گیا۔ (۵) سودا کے بارے میں لکھا ہے:

"بحالی در سرکارِ نواب شجاع الدولہ بہادر بہ سببِ فن شاعری سرفراز است[5]"

شجاع الدولہ نے ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ میں وفات پائی۔ ظاہر ہے یہ حال اس سنہ سے قبل لکھا گیا ہوگا۔

(۶) فغاں کے بارے میں میرحسن کا بیان ہے: "فغاں خوش اختلاط بود[6]"۔ فغاں کے بارے میں قطعی طور پر معلوم ہے کہ وہ ۱۱۸۶ھ میں فوت ہوئے اس لئے ثابت ہے کہ یہ حال ۱۱۸۶ھ کے بعد لکھا گیا۔

---

(۱) دیباچہ سحرالبیان ص ۱۸ (۲) حواشی تذکرہ شعرائے ابن طوفان ص ۲۰ (۳) تذکرہ شعرائے اردو ص ۲۲ (۴) تاریخ اودھ نجم الغنی جلد سوم ص ۲۹ (۵) تذکرہ شعرائے اردو ص ۹۳ (۶) تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۱۵۔

(۷) تذکرہ شعرائے اردو کے ص۱۲۰ پر فرحتؔ کو سلمہ اللہ لکھا ہے۔ تذکرۂ گلزارِ ابراہیم میں فرحتؔ کی وفات کا سنہ ۱۱۹۱ھ دیا گیا ہے گویا فرحت کا حال ۱۱۹۱ھ سے قبل تحریر ہوا

(۸) شاہ فصیح کا حال قاضی صاحب کے نسخے میں نہیں ہے۔ گویا ۱۱۸۹ھ کے بعد تحریر ہوا۔ شاہ فصیح کے حال کے بعض فقرے جن میں ان کا ذکر بطور زندہ شخص کے ہوا ہے اور مطبوعہ نسخے کی طبع ثانی میں شامل ہیں۔ ۱۱۸۹ھ اور ۱۱۹۱ھ کے مابین لکھے گئے ہوں گے۔ لیکن مندرجہ ذیل فقرہ " در سالِ یک ہزار و یک صد و نود و دو بہ رحمتِ حق پیوستہ است"۔ ۱۱۹۲ھ میں یا اس کے بعد لکھا گیا۔

(۹) میر حسن تاباںؔ کے بارے میں کہتے ہیں۔ "الحال در سنبھل مراد آباد است"۔ قرائن ظاہر کرتے ہیں کہ تاباں کا قیام سنبھل ۱۱۸۸ھ کے لگ بھگ ہو سکتا ہے۔ یہ حال اسی زمانے میں لکھا گیا ہو تو تعجب نہیں۔

(۱۰) گدازؔ کے حال میں ہے: "در لکھنؤ بہ نظر می آید"[1]۔ میر حسن غالباً ۱۱۸۹ھ یا ۱۱۹۰ھ میں لکھنؤ گئے۔ یہ حال اسی تاریخ کے بعد لکھا گیا ہوگا۔

(۱۱) مصیبتؔ: "بعد از مراجعت منزلِ مقصود بہاں بجاں آفریں سپرد"[2] تذکرۂ مسرت افزا میں تاریخ وفاتِ مصیبت ۱۱۸۶ھ "قطبِ زماں وفات یافت" حسن نے یہ حال ۱۱۸۶ھ کے بعد لکھا ہوگا۔

(۱۲) معینؔ: "مدتے در الہ آباد بسر بردہ الحال شنیدہ ام کہ بطرف اکبر آباد است"[3]۔ معین الہ آباد میں شاہِ عالم ثانی کے ملازمین میں تھا۔ شاہ عالم نے

---

(۱) تذکرہ شعرائے اردو ص۱۴۲ (۲) تذکرہ شعرائے اردو ص۱۵۷ (۳) تذکرہ شعرائے اردو ص۱۵۹

۱۱۸۵ھ میں الہ آباد سے دلّی کی طرف کوچ کیا اور یہ محفل برہم ہو گئی۔ اس لئے میر حسن نے معیّن کا حال ۱۱۸۵ھ کے بعد لکھا ہے[1]۔

(۱۳) مدعا کے بارے میں میر حسن لکھتے ہیں: "از راہِ قدر شناسی و نکتہ دانی ..... عنایت خاں غفر اللہ لہٗ سہ صد روپیہ و براو (؟) می داد ..... الحال معلوم نیست کہ کجا است[2]" یہاں عنایت خاں پسر حافظ رحمت خاں کا ذکر بطور مردہ کیا ہے۔ لہٰذا یہ حال ۱۱۸۷ھ کے بعد لکھا گیا۔

(۱۴) نواب محبت خاں کے بارے میں میر حسن لکھتے ہیں "محبت بہ اصلاح خواجہ حسن یا میاں حسرت جرأت نمودہ[3]"۔ نواب محبت خاں ۱۱۸۹ھ میں مہندی گھاٹ پر آصف الدولہ کے پاس آئے۔ ان کا حال ۱۱۸۹ھ میں یا اس کے بعد داخل تذکرہ کیا گیا ورنہ خواجہ حسن اور میاں حسرت کے ذکر کا کیا موقع تھا۔

(۱۵) ولایت کے بارے میں میر حسن لکھتے ہیں: "قریب دوازدہ سال شدہ باشد کہ بہ رحمتِ الٰہی پیوستہ[4]"۔ ولایت کی وفات کے بارے میں ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ بعمر ۷۸ برس ۱۱۷۸ھ میں وفات پائی۔ اس لئے ان کا حال حسن نے بارہ برس بعد یعنی ۱۱۹۰ھ میں لکھا۔

(۱۶) مصحفی کے بارے میں میر حسن کا کہنا ہے کہ "الحال در شاہجہاں آباد بہ پیشۂ تجارت بسر می برند[5]" یہ حال اغلب ہے کہ ۱۱۸۶ھ کے بعد لکھا ہو کیونکہ مصحفی سفر سے واپس دلّی جا چکے تھے۔

(۱۷) میر حسن نے اپنا حال ۱۱۸۸ھ کے بعد لکھا ہے جبکہ رموز العارفین تصنیف

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے مسرت افزا ص۲۰۳ (۲) تذکرہ شعرائے اردو ص۱۴۲ (۳) تذکرہ ص۱۷۵
(۴) تذکرہ شعرائے اردو ص۱۴۸ (۵) تذکرہ شعرائے اردو ص۱۶۵۔

کر چکے تھے۔ قاضی صاحب کے نسخے میں یہ حال موجود ہے اس لیے ۱۱۸۸ھ اور
۱۱۸۹ھ کے مابین تحریر پیدا ہوگا۔ ان تراجم سے جن کے سنین ایک حد تک
متعین ہو سکتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن نے تذکرہ شعرائے اردو کی تالیف
کا کام اغلب یہ ہے کہ ۱۱۸۵ھ کے قریب شروع کیا۔ زیادہ شعرا کے حالات
۱۱۸۸ھ کے آس پاس تحریر ہوئے۔ پہلا مسودہ ۱۱۸۹ھ میں تکمیل پا گیا۔ پھر
خاتمہ ۱۱۹۱ھ میں لکھا گیا۔ بعد ازاں صرف شاہ فصیح کی تاریخِ وفات داخل
تذکرہ ہوئی ہے۔ اس بات کا قرینہ نہیں کہ ان کے بعد اور اضافے بھی ہوئے ہوں۔
مثنوی تہنیت عید: ڈاکٹر ابواللیث مثنوی تہنیتِ عید کے بارے
میں یہ رائے رکھتے ہیں۔ "غالباً ۱۱۹۳ھ کے بعد کی تصنیف ہے.... اس
میں جواہر خاں (کذا) کی تعریف ہے جو آصف الدولہ کی والدہ بہو بیگم کے ناظر
اور میر حسن کے خاص محسنوں میں تھے۔ ۱۱۹۳ھ کے بعد کی قید یوں لگائی گئی
ہے کہ تذکرہ میر حسن سنہ مذکور میں مکمل ہوا۔ اس میں میر حسن اپنے صرف دو
ممدوحوں کا ذکر کرتے ہیں.... بعد کی مثنویوں میں جواہر خاں (کذا) کی تعریف
کی ہے اور لکھا ہے۔ اب انہیں کے دامن سے وابستہ ہوں.......
.... مثنوی (قصر جواہر) ۱۱۹۴ء اور ۱۱۹۷ھ کے درمیان لکھی گئی"[1]۔ آصف الدولہ
اور ان کی والدہ کے تعلقات ۱۱۸۹ھ کے اواخر ہی سے کشیدہ ہونے شروع
ہو گئے تھے اور انتہائے عروج چپقلش ۱۱۹۶ھ ہے۔ جب جواہر علی خاں اور
بہار علی خاں گرفتار کر لئے گئے[2]۔ انہیں گرفتار کر کے آصف باغ میں رکھا
گیا۔ ۸ رجب کو دونوں لکھنؤ سے جائے گئے۔ رمضان ۱۱۹۷ھ میں دونوں

---

(۱) لکھنؤ کا دبستانِ شاعری صفحہ ۱۰۳، ۱۰۶ (۲) ۲۰ محرم ۱۱۹۶ھ بحوالہ تاریخ فرح بخش۔

امیر ہی ہے۔ جب وارن ہیسٹنگز بنارس کی طرف آیا تو آصف الدولہ اس سے ملنے کے لئے گیا اور خواجہ سراؤں کو ساتھ لیتا گیا وہیں کے بعد آصف کا انداز بدل گیا۔ وہ خواجہ سراؤں کو واپس بھیجتا ہے۔ اور اب چاپلوسی کا رستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ تاکہ بیگمات اودھ سے جو بگاڑ ہوا تھا۔ ٹھیک ہو جائے۔ اس طرح جواہر علی خاں کی مدح کا موقع ۱۱۹۸ھ اور ۱۲۰۱ھ کے درمیان نکل سکتا ہے۔ اس سے پہلے نہیں،

مثنوی تہنیتِ عید کا پہلا شعر ہے :-

فلک کی یہ تھا کج روی سے بعید — کہ دو سال بعد تجھ کو نکلے ہیں عید (۱)

شعر کا مطلب غالباً یہ ہے کہ فلکِ کج رفتار کے ظلم کی وجہ سے (غالباً عرصے سے؟ فیض آباد میں مسلسل) دو سال عیدیں کرتا (یا پچھلے دو سال سے عیدیں کرنا) نصیب نہیں ہوا۔ اس مثنوی میں عید الفطر کا ذکر ہے۔ جو قمری حساب سے یکم شوال کو ہوا کرتی ہے۔ میر حسن نے فیض آباد میں آکر یہ عید گذاری اور سات دن یہاں قیام کیا۔ آگے چل کر ایک شعر ہے :-

نہیں اب کے ساون میں آئی ہے عید — سو ہے یہ گھر بال بالِ سعید (دیباچہ ۱۲۲)

"اب کے" اور "ساون" قابلِ غور ہیں۔ یہ ایسی عید الفطر ہے جو پہلی دفعہ ساون کے مہینے میں آئی ہے۔ تقویم سے رجوع کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن کی زندگی میں ساون کے مہینے میں عید الفطر پہلی دفعہ یکم شوال ۱۱۶۵ھ پنجشنبہ کے دن (۱۲ اگست ۱۷۵۲ء) ہوئی۔ اور پھر ساون کے مہینے میں ۱۱۶۵ھ اور ۱۱۶۶ھ کو بھی عیدیں ہوتی رہیں۔ جبکہ میر حسن ابھی دلی ہی میں تھے۔ ساون کی عیدوں کا دوسرا چکر یکم

---

(۱) مثنوی ہذا۔ مطبوعہ معیار میرٹھ ۱۹۳۶ء ص ۱۲۲

شوال ۱۱۹۹ھ [یک شنبہ] مطابق ۷ اگست ۱۷۸۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ دوسری ساون کی عید یکم شوال ۱۲۰۰ھ سہ شنبہ [۲۷ جولائی ۱۷۸۶ء] کو اور تیسری عید ۱۲۰۱ھ میں ہوتی ہے۔ ۱۲۰۱ھ خارج از بحث ہے کیونکہ میر حسن اس سے پہلے فوت ہو جاتے ہیں۔ ۱۲۰۰ھ کی عید اگر لی جائے تو "اب کے" کا ٹکڑا بے کار ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہمارے خیال میں یہ مثنوی (تہنیتِ عید) ۱۱۹۹ھ میں لکھی گئی اب ایک اور لحاظ سے اسے دیکھنا چاہیے۔ مثنوی تہنیت عید میں ایک شعر ہے

پڑا مہر سے سایۂ بدر اب ۔۔۔ کہ برجِ اسد میں گیا آفتاب

جب برج اسد میں آفتاب ہو تو ساون کے مہینے میں یہ عید آتی ہے۔ ایسا ممکن ہے کیونکہ ذوق کہتے ہیں۔ (اشعارِ قصیدۂ مفدہ زبان) :۔

جب کو سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن ۔۔۔ آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

جوشِ روئیدگی سبزہ پہ یاد آتی ہے ۔۔۔ آیتِ اَنبتہُ اللّٰہ نباتاً حَسَناً

جس طرح شعلہ کا عالم ہو یہ فانوسِ خیال ۔۔۔ خوف سے یوں ترے لرزاں ہے عدو زیرِ کفن [۱]

سحرالبیان : باڈلین لائبریری کے مخطوطات کی فہرست کے مرتب کی رائے میں سحرالبیان ۱۱۹۳ھ مطابق ۱۷۷۹ء میں لکھی گئی ہے [۲] یہی بیان اسپرنگر کی فہرست میں بھی ہے۔ یہ رائے کس بنا پر قائم کی گئی۔ اس کا حال نہ کھلا۔ سعادت خاں ناصر تذکرہ خوش معرکہ زیبا (۱۲۶۱ھ) میں لکھتے ہیں :۔ یہ بھی کیا خوب لطیفہ ہے کہ جب مرزا رفیع سودا نے وہ مثنوی سنی نہایت خوش ہوتے فرمایا۔ تم نے یہ مثنوی ایسی کہی ہے کہ میر غلام حسین (ضاحک) کے بیٹے نہیں معلوم ہوتے یعنی مخزان کے ہو۔ (سب رس نومبر دسمبر ۱۹۵۰ء ص۱)

---

(۱) دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد ص۳۵۲ (۲) باڈلین کیٹلاگ کالم ۱۲۹۵ نمبر ۲۳۲۶ (۱۹)

اس پر اعتبار کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ سحر البیان وفات سودا (۱۱۹۵) سے قبل تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ ناصر غیر محتاط تذکرہ نگار ہیں۔ ان کے بیان پہ بغیر کسی دوسرے ماخذ کی تائید کے بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم [1] قرینہ یہ ہے کہ سحر البیان خاصے وقت میں مرتب ہوئی۔

یہ حسن کی عمر بھر کی محنت کا نتیجہ ہے۔ خود کہتے ہیں:

نہیں عمر کی اس کہانی میں عرق — تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف
جوانی میں جب ہو گیا ہوں میں پیر — تب ایسے ہوئے ہیں سخن دل پذیر

ایک آدھ سال میں پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچی بلکہ حسن نے خاصا وقت صرف کیا ہے۔ اور بڑی محنت سے لکھا ہے۔ ۱۱۹۹ھ میں آصف الدولہ کے سامنے پیش کی گئی۔ لیکن خاطر خواہ داد نہ ملی۔

---

(۱) مثنویاتِ حسن مرتبہ آسی ص۳۴۲۔

باب ششم

میر حسن کی علمی قابلیت

(۱)

حسن ذو زبان ادیب تھے۔ ان کا بیشتر سرمایۂ نظم اردو میں ہے۔ کچھ اشعار فارسی میں بھی ہیں۔ "شعرائے ریختہ" کا تذکرہ بھی زمانے کے رواج کے مطابق فارسی میں لکھا ہے۔ اردو فارسی میں ان کی زبان دانی اور علمی فضیلت کے بارے میں اکثر تذکرہ نگاروں نے اپنی رائے دی ہے۔ چند رائیں ملاحظہ ہوں۔ محمود فاروقی "میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعراء" میں میر حسن کی زبان دانی اور زبان شناسی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

میر حسن کے کلام کی خوبی زبان کی صفائی، محاورہ بندی اور فطری سادگی ہے۔ لیکن فارسی نثر کا اسلوب اس کے برعکس ہے۔ تذکرے کی عبارت رنگین مرصع اور زورِ قلم کا بہترین نمونہ ہے۔ وہ سادگی جو میر تقی میر کے تذکرے میں ملتی ہے، اس تذکرے میں نہیں ہے کہیں کہیں عبارت پر تصنع اور پر تکلف بھی ہو گئی ہے۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کے لکھنے میں بڑی کاوش اور دماغ سوزی کی ہے۔ تشبیہات و استعارات کو اس [illegible] اور سلیقے سے استعمال کیا ہے کہ نثر میں نظم کا حسن پیدا ہو جاتا ہے
(ص ۲۳۳)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" میں لکھتے ہیں:-

"میر حسن نے باوجود دربار سے تعلق رکھنے کے دہلوی خصوصیات کو رفتار و گفتار دونوں میں قائم رکھا۔ چنانچہ یہی روایت ان سے خلیق کو اور خلیق سے انیس کو ورثے میں ملی۔ اس کا نتیجہ ہے۔ کہ ان اصحاب کی زبان تصنع اور تکلف سے پاک سادہ اور شیریں ہے اور اس عہد میں بھی جب لکھنؤ میں رعایتِ لفظی، ضلع جگت، صنعت گری کا رواج عام ہو جاتا ہے۔ میر حسن کا اثر اپنے خاندان میں کارفرما رہتا ہے" ص ۱۱۲

محمد حسین آزاد آبِ حیات میں فرماتے ہیں:-

"بے نظیر اور بدرِ منیر کا قصہ بے نظیر لکھا ہے۔ اور اس مثنوی کا نام سحر البیان رکھا ہے۔ زمانے نے اس کی سحر البیانی پر تمام شعرا اور تذکرہ نویسوں سے محضرِ شہادت لکھوایا۔ اس کی صفائی بیان اور لطفِ محاورہ اور شوخیٔ مضمون اور طرزِ ادا اور ادا کی نزاکت اور جواب سوال کی نوک جھونک حدِ توصیف سے باہر ہے۔ اس کی فصاحت کے کانوں میں قدرت نے کیسا سناد ش رکھی تھی۔ کیا اسے سو برس آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں۔ کہ جو کچھ اس وقت کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے۔ جو آج ہم تم بول رہے ہیں اس عہد کے شعرا کا کلام دیکھو ہر صفحہ میں بہت سے الفاظ اور ترکیبیں ایسی ہیں کہ آج متروک اور مکروہ سمجھی جاتی ہیں۔ اس کا کلام (سوا چند الفاظ کے) جیسا جب تھا ویسا ہی آج دل پذیر و دلکش ہے۔ کیا کہتا ہوں؟ آج کس کا منہ ہے جو ان خوبیوں کے ساتھ پانچ شعر بھی موزوں کر سکے۔ خصوصاً ضرب المثل کہاوت کو

اس خوبصورتی سے شعر میں مسلسل کر جاتے ہیں کہ زبان چٹخارے بھر جاتی ہے اور نہیں کہہ سکتی کہ یہ کیا میوہ ہے" (صفحہ ۲۵۴، ۲۵۵)
عبدالحیؒ گل رعنا میں فرماتے ہیں :-

بے نظیر و بدرِ منیر کے قصہ میں جو سحر بیانی کی ہے اس کا آج تک جواب نہیں ہو سکا۔ اس کی زبان کی صفائی، محاورہ کا لطف، مضمون کی شوخی، طرزِ ادا کی نزاکت اور سوال و جواب کی نوک جھونک حدِ توصیف سے باہر ہے۔ باوجود اس کے کہ سحر البیان کی تصنیف کو ڈیڑھ سو برس ہونے کو آتے ہیں۔ لیکن اس کی زبان قریب قریب وہی ہے۔ جو آج کل بولی جاتی ہے۔ یہی ایک امر اس بات کا کافی ثبوت ہے۔ کہ میر حسن کا مذاقِ سخن کتنا لطیف و پاکیزہ تھا (صفحہ ۲۳۶)
اشرف حبلن دیباچۂ سحر البیان میں لکھتے ہیں :-

"سحر البیان اول تو مثنوی، اور پھر عشقیہ، اس نذہری ضرورت کا پورا کرنا میر حسن ہی کا کام تھا۔ یہ صفائی بیان اور لطیف محاورہ نہ آج کسی کو حاصل ہوا ہے۔ نہ آئندہ امید، ضرب المثل کا ذکر جو اس کلام میں پایا ہے۔ وہ خود ضرب المثل ہے۔ تکلف سے بری، تعقید سے پاک، اضافتوں کی بھرمار نہیں۔ مخدوفات سے سروکار نہیں، نثر کی نثر نظم کی نظم، جتنے لفظ ہیں گنے چنے ہیں۔ نہ کوئی گھٹ سکتا ہے، نہ بڑھ سکتا ہے ..... زبانوں میں کچھ نہ کچھ تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اس کے یہ سبب ہوتے ہیں۔ (۱) غیر زبان کا اثر جو انقلاب سلطنت، ترقی تجارت، آمد و رفت کی سہولت، یعنی ریل وغیرہ سے ہوتا ہے۔ میر حسن کے زمانے میں اردو

کا بچپن تھا اسی وقت سارے انقلاب شروع ہو گئے۔ افلاس نے گھر سے بے گھر کیا، پردیس میں کچھ ہوش سنبھالا تھا کہ زمانے نے اس کو بھی اجاڑ دیا۔ در بدر بھیک مانگنے کی نوبت آگئی، پھر گھر کا رستہ لیا۔ کہیں پرسش نہ سہارا، داد نہ فریاد، یہاں تک کہ کچہری عدالت سے بھی نکالا ملنے لگا۔ اس انقلاب میں جتنا فرق نہ ہوتا تھوڑا تھا۔

(۲) اندرونی نقائص کی اصلاح یعنی ثقیل الفاظ و بے مزہ محاورات کی درستی۔ انقلاب زمانہ کے ساتھ کچھ مذاق بھی بدل جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں پہلے جو چیزیں بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں، اب ان کی طرف توجہ بھی نہیں ہوتی۔ جن چیزوں کی برائی چنداں ناگوار نہ تھی۔ اب ان کے نام سے نفرت ہے۔ یہی حال زبان کا بھی ہے۔ جو الفاظ اور محاورے پہلے استعمال میں تھے، لیکن چنداں خوشگوار نہ تھے۔ اب ان کا زبان پر لانا ہی عار ہو گیا، جو الفاظ و محاورات متروک الاستعمال ہو گئے۔ وہ تو ہم کو بھی برے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اب جو استعمال میں ہیں ان کی نسبت کون کہہ سکتا ہے کہ سو ڈیڑھ سو برس کے بعد کیسے معلوم ہوں گے۔ اس کے واسطے ایک خاص ملکے کی ضرورت ہے۔ کہ خفیف سے خفیف نقص بھی فوراً کھٹک جاتے کہ یہ لفظ گو آج چنداں ناگوار نہیں، لیکن آگے چل کر متروک ہو جائے گا۔ اس کاٹ چھانٹ سے جو الفاظ بچیں گے ان کو کون نکال سکتا ہے۔ آج مثنوی سحر البیان کو دیکھئے تو سو میں کیا ہزار میں بھی ایک لفظ

یا محاورہ ایسا نہیں جو کانوں کو برا یا دل کو ناگوار معلوم ہو۔ حضرت میر تقی میر کو زبان کی بہت ہی احتیاط تھی۔ اپنے زمانے کے اندر آیندہ کی احتیاط انہوں نے بھی کی۔ لیکن نہ تھی اس وقت ان کی زبان کا کہیں زیادہ حصہ بمقابلہ میر حسن کے متروک ہو گیا۔ حالانکہ دونوں کا زمانہ قریب قریب ایک ہی ہے۔

(۳) تیسرا سبب یہ ہے کہ کوئی لفظ یا جملہ نئی طرح کسی کے منہ سے نکل گیا۔ محض بوجہ جدت ہم صحبتوں کی توجہ ہوئی اسی طرح بولنے لگے۔ رفتہ رفتہ عام ہو گیا۔ حالانکہ کوئی خوبی یا لطافت اس میں نہیں۔ ہم ایسے تغیر کو ترقی نہیں۔ محض تغیر کہتے ہیں اور بعض صورتوں میں تنزل۔ بعض تغیر صرف و نحو کے ہی نام سے ہو گئے۔ حالانکہ نہ کچھ فصاحت میں بیشی ہوئی نہ اختصار نہ کوئی اور خوبی جیسے

سابق	حال	سابق	حال
کرنہیں آتی	کرنی نہیں آتی	میں کہا	میں نے کہا
جانے ہے	جانتا ہے		

یہ اور بات ہے کہ اب ہمارے کان نئے طرز کے عادی ہو گئے۔ پرانا طرز غیر مانوس معلوم ہونے لگا۔ لیکن خوبی کیا نکلی اس قسم کا فرق بھی میر حسن کی زبان اور آج کی زبان میں زیادہ نہیں اور ہوتا بھی تو بلا وجہ تغیر کی پیش بینی فلسفی یا شاعر کا کام نہیں (ص ۲۲ نامہ)

یحییٰ تنہا مراۃ الشعراء میں رقم طراز ہیں :۔
آپ کے کلام میں متروکات کی کافی تعداد ہے۔ اور یہ بات

زمانہ کے لحاظ سے ہوتی بھی جاتی ہے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

انھوں کا بجائے ان کا۔ کوئی کو کئی لکھا ہے۔ ع

یوں ہی تڑپ تڑپ کر کوئی دم میں مر رہے گا

دوانے بجائے دیوانے۔ جاگہ بجائے جگہ۔ ٹک بجائے ذرا۔ تاسحر بجائے سحر تک۔ میں بجائے میں نے۔ نہیں رونے کا بجائے نہیں روؤں گا۔ یہاں غلطی غیر متروک ہے۔ ع

تم نے ملنا بھی اب اس دل سے میاں چھوڑ دیا

پرلکھا بجائے خیال، زور بمعنی بہت، جنھوں کے بجائے جن کے۔ ہم پاس بجائے ہمارے پاس۔ آپی بجائے آپ ہی۔ ع

بیچارہ اپنی جان سے آپی گذر گیا۔

سمجھیو بجائے سمجھیو ع

آساں نہ سمجھیو تم نخوت سے پاک ہونا

ایدھر بجائے ادھر۔ ماٹی بجائے مٹی۔ ہوجیو بجائے ہونا ع

ہوجیو کاشش ایک بار وداع

پوچھیو بجائے پہنچیو۔ جی کرتا ہے بجائے جی چاہتا ہے۔ نت بجائے ہمیشہ، شب ہجراں کے تئیں کو باعلان اب کوئی نہیں باندھتا ہے۔

محشر کا بھی دن کم نہیں آفت سے ولیکن کرتی ہے قیامت شب ہجراں بہت کچھ

بھر نظر بجائے نظر بھر ع

میں نے تو بھر نظر تجھے دیکھا نہیں ابھی

آپ نے بعض الفاظ غلط یا بیجا طور پر استعمال کئے ہیں۔ تظلم کے معنی

فریاد ہیں۔ لیکن بجائے ظلم باندھا ہے سہ

قیامت مجھ پہ شب اس کا تکلم اور ترحم تھا۔ کبھی تھیں گالیاں منہ پر کبھی لب پہ تبسم تھا

ہوئی کو ہئی باندھا ہے سہ

اس کوچہ میں بھی رفت کم نہ ہئی تیری حسن روتے روتے یہاں سے آیا پھر یہاں بننے لگا

طُرفہ کو طُرفہ باندھا ہے۔ عہ

ان دنوں کیوں تو نے کم اس طرف کا جانا کیا

اغیاروں بجائے اغیار لکھا ہے۔ اس قسم کی جمع الجمع سے پرہیز ہی لازم ہے:

عہ ہماری اور اس کی بات اغیاروں سے مت پوچھو

یک جہتی بجائے یک جہتی باندھا ہے:۔

کیوں کہ یک جہتی سے اس بندہ کی مشہور ہے تو

بعض فارسی ترکیب بھی بد نما معلوم ہوتی ہے مثلاً عہ

گرچہ سچ ہے کہ حسینوں میں بہ از حور ہے تو

اور بعض فارسی جمع مثلاً بتاں۔ رفتگاں۔ بغیر اضافت آتی ہیں۔ اگر اس قسم کی اضافت کے ساتھ استعمال کی جائے تو آج کل بھی پسندیدہ ہے۔ ورنہ متروک ہے۔ (صفحہ ۲۷۸، ۲۷۷)

اسی طرح میر حسن کی فارسی دانی کے بارے میں بھی بعض بزرگوں نے تعریف و توصیف کا پہلو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ سری رام "خمخانۂ جاوید" میں لکھتے ہیں:۔

"میر حسن کی علمی لیاقت۔ فارسی دانی میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا" (جلد دوم صفحہ ۲۴۳)

"مجیبی" "نہا حراۃ الشعرا" میں فرماتے ہیں۔

"فارسی قابلیت مسلمہ ہے۔ آپکا تذکرۃ الشعرا (کذا) اور فارسی اشعار اس پر شاہد عادل ہیں"۔ (صفحہ ۲۷۳)

سید احمد اللہ قادری دیباچۂ مثنوی رموز العارفین میں لکھتے ہیں:

"میر حسن عربی سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ البتہ اردو اور فارسی میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے (ص۵)

(۲)

بیانات کے ان حصوں سے قطع نظر جہاں میر حسن کی شاعرانہ صلاحیتوں اور ان کی اردو دانی کو ملا دیا گیا ہے، اگر بغور دیکھا جائے۔ تو ناقدین فن سحر البیان کی زبان سے خاصے متاثر ہیں۔ ان کے خیال میں میر حسن کی زبان دانی کا یہ بڑا کمال ہے کہ ان کی مثنوی کی زبان اور آج کل کی زبان میں زیادہ تفاوت نہیں ہے۔ علامہ شبلی نے شعر العجم میں۔ معرّی کے ضمن میں بڑی پتے کی بات کہی تھی، معری نے عربی زبان میں قرآن پاک کا جواب لکھا۔ اس سے کہا گیا کہ تمہاری کتاب میں وہ فصاحت اور جزالت نہیں ہے۔ جو قرآن پاک کے حصے میں آئی ہے تو اس نے جواب دیا کہ جب دو چار سو سال میرا قرآن لوگوں میں جاری رہے گا۔ تو رفتہ رفتہ اس میں بھی جزالت اور فصاحت پیدا ہو جائیگی۔ معلوم ہوا کہ زبان کا دورِ حاضرہ کے مطابق ہونا اس کا فصیح و بلیغ کہلانا کتاب کی مقبولیت پر منحصر ہے۔ ہمارے فضلاء نے فصاحت کے نظام میں زبان کی "ہمہ عصری" کے اسباب پر غور نہیں کیا۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان تحریر میں آتے ہی بہت زیادہ مقبول اور مشہور ہو گئی۔ اس نے آئندہ نسلوں کی زبان پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہ مثنوی کا کمال نہیں ہے کہ آج ہماری زبان سحر البیان سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ بلکہ اصل سبب مثنوی کی مقبولیت ہے۔ جس نے موجودہ نسل تک کو روزمرے محاورے اور ضرب الامثال کے میدان میں بہت متاثر کیا ہے میر حسن کی تخلیقات میں دیوان غزلیات قصائد اور رباعیات وغیرہ بھی ہیں۔ ان

کی زبان بھی فصاحت و بلاغت کے انہیں معیاروں سے جانچی جانی چاہئیے۔ سحر البیان کی مقبولیت کے بے شمار اسباب ہیں۔ کہانی کی دلچسپی مصنف کے طریقِ کار کی دلکشی اور شخصیت کا بھرپور اظہار، اندازِ بیان میں ہر سطح پر انسانی جذبات کی تسکین کا سامان، انہوں نے حسن کی مثنوی کو سچ مچ "نگار خانہ چین" بنا دیا ہے۔ ورنہ ایک ہی مصنف کی غزلیات میں بھی وہی زبان ہے، مثنوی میں بھی وہی ہے، مثنوی مقبول ہو گئی۔ دیوان قبول کا درجہ حاصل نہ کر سکا۔ اس لئے ہمارے خیال میں قدرت نے فصاحت کے کانوں میں جو "سناوٹ رکھی ہے"۔ اس کی زبان کو جو سادگی اور شیرینی حاصل ہوتی ہے، زبان کی صفائی، محاورہ بندی اور الفاظ کی "کاٹ چھانٹ" پر میر حسن کی جو تعریف کی گئی ہے۔ اسے اگر صحیح تناظر میں دیکھا جائے تو میر حسن کے کلام کی اصل نوعیت معلوم ہوتی ہے۔ "بے مزہ محاورات کی ردّ بتی" "ثقیل الفاظ کی اصلاح" "صرف و نحو کے تغیرات" ان سب میں حسن کا حصہ بہت کم ہے۔ یہ انقلابات تو میر و مرزا کے زمانے سے سرعت کے ساتھ آ رہے تھے۔ حسن بھی اسی روایت کے ماننے والے ہیں۔ اسلئے انہیں اپنے دور سے الگ یا اپنے دور سے بلند قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ اشرف حسین صاحب نے زبان کے تغیرات کی جو تیسری قسم دریافت کی ہے کوئی سائنٹفک طریقِ خیال نہیں ہے۔ جس کو اپنے زمانے کا احساس تھا۔ اس معیار سے بھی وہ زیادہ قابلِ لحاظ نہیں اسلئے یہ کہنا کہ میر حسن کو موجودہ زمانے کے تقاضوں کا احساس تھا۔ وہ زبان کے تغیراتِ کی رفتار سے واقف تھے۔ جس کے دیکھے سہرے پر مظہر جان جاں، خان آرزو اور میر و سودا تھے، دوسری طرف انشاء اور جرأت کی نئی پود سامنے آ رہی تھی۔ حسن کے کلام میں آج بھی ہمیں وہ جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ جو انہیں ان کے معاصرین سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ یاں مثنوی سحر البیان کے زیر اثر ہماری اردو زبان میر حسن کی زبان سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ لیکن ان کے ہاں ایسے الفاظ اور محاورات

اور تذکیر و تانیث موجود ہیں۔ جو انہیں میر و مرزا کی صف میں لے جاتے ہیں۔ دراصل مشہور شعرا کی دو نسلوں کے درمیان ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف ان کا کلام میر و مرزا سے پہلو مارتا ہے۔ دوسری طرف جرأت و انشاء کے چونچلے اور پھکڑ بازی بھی ان کے ہاں پائی جاتی ہے۔ زبان کا حال بھی اس سے مختلف نہیں۔ ایسے متروکات ملتے ہیں جو ان کے نوعمر ساتھیوں کے ہاں دکھائی نہیں دیتے۔ ان کے کلام میں بعض ایسے نسبتاً جدید الفاظ بھی ہیں۔ جن کا سراغ میر و مرزا کے ہاں بڑی مشکل سے ملے گا۔ مصحفی کی بات دوسری ہے۔ کیونکہ ان کی عمر طبعی دو چھوڑ تین نسلوں کو حاوی ہے۔ حسن کی عمر کچھ اوپر پچاس برس کی تھی۔ ان کا دور وہ ہے۔ جب میر ضیا اور ان کے ساتھیوں کے پسندیدہ محاورے اور روزمرّوں نے فیض آباد کی فضاؤں میں ذرا قدیم رجحانات کو زندہ کر رکھا تھا۔ سودا پہونچے تو ان کے زبان و بیان کے اجتہاد فیض آباد میں گھر کر گئے۔ میر حسن نے ان اثرات کو بھی جذب کیا۔ پھر حسرت اور ان کے شاگردوں (خاص کر جرأت وغیرہ) نے لکھنؤ کی زبان گوئی سے کچھ کچھ الگ کرنا شروع کیا۔ حسن کا کلام ان رجحانات کا آئینہ دار بھی ہے۔

کلامِ حسن کا جائزہ اگر زبان کے اعتبار سے لیا جائے تو اس میں بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث میں قدامت کا رنگ (بالفاظِ دیگر وہ عنصر جو سحر البیان کی مقبولیت کے باوجود ہمارے مزاج کا جزو نہیں بن سکا) بڑا نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ یحییٰ تنہا صاحب کو بھی بات کھٹکی ہے۔ مثالوں میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

"لب" میر حسن کے ہاں مونث ہے کہتے ہیں ؎

صبح کو جاتا اٹھا ہیں ہونٹ	خواب میں شب جو تیری لب کاٹی

"غزل" کو مذکر باندھتے ہیں ؎

سرسری یہ تو لکھا ایک غزل میں لیکن — کہہ حسن اور بھی احوال سراسر اپنا

"التفات" مونث ہے ؎

کی تو نے التفات کبھی سرسری تو کیا — اس پر جو اعتبار ہو سو اعتبار کیا

"دارو" مونث ہے۔

اس مرض سے جانبر ہو بھلا کیونکر حسن — جس مرض کی کہیں دنیا میں کہ دارو ہی نہ ہو

"بحر" مونث اور "قیل و قال" مذکر ہیں ؎

"بحر" اشکوں کی تو لے ابر حسن کی سوکھی — پانی اب کون سے چشموں سے تو بھر لاویگا

یہ جو کچھ "قیل و قال" ہے اپنا — وہم ہے اور خیال ہے اپنا

"چشم" ان کے ہاں مونث بھی ہے مذکر بھی ؎

چشم بارست کے مارے ہیں تری ابلِ قبور
جائے گی خاک پہ ان کی شجرِ تاک چڑھا!

ہے وہ خورشید سامنے تو بھی — "چشم" آنسو بہائے جاتا ہے

پھٹا دل کے زخموں کا انگور کیا — کہ پھر "چشم" خوں لبنۂ کچھ نم ہوا

اس آہ و نالہ سے جل جائے جان و دل یکسر — رفیق میرا اگر "چشم" اشک بار نہ ہو

دیکھتی ہے یہ کس کی آنکھوں کو — کیوں کھلے ہیں یہ "چشم" نرگس کے

"افواہ" مذکر ہے ؎

پوچھا جو میں حسن سے آیا ہے تیرا یار — "افواہ" یوں اڑا ہے یہ سچ ہے کہ یا غلط

"آغوش" مونث ہے۔

---

(۱) مذکر کے لئے معاصر حصہ دوم ص ۱۳۱ ستو کھ سنگھ بے تاب کا شعر۔ مجموعہ نغز جلد دوم ص ۲۴۹ بدایت کی رباعی (قاضی عبد الودود فرماتے ہیں: اس زمانے میں چشم مذکر بھی مستعمل تھا)

"آغوش" سے ہماری کھینچے ہے کیا کنارہ | ہم بھی کنارہ تجھ سے ناچار کھینچتے ہیں

"التماس" مذکر ہے ؎

نہ خط کسی کا پڑھے ہے نہ وہ عرضی | کہاں تلک نئے ہم اپنا "التماس" پھر یں

"سیل" مونث ہے ؎

ڈھ گیا ہو نہ خانۂ دل آج | "سیل" خوں چشم سے بھی تو ہے

"فکر" مذکر ہے ؎

حسن کچھ "فکر" جلدی سے کرو واں کے بھی جانے کا
رہو گے کب تلک بیٹھے یہاں تم آہ غافل سے

"زلف" مذکر ہے ؎

پھنسایا ہم کو دل ہی نے غرض دام محبت میں
نہ تیرے جعد گیسو نے نہ تیرے "زلف" دکاکل نے

گر بخت اپنے جاگیں تو اک کام کیجیے | سائے میں اس کے "زلف" کے آرام کیجیے

"انتہا" بھی مذکر ہے۔

"انتہا" یا دیہ عشق کا پایا نہ حسن | ہم تو مر مر گئے اس راہ میں چلتے چلتے

"کف" مذکر ہے ؎

دل گم گشتہ کی طرف سے ہم | "کف" افسوس اپنے مل بیٹھے

اس تذکیر و تانیث کا مقابلہ ناسخ اور ان کے معاصرین کی کوششوں سے کیا جائے تو اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ کہ ہمیں ان الفاظ کی تذکیر و تانیث کیوں کھٹکتی ہے دریائے لطافت (۱۲۲۱ھ) میں انشا نے تذکیر و تانیث کے اصول و قواعد مرتب کئے ہیں۔ ان کی روشنی میں حسن کی سحر البیان کا جائزہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ یہاں صرف ان الفاظ کو پیش کیا جاتا ہے۔ جو حسن نے سحر البیان میں استعمال کئے ہیں۔

اور ان کی تذکیر و تانیث دریائے لطافت میں درج ہے ۔

ازدحام (مؤنث)[1] آزار (مؤنث) انبوہ (مؤنث) بادِ (مؤنث)، ددل (مؤنث)[2] بائیں ہم زمرہ ...[3] ۔ اس طرح پیکاں ۔ دہی ۔ قرآن ۔ سخن ۔ قلم ۔ بحر وغیرہ ۔ مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہونے لگے تھے[4] (اصطلاح میں ایسے الفاظ کو جو بیک وقت مؤنث بھی ہوں اور مذکر بھی ۔ مختلف فیہ کہا جاتا ہے) ذرا اس کا مقابلہ ناسخ کی تحریک سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن کے کارنامے کا زبان کے معاملے میں ایک حصہ ایسا بھی ہے ۔ جسے ناسخ کی تحریک نے مٹا دیا اور خود میر حسن کا خاندان بھی اس اثر سے نہ بچ سکا ۔ انیس کے گھرانے کی زبان ناسخ کے زمانے میں بھی مستند تھی ۔ لیکن ناسخ کی تحریک بھی زندہ حقیقت تھی ۔ اس کا اثر بھی دورِ حاضرہ پر اب تک محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ مذکورہ بالا الفاظ کی تذکیر و تانیث کا حال ضامن لکھنوی کے زمانے میں لکھنؤ میں کیا تھا ، اس کا جائزہ بھی بے موقع نہ ہوگا ۔ میر حسن کے اشعار پیش کئے جا چکے ہیں وہی الفاظ ضامن کے ہاں دیکھئے ۔

لب (مذکر)[5] غزل (مؤنث)[6] النغات (مذکر)[7] دارو (مونث)[8] چشم (مونث)[9] التماس (مؤنث)[10] آغوش " بعضوں کے عندیہ میں گود کے قیاس پر مؤنث ہے ۔ حالی آنکہ بلغیٔ نظم مذکر پایا جاتا ہے[11] ۔

" سیل " مختلف فیہ " تانیث کے بیشتر فصحا قائل ہیں اور تذکیر کے کم تر[12] افواہ (مذکر)[13] فکر (مؤنث) دلی والے مذکر باندھتے ہیں ۔ زلف (مونث)[14]

---

(۱) دریائے لطافت ص ۲۵۵ (۲) دریائے لطافت مترجمہ ص ۲۴۷ (۳) دریائے لطافت ص ۲۵۰ (۴) ایضاً ص ۲۵۷ (۵) رسالۂ تذکیر و تانیث ص ۱۵ (۶) ص ۵۱ (۷) ص ۱۷ (۸) ص ۴۳ (۹) ص ۵۶ (۱۰) ص ۳۸ (۱۱) ص ۵۹ (۱۲) ص ۴۲ (۱۳) ص ۴۴

انتہا (مونث)[1] بحر (بمعنی سمندر۔ (مذکر)[2]۔ کف۔ "مختلف فیہ" اکثر فصحی تانیث ہی کے قائل ہیں"[3]۔ دریائے لطافت میں سحر البیان کے جن الفاظ کی تذکیر و تانیث بیان ہوئی ہے اور اوپر درج ہو چکے ہیں۔ وہ ضامن کے رسالے میں اس طرح ہیں :۔

ازدحام (مذکر)[4] آزار (مذکر)[5] انبوہ (مذکر)[6] باؤ (مذکر)[7] اب متروک ہے۔ [حاشیہ نگار ترجمۂ دریائے لطافت] دوں (مونث)[8] ہجوم۔ آجکل مذکر ہے۔ [حاشیہ نگار ترجمۂ دریائے لطافت] پیکاں (مذکر)[9] دہی (مذکر)[10] قرآن (مذکر)[11] سخن (مذکر)[12] قلم (آجکل مذکر)۔

اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ تذکیر و تانیث میں عہد بہ عہد فرق پڑتا رہا ہے۔ صفیر بلگرامی تذکرۂ جلوۂ خضر کی پہلی جلد میں اردو زبان کی عہد بعہد ترقی کا جائزہ لیتے ہوئے تین چارٹ پیش کرتے ہیں۔ چارٹ نمبر ۱ دلی کی زبان میر و مرزا کی تبدیلی۔ چارٹ نمبر ۲ سودا اور میر کی زبان اور ناسخ کی تبدیلیاں۔ نمبر ۳ میر حسن اور ان کے معاصرین کی زبان اور ناسخ کی تبدیلیاں (یہ تینوں چارٹ اردو زبان کے بارے میں بڑے مفید ہیں)۔

لوگ میر حسن پر بعض متروک الفاظ کے استعمال کا الزام لگاتے ہیں۔ وہ اس بات کو فراموش کر جاتے ہیں۔ کھائے ہے۔ میر حسن کے زمانے تک یہ لفظ فصیح سمجھے جاتے تھے اور بے تکلف استعمال ہوتے تھے۔ میر حسن نے بھی انہیں استعمال کیا ہے۔ بعض الفاظ اور روزمرے میں معمولی تغیر جلد ہی شروع ہو گیا تھا دریائے لطافت کے مندرجہ ذیل بیانات قابلِ غور ہیں :۔

---

(۱) ص۱۱ (۲) ص۳۰ (۳) ص۴۳ (۴) ص۵۵ (۵) ص۳۲ (۶) ص۶۴ (۷) ص۶۶
(۸) ص۶۳ (۹) ص۵۸ (۱۰) ص۶۷ (۱۱) ص۵۹ (۱۲) ص۶۰

(۱) "میں نے کہا" کے بارے "میں کہا" فصحا نہیں بولتے۔ پرانے شہر (پرانی دلی) کے رہنے والے دقیانوسی بوڑھے ایسا بولتے ہیں۔[1] لیکن میر حسن نے یہ استعمال کیا ہے میر حسن کے بعد "میں کہا" ترک ہو گیا

(۲) "بہت سی" اور "بہت سیاں" مونث ہیں "بہت سا" اور "بہت سے" مذکر ہیں۔ "اکٹھی" اور "اکٹھیاں" مونث ہیں یہی تکرار کا حکم رکھتے ہیں۔ اور "سارا" "سارے" اور "ساریاں" بھی اسی قبیل سے ہیں.....

"بہت سیاں" بھی صحیح ہے لیکن بعض فصحا کے نزدیک مفرد اور جمع میں ایک ہی لفظ "بہت سی" لانا چاہیئے۔[2] گویا میر حسن کے تو دور بعد "سیاں" والی شکل غیر مقبول ہونے لگی تھی۔

"کئی اکٹھے ہوئے" یہ فصیح ہے "کئی مرد اکٹھا ہوئے" یہ صحیح ہے مگر فصیح نہیں "کئی رنڈیاں اکٹھی ہوئیں" فصیح "کئی رنڈیاں اکٹھیاں ہوئیں" یا "کئی رنڈیاں اکٹھا ہوئیں" یہ دونوں غیر فصیح۔[3] اب آج کل یہ فرق لکھنؤ اور دلی کا فرق بن کر رہ گیا ہے۔

(۳) میرا۔ میری۔ تیرا۔ تیری کو (بغیر حرفِ دوم دیے) کے اور محض اول حرف کے کسرہ سے بھی لاتے ہیں۔ جیسے مری۔ تری۔ یہ بھی فصیح ہے۔ ضمیر واحد غائب ہی۔ کا۔ کی۔ لانا چاہیئے۔ جیسے "اس کا" "ان کا" اور "انہوں کا بیٹا" اگرچہ لاہور کی زبان ہے۔ لیکن اردو میں مروج ہے۔ اس طرح "اس کی بیٹی" "ان کی بیٹی" "انہوں کی" بھی "انہوں کا" کی طرح اردو میں رائج ہے۔ لیکن اردو نہیں۔[4] اس زمانے تک میرا۔

---

(۱) دریائے لطافت صفحہ ۲۶۳ (۲) ایضاً صفحہ ۲۹ (۳) ایضاً صفحہ ۲۹۱ (۴) دریائے لطافت صفحہ ۲۷۰۔

میری- تیرا- تیری- میں سے (یے) کے حذف کو فصیح جانتے تھے۔
میرحسن کے ہاں بھی یہ الفاظ بہ حذفِ (یے) موجود ہیں۔ "انہوں کا"، "انہوں کی" یہ بھی حسن کی محبوب ترکیبیں ہیں۔ لیکن دریائے لطافت کی تالیف کے وقت تک انہیں ترک کرنے کا رجحان صاف دکھائی دیتا ہے۔ "انہوں کے واسطے" "یا" "لئے" اور انہوں کی خاطر- غیر فصیحوں کی زبان ہے جب کہ "ان کے واسطے" "یا" "لئے" اور "ان کی خاطر" فصیح ہے۔ "کنے" (یائے مجہول) بمعنی نزدیک بھی "واسطے" اور "لئے" کے طریق پر مستعمل ہے۔ جیسے "میرے کنے"۔[۱]
(۴) دو ہندی لفظوں یا ایک ہندی اور ایک فارسی کے درمیان واوِ عاطفہ کا لانا اچھا نہیں جیسے یہ کہنا "جھاڑ و ٹوکرا" یا جاروب و ٹوکرا"۔[۲]
لیکن میرحسن کے ہاں سحرالبیان کے بعض نسخوں میں یہ واوِ عطف موجود ہے فی الحال یہ کہنا مشکل ہے کہ قدیم ترین نسخوں میں اس کی کیا صورت ہے۔
(۵) "کسرۂ اضافت ایسے لفظ کے آخر میں استعمال کر سکتے ہیں جس کے لئے فارسی میں کوئی لفظ نہ ہو۔ مثلاً "پھلکاریٔ نادر- چھینٹِ بوٹے دار- ایسا لفظ عطف اور اضافت دونوں میں فارسی کا حکم رکھتا ہے"۔[۳]
میرحسن بھی اسی مسلک کے آدمی تھے۔ لیکن آج کل یہ طریقہ رائج نہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ابھی دلی سے سند لی جاتی تھی اور لکھنؤ کی زبان پوری طرح

---

(۱) ایضاً ص۳۰۶ (۲) ایضاً ص۳۰۶ (۳) ایضاً ص۲۹۲ (۴) ایضاً ص۲۹۰

ادب میں بار نہیں پا سکی تھی[6]۔ طَرْفہ اور طَرَف دونوں طرح باندھے جاتے ہیں۔ تنہا صاحب نے بھی اس کی مثالیں دی ہیں۔ مزید مثالوں کے لئے غزلیات حسن مرتبہ مرزا علی حسن کا صفحہ [16]، ۴۰، ۵۷ طَرْفہ کے لئے اور ۱۸، ۵۵، ۵۹ طَرَفہ کے لئے۔ دیوانِ میر حسن شائع کردہ نولکشور پریس طَرْف کے لئے صفحہ ۴، ۷، ۲۵، ۴۱، ۴۷، ۴۴، ۶۲، ۶۷ اور طَرَف کے لئے صفحہ [16]، ۳۱، ۳۴، ۵۱، ۵۴، ۱۰۱ اور ۱۷۱ ملاحظہ فرمائیے۔ یہی اصول بعض الفاظ کے ترک اور عدم ترک میں استعمال ہو سکتا ہے۔ سحر البیان میں مندرجہ ذیل الفاظ پائے جاتے ہیں۔ لیکن آج کل انہیں کوئی استعمال نہیں کرتا "واچھڑے" (بہت خوب کے معنوں میں[3]) "ابیس" اور "سا"[4]۔ "باری دار"[5]۔ "میں بجائے نے"۔

---

(۱) انشا دریائے لطافت میں لکھتے ہیں:۔ ازیں حالات بریقین پیوست کہ در شہر فصحائے آنجا تائید کلام خود از فصحائے دہلی جویند و ترجیح لکھنؤ بر دہلی در زبان و سلیقہ ہماں ترجیح است کہ مخطرہ ترا ہمسہ بیرم خاں را بر کنٹرہ ڈنیل (صہ[49]، صہ[73]) افسوس آرائشِ محفل میں فرماتے ہیں:۔ شعرا بھی جتنے اس شہر لکھنؤ میں کیا فارسی گو کیا ریختہ گو کہیں نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد برہم ہونے شاہ جہاں آباد کے اکثر غریب امیر مرزایاں ہندوستان سے نواب صفدر جنگ اور شجاع الدولہ بہادر کے عہد میں آ کر اس شہر میں بہ سکونت دائمی ساکن ہوئے۔ پس شہر تو عبارت اشخاص سے ہے یہی دلی ہو گیا اور باشندے بھی اس کے بسبب کثرت صحبت و تتبعِ زبان تلفظ صحیح کرنے لگے۔ یہاں تک کہ جن کی طبع موزوں تھی شاعر ہو گئے۔ باوجود اس کے بھی لہجے میں تفاوت بہت رہ گیا۔ لیکن محاورے میں کم کہ زبان دان ہی اس کو سمجھے اور اس کی جمعیت پر لگے (آرائش محفل صہ[121]) (۲) دریائے لطافت صہ[128] (۳) اچھا کر دیا۔ بزرگ معلومات رکھنے والی ایضاً صہ[129]! (۴) دیکھئے امیر اللغات جلد اول صہ (۵) جو اپنی باری پر بادشاہ کی خدمت پر حاضر ہو۔ دریائے لطافت صہ[143]!)

بلانے[1] ۔ ڈھمنی پن[2] ۔ ٹکیودی[3] ۔ سہیلی[4] ۔ جانی[5] ۔ تہاتے پر یکھا ۔ ڈھٹا ہے
وغیرہ میں سے بعض ناسخ اور ان کے معاصرین نے مٹا دیے ۔ بعض کے معنے
بدل دیے ۔ آج ہمارے لئے یہ الفاظ متروک، اور غیر فصیح ہیں ۔ علاوہ ازیں الفاظ
کے تلفظ کا بھی یہی عالم ہے ۔ ان کے زمانے میں بقول انشاء کُھلنا اور کِھلنا دونوں
دونوں فصیح تھے[6] ۔ آج کِھلنا متروک ہے ۔ ہرن ۔ کبھی دونوں طرح آتا تھا[7] ۔ یعنی
بالفتح حرفِ اوّل و بالکسر حرفِ بھی اب صرف بالکسر آتا ہے[8] ۔ دہ اور دو دونوں
طرح مستعمل تھا ۔ اب موخر الذکر صورت متروک ہے ۔ بہ کو بے بھی دلی کے فصحا
بنا لیتے تھے[8] ۔ اب یہ صورت نہیں ۔ تانک اور تک، دونوں صورتیں اس زمانے میں
استعمال ہوتی تھیں[9] ۔ اب ایسا نہیں ہے ۔ "جوں" بطور حرفِ تشبیہ دریائے
لطافت کی تالیف کے وقت "گویا" کے معنوں میں صاحبانِ اردو کے نزدیک
ثابت نہیں ۔ بلکہ حرفِ تشبیہ کے معنی میں بھی شاہجہان آباد میں مستعمل نہیں ۔
ریختہ گویوں نے زبردستی اس کو اردو بنا لیا ہے ۔ لیکن بولتا اس کو کوئی نہیں ۔ ممکن
ہے اردو ہو[10] ۔ میرحسن نے اس کا بہت استعمال کیا ہے ۔ بعد کو متروک ہو گیا
"گویا اور کاشکے اردو میں مثلِ فارسی کے استعمال ہوتے ہیں ۔ "کہے تو" اور

---

(۱) ایک چیز کو لینے کو دل تو کرتا ہے مگر بناوٹ سے انکار دریائے لطافت ص۱۴۵ (۲) انشا کے خیال میں ڈھمنی پن یعنی معشوقوں کے لبھانے کا انداز میرحسن نے سحرالبیان میں ڈھمنی پن باندھا ہے شاید عورتوں کی زبان میں ٹھیک ہو۔ دریائے لطافت، اردو ترجمہ ص۱۴۹ (۳) چوب جس سے نقارہ بجاتے ہیں ص۱۴۵ (۴) ہم عمر کنیز ص۱۴۰ (۵) معشوق کا خطاب ایضاً ص۱۴۳ (۶) دریائے لطافت ص۲۲۱ (۷) ایضاً ص۲۲۳ (۸) ایضاً ص۳۲۳ (۹) دریائے لطافت ص۳۲۵ (۱۰) ایضاً ص۳۴۵ ۔

"تو کہے" "جو تو کہوئے" اور "گوئی تو" کا ترجمہ ہے۔ میر تقی میر کی ایجاد ہے۔ یہ لفظ اردو نہیں۔ شعر میں میر کی تقلید اور تتبع میں باندھ سکتے ہیں۔ روزمرہ میں داخل نہیں۔[1] میر حسن نے بھی میر کے اس مسلک کی پیروی کی ہے۔ لیکن انشا کے فوراً بعد تو کہے اور کہے تو متروک ہو گئے اور آج بھی متروک ہیں۔ یہ تمام الفاظ جن کا ذکر آیا ہے۔ میر حسن کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ ان کی جدت زیادہ تھی اور یہی خوشگوار اور فصیح سمجھے جاتے تھے۔ ناسخ کی تحریک نے انہیں بھی متروکات کے ذیل میں کر دیا۔ میر حسن کے بعد جب ان کے پوتے میر انیس نے مرثیہ نگاری میں نام پیدا کیا۔ تو ان کے گھرانے کی زبان اور بھی مستند مانی گئی۔ اس استناد کی قدامت ثابت کرنے کے لئے نصیر حسین خیال نے خواہ مخواہ ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور ایک روایت بھی گھڑ لی۔ جس کے مطابق میر حسن کے والد سالار جنگی خاندان کی عورتوں کی زبان کو قلم بند کرنے پر مامور تھے میر حسن بھی اسی زبان کے دفتر میں ملازم تھے۔ تاریخی طور پر یہ روایت ثابت نہیں۔ تذکرۂ بہارِ بے خزاں میں سحر البیان میں عورتوں کی بولی کی صحت کو منوانے کے لئے ایک ایسی ہی حکایت درج ہے "یہ سرکارِ نواب سردار جنگ خلفِ نواب سالار جنگ کامیاب بودہ لہجۂ زبانِ بیگمات از حسنِ صحبتِ پردگیانِ آئینہ رو کہ از سرادقِ عصمتِ نوابِ نامدار بودند و بے حجابانہ لیل و نہار بالیشاں چشم دوچار داشت۔ بہم رسانیدہ و تکلفاتِ امارت و اختراعاتِ طرزِ دلبری و دلداری زنانہ از آنکہ در مثنوی سحر البیان بہ مبالغہ گفتہ بہ چشم سر دیدہ جائیکہ غمزۂ پامالِ نگاہ و عشوہ صرفِ تماشائے ہر ادا بود۔ سیر تلاشِ مضمونِ دلفریب

---

(۱) ایضاً ص ۳۳۵، ص ۳۳۶

داشتہ۔ القصہ آنجا کہ در ہر کرشمہ صد داد و در ہر غمزہ ہزار سحر نمایاں بودند۔ مضمونے می جست۔ دست بستہ پیشِ خود می یافت۔ گویا مضمونِ حاضر را بہ تکلف غائبانہ بستہ دادِ سخنوری دادہ[1]۔

یہ بھی یار لوگوں کے اختراعاتِ خائقہ میں سے معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اتنا قطعی ہے کہ سحرالبیان کی زبان کو مستند مانا جاتا تھا اور اس کا اثر بعد کی مثنویوں پر پڑا۔ میر حسن کی اردو اپنے زمانے کے اصول و قواعد کے عین مطابق ہے اور لکھنؤ کی مابعد کی زبان کا مزاج متعین کرنے میں میر حسن کی مثنوی اور میر حسن کے گھرانے کی زبان کا بڑا ہاتھ ہے[2]۔

(۳)

فارسی دانی کے بارے میں جو دعوے اوپر درج ہوئے ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ مبالغہ آمیز ہیں۔ ہندوستان میں اس وقت فارسی زبان کی یہ حالت تھی کہ اس پر ایک بڑی حد تک زوال آچکا تھا۔ سلطانی دور میں فارسی ادب کو

---

(۱) تذکرۂ بہارِ بے خزاں کا یہ اقتباس شعر الہند جلد دوم ص ۱۲۷ سے لیا گیا ہے

(۲) حسن کے ایک لفظ پر صاحبِ نوراللغات نے ایک اعتراض کیا ہے۔ (جلد چہارم۔ کھٹوائی کے ذیل میں) حسن کی رباعی ہے۔

اس قیدِ فرنگ کی پڑی تھی گھاٹی — لی تھی ترے غم سے خلق نے کھٹوائی
چھوٹا نہیں اس قید سے تو ایک فقط — گویا کہ خدا نے ہند سب کی کاٹی

اس پر صاحبِ نوراللغات کہتے ہیں کہ محاورہ "اٹوائی کھٹوائی" کا ہے۔ حسن نے صرف "کھٹوائی" لکھا ہے۔

پاک و ہند میں بڑی ترقی حاصل ہوئی لیکن رفتہ رفتہ مغلوں کی آمد تک یہاں فارسی زبان و ادب میں زوال آگیا۔ بابر کی آمد سے ہندوستان میں فارسی ادب اور زبان میں پھر سے زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اورنگ زیب کے زمانے تک ایرانی ادبا اور شعرا بکثرت ہندوستان میں آتے رہے۔ مقامی اثرات کا زبان پر اثر و نفوذ ناگزیر تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں فارسی زبان مقامی روزمرے محاورہ اور اسالیب بیان کے تحت آگئی۔ نثر سادہ سے کہیں زیادہ پاک و ہند کی فارسی میں مصنوع کا چلن تھا۔ جس میں استعمالِ ہند کی کمی نہ تھی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں جب شیعہ سنی اختلافات مذہبی کی بجائے سیاسی ہو گئے۔ تو برصغیر میں ایرانیوں کی آمد بڑی حد تک رک گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کی فارسی میں مقامی اثرات زیادہ ابھرنے لگے۔ ہندوؤں اور ہندوستان زاد مسلمانوں نے جب مغلوں کے دفاتر میں کثرت کے ساتھ شمولیت شروع کی تو فارسی زبان کے ساتھ بڑی زیادتیاں کی گئیں۔ دلی میں ہندوستان زاد ادیبوں میں جس شخص نے سب سے زیادہ نام پیدا کیا ہے وہ خان آرزو ہے۔ ان کے شاگردوں میں مخلص، میر تقی میر اور سودا وغیرہ ہیں۔ ایک دوسرے بزرگ مظہر جان جاناں تھے۔ یہ لوگ اورنگ زیب کے بعد کے زمانے کے بلاشبہ بڑے ادیب ہیں۔ ان کی فارسی ہندوستانیانہ اور استعمال ہند سے پر ہے۔ لیکن استعمالِ ہند کی گھناؤنی صورتیں ان کے ہاں نہیں ہیں۔ ان دو چار بزرگوں کو چھوڑ کر باقی فضلاء کی فارسی دانی واجبی سی تھی۔ دلی میں فارسی شاعری کی جگہ نمایاں حیثیت اردو شاعری نے لے لی۔ میر حسن ایسی ماحول میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدا میں جن بزرگوں کی صحبتوں سے فیض حاصل کیا ہے۔ ان میں خواجہ میر درد کا نام لیا جاسکتا ہے۔ درد کے زمانے

تک یہ حال ہو گیا تھا کہ لوگ خط و کتابت اور تذکرہ نویسی فارسی میں کرتے تھے۔ شعر و شاعری میں زیادہ تر اردو کو مقبولیت حاصل تھی۔ میر حسن شروعِ جوانی میں فیض آباد پہونچے۔ فیض آباد میں نوابانِ اودھ کے شیعہ ہونے کی وجہ سے ایران کے ساتھ کچھ نہ کچھ روابط استوار تھے۔ بعض ایرانی شیعہ فاضل یہاں بھی پہونچتے رہے۔ چنانچہ انہیں کے شاگردوں میں نومسلم مرزا محمد حسن قتیل تھے۔ قتیل پاک و ہند میں اس دورِ اول میں ٹکسالی فارسی کے ماہر تھے۔ میر حسن کو دوبارہ لکھنؤ آنے پر ان کی دوستی سے فائدہ اٹھانے کا موقع بھی ملا۔ ہندوستان میں فارسی زبان کے زوال پذیر اثرات کی نشاندہی قتیل نے نہر الفصاحت میں بڑی چابک دستی سے کی ہے۔ اس کے علاوہ فارسی زبان میں ریختہ گو شعراء تذکروں کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان کے اعتبار سے بارھویں صدی کے ابتدائی تذکرے زیادہ اچھے ہیں۔ میر تقی میر۔ گردیزی اور قائم کی فارسی میر حسن کی فارسی سے کہیں بہتر ہے۔ حسن کے ہاں ان خرابیوں کا بہت سا حصہ موجود ہے۔ جسے ان کے دوست مرزا قتیل بھی ناپسند کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ میر حسن کی فارسی ہندی فارسی کی بدترین صورت نہیں ہے۔ اس کی نوبت مجالسِ رنگیں میں رنگین کے ہاتھوں آئی ہے لیکن حسن اپنے معاصرین میں قتیل کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ نظم میں حسن کا کل فارسی سرمایہ زیادہ نہیں ہے۔ انہوں نے دیباچۂ دیوان میں اپنے تین شعر دیے ہیں۔ فارسی میں شعر کہنے والے شعراء میں ان کا شمار بھگوان داس نے سفینۂ ہندی میں اور باغِ معانی کے مصنف نے اپنے تذکرے میں کیا ہے۔ دو رکم و بیش انہیں، دو تین اشعار پر تکیہ کیا ہے۔ کلیاتِ میر حسن میں دو چار رباعیوں اور ایک آدھ متفرق شعر کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ نثر میں

ان کا دیباچۂ دیوان اور تذکرۂ شعرائے اردو موجود ہیں۔ میر حسن کی فارسی دانی کے بس یہی چند نمونے ہیں۔ ان کے ہاں فارسی نثر میں وہی اسلوب ملتا ہے جو اس زمانے کا عام رواج ہے۔ سادہ نثر کے ساتھ نثر مصنوع کا پیوند کیا ہے۔ قوافی کا التزام ہے اور کہیں کہیں عبارتوں کو قرآن پاک کی آیات اور احادیث اور ضرب الامثال سے بھی سجایا ہے۔ لیکن حسن عربی میں غالباً زیادہ دسترس نہ رکھتے تھے۔ اس لئے دیباچۂ دیوان میں عربی عبارتوں میں اغلاط کا راہ پا جانا چنداں تعجب انگیز نہیں۔ حسن کی فارسی بھی ایرانی فارسی نہیں ہے۔ وہ ہندوستانی فارسی لکھتے ہیں اور اس طرزِ نگارش کے بعض برے اثرات سے بھی نہیں بچ سکے۔ بعض اوقات ان کی فارسی پڑھنے والے کو الجھن میں بھی ڈال دیتی ہے۔ دیباچۂ دیوانِ حسن میں لکھتے ہیں :-

"روزے بفرمائش آں شفیق ریختہ انشا کردم کہ در فصاحتِ زبانِ دانانِ ہند فصیح آمد۔ ازاں باز چوں زبانِ خود گفت از فارسی گذشتہ آنچہ بدل آمد گفتہ"[1]

یہ فقرہ الجھا ہوا ہے۔ مطلب نہیں کھلتا۔ "زبانِ خود گفت" سے مراد "در زبانِ خود گفتن" ہے؟ یا میر حبیب اللہ بامن گفت کہ در زبانِ خود شعر بگو" ہے۔ بات خاصی الجھی رہتی ہے۔ اس طرح ان کا یہ کہنا۔

"پس آنجا آنچہ طبع زادہ معروف نمودہ توقع از صاحبانِ معنی دارم کہ ہر گاہ بر نسبتِ معانی نہ الفاظ نگاہ کنند از بلند ہمتی"

---

(۱) حالاتِ حسن کے دو ماخذ۔ مقالۂ راقم اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۵۷ء ص ۶

حوصلۂ خود قلم برا د بکشند (ایضاً)

اس عبارت میں بھی "طبع زادہ معروف نمودہ" ہے۔ تذکرہ شعراے اردو بھی اغلاط سے خالی نہیں ہے۔ انفس کے حال میں لکھتے ہیں:۔

کدام ہندو بچہ گو پال نامی بود کہ برا د عاشق شد[1]

"کدام" کا یہ استعمال ہندی فارسی کی قبیح ترین مثالوں میں سے ہے۔ مرزا قتیل نے نہر الفصاحت میں اسے واجب الترک کی صف میں شمار کیا ہے۔ قتیل لکھتے ہیں :۔

واجب الترک آں است کہ مخالفِ محاورۂ زبان داناں باشد
باید دانست کہ عوامِ ہند کہ جز از فارسی نہ دارند و لفظِ چند
استعمال کنند۔ در جمیع اہلِ زبان موجب ریشخند باشد[2]

اس کے بعد ان الفاظ کی فہرست دی ہے۔ جس میں "کدام" کے اسی طرح کے استعمال پر اعتراض کیا ہے۔ حسن کی نثر میں "ایشاں" کی بجائے "ادشاں" کا استعمال بھی پایا جاتا ہے۔ مدعا کے حال میں لکھتے ہیں :۔

از اشعارِ ریختۂ او کم بہ نظر آمدہ مگر ایں چند بیت کہ در
تہنیت شادی خانۂ بلند مقام محبت خاں سلمہ اللہ در زمین
قصیدۂ ٹپک ٹپک گفتہ چنانچہ بہ نگارش می آید[3]

اس اقتباس میں دو غلطیاں ہیں۔ "شادی" کا لفظ "خانہ آبادی" کے معنوں میں فارسی نہیں اردو ہے۔ دوسری غلطی یہ ہے "چنانچہ" کا کوئی موقع نہ تھا۔ لفظ یاد آ گیا اور ٹھونس دیا گیا۔ مجنوں کے حال میں لکھتے ہیں :۔

---

(۱) تذکرہ شعراے اردو طبع ثانی ص۰ (۲) نہر الفصاحت ص۳ (۳) ایضاً ص۱۴۲

دیما غریب مسلمان شد ۔ لیکن تا حال بوئے کفر و نفاق از دلش نہ رفتہ [۱]

غریب کے لفظ کا یہ معنی بھی اردو میں آتا ہے یا فارسی میں نہیں ۔ فارسی میں غریب بغریب الوطن کے معنوں میں آتا ہے ۔ ان کی فارسی دانی نے بعض جگہ بیانات کو الجھا بھی دیا ہے ۔ اپنے حال میں لکھتے ہیں :۔

فقیر دریں مدت ہفت ہشت ہزار بیت گفتہ باشد و یک ترکیب بند و یک رموز العارفین گفتہ است کہ مقبول دلہا گردیدہ مشہور شدہ است و دو سہ بند اند در اواخر قلمی خواہد شد [۲]

آخر میں میر حسن نے ترکیب بند کا ایک بند درج کیا ہے ۔ گویا مذکورہ بالا اقتباس میں وہ ترکیب بند کے اشعار کے اندراج کا ذکر کرنا چاہتے تھے ۔ لیکن فقرے کا مطلب یہ بنتا ہے کہ آخر میں جا کر رموز العارفین کا کچھ حصہ نقل کریں گے ۔ اسی طرح تذکرے کے ترتیب میں فرماتے ہیں :۔

احوالِ معاصرین خود ماسوائے ایں تذکرہ خواہد نوشت ۔ چنانچہ ہمیں طور نوشتہ آمدہ اند [۳]

یہ اور ایسی سیکڑوں اغلاط میر حسن کی فارسی نثر میں پائی جاتی ہیں ۔ ان کی عبارت کہیں کہیں سے بے جوڑ اور بے ربط ہے ۔ بعض جگہ قوافی کے التزام نے سادہ نثر کے عین درمیان میں آکر ناہمواری کا احساس بھی پیدا کر دیا ہے ۔ وہ ہر جگہ اظہارِ مطلب پر بھی قادر نہیں ہیں ۔ وہ اپنے زمانے کے عام فارسی دانوں میں سے تھے اور میر و مرزا اور تجلی وغیرہ سے فارسی میں کم فضیلت رکھتے تھے ۔ فارسی کے اہم شعرا کے منتخب اشعار ان کی نظر سے گذر چکے تھے (جیسا کہ ان کے

---

(۱) ایضاً ص ۱۶۶ (۲) ایضاً ص ۵۹ (۳) ایضاً ص ۲۰۵ ۔

دیوان میں تضمینوں سے معلوم ہوتا ہے) سکندر نامہ بھی پڑھ چکے تھے۔ (سحر البیان میں اس کے اثرات پائے جاتے ہیں) مولانا روم کی مثنوی بھی ان کے زیرِ مطالعہ رہی ہے (رموز العارفین اس کی شاہد ہے) تالیفِ تذکرہ کے وقت تذکرۂ قائم[1] تذکرۂ میر تقی میر[2]۔ تذکرۂ اشرف علی خاں[3] اور تذکرۂ خانِ آرزو[4] بھی ان کے زیرِ مطالعہ رہ چکے ہیں۔ ان کا اردو کلام اردو شعرا کے علاوہ حافظ، نظیری، ظہوری اور شعرائے عہدِ عالمگیری کے اثرات کو ظاہر کرتا ہے[5]۔ وہ فارسی یقیناً جانتے تھے لیکن اُن کی تحریر پختہ نہیں ہے۔ فارسی زبان کو انہوں نے خالصانہ انداز میں [illegible] نہیں کیا۔ وہ بنیادی طور پر اردو کے شاعر ہیں اور فارسی ادب کے اثرات کو نہایت عمدگی سے انہوں نے اردو میں جذب کیا ہے۔ اس سے ان کی فارسی نہیں منجھ سکی۔ لیکن ان کی اردو شاعری کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

کیا ریختہ کم ہے مصحفیؔ کا
بو آتی ہے اس میں فارسی کی

---

(۱) تذکرہ حسن طبع ثانی ص۱۵ (۲) ایضاً ص۱۲۷ (۳) ایضاً ص۱۲۵ (۴) ایضاً ص۱۲۵ (۵) میر حسن نے سحر البیان میں اردو شعرا میں نوری (ص۱۳۹ شمس بریلوی ایڈیشن) سودا (ایضاً ص۱۲۵) اور فارسی شعرا میں سے رومی (ص۱۲۵ ایضاً) اور ظہوری (ایضاً ص۱۲۵) کا نام لیا ہے۔ تذکرہ شعرائے اردو سے معلوم ہوتا ہے۔ نوری کا دیوان انہوں نے خود نہیں دیکھا صرف تذکروں میں دو ایک شعر دیکھے ہیں۔ لیکن باقی شعرا سے وہ بخوبی واقف دکھائی دیتے ہیں۔

باب ہفتم

زمانہ، شخصیت، غزل گوئی

(۱)

میر حسن کی شاعری کا زمانہ وہ ہے جب پاک و ہند میں فارسی اپنے دن پورے کر چکی تھی۔ مغلیہ تمدن کی پرچھائیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ فارسی ادب کی وہ شان و شوکت، جسے مغلوں نے سہارا دے رکھا تھا، رفتہ رفتہ مٹنے لگی۔ ایران سے نئے اثرات کا راستہ ایرانی تورانی مناقشے نے بند کر دیا، ایرانیوں کی آمد دلی اور نواحِ دلی میں رک گئی تھی۔ اس سے مقامی زبانوں کے سر اٹھانے کے لئے فضا ہموار ہو گئی۔ جتنی بچی کھچی فارسی موجود تھی۔ وہ بھی اردو کے نفوذ سے خالی نہ تھی۔ اسی طرح اردو بھی فارسی کے اثر سے نہ بچی۔ اورنگ زیبی دور میں تمثیل گوئی اور تہ داری کی روش چل چکی تھی۔ دکن میں اردو شاعری کئی منزلیں طے کر چکی تھی۔ جب اردو شاعری کا شمال میں دور دورہ ہوا۔ فارسی شاعری کا اثر اس پر نمایاں ہونے لگا۔ اردو میں ایہام گوئی کا رواج ہوا۔ ایہام گوئی بعض ادبا کے نزدیک برج بھاشا کی وجہ سے رائج ہوئی لیکن اگر سرخوش (کلمات الشعرا) کے قول کو تسلیم کیا جائے تو یہ فارسی کا اثر تھی۔ فارسی کے اثرات اردو شاعری میں ایہام کے سوا ابھی ابھرنے نہ پائے تھے کہ مضمون، ناجی اور حاتم وغیرہ کے اشعار کی قدر اٹھ گئی اور ان کی جگہ مظہرِ جاں اور خانِ آرزو کی تازہ گوئی کی تحریک نے

نے بھی یہ نئی نسل ایہام گوئی سے متنفر تھی اور اس کا مذاق اڑاتی تھی ان کے شاگرد تو اور بھی زیادہ تیز نکلے۔

"ایں ستم کہ شاعرانِ ابتدائی زمانہ محمد شاہ بہ اعتقادِ خود تلاشِ الفاظِ تازہ و ایہام نمودہ شعر را از مرتبۂ بلاغت انداختند۔ تا بمعنی نہ رسد۔ غرض ناگفتہ بہ۔ (قائم۔ مخزنِ نکات)

میر (در بارۂ احسان اللہ می گوید) طبعش بسیار مائل بہ ایہام بود۔ ازیں جہت شعرِ او بی رتبہ ماند (میر۔ نکات الشعرا)

اسی طرح شاعری میں بھی اس پر طرح طرح کے وار کئے گئے:

(۱) ہو رہوم مرا کیوں نہ خوش کہ وہ بتِ چیں
یہ کہہ گیا ہے کہ آؤں گا آج میں سحر شام

بطورِ ریختہ ہے تا تم یہ گفتگو ورنہ — تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

(۲) کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے — کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

(۳) از بس کہ ہم نے حرف دو تی کا مٹا دیا — لے در دا پنے ذہن میں ایہام رہ گیا

(۴) یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی منکر سخنِ شعر میں ایہام کا ہوں میں (سودا)

یہ دور فارسی شاعری کی ان روایات کا متوالا ہے۔ جو اکبری دور میں پاک و ہند میں جاری و ساری تھے۔ شاہ حاتم نے بھی پرانا بستہ لپیٹا اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے نوجوانوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ ایہام گوئی کی ساکھ نہ رہی۔ اس نئی تحریک نے میر و سودا کو جنم دیا۔ ان کے ہاں ایہام رنگ نیبی دور صرف تمثیل گوئی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ ورنہ یہ بنیادی طور پر تازہ گوئی کے قائل تھے

---

(۱) میر تقی میر۔ خواجہ احمد فاروقی صفحہ ۵۴، ۵۵۔

الفاظ و معانی کی بھول بھلیوں میں پڑنے کی بجائے سیدھے سادے تغزل کو انہوں نے اپنایا۔ فارسی کا اثر یہاں بھی پیش پیش تھا۔ فارسی شاعری کی تقلید بھی ہوئی اور تقلید کرنے والوں کی قدر بھی کی گئی۔ ولی مقبول ہوئے اور ان کا کلام اعلا درجے کا قرار پایا۔ اس زمانے میں فارسی زبان میں شعر بھی کہے جاتے تھے۔ میر و سودا نے ایک ایک فارسی دیوان بھی چھوڑا ہے۔ عام خط و کتابت بھی فارسی ہی میں ہوتی تھی۔ البتہ شعر گوئی میں اردوئے معلّیٰ نے اپنے لئے جگہ بنا لی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ اردو فارسی ہی کے بطن سے افکار و احساسات کو جنم دیتی تھی۔ ایسی فضا میں شعرا کو فارسی شاعری کے مقابلے میں اگر اردو شاعری زیادہ خوش آنے لگے تو اچنبھے کی بات نہیں۔

مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ   اب ہے اشعارِ ہندی کا رواج

مصحفی ہوں میں جہاں ریختہ گوئی کو رواج   قدر شیرازی کی ہو واں نہ صفاہانی کی

اب تو جرأت ہے یہ رتبہ غزلِ ہندی کا   کہ مشتاق ہوئے سن کر شعرائے ایراں کے

قائم جو کہیں ہیں فارسی یار   اس سے تو یہ ریختہ ہے بہتر[1]

دلی کے اثرات جن کی اساس میر و مرزا کا کلام ہو گئی تھی، سیاسی انتشار کے سبب، آوارہ خرام ہو گئے۔ جب مغلیہ سلطنت کے چراغ کی لو چھوٹی چھوٹی شمعوں میں تقسیم ہو گئی۔ بنگال میں علی وردی خاں اور ان کی اولاد نیم خود مختار ہو گئی، اودھ کی ریاست برہان الملک نے سنبھالی اور ان کی اولاد اس پر حکومت کرنے لگی، روہیل کھنڈ بھی دریدہ دامن ہو کر چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ گیا۔ فرخ آباد، ٹانڈہ، بریلی وغیرہ اس علاقے کی حکومتیں قرار پائیں۔ نادری

---

(۱) گل رعنا۔ عبد الحی ص ۹۱

حملے نے دلی کا سہاگ لوٹا، تو علوم و فنون کے دھارے صوبائی خود مختار حکومتوں کی طرف بہنے لگے۔ میر و مرزا بھی خانہ ویراں ہوئے اور اس ماحول میں انہیں بھی دوسرے دروازوں پر دستک دینی پڑی۔ نادری حملے سے لے کر ابدالی کے حملوں تک شعرا کی نقلِ مکانی کا یہی عالم رہا۔ راجپوتانے اور اس کے گرد و نواح میں راجپوت کوس لمن الملکی بجا رہے تھے۔ جنوب میں نظام الملک کی ریاست کے ہمسایے میں مرہٹوں کا پیچ و تاب کھاتا ہوا لاوا بار بار شمال کی طرف یورشیں کرتا تھا۔ اس طوفان میں انگریزی اقتدار جنوب میں ابھرنے لگا۔ مشرق میں ان کے قدم بنگال کی سرزمین پر جمنے لگے۔ پاک و ہند کا برِّصغیر آگ کے بے شمار بگولوں کی آماجگاہ بن گیا۔

مغلیہ سلطنت کا یہ زوال ایک ایسی حقیقت تھا۔ جن نے انفرادی شجاعت، اور دلیری کی تو قدر کی اور نامی گرامی سرداروں کی شہرت کا ڈنکا گونجتا رہا۔ لیکن امور سے سیاسی زوال کے بادل نہ چھٹ سکے۔ انفرادی دلیری اجتماعی دلیری کا بدل نہ ہو سکی۔ ہئیتِ اجتماعیہ میں زوال سرایت کرنے لگا۔ لیکن سیاسی زوال ادبی زوال نہ تھا۔ اس تاریکی اور افراتفری کے دور میں اردو کے بڑے بڑے شعرا پیدا ہوئے۔ میر و مرزا اور ان کے بعد آنے والے شاعروں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ جس پر اردو ادب بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ سیاسی اور سماجی زوال کا اثر اردو شاعری کے موضوعات پر پڑا ہے۔ کبھی زمانے کا غم انفرادی غم بن کر، کبھی اجتماعی غم شہر آشوب کی صورت میں رونما ہوا ہے، شعرا کی زندگیاں (جہاں تک اس کی جھلک تذکروں اور شعرا کے اپنے کلام میں ملتی ہے) طوفانِ بادو باراں کے مقابلے میں کانپتی کانپتی دکھائی دیتی ہیں۔ شعرا ان انقلاباتِ زمانہ کے ہاتھوں

مجبور ہو کر جپسی ٹریولرز بن گئے ہیں۔ کبھی رزق کی تلاش میں مارے مارے پھرتے
ہیں۔ دنیا ان کے خیال میں عبرت کا مقام بن جاتی ہے۔ اور وہ تصوف کی چوکھٹ
پر سکون تلاش کرتے ہیں۔ اس دور میں تصوف سنی فرقے تک ہی محدود نہ تھا۔
شیعوں کے ہاں بھی پیری مریدی کے سلسلے مقبول تھے۔ خواجہ باسط کی مثال
سامنے ہے۔ تصوف کی راہ میں شیعہ سنی کا امتیاز نہ ایک معمولی پہچان بن
کر رہ جاتا ہے۔ میر درد اور ضاحک شخصی حیثیت سے دو الگ مسلکوں کے
پیرو ہیں۔ مجموعی حیثیت سے شیعہ سنی تفریق کے علم بردار نہیں ہیں۔ اردو
شاعری کی بجھی بجھی سی کیفیت، الم ناکی اور سوز و درد اس تمدنی زوال کا بالواسطہ
اظہار ہیں۔ لیکن فی نفسہٖ اردو شاعری اس دور میں گھٹیا شاعری ہرگز
نہیں ہے۔ لسانی اعتبار سے بھی اردو پھل پھول رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں
فارسی زبان کو شدید نقصان پہنچا۔ اسی خرابی میں اردو کی بھلائی مضمر تھی۔
اردو شاعری فارسی شاعری کے دوش بدوش ایک جاندار تحریک کے طور
پر چلنے لگی۔ میر و مرزا کے اثرات برصغیر کی وسعتوں میں پھیلتے چلے گئے۔
قاعدہ ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ استادی شاگردی کا ادارہ
ایک قومی اثر تھا۔ جس نے ان شعرا کی نقالی سے لے کر ان کی کامیاب تقلید
تک راستے کھول دیے اور ان شعرا کے اسالیب فعال حقیقت کے طور پر
ہمارے معاشرے پر نظر آنے لگے۔ تازہ گوئی دلی سے نکلی تو فرخ آباد آئی
وہاں سے چلی تو فیض آباد اور لکھنؤ حتیٰ کہ مرشد آباد تک جا پہونچی،
اس زمانہ میں رسل و رسائل اور آمد و رفت کے ذرائع اچھے نہ تھے۔ پھر بھی
علاقائی لوٹ مار کی وجہ سے جس کسی کو کہیں گوشۂ امن دکھائی دیتا تھا۔ وہ
وہیں جا رہتا تھا۔ یوں فیض آباد اور لکھنؤ کے کوچے آباد ہو گئے۔ دلی کے مقابلے

میں لکھنؤ اور فیض آباد کو ایک فائدہ اور بھی حاصل تھا۔ تصوف شاعرانہ سطح پر من و تو کا قائل بن سکا۔ دنیا داری کی سطح پر تو امتیاز موجود تھا۔ دنیا بھی مغلیہ دور کے شباب کے اختلافات نہیں بھولی تھی۔ یہ اختلافات اورنگ زیب کے زمانے تک سیاسی اختلافات بن گئے تھے۔ ایرانی تورانی، شیعہ سنی سیاسی پارٹیوں کی حیثیت متعین کرتے تھے۔ ایرانی ماوراءالنہری امتیازات جدال کی شکل میں تو تھے ہی۔ دلی میں یہ رام لیلا اسی زمانے میں منائی جا رہی تھی۔ جب فیض آباد میں سعادت خاں برہان الملک نے حکومت قائم کی اور زیادہ تر شیعہ قبائل ہی کی سرپرستی کی۔ سیاسی لحاظ سے فیض آباد ایک شیعی اڈا تھا۔ جہاں ایران سے شیعہ آتے رہتے تھے۔ دلی اور اس کے نواح کے شیعہ بھی یہیں امن و سکون پاتے تھے۔ حسن کے خاندان کو جب شکست و ریخت سے دوچار ہونا پڑا اور زمانے نے دلی کی حالت دگرگوں کر دی۔ تو وہ بھی لکھنؤ اور فیض آباد کی طرف چل پڑے۔ میر ضاحک شیعہ پارٹی کی سرپرستی میں دن پورے کر رہے تھے۔ تصوف سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ شعر و شاعری کا ذوق بھی تھا۔ خواجہ میر درد سے بھی انہیں صحبت رہی، حسن بھی اسی شاعر کے خوانِ کرم کے زلہ ربا ہوئے۔ لیکن دلی کی زبوں حالی کہاں ٹکنے دیتی تھی۔ مرہٹہ گردی، جاٹ گردی، نادر گردی، ابدالی گردی نے ضاحک کے مزاج کو ہزل کی طرف لگا دیا۔ زمانہ کی بے قدری نے انہیں قلندرانہ وضع پر آمادہ کیا۔ وہ قلندر ہوگئے اور زندگی کی کشمکش کی طرف سے آنکھیں موند کر تلاشِ معاش کے چکر سے نکل گئے۔ اور اب حیات کے مسئلے ہنسی مذاق میں حل ہونے لگے۔ اس سے سیاسی طوفان تو نہیں رکتے۔ ہاں امن عافیت کا ڈھنگ ہو جاتا ہے۔ خاندانِ حسن بھی دلی سے ہجرت پر، وہاں

سے ملکن پور، لکھنؤ اور پھر فیض آباد آ گیا۔ دلی کی شاعری کی موجیں پہلے ہی فیض آباد کے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ سیاسی سمندر کی کف درد ہیں لہریں شعرا کو تنکوں کی طرح بکھیرتی رہیں۔ میر حسن نے دلی میں بچپن گزارا تھا۔ شاعری کے جس دور سے وہ متاثر ہوئے ہیں۔ میر و مرزا کا دور تھا۔ سودا اور میر کے علاوہ خواجہ میر درد بھی تھے۔ علاوہ ازیں حسن کے استاد میر ضیاء سودا کے شاگرد تھے۔ غالباً سودا سے پہلے فیض آباد میں آ گئے تھے عہد شجاع الدولہ میں فیض آباد میں شعرا و ادبا کا مجمع لگ گیا تھا۔ منشی فیض بخش تاریخ فرح بخش کی دوسری جلد میں اس کی کیفیت جا بجا بیان کرتے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :-

Artisans & scholars flocked hither from Dhaka Bangal, Gujrat, Malwah, Hydrabad, Shahjahanabad, Lahore Peshawar, Kabul, Kashmir and Multan. Had the Nawab Wazir (Shuja-ud-Daulah) but lived for ten or twelve years more, There should have grown up another Shah Jahan abad and Delhi

فیض آبادی شاعروں میں ابتدا میں صرف دلی کی زبان کو مستند جانا اور لکھنؤ اور فیض آباد نے دلی کے روز مرے کو سینے سے لگائے رکھا۔ سید انشا دریائے لطافت میں فرماتے ہیں :-

---

(1) Tarikh -e- farah Bakhsh. Eng. Tr. Vol. 2. P. 9

"از یں حالات بہ یقین پیوستہ کہ در ہر شہر فصحائے آنجا تائیدِ کلام خود از فصحائے دہلی جوبند"[1]۔

لیکن زبان پر پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے۔ یہ فیض آباد اور لکھنؤ میں آئی تھی تو مقامی اثرات سے کیسے بچ سکتی تھی۔ میر شیر علی افسوس نے جب آرائشِ محفل مرتب کی تو اس وقت تک لکھنؤ کی زبان الگ نکھر آئی تھی:

"شعرائے بھی جتنے اس شہر (لکھنؤ) میں ہیں۔ کیا فارسی گو کیا ریختہ گو کہیں نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد برہم ہونے شاہ جہان آباد کے اکثر غریب امیر میرزایان ہندوستان سے نواب صفدر جنگ و شجاع الدولہ بہادر کے عہد میں آکر اس شہر میں بہ سکونتِ دائمی ساکن ہوئے۔ پس شہر تو عبارت اشخاص سے ہے یہی دلی ہو گیا۔ اور باشندے بھی اب اس کے بسبب کثرتِ صحبت و تتبع زبان تلفظ صحیح کرنے لگے۔ یہاں تک کہ جن کی طبع موزوں تھی شاعر ہو گئے۔ باوجود اس کے بھی لہجہ میں تفاوت بہت رہ گیا۔ لیکن محاورے میں کم کہ زبان دان ہی اس کو سمجھے اور اس کی طبعیت اس پر لگے"[2]۔

عشق جب فیض آباد پہونچے ان کی آمد سے قبل ہی یہاں شاعری کی فضا قائم ہو چکی تھی۔ تازہ گوئی کے اثر کے ساتھ ساتھ میر ضیاء کے قدلیے پیچدار اسلوب اور رعایت لفظی سے پورب کی شاعری کے مزاج کو دلی سے ذرا مختلف کر دیا تھا۔ سودا و میر کی شاعری بھی یہاں پڑھی اور سمجھی جاتی تھی۔

---

(۱) دریائے لطافت صہ ۷۹ (۲) آرائشِ محفل صہ ۱۲۱

درد کے تصوف کا طوطی بھی اسی شیعہ ریاست میں بول رہا تھا۔ اورنگ زیبی عہد کی روایتیں خصوصاً تمثیل گوئی بھی نسبتی تھا۔ ثیسری دغیرہ کی مقبولیت کے سبب چل رہی تھیں حسن ان بزرگوں کے زیر اثر بھی تھے۔ اس فضا میں سوز کی طرز ادائیہ کی مخصوص شکل (چوچلا اور گفتگو) بھی رسی بسی ہوئی تھی۔ ان کے معاصرین میں شیر علی افسوس اور جعفر علی حسرت تھے۔ جو اپنے سا کھتی کی شخصیت پر اثر ڈال رہے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے نوعمر شعرا بھی اس قافلے میں آملے۔ جرأت، انشا وغیرہ سوز کے تتبع کرنے والے تھے۔ انہوں نے اس چونچلے اور گفتگو میں معاملہ بندی کی دوسری شکلیں دریافت کرلیں۔ حسن ان دو صفوں کے درمیان کھڑے ہیں۔ وہ دو بڑی تحریکوں کے درمیان ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا ایک ہاتھ میر دسودا اور ان کے دوستوں کے ہاتھوں میں ہے۔ دوسرا نوعمر شعرا کے ہاتھ میں ہے۔ فیض آباد کے دینی اور صوفیانہ رجحانات گھر کا قلندرانہ ماحول سالار جنگ کی ادباشی اور دریار داری، میر دسودا کی متانت اور ان کا دکھ رکھاؤ، سوز کی بول چال، اورنگ زیبی شعرا کی تمثیل گوئی، نوجوان شعرا کی صحبتیں اور اچپلاہٹ حسن کی شاعری کا خمیر اسی سے اٹھا ہے۔

(۳)

میر حسن نے جس ماحول میں پرورش پائی۔ اس کی یہ عمومی خصوصیات تھیں لیکن ان اثرات کا محور حسن کی اپنی شخصیت بھی تھی۔ حسن کا اپنا زاویۂ نظر، انفرادی خصوصیات، قریبی ماحول، اپنی پسند اور ناپسند، ان کے بغیر حسن کی شاعری کو نہیں سمجھا جاسکتا۔

قایم نہ کرے حسن کی شخصیت کو سمجھنے میں ہماری کچھ مدد نہیں کرتے، معاصر
بیانات حسن کی خوش باشی، بذلہ سنجی، دوست نوازی اور مرنجاں مرنج طبیعت
کے سوا کچھ نہیں بتلاتے۔ ظاہر ہے یہ باتیں حسن کے کردار پر کوئی مفصل روشنی
نہیں ڈالتیں۔ نیز ان میں حسن کے کردار کا کوئی مرکزی نقطہ بھی دکھائی نہیں
دیتا۔ جس کے بھروسے پر ان کی شاعری کے عوامل کا صحیح طور پر جائزہ لیا جا
سکے۔ حسن کی یار باشی اور بذلہ سنجی کا۔ ان کی شاعری سے کتنا رشتہ ہے؟
اس کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ یہ معمولی اشارے حسن کی شخصیت کو پوری
طرح ہمارے سامنے نہیں لاتے۔ نیز ان کا تعلق حسن کی شاعری سے زیادہ
گہرا ہے بھی نہیں۔ جو ہے بالواسطہ ہے۔ اس لئے ان اشارات کی بنیاد
پر کوئی مفصل رائے قائم کرنا دشوار ہے۔ حسن کا کلام (خصوصاً سحرالبیان)
ان کی شخصیت کے بعض گوشوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ سحرالبیان ایک
خیالیہ (Fantasy) ہے۔ ڈاکٹر میری کولنز (Dr. Mary Collins)
لکھتی ہیں۔ تخیل کی دو قسمیں ہیں۔

creative imagination اور pragmatic imagination

خواب بیداری تخلیقی تخیل کی اقسام میں ہے۔ ہمارے اذہان جب گرد و پیش
سے فرار چاہتے ہیں۔ تو خواب بیداری کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ خواہشیں جن
کی تکمیل ہم عام حالات میں نہیں کر سکتے ان کی تشفی کا سامان خواب بیداری
میں ہو جاتا ہے۔ ایسے خوابوں میں انسان کی اپنی ذات مرکزی حیثیت رکھتی ہے

(Psycholology of in study of Man's mind.
chapter on Imagination & Imagery

ڈاکٹر جے ویرن ڈانک Dr. J. Varendonck نے خواب بیداری کا پہ

پوری کتاب لکھی ہے (The Psychology of day dreams
ان کی رائے میں خواب بیداری اختباس (Inhibition) کا نتیجہ ہیں۔
ہماری روزانہ زندگی میں بعض Impulses اور (Desires) خواہشات
کو نظر انداز کیا جاتا ہے یا انہیں دبا دیا جاتا ہے (Repressed)
ایسے موقعوں پر یہ دبی ہوئی خواہشیں اپنا بدلہ لیتی ہیں۔ ان خواہشوں میں
بالعموم Erotic Impulses کو بنیادی جگہ حاصل ہوتی ہے۔ جنسی خواہشات
اسی لئے خواب بیداری میں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ ان کے بعد ان خواہشوں کا
ابھر آنا ہے، جن کی تکمیل عام زندگی میں ممکن نہ ہو۔ ایسے خواب اپنا آغاز
اسی دن کے واقعات یا قریبی زمانے کے بیتے ہوئے واقعات سے کرتے
ہیں۔ اور یہ عناصر مہیج کا کام دیتے ہیں۔

حسن کے بارے میں یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کن فوری واقعات سے
متاثر ہوئے۔ لیکن سحر البیان کے بعض نمایاں اشعار اور حسن کی زندگی کے
واقعات سے ان کی خواہشوں کا جزئی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ سحر البیان جنسی
جذبے کی ناآسودگی کا اعلان ہے۔ حسن اس کی تکمیل کے وقت پچاس کے
پیٹے میں ہوں گے۔ اس سے پہلے انہیں محبت کے دو تجربے ضرور ہو چکے تھے۔
حسن کا یہ عشق گوشت پوست کی عورتوں سے ہے۔ ان کا ردِ عمل شہوانی ہے
لیکن نارسائی کا غم بھی ان کے ہاں پایا جاتا ہے۔ ان کے جنسی کلام میں روشنی
کا تصور بھی ہے۔ یہ زرد روشنی بھی جنسی خواہشات کی آئینہ دار ہے۔ یہ ان
آرزوؤں کا مظہر بن گئی ہے جو پوری نہ ہو سکیں۔ خلوت کے مناظر کی مفصل
تصویر کشی، شہزادے اور پریاں، کل کا گھوڑا، طلسماتی مناظر ایک طرف، (۲)
دنیا سے فرار کی علامتیں ہیں اور دوسری طرف حسن کی جنسی خواہشات کا نشانہ ہیں۔

ہیں۔ سحر البیان میں مال و دولت کے تذکرے، امن و امان کی غیر موجودگی، ماحول کی بے اطمینانی کی غماز ہیں۔ خوابِ بیداری میں ہر خواہش فوری تسکین کا موقع ڈھونڈتی ہے۔ یہاں حسن کی ہر خواہش جلد پوری ہو جاتی ہے۔ کیا حسن اپنے احول سے اکتا کر اپنی خواہشوں کی عدمِ تکمیل سے گھبرا کر خوابِ بیداری میں مبتلا نہیں ہیں؟ حسن شغلِ شعر کو یا تو عاقبت سنوارنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں یا دنیا میں اپنا نام باقی رکھنے کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ شاعری ان کے ہاں غم غلط کرنے کا ایک سہارا بھی ہے۔ گردشِ پیش سے گھبرا کر شاعری پناہ گاہ بن جاتی ہے۔

حسن نے غزلوں میں ان خیالات کا اکثر جگہ ذکر کیا ہے:۔

شعر کہنے سے یہ حاصل ہے کہ شاید کوئی / بعد مرنے کے حسن اپنے تئیں یاد کرے

یہ عبرت گاہ ہے دنیا حسن مت ذکر کر اس کا / عوض اس کے کوئی تازہ غزل لکھ اپنے دیواں کے

نکالو نے زمیں تنگ زبس ہم نے نکالی / رہنے کے لئے شعر کے عالم میں زمیں اور

پوچھا کیا ہے کہ گذری رات کیوں کر تجھ بغیر
شعر کچھ پڑھتا رہا اور سر کو ٹکراتا رہا

حسن جی چاہتا ہے رو دیجے پڑھ کوئی غزل ایسی [illegible]
بھرا ہو جس کے ہر مصرع میں سوز و درد و حرماں کو

کہہ غزل اور حسن ایسی کوئی رتبے کی / آفریں جو شعرا سے تجھے ہر بار ملے

لیکن شعرا کی تعریف کافی نہیں ہے۔ شعر کے قدردان تو روپے پیسے والے تھے حسن کو روپے کی ضرورت تھی۔ اپنی شعری خوبیوں کے احساس کے باوجود حسن شعر کی ناقدری اور بے حاصلی کے گلہ گزار ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے بارے میں بڑی بلند رائے رکھتے ہیں:۔

اک ایک شعر میرا جواہر کا ہے رقم / کیا کیا سخن کے لعل اگلتی رہی زباں

نیرنگِ معانی ہوں غزل میں تو حسن کی — ہے اس کو بجا کہیے اگر افسرِ طاؤس
شاعری اسی کو ہم تو سمجھتے ہیں اے حسن — مضموں لا کے باندھے جو ایسے نئے نئے
کچھ بھی ملا نہ پھل مجھے کاغذ بہ لے حسن — مقراض سے زباں کے بہت گل کتر گئے
جو ہو نسبت میں پریشانی تو وہ جائے کہاں — گو خدائی کے ہنر اہلِ ہنر جمع کریں
پوچھ مت کچھ کمال ہم سے حسن — بے کمالی کمال ہے اپنا
نکتہ چینوں نے کچھ کہا تو کیا — کوئی اس میں کمال جانتا ہے

قصائد میں بھی حسن سخن کی ناقدری کے نوحہ خواں ہیں ۔

شعر و سخن کا کس کو رہا ہے حسن دماغ
میدانِ فکر میں کوئی کیا رکھے بار پا
یہاں تنگ کیا ہے اس غمِ دوراں نے کارِ تنگ
کیا ہے عجب جو مجھ میں سما دے نہ میرا رنگ
جوہر شناس ہو کوئی میرا تو سمجھے وہ
کس کس طرح کی دل میں ہے میرے نئی امنگ
آئینہ سامنے ہو تو طوطی ہو حرف زن
کیا سر کو اپنے پیٹے کوئی روبروئے سنگ
سیکھیں ہنر وہ کس کے لئے قدر داں ہے کون
سارے ہی بھڑوے ہوں گر اب تو اڑاتے پھریں تلنگ

میر حسن کے نزدیک شاعری ایک فن ہے اور زندگی بسر کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ ان کی زندگی میں جتنی قدر ہونی چاہیے تھی اتنی نہیں ہوئی۔ آخر عمر میں سحر البیان کا معاوضہ بھی ان کی توقع سے کم نکلا۔ سالار جنگ کی سرکار سے بھی زیادہ تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ اس لئے حسن تمام عمر دولت کے خواب دیکھتے

رہے ہ آصف الدولہ کی شادی والی مثنوی، جواہر علی خاں کے محل کی تعریف، سحرالبیان میں محلات کے مناظر، شان وشوکت کے وہ ادھورے خواب ہیں جو میر حسن عمر بھر دیکھتے رہے۔ ان کی شاعری اس ہیجیں سے شعری تحریک حاصل کرتی ہے۔ کلام حسن میں وہ مناظر بڑے پُر لطف ہیں جن میں شاہانہ ٹھاٹھ کی عکاسی کی گئی ہے لیکن یہی خواہش گریز پا بھی ہے۔ حسن چھپے ڈھکے انداز میں مال و دولت کی تمنا کرتے ہیں تو ان کی شاعری بلند ہو جاتی ہے۔ لیکن جب براہ راست اس خواہش کا نام لیتے ہیں تو ان کی شاعری پھیکی اور بے مزہ ہو جاتی ہے۔ اپنی خواہشوں کو سیدھے طور پر شعوری سطح پر لانے سے غالباً ان کے ذہن میں کشمکش پیدا ہوتی ہے اور یہ غیر متعلق عنصر ان کی شاعری کو خراب کرتا ہے۔ سحرالبیان کے ابتدائی حصے میں آصف الدولہ کی تعریف و توصیف اسی لئے بے جان ہے۔ قصائد کے آخری حصوں کا بھی یہی حال ہے۔ غزلوں اور رباعیات میں بھی مال و دولت کو موضوع بنانے سے پستی آگئی ہے سہ

زور سے کام نکلتا نہیں بے زر کے دیے
زر بھی حربہ ہے ترا ایک بشر کے آگے

زر اگر بر سبر فولاد نہی نرم شود   زور کا زور دھرا رہتا ہے زر کے آگے

جب تلک زر ہے تو سب کوئی ہے پھر کوئی نہیں
سچ ہے مکھی بھی رہے ہے شکر و شیر تلک

گنگوں کو کیا خبر ہے حالِ زار و غند لیباں سے
حقیقت مفلسوں کی آہ زر داروں سے مت پوچھو

بجز بے سرو سامانی حسن ہم نے جہاں میں
افسوس کہ کچھ اور سرانجام نہ پایا

آواز تفنگیر کبھی دیتے ہیں | کب ان کو جواب یہ غنی دیتے ہیں
ایسے تو سخی ہیں اس زمانے کے امیر | کوڑی کوئی مانگے تو یہ جی دیتے ہیں

جیسی کہ خدا نے تجھکو دی ہے یہ شفا | ہم کو بھی تو مرضِ مفلسی سے تو چھڑا
اس علتِ فقر کے لئے اے نواب | تھوڑا ہمیں شربتِ دینار پلا

ان اشعار کی پستی کا سبب یہ ہے کہ حسن کی طبیعت خواہشات کے براہِ راست اظہار سے ابا کرتی ہے ۔ یہی خواہشات جب بالواسطہ ہوتی ہیں تو اشعار زیادہ پر لطف ہو جاتے ہیں ۔ حسن کی دوسری دبی ہوئی خواہشِ جنسی جذبہ ہے ۔ کلامِ حسن میں اخلاقی رجحان موجود ہے اور اس کے ساتھ رندی کی طرف جانے کا میلان بھی ہے ۔

حسن سالار جنگ کی سرکار سے متعلق ضرور تھے ۔ لیکن سالار جنگ کی طرح عیاش نہ ہو سکتے تھے ۔ ان کے گھر کا ماحول اس سے مختلف تھا ۔ تصوف کی تعلیم، گھر کا ماحول راستے میں حائل تھا ۔ حسن عشق کے شیدا ہیں اور دنیاوی عشق چاہتے ہیں ۔ لیکن اسے گناہ بھی سمجھتے ہیں (اشعار کسی اور جگہ درج ہیں) دین و دنیا کی یہ کشمکش حسن میں تادیر رہی ہے ۔ ابتدائے جوانی میں عشق میں مبتلا ہوئے تھے ۔ وہ اسی دنیا کی عورتیں تھیں ۔ جسم کے تقاضے اپنی جگہ پر تھے ۔ لیکن روح کے تقاضے ان کا راستہ نہیں روک سکتے تھے ۔ شرعی حجاب اور آغازِ جوانی کا عشق، نارسائی کی مشکلات، جنسی خواہشات کی تکمیل میں رکاوٹیں معاشرے کی گرفت، مناہل زندگی کی پابندیاں، حسن ان سب سے عہدہ برآ ہوتے ہیں ۔ حسن محبوب کے جسم تک غالباً کبھی رسائی نہ حاصل کر سکے ۔ اسی لئے ان کے عشق کا بیان افلاطونی فلسفے کے غلاف میں چھپا ہوا ہے ۔ وصل کے مناظر میں خواب و خیال کی لذت ہے ۔ حسن کا ذہنی ردِ عمل ایسے مواقع پر

سایے میں روشنی تلاش کرتا ہے، ریت تاروں کی طرح چمکتی ہے۔ محبوبہ ہمارے محسوسات کی دنیا سے الگ ایک طلسمی دنیا میں بستی ہے۔ حسن کو محبوب کی موجودگی سے زیادہ اسکا تصور بھاتا ہے۔ تصور اور خیال یہ دو ایسے لفظ ہیں جن کے گرد حسن کی شاعری گھومتی ہے:۔

ہے دھیان جو اپنا کہیں اے ماہ جبیں اور
جاتا ہے کہیں اور تو جاتا ہوں کہیں اور
حسن میں خواب میں بھی دیکھتا ہوں چشم گریاں کو
ہوئی ہے مجھکو رفتہ رفتہ یاں تک الفت گریہ
بیٹھتا تیرا تو ہوتا نہیں ناچار ترے
میں تصور ہی کو اس دل بٹھا لیتا ہوں
جو کچھ سمجھے خیال میں دیکھوں ہوں میں ترے
دیکھی نہ ہوگی سیر کسی نے یہ خواب میں
ساتھ اپنے میں اسے خواب میں سوتے دیکھا
بارے مدت میں مجھے طالع بیدار ملے
کس کے خیال سے ہے تجھے گفتگو حسن
کیا جانوں آج نیند تری کیوں اچٹ گئی
جب تلک دیکھتا نہیں اس کو دل میں کیا کیا خیال جاتا ہے
نظر آتا نہیں ظاہر میں تو ملنے کا سبب
دل ہی دل میں تجھے چھاتی سے لگا لیتے ہیں
نام بوسے کا تیرے منہ پہ نہیں لیتے اور
ہونٹوں ہی ہونٹوں میں ہم اس کا مزا لیتے ہیں

تھے محوِ خیال رات اس سے   باتوں کا دماغ ہم کو کب تھا

میر حسن کا عشق حجاب سے باہر نہیں نکل سکا ہے

حجابِ عشق اگر حائل نہ ہوتا   تو ملنا یار کا مشکل نہ ہوتا

حسن عمر بھر تخیل کے بل بوتے پر عشق و عاشقی کے ڈرامے تخلیق کرتے رہے۔ تازہ گوئی طرزِ ادائیہ کے ماہر شاعروں کی طرح حسن احساسات کے شاعر ہیں۔ وہ اپنے جذبات سے آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ حواس خمسہ کی کار فرمائیوں کو شاعری میں جگہ دیتے ہیں۔ اپنے جذبات کی رو میں بہتے ہوئے کبھی انہیں اپنی محبوبہ کی ذات ضروری معلوم ہوتی ہے۔ کبھی اس سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ کبھی تنہائی کاٹنے کو دوڑتی ہے تو سراپا انتظار ہوتے ہیں۔ کبھی انہیں خیال گذرتا ہے کہ وصال کبھی نصیب ہی نہیں ہوا۔ کبھی وصال کا اقرار کرتے ہیں اور اس کے گذر جانے کا انہیں غم ہوتا ہے۔ محبوب کا روٹھ جانا ان سے برداشت نہیں ہوتا۔ محبوب چلا جاتا ہے تو حسن بے قرار ہو جاتے ہیں، کبھی انہیں خیال گذرتا ہے کہ وصال نصیب ہی نہیں ہوا ——— کبھی وصال ناپسند کرتے ہیں کبھی ہجر کی نوحہ خوانی ہوتی ہے۔ اور کبھی یوں معلوم ہوتا ہے کہ ساری عمر تو وصال ہی رہا۔ حجاب کی نوبت تو اب آئی ہے سے

ذوقِ تنہائی میں خلل ڈالا   آ کے مجھ پاس اس گھڑی تو نے

ہیں تو ساری رات کھٹکا پاؤں کا سنتا رہا

کیوں بہانہ میرے سر رکھتا ہے تو کب ہو گیا

آہ مثلِ شبِ جوانی جلد   کیا یہ روزِ وصال جاتا ہے

وصل ہوتا ہے جن کو دنیا میں   یا رب ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں

نہیں ہوتی بسر وصل کی رات
چلے جاتے ہیں یونہی دن ہمارے

ہنستے ہی ہنستے روٹھ گیا ہم سے وہ صنم
یہ اور دل پہ یک بیک آفات کیا ہوئی

اک ذرا تم تو بیٹھ کر اٹھ گئے
رات ہم نے تڑپ تڑپ کاٹی

آنے کا وعدہ کر کہ نہ کر ہم کو اب ترے
اقرار سے نہ کام نہ انکار سے غرض

وصل کے عیش کو پوچھ ان سے ہوا جن کو وصال
ہم تو جیسے تھے غرض ویسے ہی مہجور رہے

کٹتی ہو جس کی سدا عمر وصل میں یارو
کہو تو ہجر میں کس طرح وہ بہل جائے

آرزو دل کی بر آئی نہ حسن وصل میں اور
لذتِ ہجر کو بھی مفت میں کھو بیٹھے ہم

ہجر میں اس کے تنگ آیا ہے جی
اب تو اپنا سخت گھبرایا ہے جی

وہ ملک دل جو اپنا آباد کا کبھو کا
سو ہو گیا ہے تجھ بن اب وہ مقام ہو کا

نہ تھمتی تھی آہیں نہ رکتے تھے آنسو
حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا

اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا
جیسے کوئی بھولے ہوئے پھرتا ہے کچھ اپنا

کوئی نہیں کہ یار کی لا دے خبر مجھے
اے سیل اشک تو ہی بہا دے ادھر مجھے

یا صبح ہو چکے کہیں یا میں ہی مر چکوں
رو بیٹھوں اس سحر ہی کو میں یا سحر تجھے
وصل کا عیش کہاں پر غم ہجراں تو ہے
لب خنداں تو نہیں دیدۂ گریاں تو ہے

چاندنی رات کبھی وصل کی داستاں کہتی ہے۔ کبھی فراق کا رونا روتی ہے اور کبھی حسن کا دل دونوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے ؎

کیسا وصال کس کا فراق اور کہاں کا عشق
تھی عالم جوانی کی بس یہ بھی اک ترنگ

وداع و وصل کی ان جداگانہ لذتوں سے حسن کی غزل گوئی لذت حاصل کرتی ہے۔ وہ عنفوانِ کے شاعر نہیں بلکہ خمسہ کے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں عشق کے بارے میں بھی مختلف قسم کے تصورات پائے جاتے ہیں۔ عشق کو وہ کبھی جاودانی بتاتے ہیں اور عشق کے لیے عمر کی قید ہٹا دیتے ہیں۔ کبھی صرف جوانی سے مخصوص سمجھتے ہیں۔ جوانی کے گذر جانے کا احساس بھی انہیں بار بار ستاتا ہے۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ کی طرح حسن کے کلام میں جوانی کے گذرنے کا غم اور بڑھاپے کی آمد کا خوف دکھائی دیتا ہے۔ جوانی کی رنگ رلیاں انہیں بار بار یاد آتی ہیں اور بڑھاپے کا غم رگ و پے میں سنسنی پیدا کر جاتا ہے ؎

عاشقی کے حسن مزے جو کچھ ہیں سو بس عالم شباب میں ہیں

عشق ہو تو ہو جوانی میں بڑھاپے میں نہ ہو
اس پہ کیا موقوف ہے جب ہو گیا تب ہو گیا

ہٹی اب جوانی کہو شک حسن سے خدا کے لئے بت پرستی سے گذرے

اے نوجوانو اتنا اکڑتے ہو کیوں کبھی ہم سے بھی اس جوانی کا تھا جوش تھا
نوجوانی کی دید کر لیجے اپنے موسم کی عید کر لیجے

عالم ہی تب کچھ اور تھے اور ڈھنگ اور ہی
روزِ شب جوانی کے تھے رنگ اور ہی
موئے سفید نے نمک اس میں ملا دیا
کیفیت اب نہیں رہی جام شراب میں

اس کی الفت میں روتے روتے حسن یہ سیہ مو سفید کر لیجے
مزے نہ دیکھے کبھی ہم نے زندگانی کے
یونہی گذر گئے افسوس دن جوانی کے

اس بڑھاپے کے خوف نے حسن کی شاعری میں مل کر ماورائی شکل اختیار کی ہے۔ حسن سحر البیان اور گلزارِ ارم میں ہر عورت کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے کی بجائے روشنی کی چکا چوند میں دیکھتے ہیں۔ ہر عورت حور ہے اور ہر منظر فردوس جس میں سایہ روشن ہے۔ صبحیں اور شامیں سونے اور چاندی کے ورق کی بنی ہوئی ہیں۔ شجر و حجر باتیں کرتے ہیں اور انسان کے دکھ درد کے شریک ہو جاتے ہیں۔ جنت کا یہ رومانی تصور ایک حسین ذہنی کیفیت بن کر میر حسن کے بڑھاپے کو جوانی میں بدلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

میر حسن کی شاعری کا تیسرا محرک 'دل' 'جان' اور 'جی' کے الفاظ ہیں حسن کو بار بار یہ تینوں لفظ تنگ کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا بیشتر حصہ ان تین لفظوں سے تحریک حاصل کرتا ہے۔ دل ان کے نزدیک عشق کی علامت بھی اور ہمت اور حوصلے کی رمز بھی ہے۔ دل اور اس کے روایتی

مضامین ان کے شعری تجربے کی اساس بن جاتے ہیں، جان کا لفظ حوصلے اور زندگی کی قدر و قیمت کی محک ہے۔ اور اس لحاظ سے زندگی کی علامت ہے۔ "دل" کا لفظ اشعار میں علیحدہ بھی استعمال ہوا ہے۔ لیکن "جان" کا لفظ انہوں نے ہمیشہ "دل" کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ ان میں سے ایک لفظ اگر ایک مصرعے میں ہے تو دوسرا دوسرے مصرعے میں ہے۔ اگر ایک شعر میں دوسرے لفظ کی گنجائش نہیں نکلی تو اگلا شعر اس تلازمہ سے خالی نہیں۔ اس Fixation کا سبب حسن کی زندگی میں تلاش کرنا چاہیے کہ آخر وہ کون سا دباؤ ہے جس کا اظہار ان لفظوں سے ہوتا ہے۔ یہ محض رسم نباہنے کے لئے نہیں باندھے گئے۔ کیونکہ ان اشعار کی تہ میں جذبات ہیرے کی طرح جھلک رہے ہیں شدت تاثر موجود ہے۔ میر حسن کی زندگی کے جو حالات ملتے ہیں۔ وہ گذشتہ صفحات میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں اس گتھی کو سلجھانا ناممکن ہے۔ وہ اشعار جن میں یہ الفاظ آئے ہیں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

جان و دل و صبر و طاقت　　اک ملنے سے اس کے سب ملیں گے
جان و دل ہیں اداس سے میرے　　اٹھ گیا کون پاس سے میرے
جی نکل جائے گا لبا اب کے　　ہجر کا نام جس گھڑی تو نے
زندگی کا بہت مزا پایا　　اے عشق کرکے عاشقی تو نے

جی پہلے ہی جا بھو نچا کیا پرزوں سے اب دل کے
تم اشک عبث شانے کر کتوب نظر آئے
ہے ایک تو خفا ہی جی سے حسن بچارا
تو نے کھپا کھپا کر اور اس کی جان لی ہے،

ہر ایک دل و جاں سے کہ مرغوب نظر آئے
میں خوب تمہیں دیکھا تم خوب نظر آئے

یوں تو جی تجھ بن بہلنے کا نہیں
تیری ہی باتوں سے کچھ بہلائیں گے

دوستوں سے اس دل دشمن کا حال
کوئی مت کہنا کہ وہ غم کھائیں گے

جی اداؤں نے زلفوں نے دل ہوش غمزوں نے لیا
جنس ہستی اپنی سب غارت ہیں آ کر بٹ گئی

خیال دل نہ فکر جان ہے
رات دن اسی کا دھیان ہے

جی تو لگتا نہیں جہاں دل ہے
ہم بھی اب تو ادھر ہی جاویں گے

جی پہ جس کے ستم کہیں دیکھا
دل کی اوقات مجھ کو یاد آئی

جس طرح جی جانتا ہے اس طرح
کون میرے دردِ دل کو کھو سکے

جس طرف دل گیا گئے ہم بھی
جان کی اپنی پاسداری کی

بازی بگڑ گئی ہو تو اس کو سنواریے
دل کو قوی ہو نہ بچنے جی کو نہ ہاریے

سیکڑوں بے دل ترے کوچے میں دل کے واسطے
اپنے جی سے تو نہایت خاکساری کر گئے

اٹھ گئے آج جان و دل کیدھر
آہ پھرتے تھے یہ تو کل بیٹھے

ہیں سانحہ نامے کے جی اپنا بھی بدلنے لگا
کہ نامہ بر سے بھی بڑھ کر قدم نکل جاوے

حسن کے سینے میں یارب کہیں یہ دل گم ہو
کہ اک بجا ہے کا درد و الم نکل جاوے

میں بھی کچھ ہو گیا ہوں پژمردہ
دل ہی میرا فقط اداس نہیں

جی دیا کس پتنگ نے اپنا
شمع روتی ہے کس کے ماتم میں

داغ فراق دل میں اور دردِ عشق جی میں
کیا کیا نہ ہم نے دیکھا دو دن کی زندگی میں

اسکی بے تابیاں دیکھی نہیں جاتی مجھ سے
اس لیے آپ میں دل کو جدا رکھتا ہوں

یاد آتی ہیں اس کی جب باتیں — دل حسن دونوں مل کے روتے ہیں
جان میں میری جان آئی تھی — کل صبا کس کے پاس لائی تھی
پھر دبک اٹھی آگ دل کی ہائے — ہم نے رو رو ابھی بجھائی تھی

حسن بساط میں دل ہے تیری پہ بچے جاں باز
تو من چلا ہے نہایت کہیں یہ ہار نہ دے

جی سے رہتے ہیں اپنے اوس پہ نثار
دل سے ہوتے ہیں دوست ہم جس کے

ہے گرہ کیسی یہ غم کی اپنے دل میں لے حسن
ہم نے جوں جوں اس کو کھولا اور یہ محکم ہوئی

کس سے اب بات کریں اور بیٹھیں اب کس سے
مرگیا دل ہی وہ اپنا کہ خوشی تھی جس سے

ہم نہ تنہا اس گلی سے جاں کو کھو کر اٹھ گئے
سیکڑوں یاں زندگی سے ہاتھ دھو کر اٹھ گئے

ذکرِ وفا و الفت مت چھیڑ بس حسن اب
جی ہو رہا ہے اپنا بیزار سب طرف سے

دل کی ہمارے کچھ تو خبر ہم کو بھی سنا!
جیتا ہے یا سسکتا ہے یا مرگیا ہے وہ

کہتا نہ تھا میں لے دل تو اس سے جی لگا نہ
اس کا تو کیا گیا اب تیرا ہی جی گیا نہ،

تو ہوچکا ہے میرا، جی دے کے تجھکو لوں گا
دل دے رکھا ہے تجھ کو آگے ہما میں بیعانہ

خاک میں مت ملاؤ دل کو مرے
جی میں سمجھو ٹک اپنا گھر دیکھو

نہ قلق جاتا ہے دل کا نہ جی کی بیتابی
یہ کچھ بھلے نہیں آثار دیکھیے کیا ہو

دل اور جان کو لاتا تو ہوں ترے آگے
تجھے اب ان میں سے درکار دیکھیے کیا ہو

سو بار اس کے کوچے میں لے لے گیا حسن
آیا نہ پر قرار دل بے قرار کو

اس آہ دنائے سے جل جاوے جان و دل یک سر
رفیق میرا اگر چشم اشکبار نہ ہو

بنے اس طبیعت سے کیوں کر کسی کی
ذرا جی میں منصف تو دل دار تم ہو

آہ اے حسن کہ ہم تو کوچے میں اب کسی کے
رو دیں گلے سے لگ کر پھر زار زار دل کو

کون کرتا ہے مہر زلف کی باتیں دل میں
جی پہ کٹتی ہیں عجیب طرح کی راتیں دل میں

کون سی آن و ادا ہے کہ نہیں جی کو لگی
کھب رہی ہیں وہ تری سب حرکاتیں دل میں

چل دل اس کی گلی میں رو آویں
کچھ تو دل کا غبار دھو آویں

گو ابھی آئے ہیں پر ہے جی میں
پھر بھی ٹک اس کے پاس ہو آویں

دل کو کھویا ہے کل جہاں کھو کر
جی میں ہے آج جی بھی کھو آویں

یہ دل کچھ آپ ہی ہو جاتا ہے بند اور آپ ہی کھلتا ہے
نہ میں قید اس کو کرتا ہوں نہ میں آزاد کرتا ہوں

دونوں دیوانے ہیں کیا سمجھیں گے آپس میں عبث
ہم کو سمجھاتا ہے دل اور دل کو سمجھاتے ہیں ہم

اس دل میں اپنی جاں کبھی ہے کبھی نہیں
آباد یہ مکان کبھی ہے کبھی نہیں

کیا تب ملے گی آہ مجھے آرزوئے دل | مر جائیگی تڑپ کے مرے جی کی جب امنگ
دل اس کی زلف سے جو چھٹا تو بھلا ہوا | ناحق یہ اپنے جی کیلئے اک وبال تھا
دل خدا جانے کس کے پاس رہا | ان دنوں جی بہت اداس رہا
دل حسن گم ہوئے کہ سدا | ایک کو ایک کا سراغ رہا

حسن معشوق کے بارے میں بھی متضاد خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ خیال ہی خیال میں وصل اور ہجر کی دنیا آباد کرتے ہیں۔ جہاں کامیابیاں بھی ہیں۔ ناکامیاں بھی، غم بھی نشاط بھی، سکون بھی ہے، بے قراری بھی۔ سبب شاید یہ ہے کہ حسن محبوب سے ملنے کی جرات نہیں رکھتے۔ انہیں فکر رہتی ہے کہ دنیا ان کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے۔ بدنامی کا ڈر بھی ہے۔ اس لئے دور ہی سے دیکھ لینے پر اکتفا کرتے ہیں اور ہر بات غائبانہ کرنا چاہتے ہیں۔ ؎

دور ہی سے دیکھ ہم تجھ کو ذرا ہوتے تھے خوش
بھر رخ کے ہاتھوں سے وہ صحبت بھی اب برہم ہوئی
جی چاہتا ہے اس سے چھپ کر کہیں سنوں میں
دیکھوں تو کیا کہے ہے وہ مجھ کو غائبانہ
واہ ٹک کسی نے ہنس کے کہیں اس سے بات کی
یاں جی لگا نکلنے کہ یہ بات کیا ہوئی

یہی گر خوف ہے تو زندگی کیونکر حسن ہوگی کہ جب کچھ بات کہنا رو برو اسکے تو ڈر جانا

کہتا نہ تھا کہ ہر دم اس کی گلی میں مت جا
اس بات کا اب آخر جبر چا حسن ہوا نہ
تو ہی نباہ اس سے جو چاہے تو کر حسن
اس پہ نہ بھولیو کہ کرے گا نباہ وہ

حسن کی مجبوبہ میں روایتی معشوق کا تصور جا بجا جھلکتا ہے۔ پردہ نشینوں تک رسائی کا امکان اس معاشرت میں نہ تھا۔ لکھنؤ اور فیض آباد کی مثالی طوائف ہی دکھائی دے سکتی تھی اور حسن بھی اپنے احساسات کے لئے اسی پیکر کا سہارا لیتا ہے۔ یہی خواہش اس دور میں طرزِ ادا بن کر سے نکل کر غزل کے لئے گفتگو اور معاملہ بندی بن جاتی ہے۔ حسن اپنے محبوب کے ردِّ عمل سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن انہیں ہمیشہ یہی دھڑکا رہتا ہے کہ خبر نہیں کہ محبوب انہیں چاہتا بھی ہے یا نہیں یہی دکھ ان کی شاعری میں ابھرتا ہے تو وہ میر تقی میر اور خواجہ میر درد کی چوکھٹ پر سجدہ کرتے ہیں۔ یہ درد زیادہ ہوتا ہے تو سوز تک چلے آتے ہیں۔ غزل میں عشق و عاشقی کی ٹکنیک اور دوسری روایات کی وجہ سے داخلیت کی طرف شعرا کا جھکاؤ عموماً رہا ہے اور حسن بھی اسی کی طرف جھکتے رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مثنوی کی فارم کے تقاضے داخلیت کے لئے اتنی گنجائش نہیں چھوڑتے یہاں حسن زیادہ کامیاب ہیں تاہم غزل میں بھی محاکات ان کے لئے راستہ بہت ہموار کر دیتے ہیں۔ ایڈلر نے افراد کی کئی قسمیں قرار دی ہیں۔ بعض لوگ ہر بات رنگ کی صورت میں دیکھتے ہیں بعض آواز کی صورت میں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو Images کی صورت میں سوچتے ہیں۔ میر حسن ان لوگوں میں سے ہیں جو منظر کشی میں ابھرتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد کی طرح حسن کا مزاج بھی خیالات کی بجائے تصویروں کا زیادہ شائق ہے۔ موجودہ مواد کی روشنی میں اس رجحان کے عوامل کا معلوم کرنا مشکل ہے۔ میر حسن کو اس میلان کا احساس زندگی کے آخری ایام میں ہوا ہے۔ غزل گوئی سے لیکر سحر البیان کی تصنیف تک وہ کئی نشیب و فراز سے گذرے ہیں۔

(۳)

داغ ہیں کاروانِ رفتہ کے　　نقشِ پائے گذشتگاں ہیں ہم (میر ضیاءؔ)

سخن کا یہ بزرگوں کی تتبع بس کہ کرتا ہے
نکلتی ہے حسنؔ کی بات میں اک بو قدامت کی (میر حسنؔ)

مثنوی در شادی آصف الدولہ ۱۱۸۳ھ میں، رموز العارفین ۱۱۸۸ھ میں، تذکرۂ شعرائے اردو کا آغاز ۱۱۸۷ھ میں اور انجام ۱۱۸۹ھ اور نظرِ ثانی ۱۱۹۲ھ میں ہوئی۔ مؤخر الذکر نثری کارنامے کے ساتھ ساتھ غزل گوئی بھی چلتی رہی گی۔ دیوانِ حسن کی اولین اشاعت ۱۱۹۲ھ میں ہوئی۔ لیکن ۱۱۸۹ھ تک اشعار کی تعداد سات آٹھ ہزار ہو چکی تھی۔ پھر گلزارِ ارم ۱۱۹۲ھ میں، مثنوی تہنیتِ عید، شوال ۱۱۹۹ھ میں قصیدہ در مدحِ جواہر علی خاں اور مثنوی قصرِ جواہر بھی غالباً اسی زمانے میں لکھی گئیں۔ سحر البیان بھی ۱۱۹۹ھ میں مکمل ہوئی اسی ترتیب کو اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس میں دو واضح دور دکھائی دیتے ہیں۔ پہلا دور معاصرین سے دب کر شاعری کرنے کا ہے۔ جس میں انفرادیت پوری آب و تاب سے روشن نہیں ہے۔ حسن کی غزل گوئی　زیادہ تر اسی اولین دور کی یادگار ہے رموز العارفین، رباعیات اور دوسری متفرق اصنافِ شعری بھی اس زمانے کی تصانیف ہیں۔ دوسرا دور گلزارِ ارم کی تالیف سے شروع ہوا۔ دونوں کے درمیان نثری کام کا وقفہ ہے۔ گلزارِ ارم سے چل کر حسن کی وفات تک، مثنویاں ان کی شاعری کی معراجِ کمال ہیں۔ گلزارِ ارم سے بہت پہلے آصف الدولہ کے شادی والی مثنوی میں حسن محاکاتی میں

لیکن انہیں خود اس کا پورا احساس نہ تھا۔ وہ شروع شروع میں غزلیں زیادہ کہتے تھے۔ کیونکہ ان کے معاصرین میں غزل ہی زیادہ مقبول تھی۔ میر حسن کی غزل گوئی کے بارے میں ادبا کی آرا کچھ اس قسم کی ہیں[1]

طرزِ گفتارش بہ شاعر فصاحت افروز محمد میر سوز مرحوم مانا ست

مختصر کلام شاعر فصیح زبان عذب البیان است دیوانے مملوِ اقسامِ سخن دارد[2]

"شعر پر مزہ و شور انگیز خوب کہتے ہیں۔"[3]

"انہوں نے مرثیے رباعیات اور قصاید بھی کہے ہیں یہ اپنے عصر کے بہترین قصیدہ گو تھے۔ مرزا رفیع سودا کے انتقال کے بعد لکھنؤ میں ان سے اچھا قصیدہ کہنے والا نہیں تھا[4] حسن کا طرزِ کلام زیادہ تر میر اور کم تر سودا کے اندازِ شاعری سے ملتا جلتا نظر آتا ہے۔۔۔۔۔ بیان سے گذر کر زبان کو دیکھئے تو وہ بھی ان بزرگوں کی سی ثابت ہوتی ہے۔ وہی "میں دیکھا" "میں کیا" جو میر و سودا کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ ان کے ہاں بھی موجود ہے۔۔۔۔ اصنافِ سخن میں میر حسن قصیدے کے مردِ میدان نہ تھے۔ البتہ غزل سرائی میں ان کا صاحبِ امتیاز اور مثنوی میں یکتائے زمانہ ہونا قطعی ثابت ہے۔۔۔ میر حسن کی غزل کا مرتبہ ان کی مثنوی کے برابر نہیں ہے۔[5]

---

(۱) یوں تو ہر قدیم تذکرے میں جہاں جہاں حسن کا ذکر آیا ہے۔ ان کی غزل گوئی کے بارے میں آرا موجود ہیں۔ اختصار کی خاطر صرف چند ایک یہاں درج کی جاتی ہیں (۲) قاسم مجموعہ نغز صفحہ ۲۰۳ (۳) نساخ سخن شعرا صفحہ ۱۳۰ (۴) سید احمد اللہ قادری دیباچہ رموز العارفین صفحہ ۵ (۵) سری رام۔ خمخانۂ جاوید ج ۱ (۳۱)، صفحہ ۳۲۔

"حسن کی غزلیں اپنی سادگی بیان کے لحاظ سے ضرور قابلِ تعریف ہیں۔ لیکن آپ کے یہاں بلند خیالی بالکل نہیں پائی جاتی، وہی معمولی وصل و ہجر کے مضامین ہیں۔ ان میں کوئی جدت نہیں البتہ طرزِ ادا خوب ہے ..... جہاں تک غزل کا تعلق ہے ہم حسن کو دوسرے درجے کے شعرا میں شمار کرنے پہ مجبور ہیں ..... ہمارے نزدیک حسن میں نہ میر جیسا عمق ہے اور نہ سودا جیسی بلند آہنگی۔ درد کے تصوف اور تفحص کا بھی ان کے ہاں پتہ نہیں۔ اگر آپ کو بلحاظ سادگی اور صفائی بیان کسی دوسرے شاعر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تو وہ میر اثر برادرِ خواجہ میر درد ہیں کہ آپ میر سوز کے پہلو بہ پہلو بیٹھتے ہیں جو معمولی خیالات اور روزمرہ کی باتیں اثر اور سوز کے یہاں ہیں۔ وہی حالت میر حسن کی ہے۔ آپ کا پایۂ غزل گوئی بھی ہرگز اثر اور سوز سے بڑھ کر نہیں ہے۔ آپ جو لکھتے ہیں وہ عاشقانہ رنگ میں لکھتے ہیں اور عوام کے خیالات ظاہر کرتے ہیں البتہ اس کو اس طرح لکھتے ہیں کہ وہ معمولی باتیں اجیران ہونے کی بجائے دلچسپ معلوم ہوتی ہیں اور اصل پوچھو تو یہی خوبی میر حسن کی خاص ہے۔ حسنِ بیان ہی کا نام شاعری ہے اور یہ بات آپ میں موجود ہے[1]۔ یوں تو میر حسن جملہ اصنافِ سخن پر قادر تھے مگر مثنوی بدرِ منیر آپ کے کمال کا بے نظیر نمونہ ہے۔ جس میں چند باتیں انسانی کی تصویر کچھ ایسے طریقے سے کھینچی گئی ہے کہ زمانۂ حاضرہ میں بھی وہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے[2]۔"

---

(۱) یحییٰ تنہا۔ مراۃ الشعرا، صـ۲۷۶ (۲) راس مسعود۔ انتخابِ زریں صـ۱۱

"میر حسن کی حیاتِ جاودانی کا راز نہ غزل ہے نہ قصیدہ بلکہ مثنوی ہے"[1]

"میر حسن اردو ادب کی تاریخ میں اپنی مشہور مثنوی سحر البیان کی وجہ سے زندہ نظر آتے ہیں اگرچہ اس کے متعلق انشاء نے کہہ دیا ہے کہ مثنوی نہیں کبھی سانڈے کا تیل بیچتے ہیں لیکن اور تمام ناقدین نے قدیم و جدید دور میں اسے نہ صرف میر حسن کا شاہکار بلکہ مثنوی کی تاریخ میں ایک نقطۂ عروج تسلیم کیا ہے..... واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کا جیسا صحیح تناسب اس مثنوی میں ملتا ہے اور کہیں نہیں پایا جاتا..... اس مثنوی کی شہرت نے میر حسن کے نام کو تو زندہ کر دیا۔ لیکن ان کے باقی کلام پر گمنامی کا ایسا پردہ ڈال دیا جو اب تک اٹھنے کا منتظر ہے۔ اس مثنوی کے علاوہ میر حسن نے جو کچھ کہا ہے خوب کہا ہے"[2]۔ خواجہ میر درد جیسے بلند پایہ شاعر سے شرفِ تلمذ حاصل کیا تھا اور باوصف اس کے کہ بعد ازاں وہ عمر بھر لکھنؤ میں رہے۔ انہوں نے وہ رنگِ سخن اختیار نہیں کیا جسے لکھنؤ کی درباری داری اور شہر کی ہلکی پھلکی معاشرت نے جنم دیا تھا اور اگرچہ وہ بغایت درجہ شگفتہ مزاج اور ملنسار تھے اور میر کی طرح ابنائے زمانہ سے نفور اور گوشہ نشین نہیں تھے تاہم انہوں نے اپنے شعری مزاج کو اسی کیفیت میں برقرار رکھا جس کیفیت میں یہ انہیں اپنے استاد کے فیض سے ارزانی ہوا تھا یوں تو وہ ہر صنفِ سخن پر قادر تھے۔ لیکن قصیدہ ان کے بس میں نہیں آتا تھا اور یہ بات ان کی آزادیٔ طبع کی شہادت دیتی ہے۔ ان کی غزل میں میر اور درد کا رنگ صاف جھلکتا ہے اور

---

(۱) اعجاز حسن۔ مختصر تاریخ ادبیات اردو ص ۹۸ (۲) ص ۹۹ (۳) ابواللیث صدیقی۔ ادبی دنیا اشاعت خاص ۱۹۵۱ء ص ۹۰

وہ کیفیت بے نام بدرجۂ غایت نمایاں ہے جسے جانِ تغزل اور روحِ سخن کہتے ہیں۔ مثنوی کے وہ بادشاہ تھے اور اس عرصۂ سخن میں آج تک ان سے کوئی سخنور بازی نہیں لے جاسکا۔[1]"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ میر حسن کی مثنویوں کی روشنی میں ان کا دوسرا کلام چھپ گیا۔ جس طرح دھوپ میں ستارے دکھائی نہیں دیتے لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ان کا غزلیہ کلام بھی نہایت بلند مرتبہ اور اپنے اندر درد و سوز اور جذب و کیف کے بے بہا عناصر رکھتا ہے۔[2]"

"میر حسن کی غزلیں بہ حیثیت اعلیٰ معیار کی ہیں۔ جن میں حقیقی تغزل کی روح موجود ہے۔ انہوں نے دہلی کے سوز و گداز میں لکھنؤ کی نئی امنگیں بھر کر غزل کے کیف میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جرأت اور انشاء بلکہ آتش اور داغ کے راہبر بھی میر حسن ہی تھے۔ کیونکہ معاملہ بندی، زبان کی سادگی، روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی اور عشق و محبت کے عام اور گوناگوں جذبات سے ان کی غزلیں بھری ہوئی ہیں۔ مگر عریانی اور فحاشی سے پاک ہیں۔ میر و مرزا کے ایسے گہرے نفسیات کی کمی سہی لیکن یہ بھی شاید ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بڑے بڑے معاملات میں فطرت انسانی کی مصوری اگرچہ مشکل ہے تاہم روزمرہ کے معمولی واقعات میں نفسیاتی کیفیات کی سادگی اور وضاحت سے بیان کرنا بھی بہت مشکل ہے۔۔۔ معشوق سے جلی کٹی، شوخی، طعن و تشنیع اور تیکھے پن کی باتیں جس کو دنیا نے داغ کی

---

(۱) صلاح الدین احمد۔ ادبِ لطیف اکتوبر ۱۹۵۱ء، ص ۱۵ (۲) ایضاً (۳)
م۔ علی حسن۔ ادبِ لطیف فروری ۱۹۵۲ء ص ۱۳

رنگ سمجھ لیا ہے۔ رجائیت اور بانکپن جو آتش کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے سب حسن کے یہاں کافی طور پر موجود ہے ...... حسن جس کی بھی شاگردی یا پیروی کا اقرار کریں لیکن حقیقت میں ان کا عام رنگ میر سوز سے بہت ملتا ہے۔ سوز ادا بندی کے بادشاہ تھے۔ میر حسن کو بھی اس کمال پر فخر ہے۔

ادا بندی کا کیا کہنا حسن تیری یہ اب یعنی
غزل کہی مرصع کہہ سخن کو دے مزا میرے

لیکن فرق یہ ہے کہ سوز بسا اوقات بہت زیادہ عامیانہ زبان اور مبتذل خیالات نظم کر دیتے ہیں ..... میر حسن کے یہاں مقابلۃً سنجیدگی اور متانت ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ لب و لہجہ کے اعتبار سے میر سوز اور میر تقی کا درمیانی انداز ہے۔

حسن کی غزلیں محض حسن سادہ رکھتی ہیں۔ تصنع بہت کم ہے۔ کبھی کبھی اظہار استادی کے لئے صناعت لفظی برتتے ہیں۔ ورنہ بعض اوقات غزل میں ردیف کا التزام نہیں کرتے ان کی غزلوں میں اکثر طولانی قطعے ملتے ہیں۔ بلکہ مسلسل غزلیں بھی ہیں۔ جس سے مترشح ہوتا ہے کہ محاکات اور تسلسل بیان ان کا خاص جوہر تھا۔[1] حسن کی غزل گوئی کی شہرت و مقبولیت مثنوی سحر البیان کے برابر نہیں ہوئی۔ اس کے کئی سبب تھے۔ دیوان ۱۱۸۹ھ میں کم و بیش سات آٹھ ہزار غزل کے اشعار پر مشتمل ہو چکا تھا۔ ۱۱۹۲ھ میں اس کی ترتیب ہوئی (بعد میں غالباً چند ہی غزلوں کا اضافہ ہوا (کل ملا کر نو ہزار کے قریب شعر ملتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ابھی ان کی انفرادیت

---

(۱) مرزا علی حسن: غزلیات میر حسن (غیر مطبوعہ) ۱۹۲۴ء مقدمہ ص ۵،۶

نے وہ رنگ اختیار نہیں کیا. جو سحر البیان کا رنگِ خاص ہے. ثانیاً اس میں
نوشتی کا کلام شامل ہے جس کا اثر مقبولیت پر پڑ سکتا ہے. ثالثاً غزل
کی تکنیک میر حسن کے مزاج کے مطابق نہ تھی وہ episodes کے شیدائی
تھے اور غزل اختصار کی طرف کھنچتی ہے. غزل میں ایسی گنجائشیں نکالنے کے
لئے بہت بڑے ادبی جہاد کی ضرورت تھی اور حسن کی کوششیں اسی جہاد میں
صرف ہو گئیں. اختصار کا علاج حسن نے یہ سوچا کہ جرأت کی طرح مربوط
گوئی اور مسلسل گوئی کی اور قطعہ بند اشعار بھی کہے لیکن غزل کی روایت
اس میں زیادہ دور تو نہیں جانے دیتی ہر شعر کی حیثیت الگ تو رکھنی ہی
تھی. طرزِ ادائیہ کی وہ چھب جسے سوز نے اپنایا اس میں ڈرامائی کیفیت کی
گنجائش ہو گئی. مکالمہ بھی تھا اور مکالمے میں چہ چلا بھی تھا. حسن بھی اس کے
ہیرو ہوتے یہاں طبع کے مطابق کچھ مواد ملتا تھا. سوز کے شاگردوں کی پلٹن
نے معاملہ بندی اور محاکات پر ہاتھ ڈالا. اب اور بھی آسانی ہو گئی. حسن
کی غزلوں میں یہ رجحان بھی آیا. لیکن سوال خارجیت کی طرف آنے کا تھا.
داخلیت سے خارجیت اور خارجیت سے داخلیت کی طرف حسن غزل گوئی
میں اکثر رجوع کرتے رہے. لیکن غزل کی داخلیت سے اس کی خارجیت تک
منتقل دوڑ تو ممکن نہ تھا. صرف چوکڑی ہی بھری جا سکتی تھی اور حسن
اس چوکڑی پر خوش دکھائی دیتے ہیں.

ان کی ابتدائی غزل گوئی رنگِ ضیاء میں تھی. اسے انہوں نے بڑی مشکل
اور کوشش سے اختیار کیا. وہ ضیاء کی غزلوں پر غزل بھی کہتے ہیں مثلاً

کیا کہیں پوچھ مت کہیں ہیں ہم — تو جہاں ہے غرض وہیں ہیں ہم
شمع ساں شب کے میہماں ہیں ہم — صبح ہوتے تو پھر کہاں ہیں ہم

میر حسن کے قول کے مطابق ضیاء، مولانا نسبتی تھانیسری کے مقلد تھے۔ سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنا، نامقبول الفاظ کو خوبی سے شعر میں کھپانا، ان سے خاص ہے۔ میر حسن نے ان کے حال میں ستر شعر بھی نقل کیے ہیں۔ مولانا نسبتی کا دیوان موجود ہے۔ حسن نے بھی اپنے دیوان میں نسبتی کے بہت سے اشعار کو تضمین کیا ہے۔ نسبتی کے اشعار کا مرکزی رجحان تمثیل گوئی ہے۔ میر ضیاء کا جو کلام حسن نے دیا ہے اس میں اس کا کچھ اثر نہیں۔ نسبتی تضاد paradox کو بھی پسند کرتے ہیں۔ ضیاء میں یہ رجحان کہیں کہیں ہے۔ حسن میں تمثیل گوئی تو ہے مگر مولانا نسبتی کی یہ خصوصیت اس میں نہیں۔ یہ تو اس دور کا عام رجحان ہے۔ دوسری خوبی کہ ضیاء کے مذکورہ اشعار میں ہے نہ حسن ہی اسکے رسیا تھے۔ میر ضیاء کی مشکل زمینوں اور کرخت الفاظ کو کہل بنانے کی کوشش میر حسن کے اس ابتدائی کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

تماشا کر نگاہِ لطف سے اک بار نرگس کا
کہ تا اہل چمن میں گرم ہو بازار نرگس کا
کسی کی چشم یاد آوے گی اے ظالم تو روؤں گا
نہ لیجو نام تو آگے مرے زنہار نرگس کا الخ

ہیں ترے ابرو مژہ جیسے صنم شمشیر و تیر
دیکھتے ہیں ایسے تو آتے ہیں کم شمشیر و تیر
دیکھئے کیوں کر بچے دل میرا اس قاتل سے کہ آہ
قتل پر میرے ہوئے ہیں ہم قسم شمشیر و تیر الخ

---

(۱) تذکرۂ شعرائے اردو صفحہ ۱۰ بجاد

ہے سرخ میرے خوں سے جو تیری نگار تیغ
مانندِ شاخِ گل کے رکھے ہے بہار تیغ
مت پونچھ ابرو عرق آلودہ ہاتھ سے
لازم ہے احتیاط کہ ہے آبدار تیغ الخ

ضعف سے نالے نہیں گو اب دلِ ناشاد میں
جب یہ تھے تب ہی کیا کچھ تھا اثر فریاد میں
بے مزہ تب جب وہ طرفہ چاہ ہو لے ہم نشیں
کچھ نمک پایا نہ عشقِ شیریں و فرہاد میں الخ

مجھے جوں ابر تصویر اب نہیں ہے رخصتِ گریہ
مری آنکھوں میں ورنہ کھنچ رہی ہے صورتِ گریہ
گئے وہ دن جو آنسو بھی ان آنکھوں سے نکلتے تھے
بجائے اشک اب تو رہ گئی ہے حسرتِ گریہ الخ

افتادگی جو چاہے تو رکھ ہوشِ نقشِ پا
آئینہ خاکساروں کا ہے نقشِ نقشِ پا الخ

ان اشعار میں میر ضیاء کی وہ خصوصیات موجود ہیں جن کا حسن نے تذکرہ کیا ہے۔ یہ شعر لکھنؤ کے آخری عاملی دور کی یاد دلاتے ہیں۔ جب اکثر شعرا کے ہاں جذبات کی جگہ خیالات تھے اور ان چند گنے چنے خیالات کو بھی وہ لوگ تکنیک کا حصہ جان کر الٹ پلٹ کر باندھتے رہتے تھے۔ مقصد شعر کہنا نہیں قافیے جمع کرنا ہوتا تھا۔ حسن کے اس کلام میں بھی جذبہ اور اس کا پر خلوص اظہار غائب ہے۔ یہ طرز ان سے نبھ نہ سکا۔ اس لئے انہوں نے اسے خیرباد کہی اور بقولِ خود (تذکرہ: ترجمۂ حسن) روشِ میر، سودا اور

درد کی طرف آ گئے۔ اس گروہ میں جذبے کا ابلاغ اور تجربے کا اظہار اہمیت رکھتا ہے۔ دوسروں کی بات کی بجائے اپنی بات کہنے کی لگن انہیں زیادہ تھی یہ لوگ ایہام گو شعرا کی طرح ہر جذبے کو مفہوم کی دو متوازی اکائیوں میں بانٹنے کے خواہشمند بھی نہ تھے۔ انہوں نے اسالیب میں اکبری دور کی فارسی کو راہنما بنایا۔ جس میں تغزل کا بہرہ وافر تھا۔ اب ہر شاعر کی آواز (دولت فن اشتراک کے باوجود) دوسرے سے الگ اٹھی۔ میر کی خود رحمی، ان کی نرم ونازک غم انگیز آواز اور نشتر سے پہلو مارتا ہوا "انداز" اسی دور کی تخلیق ہے۔ یہ سادہ طریقِ اظہار ایسا تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی شعر کو سپاٹ کر سکتی تھی اسی سے میر کے مقلدین کے لئے مشکل ہو گئی۔ اپنے غم کو اجتماعی رنگ میں بدلنے کا یہ ڈھنگ میر سے مخصوص ہے۔ اس کے مقابلے میں سودا کا بلند بانگ تغزل، اضافتوں کا تسلسل، روایت کی پاسداری، تنہائی کا احساس، مٹتی ہوئی ثقافت کا خیال، دلی کا نوحہ، تجربات کی دھوم دھام آنکھوں کو نظر نہ آنے والی اشیا کی تصویر کشی۔ یہ سب کچھ میر حسن کو بھاتے ہیں۔ خواجہ میر درد کی سادہ نگاری۔ تصوف کا میلان، اور (بقول حسن) عالی فکری اور کسک میر حسن کو بھا گئیں۔ حسن نے وہی لے اپنانے کی کی سعی کی جو ان شعرائے عالی مرتبت میں پائی جاتی تھی۔

میر حسن میر تقی میر کی زمینوں میں غزلیں کہنا باعث فخر سمجھتے ہیں:۔

جانا تھا اس کی کھوج میں میں بے خبر چلا ... بارے اس نے ڈھک کے پوچھا کدھر چلا۔۔

تجھ سے تازہ آئی تھی یہ میر کی غزل ... کس کا یہ شعر جوش سے بے ہوش کر چلا۔۔

---

(۱) تفصیل کے لئے راقم کی کتاب "انتخاب سودا" کا دیباچہ ملاحظہ ہو۔

یہ چھیڑ دیکھ ہنس کے رخِ زرد پر مرے — کہتا ہے میرؔ رنگ تو کچھ اب نکھر چلا....

ہوا نہ غم مجھے کچھ میری جاں گدازی کا
صنم میں کشتہ ہوں تیری بھی بے نیازی کا
مثالِ خاک حسنؔ رہ یہاں بقول میرؔ
رکھے ہے دل میں اگر قصد سرفرازی کا

حسن میر کی سبھی بحروں کی پیروی نہیں کرتے۔ حالانکہ رنگِ میر کو ان بحروں میں اپنا لینا زیادہ آسان ہے۔ وہ چھوٹی اور رینگتی ہوئی بحروں میں میر کے انداز میں غزلیں کہتا ہے۔ میر کی جنونی کیفیت اور مالیخولیائی آہ و بکا حسن کو پسند نہیں۔ وہ تو میر کے اسلوب اور لہجے کو اپناتا ہے۔ بے دماغی اور قلندرانہ وضع اسے مرغوب نہیں۔ شاید اس لئے کہ حسن نے میر کے کلام کو خواجہ میر درد کے پاسِ نظر سے ہو کر دیکھا ہے اور اس کی نظر انہیں گوشوں پر پڑی ہے جو خواجہ میر درد کے سامنے تھے۔ میر کے کلام کی یہ خصوصیات حسن میں نہیں۔ دوسری البتہ ضرور ہیں۔ نمونے ملاحظہ ہوں:-

یہ کچھ قیل و قال ہے اپنا — وہم ہے اور خیال ہے اپنا
حالِ دشمن کا یہ نہ ہو یارب — اس کے ہجر غم سے حال ہے اپنا
یاس کوئی مگر ہوئی تازہ — آج پھر دل نڈھال ہے اپنا

★

کب کہیں گلشن میں باغ باغ رہا — میں تو جوں لالہ واں بھی داغ رہا
سیرِ گلشن کریں ہم اس بیج گیا — اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ رہا
طبعِ نازک کے ہاتھ سے اپنے — عمر بھر میں تو بے دماغ رہا

★

دل خدا جانے کس کے پاس رہا — ان دنوں جی بہت اداس رہا
کیا ہوا مجھ کو وصل میں اس کے — میں رہا بھی تو بے حواس رہا
جب تلک میں جیا حسن تب تک — غم مرے دل پہ بے قیاس رہا

☆

نہ رہا گل نہ خار ہی آخر — رک رہا حسن یار ہی آخر
وہ نہ آیا ادھر حسن افسوس — رہ گیا انتظار ہی آخر

☆

بس دل کا غبار دھو چکے ہم — رونا تھا جو کچھ سو رو چکے ہم
کہسار پہ چل کے روئیے اب — صحرا تو بہت ڈبو چکے ہم
پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ — بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

☆

دل غم سے ترے لگا گئے ہم — کس آگ سے گھر جلا گئے ہم
ماتم کدۂ جہاں میں جوں شمع — رو رو کے جگر بہا گئے ہم
مانندِ حباب اس جہاں میں — کیا آئے تھے اور کیا گئے ہم
کھویا گیا اس میں گو دل اپنا — پر یار تجھے تو پا گئے ہم
آتا ہے یہی تو ہم کو رونا — یوں موت کا غم بھلا گئے ہم

☆

وصل ہوتا ہے جن کو دنیا میں — یارب ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں
یاد آتی ہیں اس کی جب باتیں — دل حسن دونوں مل کے روتے ہیں

☆

جان و دل ہیں اداس سے میرے — اٹھ گیا کون پاس سے میرے

ان اشعار کو اگر دیوانِ میر میں شامل کر دیا جائے تو پہچان مشکل ہو جائے گی۔ سودا سے حسن نے زیادہ کام لیا ہے۔ الفاظ کی تراش خراش (جو سودا میں غالباً نظیری کے اثر سے آئی ہے) شوکتِ الفاظ، بھاری بھرکم لہجہ سودا کے مزاج کو ظاہر کرتے ہیں۔ سودا کی شاعری کے یہ خارجی پہلو ہیں۔ حسن نے ان کا اکتساب بھی کیا ہے اور سودا کے اسلوب کے ان خارجی پہلوؤں کو غزل میں کھپایا ہے:

جوانی یاں نہیں رہتی کسی کی — یہ عمرِ ابدِ جاں نہیں رہتی کسی کی
ترقی و تنزل ہے ہمیشہ — یہ عز و شان نہیں رہتی کسی کی
حسن مت یاد کر ان صحبتوں کو — سدا یکساں نہیں رہتی کسی کی

کس کی سنوں بر نگہ جرس کا رواں ہیں
میں پھر رہا ہوں اپنی ہی شور و فغاں میں
زیرِ زمیں ہیں اشک مرے اور فلک پہ آہ
میں بھی تو چھا رہا ہوں زمیں آسماں میں
مجنوں کی آہ و زاری کی نوبت گزر گئی
ڈنکا ہے اب تو باتوں کا میری جہاں میں
دو چار باتیں عشق کی سن کر نہ ہو اچاٹ
لڑکے ابھی تماشے ہیں اس داستاں میں

سب نقش اس فلک کے نگینے پہ آ رہے — کارِ جہاں تمام کمینے پہ آ رہے
غصے میں جو تو ...ما جو دریائے حسن نے — جلوے نزاکتوں کے پسینے پہ آ رہے
دہ دن گئے کہ جو تھے حسن کے بھی ہو چکے — پھر رفتہ رفتہ اپنے قرینے پہ آ رہے

★

تجھ سوا کون مری بات کو پہچانے گا	ہیں اگر سیج بھی کہوں گا تو کوئی مانے گا
ہم نہ نکہت ہیں نہ گل ہیں جو مہکتے جاویں	آگ کی طرح جدھر جاویں دہکتے جاویں

حسن احساس کمتری میں مبتلا تو تھے لیکن سودا کی طرح نہیں تھے کہ اپنی بوجا کرنے لگتے ۔ یا صیغہ واحد متکلم کا زیادہ استعمال کرتے۔ وہ اپنی خواہش کے برملا اظہار پر قادر نہیں ہیں ۔ اگر کبھی اس کا اعلان کرتے ہیں تو ان کے شعر بے جان ہو جاتے ہیں ۔ وہ سودا کی شخصیت سے تو نہیں البتہ ان کے الفاظ کے استعمال، مصرعوں کی دروبست اور اسلوب کے عام پیرائے کے زیادہ کامیاب پیروہیں انا کا زوردار اظہار حسن میں نہیں۔ غزل ۲ کے جو شعر اوپر درج ہوئے ہیں ۔ وہ حسن کی طبیعت کے عجز کو ظاہر کرتے ہیں ۔ ان اشعار میں وہ زورِ کلام نہیں رہا جو باقی اشعار میں ہے ۔

سودا کے بعض موضوع، حسن اور اس میں مشترک بھی ہیں ایسے مقامات پر حسن کے لئے سودا کے اسلوب کو اپنانا زیادہ آسان ہو جاتا ہے ۔ دنیا کی بے ثباتی، دلی کی یاد، حسن کو بھی ہے ۔ اس کا نوحہ وہ بھی کرتے ہیں، انگر وطن، صحرا کے الفاظ ان کے جذبات کو بھی بروئے کار لاتے ہیں۔ یہاں سودا کا اسلوب ایک آسان راستہ بن جاتا ہے ۔ جس پہ سودا کا خنگِ باد پا رواں ہو جاتا ہے ۔

آئی تھی رات روتی ہوئی شمع بزم میں	حال اس کا پوچھ پوچھ صبا جان کھا گئی
اس بستی خراب کا مشتری کون تھا	ایسے قدم سے آئی کہ بس خاک اڑ گئی
بلبل کا جی نکل کے بھی پہونچا نہ گل تلک	ادھر بیچ سے صبا سے کہیں اڑا گئی

★

صبا کے ہاتھ سے خط گلعذار کا پہونچا	خزاں رسیدوں کو مژدہ بہار کا پہونچا

کسی نے بات کہی اور نہ دیا اس نے   یہ حالِ دلِ زار و نزار کا جب پوچھا

گئے گزرے دن جو بستے تھے جہاں آباد میں ہم بھی
خرابی شہر کی صحرا کے آواروں سے مت پوچھو

کس سے پوچھوں حالِ دل باشندگانِ دل کا ہائے
اس نگر کے رہنے والے کس نگر کو اٹھ گئے
شہر میں رونے کے ہاتھوں جب نہ رہنے پائے ہم
کوہ و صحرا کی طرف سے چشمِ تر کو اٹھ گئے
پوچھتا ہے حال کیا آوارگانِ سند کا
کچھ ادھر کو اٹھ گئے اور کچھ ادھر کو اٹھ گئے
تو اکیلا اس جگہ بیٹھا کرے گا کیا حسین
تیرے ساتھی تو کبھی کے اپنے گھر کو اٹھ گئے

کبھی بستا تھا اک عالم یہاں بھی   یہ دل جو اب کہ اجڑا سا نگر ہے

ہم باغباں کے ہاتھوں یوں اجڑے اس چمن سے
آوارہ ہو کے نکلے جیسے کوئی وطن سے

آباد شہرِ دل تھا اسی شہریار تک   اب کوئی آ پھرے نہ اس اجڑے دیار تک

وہ ملکِ دل کہ اپنا آباد تھا کبھی کا   سو ہو گیا ہے تجھ بن اب وہ مقام ہو کا

دل غم سے ترے لگا گئے ہم   کس آگ سے گھر جلا گئے ہم
ماتم کدۂ جہاں میں جوں شمع   رو رو کے جگر بہا گئے ہم
مانندِ حباب اس جہاں میں   کیا آئے تھے اور کیا گئے ہم

جوں چراغِ صبح گاہی اے نسیم   عازمِ ملکِ فنا بیٹھے ہیں ہم

دم بدم قطع ہوتی جاتی ہے — عمرِ بلبل وا بہار کے ہاتھوں
دامنِ صحرا سے اٹھنے کو حسن کا جی نہیں — پاؤں دیوانے نے پھیلائے بیاباں دیکھ کر
کیا بلا دن بہار کے آئے — پھر دوانوں کا شور و شر اٹھا
طوفاں کریں گے دیدہ پر آپ دیکھنا — ایٹھے ہیں بے طرح سے یہ نالاب دیکھنا

حسن زمانے کی بے قدری کے گلہ گزار ہیں۔ اس لئے ان کی شخصیت پر شوکت الفاظ اور بولتے ہوئے قافیوں کا سہارا بنتی ہے۔ یہیں احساس کمتری کا باقاعدہ اظہار ہو سکتا تھا۔ جہاں وہ اس احساس کو شعوری سطح پر لاتے ہیں۔ ان کا کلام پست ہو گیا ہے۔ صیغۂ واحد متکلم کی جگہ وہ تخرد رحمی (سیلف پٹی) کی طرف زیادہ رجوع کرتے ہیں۔ وہ بھی میر کی طرح اپنا آپ ماتم کرتے ہیں اور پڑھنے والے سے ہمدردی کی اپیل کرتے ہیں۔ اس مرحلے پر میر کا اسلوب ان کے کام آیا ہے۔ حسن میں ایسے مقامات پر ایک بجھی بجھی سی کیفیت ملتی ہے لیکن یہ بات صرف میر سے مخصوص نہیں۔ میر درد اور میر اثر میں بھی ہے۔ میر حسن نے میر کے کلام سے استفادہ درد ہی کی وساطت سے کیا ہے۔ ان کے ہاں بھی وہی رجحانات ہیں جو حسن کو پسند ہیں۔ یہ خصوصیت میر کا رنگ متعین نہیں کرتی کیونکہ رنگِ میر میں بعض دوسری خصوصیات بھی ہیں۔ جنہیں حسن نے ہاتھ نہیں لگایا۔ مثلاً ایک جنوں کی سی حالت قلندرانہ علیحدگی یہ حسن میں نہیں ہیں۔ میر کی مجموعی تصویر میر حسن کی مجموعی تصویر سے مختلف ہے۔ حسن ان مشترک اقدار کے نمائندے ہیں جو میر، درد اور اثر میں پائی جاتی ہیں۔ بعض نقاد حسن کو میر اثر کا مقلد قرار دیتے ہیں۔ اثر نے اپنے بھائی کا رنگ اڑایا ہے۔ حسن میں درد کا اثر گہرا ہے۔ اس لئے اسے اثر کا تتبع قرار دے لینا آسان ہے۔ لیکن حسن درد ہی کے مقلد ہیں۔ درد کی زمینوں میں شعر کہتے ہیں۔ اور اکثر ان کے اشعار کا حوالہ

بھی دیتے رہتے ہیں :

اک وقت تھا کہ عشق کا ہم کو خیال تھا — جو شعر درد کا تھا سو وہ حسب حال تھا

کیا خوب شعر ہیں یہ حسن خواجہ میر کے
کچھ کہتے کہتے آگئے اس وقت دھیان میں

تیرے سوا نہیں کوئی دونوں جہان میں
موجود ہم جو ہیں بھی تو اپنے گمان میں

باراں بیاں کرے ہے نکات تنزلات
بجلی لکھے ہے رقت تجلی کی شان میں

اب دھر بھی اہل بزم تو جبہ ضرور ہے
کچھ کچھ کہے ہے شمع بھی اپنی زبان میں

خارجی صورت (زبان، محاورہ، روزمرہ) سے قطع نظر حسن پر میر درد کا اثر داخلی رجحان میں بھی بہت زیادہ ہے۔ درد کی زبان کا جو رشتہ ان کے جذبات سے ہے حسن اس پر بھی تکیہ کرتے ہیں۔ وہ درد کے صوفیانہ خیالات کو پسند کرتے ہیں، میر تقی میر سے درد کی روشنی آتی میں استفادہ کرتے ہیں، بعض اوقات یہ اثر ابھر کر سامنے آتا ہے مثلاً درد کی غزل ہے

بات جب آندان پڑتی ہے — تب کہیں تیرے کان پڑتی ہے
آتش عشق قہر آفت ہے — ایک بجلی سی آن پڑتی ہے
آخر الامر آہ کیا ہوگا — کچھ تمہارے بھی دھیان پڑتی ہے
میرے احوال پہ نہ ہنس اتنا — یوں بھی اے مہربان پڑتی ہے

شعر ہے اور درد ہے یعنی
بات ہیں اور جہان پڑتی ہے

میر حسن فرماتے ہیں :-

اس کی جب بات دھیان پڑتی ہے دل میں مرمٹ کے جان پڑتی ہے
بندہ عاجز ہے رو ہی دیتا ہے آدمی پر جب آن پڑتی ہے
جانتا ہے وہی مصیبتِ عشق جس پہ اے مہربان پڑتی ہے
جس کو دل اپنا چاہتا ہے حسن بات کب اس کی دھیان پڑتی ہے

رنگِ درد یوں بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔

جوانی یاں نہیں رہتی کسی کی یہ عمر اے جاں نہیں رہتی کسی کی
چھپایا گو کسی نے پر محبت کبھی پنہاں نہیں رہتی کسی کی
حسن مت یاد کر ان صحبتوں کو سدا یکساں نہیں رہتی کسی کی
عشق کا راز گر نہ کھل جاتا اس قدر تو نہ ہم سے شرماتا
حجابِ عشق اگر حائل نہ ہوتا تو ملنا یار کا مشکل نہ ہوتا
امنگیں تھیں حسن کے دل میں کیا کیا ابھی تو کوئی دن بسمل نہ ہوتا
یاس کوئی مگر ہوئی تازہ آج پھر دل ندھال ہے اپنا
مشتعل ہوا ہے دل کا داغ جس طرح سے بھڑک اٹھے ہے چراغ
ٹک دیکھ لیں چمن کو چلو لالہ زار تک کیا جانے پھر جئیں نہ جئیں ہم بہار تک
شمع ساں شب کے میہماں ہیں ہم صبح ہوتے تو پھر کہاں ہیں ہم
تم بن اے رفتگانِ ملکِ عدم ہستی اپنی سے سرگراں ہیں ہم
جنس آسودگی نہیں ہم پاس درد اور غم کے کارواں ہیں ہم

یہ آواز میر درد ہی کی ہے اور حسن نے بڑی چابکدستی سے درد کے الفاظ و تراکیب کو اپنی شاعری کے مزاج میں سمو دیا ہے۔ درد کا کلام حسن کا نقطۂ تحریک ہے۔ اس کی مدد سے وہ دوسرے شعرا کے رنگوں کو دیکھتے

ہیں۔ اسی لئے درد کا رنگ کلامِ حسن میں بالعموم یوں علیحدہ دکھائی نہیں دیتا
بہ طرف چند مثالیں تھیں جو درج ہو گئی ہیں۔ ورنہ حسن درد کی آواز کو
دوسرے معاصرین کی آوازوں سے ملا کر اپنا رنگ بنا لیتے ہیں۔ درد کا
کلام حسن کے ہاں عام طور پر الگ ان کی شاعری کے تار و پود میں رچ کر
معروضی اظہار میں آتا ہے۔

میر حسن میر تقی کو درد کی وساطت سے دیکھتے، سودا بھی ان کے ہاں
اکثر اسی زاویے سے دیکھے گئے ہیں۔ دنیا کی ناپائداری کا احساس سودا
میں بھی ہے۔ درد کے ہاں بھی ہے۔ حسن کے لئے اس قسم کے جذبات کے
لئے یہی پیمانہ آسان رہتا ہے۔ وہ بھی اپنے غم والم اور اپنے زمانے کے
حالات کو اسی فصیل پر کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں۔ گویا ایسے اثرات کا تعلق
حسن کی ذات سے دو طرفہ ہے۔ وہ درد و سودا کو اپناتے بھی ہیں اور اپنے
تخیلی تجربے سے اسے کامیاب بھی بنا لیتے ہیں۔ یہاں تقلید کی وہ گھٹن
اور بیگانگی بحالت حسن میں نہیں جو اشعار کو سپاٹ کر جائے۔ یہاں
حسن کی ذات بھی اس شعری عمل میں پنہاں ہے۔ حسن جب خاص سودا
یا صرف میر کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں تو بے اثر ہو جاتے ہیں۔ ان
کے دیوان غزلیات کا تقریباً تہائی حصہ ان شعوری کوششوں میں رہ گیا
جب حسن بزرگ شعرا کی شخصیتوں سے متاثر ہونے لگتے ہیں تو غزل کہتے
وقت وہ اس احساس کو مٹا نہیں سکتے۔ یہی ان کا تقلید کا عیب ہے۔
نتیجے میں ان کی ذات گھٹی گھٹی سی رہتی ہے۔ لیکن جب درد کی مدد سے
انھیں اس احساس کمتری سے چھٹکارا ملتا ہے۔ اور اساتذہ کے مشترک
رنگ ذات کا سراغ لگتا ہے تو وہ سودا، درد، میر کے اسالیب کو بڑی

مہارت سے اپنے رنگ میں ملا کر ہموار راستہ بنا لیتے ہیں۔ شعراء کے ملے جلے روپ جب جھلکنے لگتے ہیں۔ تو حسین پھولوں کا گلدستہ تیار کر لیتے ہیں

چپکے ہی چپکے کون مجھے لوٹ لے گیا
ڈالی ہے تو نے لے دلِ ناداں پکار گیا
دل کی تڑپ سے میرے محبت تو خفا ہوا
بے اختیاریوں پہ مرا اختیار کیا
اک لہر سی جو آ گئی دل میں مرے حسن
رویا ہوں آج بیٹھ کے میں زار زار کیا
نہ شہر میں کہیں پا یا اسے نہ صحرا میں
اجاڑ کر ہمیں کیدھر بسا وہ خانہ خراب
گلی کوچے کے رونے سے بھی اب تو کام درگزرا
سماں سا ہو گیا وہ بھی جو روتے تھے کبھو چھپ چھپ
ہمرہاں تم نے قدم اپنے اٹھائے تو چلو
ہم بھی اک آدھ گھڑی کو تمہیں آ لیتے ہیں
ایک بس دل ہے جان کھونے کو
کیا لگے ہے خراب ہونے کو
تیرے ہم نام کو جب کوئی پکارے ہے کہیں
جی دھڑک جاتا ہے میرا کہ کہیں تو ہی نہ ہو
کب مجھ کو توقع تھی یوں تجھ سے جدا ہوں گا
کیا جانوں کہاں کا تھا درپیش سفر مجھ کو
ویرانہ میں کیا ہوگا احوال کہ بستی پر

سونا نظر آتا ہے تجھ بن یہ نگر مجھ کو
کچھ رازِ دل اپنا تو اب کھول کے دل مجھ کو
کچھ حال بُرا تیرا آتا ہے نظر مجھ کو
اک ذرا تم تو بیٹھ کر اٹھ گئے
رات ہم نے تڑپ تڑپ کاٹی
دنیا ہے نہ مجھ پاس مری جاں نہ دیں ہے
اک تو ہے سو کچھ تیرا بھروسا بھی نہیں ہے
تھے مجھے خیال رات اس سے
باتوں کا ہمیں دماغ کب تھا
نہ تھمتی تھیں آہیں نہ رکتے تھے آنسو
حسن رات کیا تجھ کو غم تھا کسی کا
کون اٹھ گیا ہے مجمع عشاق سے کہ آج
آتے نظر سبھی مجھے خاموش آشنا
میں حشر میں کیا دوں کہ اٹھ جاتے ہی تیرے
برپا ہوئی اک مجھ پہ قیامت تو کہیں اور
دھڑکا تو تیرے آنے ہے سچ ہی ولیکن
بازو کے پھڑکنے سے ہوا دل کو یقیں اور

کیا کہیں پوچھ مت کہیں ہیں ہم
تو جہاں ہے غرض وہیں ہیں ہم

ہم نہ تیر شہاب ہیں نہ سموم
نالہ و آہِ آتشیں ہیں ہم

دروازہ گر کھلا ہے اجابت کا یہ حسن
ہم کس کس آرزو کو خدا سے طلب کریں

میں تو یونہی تم سے دیوانہ سا بکتا ہوں کہیں
آ گئے اس کے دوستاں یہ گفتگو مت کیجو

ہوئے ہیں عشق کے بیمار دیکھئے کیا ہو
بہت برا ہے یہ آزار دیکھئے کیا ہو
چھٹے قفس سے اگر ہم صفیر تم تو چلو
ابھی تو ہم ہیں گرفتار دیکھئے کیا ہو

بیاں تو سنتا ہی نہیں بات کسی کی کوئی
دل مرا مثلِ جرس کب تئیں فریاد کرے

کہا چاہیے کچھ کہتا ہے کچھ اور
حسن دھیان ان دنوں تیرا کدھر ہے

دیدارِ دلدار کو غنیمت جان ۔۔۔ حاصلِ زندگی یہی تو ہے
تیرے دیدار کے لئے یہ دیکھ ۔۔۔ جان آنکھوں میں آ رہی تو ہے
ڈھ گیا ہو نہ خانۂ دل آج ۔۔۔ سیلِ خوں چشم سے بہی تو ہے
واں کبھی راحت ہو یا نہ ہو دیکھیں ۔۔۔ اک مصیبت یہاں سہی تو ہے
تیرے احوال سے حسن بارے ۔۔۔ اس کو تھوڑی سی آگہی تو ہے

ہزار حیف کچھ اپنی ہمیں خبر نہ ہوئی ۔۔۔ تمام عمر تھکے پر ہم یہ سحر نہ ہوئی
شبِ فراق میں رو رو کے مر گئے آخر ۔۔۔ یہ رات جیسی تھی ویسی رہی سحر نہ ہوئی

کیا جانئے کیا گذری حسن پہ نہیں معلوم
کچھ کل سے وہ خاموش ہے اور اشک فشاں ہے

جان میں میری جان آئی تھی ۔۔۔ کل صبا کس کی باس لائی تھی
پھر دبک اٹھی آگ دل کی ہائے ۔۔۔ ہم نے رو رو کے جو بجھائی تھی
گل بگولوں سے بھر گیا تھا دشت ۔۔۔ کس کی وحشت نے خاک اڑائی تھی

شب سے دل آپ میں نہیں ناصح — ایسی کیا بات تُو نے سنائی تھی

اب وہ دل ہی نہیں رہا جس میں — درد و اندوہ کی سمائی تھی

پوچھو شمع سے رات کیونکر کٹی — رات جو میرے سر پہ آئی تھی

دل کو درد دیا جگر کو حسنؔ — تجھ کو دونوں سے آشنائی تھی

یار گر اپنا پاس ہو جاوے — زندگی کی پھر آس ہو جاوے

قاصد ایسی نہ بات کچھ کہیو — جس سے دل بے حواس ہو جاوے

میں تو اس ڈر سے کچھ نہیں کہتا — تو مبادا اداس ہو جاوے

اب تو مرتا ہوں اے نسیم اسے — کہہ کہ ٹک میرے پاس ہو جاوے

جس کو سمجھا ہوں میں حسنؔ امید — کہیں وہ بھی نہ یاس ہو جاوے

شمع ساں رات کیا سنی ہم نے — جس سے رو رو کے صبح کی ہم نے

ایک دن بھی نہ چین پایا ہائے — تیرے ہاتھوں سے زندگی ہم نے

زلفِ مشکیں میں دل پھنسا کے حسنؔ — اک بلا اپنے سر پہ لی ہم نے

شبنم کی طرح سیرِ چمن بھی ضرور ہے — رو دھو کے ایک رات یہاں بھی گزاریے

دو جہاں سے ہم کنارے ہو کے جاوینگے حسنؔ — ہاتھ ملتے ہم پہ یہ دنیا و دیں رہ جاوینگے

بہت مانگیں دعائیں ہاتھ اٹھا کر — نہ نکلا کام کچھ آخر دعا سے

مجھے ڈر ہے کہیں رسوا نہ ہو تو — جو میں رسوا ہوا تیری بلا سے

چشمِ تر رات مجھ کو یاد آئی — اپنی اوقات مجھ کو یاد آئی

وہ نہیں ہم جو ڈر ہی جاوینگے — دل میں جو ہے سو کر ہی جاویں گے

تجھ سے جس دم جدا ہوئے اے جان — پھر بھی سنیو کہ مر ہی جاویں گے

بے خبر جس طرح سے آئے تھے — اس طرح بے خبر ہی جاویں گے

تجھ کو غیروں سے کام ہے تو وہ — ہم بھی اب اپنے گھر ہی جاویں گے

وہاں جنھوں نے کہیں لگائے تھے ۔۔۔ کیا انہوں نے مزے اٹھائے تھے
اب جہاں خار و خس پڑے ہیں کبھی ۔۔۔ ہم نے یاں آشیاں بنائے تھے
یاں کیا نہ تھا جو واں کی رکھے حسن توقع ۔۔۔ دونوں جہاں سے اپنا دل سرد ہو گیا ہے
بس ہے اتنا ہی تیرا پیار مجھے ۔۔۔ او حسن کہہ سکے تو یار مجھے
عندلیبِ بہار خوباں ہوں ۔۔۔ نہیں درکار لالہ زار مجھے
لئے جاتی ہے ہوش سے ہر دم ۔۔۔ تیری یہ چشم پر خمار مجھے
گل ہزاروں کو آہ جس نے دیے ۔۔۔ دل دیا اس نے داغ دار مجھے
سوچتا کچھ تو آج دل میں گیا ۔۔۔ دیکھ روتے وہ زار زار مجھے
سخت دشمن ہے یہ کہ تجھ سے جدا ۔۔۔ لئے پھرتا ہے روزگار مجھے
عشق بازی سے دل نہ ہار حسن ۔۔۔ کاش اس کے عوض تو ہار مجھے
مل جائے حسن کہیں تیرا یار ۔۔۔ تا غم یہ ترا جدا ہو تجھ سے
دل سے اس کے دل کریگا خوبیاں ۔۔۔ ہم تو کہتے حالِ دل ترپائیں گے
ہر گھڑی مت ذکر کر اس کا حسن ۔۔۔ اور سن سن کر بہت للچائیں گے
زندگی کا بہت مزا پایا ۔۔۔ اے حسن کر کے عاشقی تو نے
وہ عشق کی گرمی نہیں وہ چار برس میں ۔۔۔ دل سرد ہوا اپنا ہوا اور ہوس سے
یار کا دھیان ہم نہ چھوڑیں گے ۔۔۔ اپنی یہ آن ہم نہ چھوڑیں گے
جب تلک ہم میں ہے ہمارے دم ۔۔۔ تجھ کو اے جان ہم نہ چھوڑیں گے
آج دل بے قرار ہے کیا ہے ۔۔۔ درد ہے انتظار ہے کیا ہے
جس سے جلتا ہے دل جگر وہ آہ ۔۔۔ شعلہ ہے یا شرار ہے کیا ہے
یہ جو کھٹکے ہے دل میں کانٹا سا ۔۔۔ مژہ ہے نوکِ خار ہے کیا ہے
چشم بد دور تیری آنکھوں میں ۔۔۔ نشہ ہے یا خمار ہے کیا ہے

شاید اٹھنے کا قصد تو نے کیا
اٹھ چلے ہیں جو اس سے میرے

ہو چکا حشر بھی حسن لیکن
نوبت ہم فراق کے مارے

دل بر سے ہم اپنے جب ملیں گے
اس گم شدہ دل سے تب ملیں گے

یہ کس کو خبر ہے اب کے بچھڑے
کیا جانیے اس سے کب ملیں گے

جان و دل و ہوش و صبر و طاقت
اک ملنے سے اس کے سب ملیں گے

دنیا ہے سنبھل کے دل لگانا
یاں لوگ عجب عجب ملیں گے

ظاہر میں تو ڈھب نہیں ہے کوئی
ہم یار سے کس سبب ملیں گے

ہو گا کبھی وہ بھی دور جو ہم
دلدار سے روز و شب ملیں گے

(۳)

حسن کے کلام کا ایک دوسرا رخ بھی ہے اور وہ معاصرین اور نو عمر نئی پود سے بھی اثر لیتے ہیں۔ قدما کی پیروی میں حسن دب جاتے ہیں۔ غزل گوئی کی گزشتہ روایات۔ بزرگوں کا رنگ کلام اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ میر حسن اپنے رد عمل کو داخلی انداز میں پیش کریں۔ اس سے کشمکش پیدا ہوتی ہے اور حسن کبھی کبھی اساتذہ کے سامنے سپر بھی ڈال دیتے ہیں۔ اس سے بچنے کے لئے بعض اوقات وہ مشترک اقدار و احساسات کا سہارا لیتے ہیں۔ کبھی نو عمر معاصرین کی طرف جھکتے ہیں۔ نئی پود کی طرز پر حسن کے معاصر میر سوز اور حسرت کی حکمرانی تھی۔ سوز کے شاگردوں کی فوج جس میں رضا علی آشفتہ، نوازش حسین نوازش (مرزا خانی)، سعید اللہ شاہ شامل ہیں۔ سوز ہی کے ساختہ و پرداختہ تھے۔ یہ لوگ سوز کا رنگ اڑانے کی تگ و دو کرتے تھے۔ ہر غزل میں ایک دو شعر سوز کے رنگ میں ضرور کہتے تھے۔

سوز کا کوئی شعر پھوہڑ پن سے خالی نہیں ہوتا تھا[۱]۔ اس انداز کی یہ قباحت ہے کہ تتبع مشکل ہے۔ میر و سودا کی طرح متانت نہیں ہے اور بات چیت کا مزا ہے۔ بقول احمد علی یکتا صاحب دستور الفصاحت[۲] "اگر کوئی لب و لہجے اور زبان کا تتبع کرنا چاہے تو میر و سودا کی طرز پر جا پڑے اور اگر گفتگو کی طرف آئے تو عورتوں اور مخنثوں کی بولی پر آ جائے"۔ انشا اور ان کے ساتھی محض اس تنگ دو دوسری روش پر نکل گئے ہیں۔ ظرافت اور چٹکلے میں بھی وہ سوز سے چل کر "پھکڑ" اچھل کود اور ضلع جگت پر آ گئے ہیں۔ طرز ادائیہ اب گفتگو کی حدوں سے نکلی تو کبھی معاملہ بندی بنی کبھی ریختی ہو کر رہ گئی۔ سوز نے اپنے کلام میں اشراف پرستی کی وجہ سے جذبات کی ایک خاص سطح کو ضروری خیال کیا تھا۔ وہ انشا اور ان کے ساتھیوں میں نہیں ہے۔ حسرت اور ان کے شاگرد جرأت نے بھی معاملہ بندی میں تاری کی اخلاقی اور معاشرتی سطح کو نظر انداز کر دیا اور محاکات کو فوٹوگرافی اور حرکات و سکنات کی متحرک تصاویر کو موضوع غزل بنا دیا۔ جس زمانے میں مصحفی لکھنؤ میں آئے (۱۱۹۸ھ) اس وقت تک یہی مذاق شعراء میں رچ گیا تھا۔ مصحفی بھی تغزل کے قائل تھے۔ اور محاکات بھی ان کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ حواس خمسہ سے انہوں نے بھی کام لیا ہے۔ لیکن وہ اس چھچھورے قسم کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ وہ حسرت اور جرأت کے رنگ کو "تیغ اور بھالے کی شاعری" قرار دیتے ہیں۔ ان کے شاگرد بھی اسی نہج پر چلے۔

مصحفی کے طرز پر اکثر غزل کہتا ہوں میں

---

(۱) تاریخ جدولیہ ص۱۹۱ (۲) ص۵۲

کام کچھ ہرگز نہیں مجھ کو عوام الناس سے[۱]

مصحفی کی سری بہ حسیناں دانشتن ہائے والی بات دو مردوں میں بھی تھی لیکن وہ رکھ رکھاؤ، وہ حفظِ مراتب نہیں تھا۔

فیض آباد اور لکھنؤ میں بہرحال اسی تیغ اور بھالے کی شاعری کا چلن ہو گیا تھا، اور ریختی بازی کو شاعری میں جگہ مل چکی تھی۔ میر حسن اسی دوراہے پر کھڑے ہو کر دیکھ رہے تھے۔ بزرگوں کی برکات کا سایہ ان کے سر پر تھا نوجوانوں کی چلبلی طبیعت ان کے سامنے تھی اور ان دونوں درجوں کے درمیان اور ان کے کندھے سے کندھا جوڑ کر میر سوز چل رہے تھے۔ سوز ان دو طرزوں کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتے تھے اور میر حسن پل سے گذر کر دوسری طرف جا سکتے تھے۔ سوز کے تتبع میں حسن لکھتے ہیں:

صنم پاس ہے اور شب ماہ ہے — یہ شب ہے کہ اللہ ہی اللہ ہے
ترے ناز کیوں کر اٹھاؤں نہ میں — مری درستی پہ تو گمراہ ہے
تجھے ہوش اتنا نہیں بے خبر — مرے حال سے کب تو آگاہ ہے
ترا نام لیتے نکلتی ہے آہ — مری آہ کے دل میں کیا آہ ہے
کہاں برقِ عشق و کہاں کوہِ صبر — بگولے کے آگے پرِ کاہ ہے
میں کیوں کر کہوں تجھ کو فرصت نہیں — پہ یہ بات کب تیرے دلخواہ ہے
نہ آنے کے سو عذر ہیں میری جاں — اور آنے کو پوچھو تو سو راہ ہے
میں اک روز پوچھا جو اس شوخ سے — کہ کیوں کچھ تجھے بھی مری چاہ ہے
تو ہنس کر لگا کہنے کیا خوب کیوں — تو میرا کہاں کا ہوا خواہ ہے

---

(۱) ریاض الفصحا صہ ۲۲ (۲) ایضاً صہ ۲۱

یہ سن کر چپ میں چپ رہا تو کہا — لے دل کا مالک تو اللہ ہے

غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو — کیا غضب کرتے ہو ادھر دیکھو
خاک میں مت ملاؤ دل کو مرے — جی میں سمجھو ٹک اپنا گھر دیکھو الخ

کبھی کبھی حسن سوز کے تکرار الفاظ کو بھی لے ہاں لے آتے ہیں :۔

شمع کہتی تھی یہی شام سے جلتے جلتے — صبح تک جی تو ہے گا مرا جلتے جلتے
مرے رخساروں سے نے تا بہ سر دامن خاک — جا بجا پڑ گئے ہیں اشک کے ڈھلتے ڈھلتے
دسترس پاؤں تلک اس کے تو ہو جائے کہیں — ہاتھ بھی گھس گئے افسوس سے ملتے ملتے

لیکن تکرار کی یہ طرز حسن کے ہاں جنبا سنتاک بن کر رہ جاتی ہے۔ اسی لئے حسن نے اس کی زیادہ پیروی نہیں کی اور بول چال اور خوش مزاجی تک ہی سوز کے رنگ کو اختیار کیا ہے۔ یہ حسن کے محاکاتی انداز کے بہت قریب تھی۔ وہ ہر شعر میں ایک ایک گفتگو ریکارڈ کرتے جاتے تھے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ حسن نے معاصرین میں کسی کا ذکر اپنی شاعری کے ضمن میں نہیں کیا۔ صرف تعداد بزرگ معاصرین) سے اثر لینے کا اقرار کیا ہے۔ ممکن ہے اس میں وہ اپنی ہتک سمجھتے ہوں۔ لیکن ان کی شاعری انہیں نئے اثرات سے بہرہ اندوز ہوتی ہے۔ سوز، حسرت، جرأت اور انشا کے رنگوں کی پرچھائیاں ان کے ہاں پائی جاتی ہیں۔

حسرت کی شاعری بھی میر و سودا کے دور سے اٹھی اور سوز کے ہمراہ چل کر شگفتہ مزاجی اور معاملے سے دو ہاتھ آگے نکل گئی۔ اشراف کے معیار ترک ہو گئے۔ جذبات کا اظہار ہر سطح پر ہونے لگا۔ معاملہ بندی کے پیرائے میں ڈھیل ڈھیا اور دھکا پیل کری تک شاعری میں جگہ پا گئے۔ حسرت کے شاگرد جرأت نے اسی رنگ کو فروغ دیا۔ جرأت کی ایک غزل ہے :۔

کیا اکیلے تیرے بن جائیے اور سو رہیے
تو نہ ہو پاس تو کچھ کھائیے اور سو رہیے
بزم میں بیٹھے ہو کیا رات چلی جاتی ہے
لو ہمیں اب کہیں سدھائیے اور سو رہیے
پائینتی بیٹھ کے تلوؤں کو تو سہلاؤں میں
اتنا منہ سے مجھے فرمائیے اور سو رہیے
جاگتے ہیں بس اسی فکر میں ہم تو دن رات
کیونکہ گھر میں لیے آئیے اور سو رہیے
تم تو بیٹھے ہی رہے اور چلی وصل کی رات
لو گجر بجتے ہیں مل جائیے اور سو رہیے
نیند آنکھوں میں ہے اور کہتے ہیں ہم لے جرأت
پاؤں اس کوچے میں پھیلائیے اور سو رہیے

میر حسن کو محاکات کی یہ شان پسند آتی ہے تو یوں گویا ہوتے ہیں ؎

منہ کہاں یہ کہ کہوں جائیے اور سو رہیے
خوب اگر نیند ہے تو آئیے اور سو رہیے
تکیہ زانو پہ مرے کیجئے بے خوف و خطر
آپ تشریف ادھر لائیے اور سو رہیے
آج کی چاندنی وہ ہے کہ کسی شوخ کے ساتھ
کھول آغوش لپٹ جائیے اور سو رہیے
یوں تو ہرگز نہیں آنے کی تمہیں نیند مگر
مجھ سے قصہ مرا کہوائیے اور سو رہیے

گر رہیں ہم بھی کہیں پائیتی اب جائیں کہاں
آپ اتنا ہمیں فرمائیے اور سو رہیے

بخت جاگے ہیں شب ماہ میں جو یار ہے پاس
چاند کی تخت پہ بچھوائیے اور سو رہیے

اس ادا کا ہوں میں دیوانہ کہ انگڑائی لے
مجھ سے کہنا ہے کہیں جائیے اور سو رہیے

ڈر خدا کا ہے نہیں اور صنم کو لے کر
ایک جا پر مجھے بہلائیے اور سو رہیے

طپش عشق کی گرمی سے جلے جاتے ہیں
چھاؤں ٹھنڈی کہیں ٹک پائیے اور سو رہیے

یہ مماثلت ایک دو نہیں کئی جگہ ملتی ہے مثلاً مندرجہ ذیل مطلعوں والی غزلیں دیکھی جائیں ؎

(۱) نظروں میں اس نے مجھ سے اشارات آج کی
کیا تھا یہ خواب کچھ نہ کھلی بات آج کی

(۲) تم پاس سے جو اپنے کنیزوں میں جا کے بیٹھے
ہم کو یہ آئی غیرت ہم منہ چھپا کے بیٹھے

(۳) ابرو سے اور مژہ سے عالم کی جان لی ہے
پہلے پہل یہ اس نے تیر و کمان لی ہے

(۴) ہر بات میں اپنے جو کہا اور نہیں تو
ہم کو بھی یہی درد ہوا اور نہیں تو

اسی طرح بعض غزلوں میں اس رنگ کے اکا دکا شعر بھی مل جاتے ہیں مثلاً:۔

غیر سے وہ گرم سرگوشی رہا جو دیر تک　　　　میں پڑا زانو بدلتا اور کھجاتا رہا

اس ڈھب کی شاعری میر حسن کو انشاؔ کے رنگ کے قریب بھی لے گئی ہے سید انشاء معاملاتِ عشق میں بھاگ دوڑ اور اچھل کود کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور بعض اوقات غزل کی جملہ روایات کی پیروڈی بھی کر جاتے ہیں۔ حسن بھی ان روایات کا مذاق اڑاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

دل اور جگر لہو ہو آنکھوں تلک تو پہونچے
کیا حکم ہے اب آگے نکلیں کہو نہ نکلیں

اتنے آنسو تو نہ تھے دیدۂ تر کے آگے
اب تو پانی ہی بھرا رہتا ہے گھر کے آگے

ہے چاک چاک سینہ کیوں کر چھپے تو دل میں
یہ تو مکان سارا بے پردا ہو گیا ہے

جانے کا قصد تیرے جیدھر سنا اُدھر کو
وہ کان دار اپنے سودے لگا کے بیٹھے

آہوں سے داغ ہوں میں اب شعلہ رو کے ہاتھوں
اس شوخ برہم اب تو دھونی رما کے بیٹھے

غزل کی روایات کے بارے میں یہ غیر سنجیدہ ردِ عمل انشاء سے خاص ہے۔ میر حسن جرأت اور حسرت تک آسانی سے جا سکتے تھے لیکن منسوڑ ہونے کے باوجود انشاء کا رنگ ان کے بس کی چیز نہیں۔ انشا کی طرف وہ کبھی کبھی آنکھ اٹھا کے دیکھتے رہتے ہیں۔ میر حسن کا مزاج محدود پیرائے

میں نہیں رہ سکتا وہ جرأت کی طرح مربوط گوئی اور مسلسل گوئی بھی کرتے ہیں۔

کہا حسن سے میں اک روز کیوں تو روٹھتا ہے
ملے گا یار ترا اتنا بے قرار نہ ہو
دیا جواب یہ ہنس کر کہ اے تسلی بخش
میں کیا کروں جو مرا دل یہ اختیار نہ ہو
کیا جاؤں جاؤں کرتا ہے جاناں تو بیٹھ جا
میں دیکھوں تجھ کو اور تو دیکھ اک نظر مجھے
پھر کوئی دم میں آہ خدا جانے یہ فلک
لے جائے کس طرف کو تجھے اور کدھر مجھے
کیا بڑی عمر ہے دل میں ابھی گندرا تھا مرے
کہ مزا ہووے جو ایسے میں وہ دل دار ملے
بارے تو آن ہی پہونچا مرا جی شاد ہوا
میں نے اب جانا کہ ہیں دونوں کے اسرار ملے

یہ مثنوی والے ربط کی تلاش و جستجو کی معمولی کوشش ہیں۔ ان مسلسل غزلوں میں ربط تو ہے لیکن جذبے کی وہ گہرائی اور فکر کی وہ تابانی نہیں جو حسن کی مثنویوں کا حصہ ہے۔

(۵)

حسن محاکات کے دل دادہ تھے۔ ان کی غزلوں میں اس کے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن کسی ہموار نقطۂ نظر کی غیر موجودگی اور کسی خاص رجحان کی گرفت کے بغیر ان کا دیوان ایک ہیجانی قوت کا نشان بن کر رہ گیا ہے۔ اس میں

ہموار ہی نہیں، جذبات کی کوئی ایک سطح نہیں۔ ابلاغ بھی کہیں مکمل ہے کہیں نہیں ہے۔ کبھی فلسفیانہ خیالات ہیں۔ کبھی معمولی دنیا داری کی باتیں ہیں۔ میر کے ہمنوا سوز کے پیرو، حسرت کے دوست سودا کے رفیق ایک سیلاب ہے جو بے تحاشا اور بے ضرورت جدھر جی چاہتا ہے نکل جاتا ہے۔ مستقبل کے امکانات بھی جھلک مارتے ہیں اور یہی رجحانات ان کے رنگِ طبیعت کی اساس ہیں۔ بادی النظر میں مصحفی کی طرح یہ دھوکا ہو جاتا ہے کہ وہ کسی خاص رنگ کے پیرو نہیں لیکن اس تہ در تہ کائی کے نیچے حسن کی اپنی آواز چھپی ہوئی ہے۔ ان کا اسلوب درد، سودا، میر اور سوز کے رنگوں سے بنا ہے جس میں کہیں کہیں حسرت اور جرأت کے رنگ کے چھینٹے بھی ہیں۔ یہ اسلوب میر حسن کے محاکاتی انداز کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ حسن کا محاکاتی رنگ انہیں تمثیل گوئی کی طرف بھی لے جاتا ہے۔ اورنگ زیبی شعرا تمثیل گوئی پر کاربند تھے۔ ایک مصرعے میں شاعر کوئی اپنی بات کہتا ہے دوسرے مصرعے میں اس کے متوازی کوئی مسلمہ حقیقت رکھ کر اور مثال قائم کر کے پہلے مصرعے کی بات کو سچ ثابت کیا جاتا ہے۔ اس منطقی مغالطے کی بنیاد بھی خیال اور اس کی تشبیہ پر ہے۔ اس لئے حسن یہاں اپنے شعری تجربے کو پورے خلوص اور دیانتداری سے شعر میں ڈھال لیتا ہے۔ یہ خصوصیت ایک خاص دور کی تھی فردِ واحد کی نہ تھی۔ اس لئے حسن کے لئے اس کے اتباع میں کسی ذہنی کشمکش کا امکان نہ تھا:۔

ہجراں میں انتظار بھی اس کا ہے مغتنم | جو ڈوبتا ہے اس کو تو ساحل عزیز ہے

کیونکر کھلا لگے تو وہ دل دار دور سے | دونی بہار دیتے ہے گلزار دور سے

مصلحت یہ ہے کہ تری چشم کو ہے دل جیسے | رنج ہو اور تجھ بیمار سے بیمار ملے

گھر میں رقیب کیوں نہ جتلائے سیاہ گری — اپنی گلی میں کہتے ہیں کتا بھی شیر ہے

اس ڈر سے میں نے زلف کی اس کی نہ بات کی — جاتی ہے دور دور تلک آواز رات کی

دل نہیں پاس جو کچھ سوزِ جگر کا ہو عیاں — مرثیہ کیا وہ پڑھے جسکا کہ بازو ہی نہ ہو

ادنیٰ سے بھی پہونچتی ہے اعلیٰ کو منفعت — لاتے ہیں شہد و مشک کو اکثر بیار لے

اس رنگ کی مثالیں میر حسن کے ہاں زیادہ نہیں ہیں۔ اس کے مقابلے میں ایسے اشعار کی تعداد زیادہ ہے۔ جو بعد میں لکھنؤ کا رنگ خاص قرار پائی اور جس کا استعمال دورِ ناسخ کے شاعروں نے کیا ہے۔ یہی رعایتِ لفظی ہے۔ جس کے لئے لکھنؤ بدنام ہے۔ حسن کے ہاں اس کی مثالیں بافراط ہیں۔ مثنویاں اور غزلیں بھری پڑی ہیں۔ ان میں وہی رعایتِ لفظی کا رجحان کارفرما ہے۔ لیکن میر حسن کو اس کا احساس نہیں کہ ان سے یہ رنگ اچھی طرح نہیں نبھتا۔ وہ بار بار اس کا استعمال کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں۔ رعایتِ لفظی بذاتِ خود کوئی برائی نہیں لیکن اگر شاعر اس کے لئے تک بندی کرنے لگے تو اس کا ترک کرنا واجب ہے۔ میر حسن رعایتِ لفظی میں کامیابی کے ساتھ اپنے احساسات کی ترجمانی دو چار جگہ ہی کر سکے ہیں۔ باقی مقامات پر تو زبان کا معمولی چٹخارا تک بھی نہیں۔ حسن کے ہاں اس کی بڑی بھونڈی مثالیں ملتی ہیں۔

سرخ رو کیوں نہ ہوں کہ جب تو نے — منہ کا پھول سے میرا لال کیا

گریہ کرتا ہے حسن زیرِ درختِ بادام — یاد آتی ہے اسے کسی دلدار کی آنکھ

نرگسی آنکھوں میں کیوں نہ بھرے آب — زرد اور رخ سے دو شالہ بناتا ہے

کل جو میرا خوش نگہ گذرا چمن سے اے حسن — مونہہ بادام نے آنکھ اور نرگس کٹ گئی

تم ادھر دھوتے تھے منہ ہم ادھر اشک بہاتے — روتے دھوتے وہ گھڑی یاد سے ہم کو نہ گئی

اپنے شائق کو وہ جب دیکھے ہے تب پرچین ہو
تیغ ابرو تری دکھلاتی ہے جوہر اپنا
تیرے ہاتھ سے لگواتی ہے مہندی اس نے
آج تو خون کروں گا میں مقرر اپنا
قلم جو بوٹوں کے دیکھے ہیں تیرے عارض پر
تو اشتیاق ہیں ان کے قلم ہوا ہے گلاب
گیسو دراز حسن کے ترے دل ہوا ہے بند
تو سلسلہ میں اپنے ہمیں بھی مرید کر
میرا تو دل جلا ہے تیری باتوں سے شمع رو
تو بھی تو دیکھ کیا تری چلتی نہیں زباں
ہیں وہ جو باحسین انہیں کا غلام رہ
دل کو نہ اپنے معتقدِ بایزید کر
میں جتنا سوچ کرتا ہوں مجھے کچھ بن نہیں آتی
بن آتی ہے تری ہر بات جو کچھ تو بناتا ہے
نہ اک محرم ہے یا ہمدم ہے اپنا نالہ دافغاں
شب ہجراں ہیں یارب سے ہمیں بنتی ہے یارب سے

یہ گھٹیا شاعری میر حسن کے شایانِ شان نہیں ہے ان اشعار میں نہ تازگی ہے نہ گہرائی نہ جذبات ہیں نہ احساسات ۔ معمولی درجے کی لفظی صنعت گری ہے جو قابلِ فخر نہیں ہو سکتی ۔ اسطرح قدیم تلمیحات کا ذکر، عشاقِ باستاں کا تذکرہ ان کے اشعار میں گرمی پیدا نہیں کرتا وہ قیس و فرہاد کے قصے لکھتے تو ہیں لیکن یہ ان کی داستان کو رنگین نہیں کر

سکتے۔ یہاں بھی ان کے اشہبِ قلم کی جولانی معمولی درجے سے بلند نہیں ہوتی:۔

دلِ مجنوں کئی روز دن سے مرے پاس نہیں
تم نے اس کو کہیں لیلیٰ صفتاں دیکھا ہے

مت کر تو خوشی دماغی یوسف کی بو پہ اے مصر
کئی روز سے اس آگے کنعاں مہک رہا تھا

ساتھ ناقے کے خدا جانے کدھر رم کر گئی
گردِ محمل بھی نہ پہونچی آہ مجنوں کی طرف

خضر ٹک کیجو مدد تو بھی کہ تا بھولے نہ راہ
ناقۂ لیلیٰ چلا ہے آج مجنوں کی طرف

پھیر پھر کے مصر ہی میں پھرتی ہے کیا صبا تو
کنعاں کو بھیج مہکا ٹک بوئے پیرہن سے

بیٹھی ہے کیا بنی یاں خسرو کے ساتھ شیریں
بگڑی ہی ہے بے طرح دل تیشہ سے کوہکن سے

مت تو سر پہ تیشہ کی فرہاد تب میں یوں
جب سر ٹیکنے کو نہ ہو دیوار و در تجھے

کوہ و صحرا کیا ہے سونا قیس اور فرہاد بن
لیلیٰ و شیریں کا خالی محمل و شب دیز ہے

بعد مجنوں کے شور سے خالی یہ بیابان ہم نہ چھوڑیں گے

فرہاد و قیس و وامق و محمود ہوں جدھر
ہم بھی رہیں الٰہی انہیں کی قطار میں

یہ روایتی مظہر اس کی شاعری کے لئے مہمیز نہیں بن سکے شراب کا
تذکرہ بھی ان کی غزل میں بے جان تذکرہ ہے۔ انکے اشعار میں پارسائی
اور رندی کی کشمکش ہے میر حسن کی ذات اس سے چھٹکارا نہیں پا سکی
سحر البیان کی بات دوسری ہے۔ اس میں شراب کا تذکرہ حسن کی اپنی ذات
سے متعلق نہیں رہتا، کرداروں کا فعل بن گیا۔ اس لئے وہاں شراب اپنا نشہ
دے گئی۔ ورنہ حسن کی غزل میں شراب کی حیثیت رسمی ہے (اس سے یہ مراد
نہیں کہ حسن شراب نہیں پیتے تھے۔ ممکن ہے پیتے ہوں۔ لیکن شراب پینا اور
بات ہے۔ اور شراب کے بارے میں اچھے شعر کہنا بالکل دوسری بات ہے)
جب اخلاقی گرفت کڑی ہو جاتی ہے تو وہ عشق تک کو گناہ قرار دیتے
ہیں لیکن عشق ہر جگہ ان کے ہاتھ اخلاقی گرفت کا شکار نہیں۔ تاہم شراب
اور عشق پر اخلاقی گرفت کی چند مثالیں دیکھئے:۔

خواہ کعبہ ہو کہ بتخانہ غرض ہم سے حسن
جس طرف دل کی طبیعت ہو، ادھر کو چلئے

اک وفاداری جو ہے آب و گل اپنی میں حسن
پھر طبیعت نہیں پھرتی جدھر آ جاتی ہے

اس بت کی بندگی سے نہ آزاد ہو حسن
یہ بات بھی کہیں نہ خدا کو بری لگے

ماجرا دل کے لگانے کا کہا اس سے آج
چھپ سکیں تجھ سے تو اپنی نہ گنہ کی باتیں

حسن گر پارسا ہوں میں تو ناچاری سے ہوں ورنہ
نظر ہے جام پر میری سدا اور دل ہے شیشہ پر

نے جام کی خواہش ہے نہ مے کی مجھے ساقی
میں نشۂ ہستی سے ہوں سرشار ہمیشہ

حسن کے لئے اگر یہ صحیح نہیں ہیں تو ان کی شاعری کس مرکز سے کسب نور کرتی ہے؟ ان کی غزل گوئی کا ایک حصہ ایسا ضرور ہے جس میں جذبات کی توانائی اور احساسات کی شدت موجود ہے۔ اس کی تلاش کے لئے ہمیں ایک طرف تو حسن کی شخصیت کو دیکھنا ہوگا۔ دوسری طرف ان مخصوص الفاظ و تراکیب کا جائزہ لینا ہوگا جو ان کی شاعری کے محور بنتے ہیں۔ حسن معاملہ بندی میں کھلتے ہیں، حسن معاملات کی فوٹو گرافی میں کامیاب ہیں، منظر کشی اور سراپا نگاری میں ابھرتے ہیں جنسی اشعار اور ہیجان انگیز مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جوانی کا نوحہ کرتے ہیں۔ بڑھاپے سے خائف ہیں۔ وصل اور ہجر دونوں کا مزہ لیتے ہیں۔ موسیقی سے لذت کش ہوتے ہیں، یہ ان کی کامیاب شاعری کے محبوب موضوع ہیں۔ ان کی شخصیت احساس کمتری میں مبتلا ہے لیکن یہ برتری کا احساس نہیں بنتا۔ انفعالی رنگ رکھتا ہے وہ مذہب اور اخلاق کی طرف جھکتے ہیں ان کی طبعیت رندی اور شاہد بازی کی طرف جاتی ہے۔ کشمکش ہوتی ہے۔ حسن بڑھاپے سے گریزاں اور شباب کی برق رفتاری سے ہراساں ہیں یہ کشمکش بھی داخلی عذاب بن جاتی ہے۔ اس سے ان کے مزاج میں ایک لاابالی کیفیت پیدا ہو گئی ہے وہ احساسات کے تعاقب میں جو جذبہ ابھرتا ہے اسے من وعن پیش کر دیتے ہیں۔ انہیں اس سے سروکار نہیں کہ وہ جذبات ان کے لئے کیا ہیں۔ اس سے ان کے جذبات کا تضاد ظاہر ہے۔ بعض احساسات شعور کی سطح پر آ کے تلاطم پیدا کرتے ہیں اور اشعار کو بے روح کر دیتے ہیں۔ بعض ابھر کر حسن کی شاعری کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ نہ جذبات کی ایک سطح ہے نہ

: حساسات کی، نہ خیالات کی، نہ عقیدے کی، نہ دنیاداری کی، ہر شے ایک لمحاتی کیفیت ہے۔ جس سے شاعر ہم کنار ہو کر کہیں سے کہیں چلا جاتا ہے۔ ایک بے ٹھکانی زندگی، ایک بے آورشی زندگی کی پکار حسن کی غزلوں میں گونجتی رہتی ہے وہ پیدائشی طور پر [illegible] کے رسیا ہیں اس لئے ان کی غزل گوئی کی کامیاب نیچ وہ ہے جہاں احساس کمتری براہِ راست نمودار نہ ہو۔ جہاں جنسی جذبہ کوئی خیالی پیکر تراشش لے، جہاں عاشقی افلاطونی سطح پر آ جائے، جہاں مذہب اور معاشرے کی ٹکر میں تذبذب کی حالت باقی نہ رہے۔ جہاں ہر خیال ایک تصویر بن جاتے مذہبی لحاظ سے یہ حسن عشق کو برا سمجھتے ہیں لیکن جب اس عقیدے کو وہ بھول جاتے ہیں۔ تو اچھے عاشقانہ شعر کہتے ہیں، دنیا کا غم انہیں ضرور ہے اور اس کی اندوہناکی انہیں پریشان کرتی ہے، وہ تنہائی کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن فرار کی صورت اس میں ہے کہ خیالیہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ غزل میں جب حسن خیالیہ سے کام لیتے ہیں۔ کامیاب رہتے ہیں۔ غم غلط کرنے کے لئے ان کے پاس موسیقی بھی ہے۔ رامش و رنگ اور ساز و آہنگ ان کی شاعری کے لئے تحریک کا کام دیتے ہیں۔ موسیقی ان کی روح کی تنہائیوں میں نئی شمعیں روشن کرتی ہے اور وہ بے خودی سے اس میں کھو جاتے ہیں۔

رات مطرب پسر نے اک نغمہ | ایسا چھیڑا کہ کر دیا محظوظ
بسمل کیطرح اب تک ہیں رقص میں مرغ و لب | مطرب پسر نے ایسی شب ایکتاں کی ہے
نغمۂ عشق سے ہیں سجہ و زنار ملے | ایک آواز سے دو ساز کے ہیں تار ملے
آج مطرب پسر گلے ہیں ترے | اور ہی ڈھب کی تان پڑتی ہے
نیرنگیاں تمام ہیں یہ نغمہ ساز کی | نغمے جو یہ نکلتے ہیں منہ سے نئے نئے

مطرب غزل سرائی میں چھیڑا ہے تیرے آہ سو جھے خیال پھر تری لے سے نئے نئے

موسیقی ان کی زندگی اور زاہدانہ خیالات کا نقطۂ اتحاد ہے، اب تک تصوف نے (جو سنی اور شیعہ دونوں فرقوں میں رائج تھا) موسیقی کو مذہبی درجہ دے دیا ہے۔ حسن کے والد (ضاحک) اور حسن کے ولی نعمت (سالار جنگ) موسیقی کے ماہر تھے۔ اس سطح پر وہ موسیقی سے بھی لذت اندوز ہو سکتے تھے۔ اس لئے اس کا پیچ بن جانا مشکل نہ تھا۔ حسن کی غزلوں میں بعض اوقات صوت کے عجیب و غریب تجربے بھی ملتے ہیں۔ یہ بھی موسیقی کا اثر ہوگا، وہ اشعار میں الفاظ کے بعض ایسے جوڑے بناتے ہیں۔ جن سے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ حروفِ علت کی ترتیب میں انہوں نے بڑے کمال دکھائے ہیں:۔

حسن بھی آدمی ہے کچھ خفا ہوتے ہو تم جس سے
خراباتی، جنونی، باولا، سودائی، آوارہ

گھروں سے اپنے بن بن کر نکلنا ناز، رویوں کا
اکڑنا، ناز پر انداز پر انداز پر اپنے تجمل پر

معذور رکھ حسن کو جو بے طرح قتی کرے
عاشق ہے درد مند ہے اور مبتلا ہے وہ

صحبت سے کوئی کیونکر حسن کے نہ ہووے خوش
شاعر ہے، یار باش ہے، اقبال عزیز ہے

ان اشعار میں میر حسن نے آہنگ کے لئے ہر دوسرے مصرع میں لسانی اختیار سے بعض وقفے لگا دیے ہیں۔ انہیں ہم بشرام کہہ سکتے ہیں، اشعار میں بعض اصوات کی ترتیب بھی قابلِ غور ہے، پہلے شعر میں طوائی اور ونی کی آواز کو ایک ترتیب میں قائم کیا ہے۔ مصرع کے شروع اور آخر میں ان اصوات

کے درمیان فاصلہ کم اور درمیان میں تندیے زیادہ ہے۔ بشرام اور حروف
علت کی مقررہ ترتیب نے دکہ ہ کے بعد ی اور ی کے بعد و آئے) شعر
کے آہنگ کو اجاگر کیا ہے۔ دوسرے شعر میں ن، ہ اور ی کا استعمال کیا
ہے اس میں دو باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ (۱) اصوات کی تکرار ہے
اور (۲) ن ی اور ہ کی خاص ترتیب قائم کی ہے۔ چوتھا شعر فن کے اعتبار
سے زیادہ پیچیدار نظامِ اصوات کا مرکب ہے، اس میں حروفِ علت کے علاوہ
س، ص، ش، کی آوازوں کی ترتیب بھی مقرر کر دی ہے اور ساتھ ہی بشرام یا
وقفے بھی ہیں۔ تین طرح کے صوتی نظام باہم ملا دیے گئے ہیں۔ شعر کا یہ
تار و پود حسن کے ذوقِ موسیقی پر دال ہے۔ حسن موسیقی کے دلدادہ تھے۔ ان کے
زمانے میں اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت ہو چکی تھی۔ ان کی سوسائٹی اسی
مزار پر فاتحہ خوانی کر رہی تھی۔ حسن بھی غزلوں میں یہ خدمت انجام دیتے رہے
آخر میں اس جنگ میں رندی کی فتح ہو گئی اور حسن کی شاعری میں شراب و کباب
رامش و رنگ مذہبی غلاف کے بغیر اور پوری آب و تاب سے آنے لگتے ہیں۔
اس کا یہ مطلب نہیں کہ حسن اوباش ہو گئے یہ مطلب ضرور ہے کہ وہ ذہنی
قیود کو فراموش کر چکے تھے۔ سحر البیان اس کی زندہ مثال ہے

حسن کی شاعری کا دوسرا مہیج جنسی ہے۔ جنسی رجحان نے ان کی غزل
گوئی کے ایک حصے کو (جو محاکات پر مشتمل ہے) متاثر کیا اس میں اس
دور کی فضا کو بھی دخل ہے اور حسن کے اپنے کردار کو بھی، اس کے گھر کا ماحول
چاہے کچھ بھی ہو جس دربار سے وہ متعلق تھے، جنسی جذبے کے کھلم
کھلا اظہار میں مانع نہ تھا۔ ممکن ہے عملی زندگی میں وہ پارسا ہی رہے ہوں
شاعری میں خصوصیت جب وہ تخیل کے پردوں پر پرواز کرتے ہیں اور خیالیہ

کی تخلیق فرماتے ہیں ، پارسا نہ تھے ۔ ان کی شاعری غالباً ان کے جنسی جذبے کے اشتعال کے لئے ایک Sublimation ہے یہ جذبہ کبھی تو تاریکی میں نور دیکھتا ہے ۔ کبھی چاندنی میں ہجر و وصال کی منظر کشی کرتا ہے ، کبھی محبوب کی زلفوں میں چکا چوند پاتا ہے کبھی جامد و ساکت مناظر میں حرکت اور روانی دیکھ لیتا ہے ، ایک بے عمل آدمی کی زندگی تخیل ہی میں حرکت دیکھ سکتی ہے ۔ حسن بھی اسی گوشے میں امن کی دھونی رمائے ہیں ۔ ان کی جوانی اور بوڑھاپے کی کشمکش بھی ذرا دیر کے لئے ختم ہو جاتی ہے ۔ نئی نئی توجیہیں اور نئی نئی منتجیں ہیں اور حسن کی دنیا ایک نئے نور، ایک نئی روشنی سے تاباں ہو جاتی ہے ۔ "سورتیہے" والی غزل اور "سر کی چاندنی" "گھر کی چاندنی" حسن کے جذبات کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے ۔ دوسری غزلوں میں بھی چاندنی سجی بیٹھی ہے ۔ حتیٰ کہ محبوب کی صورت بھی بقعۂ نور بن جاتی ہے :-

صنم پاس ہے اور شبِ ماہ ہے — یہ شب ہے کہ اللہ ہی اللہ ہے
جلوے دو چند ہو دیں شبِ ماہ کے ابھی — اس ماہرو کا عکس اگر ماہ میں پڑے
کیا ہجر کی رات آئی کہ مانندِ چراغاں — پھر جلنے لگے داغ حسن شام سے تیرے
شب ماہ کی سیر ہے اور تو ہے — یہ دوہرے مزے ہم دیکھتے ہیں
پردے میں بھی کچھ سیر نہ کی ہم نے جہاں کی — بے ساقی ڈبے جام کٹی اپنی شبِ ماہ

روشنی کی یہ کرن چاند ہی سے نہیں پھوٹتی ہر منظر روشن و تابناک ہے :-

جلوہ گر چہرہ ترا بالوں میں جو شب ہو گیا
مہر تیرے مکھڑے کے آگے ماہ نخشب ہو گیا
مسی میں دانت چمکے نہیں سحر حسن سے
اک شب میں کتنے روزوں نے باہم قطار کی (؟)

ماتھے پہ دلبروں کے افشاں نہیں چنی یہ
تحریر ہے طلائی قرآں کی سورتوں میں
جس طرح گرد ماہ کے ہالہ ہو جلوہ گر
یوں تن پہ خوشنما ترے دامن کا گھیر ہے

میر حسن کی دھوپ چھاؤں بڑی واضح اور نکھری ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کی طبعیت کا خاص میلان اسی طرف ہے۔ مندرجہ ذیل غزلوں میں روشنی کی چکا چوند کے درمیان حسن کی شخصیت بڑی نکھری ہوئی تشبیہیں پیش کرتی ہے۔

دل اور نگہ کو کر کے پریشان لے گئی
چلون سے نور تن کی جھلک جان لے گئی
چمپا کلی کو دیکھ گئے ہاتھ پاؤں پھول
بالے کی جھونک سب مرے اوسان لے گئی

ہوتے ہی سامنے دل و دیں ہوش و عقل و صبر
تقسیم کرکے اس کی ہر اک آن لے گئی ا
تیری نگہ بھی قہر ہے کوئی، کہ لاکھ میں
جس دل سے لاگ تھی اسے پہچان لے گئی
اس چشم گریہ ناک نے عالم ڈبو دیا،
جیدھر گئی اُدھر کو یہ طوفان لے گئی
دل کا تو چین لے گئی مکھڑے کی یاد، اور
راتوں کی نیند زلف پریشان لے گئی
ستی کو دیکھ اس کی رہا آپ میں نہ میں
کیا جانوں کس طرف وہ میرا دھیان لے گئی

یہاں محبوب کا جسم اور اس کے پہناوے کی چیزیں حسن کے جمالیاتی جذبے کی بیداری اور محاکات کی جا بکدستی مہیا کرتی ہیں۔ یہی نہیں کہ حسن مناظر کو نکھری ہوئی صورت میں دیکھتے ہیں۔ محبوب کا لباس، اس کے اعضا، اس کی آرائش و زیبائش، چمن و گلستان کی تصویر کشی ابر و باراں کی تر دامنی، مناظر کی شادابی، اشیا کا حسن یہ سب حسن کے لئے شعری تجربے کی ساق بن جاتے ہیں۔ جس پر ان کی تیغ زبان کے جوہر کھلتے ہیں، مہر حسن عام طور پر مناظر کو روشنی اور سفیدی کی صورت میں دیکھتے ہیں، یہ ان کے ذہن کی خاص افتاد ہے۔ وہ بار بار چاند سورج کا ذکر کرتے ہیں۔ ہیروں کی چمک۔ سبزے کی لہک۔ پھولوں کی چمک۔ آگ کی دہک، حسن کے لئے جاذب نظر ہیں۔ اس کا مشاہدہ بڑا قوی ہے۔ تیز روشنی میں جو کپکپاہٹ اور تھرتھری پنہاں ہوتی ہے۔ حسن اس کا ادراک بھی کر لیتے ہیں۔ روشنی کی لہروں کی کمی بیشی ان کا پھیلاؤ اور سکڑنا حسن کی مادی آنکھ اس کا مشاہدہ بھی کر لیتی ہے، روشنی میں یہ حرکت حسن کے جذبات کی کار فرمائی کے سبب بھی ممکن ہے اور اسے مشاہدے کی گہرائی بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی جھلک دیکھئے :۔

کل نام خدا ایسا رنگ اس کا چمکتا تھا
خورشید بھی دیکھ اس کو آنکھ اپنی جھپکتا تھا
چہرے کا عجب عالم تھا زرد دو شالے میں
ہیرا سا چمکتا تھا کندن سا دمکتا تھا
یہ کس خورشید کا دیکھا ہے جلوہ اپنی آنکھوں سے
کہ اب تک وہ ہی آنکھوں میں ہیری تھرتھراتا ہے
شب چاندنی میں کس کا مکھڑا دمک رہا تھا

مہتاب کا بھی دیدہ اس ہی کو تک رہا تھا

میر حسن کا یہ رجحان ان کی مثنویوں میں جا کر زیادہ واضح ہوا ہے۔ غزلوں میں نور کی یہ آنکھ مچولی زیادہ پھیلی ہوئی دکھائی نہیں دیتی۔ مجموعی اعتبار سے میر حسن کی غزل گوئی میر و سودا کے مقابلے کی چیز نہیں۔ حسن کا دوسرا متفرق کلام، جو دیوان میں شامل ہے، اس سے زیادہ پست ہے۔ رباعیات کو مستثنیات میں شمار کرنا چاہیے۔ کیونکہ غزل کے برابر وہ بھی آ جاتی ہیں۔ ان کی دو تین مثنویاں البتہ ان کی غزل گوئی سے بلند ہیں یہ مثنویاں حسن کے آخری زمانہ کی یادگار ہیں۔ جب وہ اپنے اکثر complexes سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں اور ان کی تلاش sublimation کر لیتے ہیں۔ آخری زمانے میں حسن بزرگوں کی بزرگی کے قائل تو تھے۔ ان کے سامنے دو زانو بیٹھنے کے قائل نہ تھے۔ اس سے ان کی شاعری اس گھٹن سے نجات حاصل کر گئی جو ان کی غزلوں اور متفرق کلام میں نظر آتی ہے۔

باب ہشتم

متفرق کلام اور مثنویاں

(۱)

حسن کا کلام جملہ اصنافِ سخن پر مشتمل ہے ، غزلیات کے بعد فردیات کا ایک لمبا سلسلہ ہے ، ان میں وقتاً فوقتاً کہے ہوئے فرمائشی اشعار ہیں ، وہ کلام ہے جو ایک ایک دو دو شعروں سے آگے نہ بڑھ سکا ، یا پھر وہ غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار ہیں جو حسن کے مکان میں آگ لگنے سے ضائع ہوئے اور حافظے کے نہاں خانے سے بچا کھچا مال زیب قرطاس کر دیا گیا ، ان میں ایک حصہ چند ایسے اشعار کا بھی ہے جو ایہام گویوں کے انداز میں ہے ، فرمائشی کلام میں قاسم علی خاں کی شادی پر جو طرز انقیق جمع تقلیں ان کی شان میں ارتجالاً کہے ہوئے اشعار ہیں (تعداد اشعار تیس) یہ اور دوسرے شعر کوئی خاص ندرت نہیں رکھتے ہیں ۔

(۲)

رباعیات کا حصہ اس کے مقابلے میں زیادہ طویل ہے ۔ بیشتر رباعیات ردیف وار ترتیب دی گئی ہیں ، ان کے موضوعات میں بہت تنوع ہے ، رباعی کے لئے ہمارے

حال یہ پابندی رہی ہے کہ اس میں اخلاقی نکات، دنیا کی ناپائیداری، صوفیانہ خیالات، بادشاہوں کی حمد و ثنا، محبوب کا تذکرہ، یہ سب کچھ ہوتا ہے حسن نے حضرت علی کی شان میں بھی رباعیاں کہیں، اور ان میں تاثر کی شدت پائی جاتی ہے، ہجر و وصال کے قصے بھی حسن کی رباعیات میں ہیں، غم دنیا کا رونا بھی رویا ہے، شجاع الدولہ کے انتقال پر بھی رباعیاں لکھی ہیں، بندہ علی یاسلی کی تعریف و توصیف بھی موجود ہے، فارسی شعرا کا یہ قاعدہ بھی رہا ہے کہ مختلف پیشوں کے بارے میں اظہار رائے بھی اس صنف میں کرتے تھے، میر حسن نے اس روایت کی تقلید میں اہل حرفہ کے بارے میں لکھا ہے، ہر رباعی میں ایک خاص پیشے کے معشوق کا تذکرہ اس کے فن کی اصطلاحات میں کیا ہے، اس میں شعری حسن مفقود ہے، ہنگامی موضوعات کی رباعیات کو چھوڑ کر حسن کی باقی رباعیات ان کے شعری مرحلے میں بڑا مرتبہ رکھتی ہیں، خصوصاً عاشقانہ اور اخلاقی رباعیات حسن کی شاعری کا بہترین حصہ ہیں، ان میں میر درد اور سودا کا رنگ غالب ہے، مصرعوں کی نشست و بست، الفاظ کا آہنگ، شاعری کا لب و لہجہ، قدیم انداز کا غماز ہے، لیکن یہاں حسن اساتذۂ سلف کے سامنے بے دست و پا نہیں ہیں، بلکہ انہوں نے تخلیقی اوصاف کو اپنی ذات کا مظہر بنایا ہے، اردو کی چند اچھی رباعیات حسن کے ہاں پائی جاتی ہیں:۔

رونے ہی میں عمر سب گئی ہے اپنی — اور جلتے ہی اوقات کٹی ہے اپنی
جوں شمع سحر، حسن بتوں کے غم میں — اللہ سے اب تو لو لگی ہے اپنی

●

آباد رہے تو کیا ہوا دنیا میں — ناشاد رہے تو کیا ہوا دنیا میں
وارستہ ہوئے نہ قید ہستی سے حسن — آزاد ہوئے تو کیا ہوا دنیا میں

●

یا وصل سے ملکِ دل یہ آباد رہا
یا ہجر سے اپنا جی یہ ناشاد رہا
دونوں (ہی) گزر گئے حسن پر ان کا
عالم عالم جدا جدا یاد رہا

●

دنیا کے نہ فکر میں نہ دیں کے غم میں
شادی میں نہیں کسی کی نے ماتم میں
کیا تجھ کو بتائیں اپنا احوال حسن
رہتے ہیں سدا ہم اور ہی عالم میں

●

کیا سنگ دلوں سے تو بھلا ملتا ہے
ملنے سے انہوں کے تجھ کو کیا ملتا ہے
بے فائدہ ہے حسن بتوں سے ملنا
کیا ان کے ملے سے کچھ خدا ملتا ہے

●

دنیا داری میں اور (نہ) دیں داری میں
چاہت میں کسی کی اور نہ بیزاری میں
حیرت کدہ دہر میں تصویر کی طرح
سویا کرتے ہیں عین بیداری میں

●

اک عمر کے بعد کل جو پایا دل کو
جی جان کے چھاتی سے لگایا (دل کو)
افسانۂ غم اپنا سنایا دل کو
کچھ رو لیے آپ کچھ رلایا دل کو

●

دل شوق میں اوس صنم کے (جب) اٹھا ہے
مجھ دل زدہ جگر خستہ نے کیے چارا ہے
کس طرح کہیں اوس سے ہم اپنا احوال
ہم کو تو حجاب عشق نے مارا ہے

●

ہر چند کہ لازم ہے حسن فکر معاش
پر ہم کو نہیں زیادہ کچھ اس کی تلاش
جو کچھ کہ مقدر میں ہے رہو اس سے
پھر خار ہوس سے دل پہ کیوں کیجیے خراش

●

دکھلاؤں کسے میں جاں فشانی اپنی
کرتا ہے یہ کون قدردانی اپنی
نے قیس رہا نہ کوہکن نے محسود
کس آگے کہوں میں اب کہانی اپنی

(۳)

اس کے بعد قطعات ہیں اوسط درجے کے دو قطعے ہیں جو فرمائشی معلوم ہوتے ہیں، قابل توجہ نہیں، پھر مخمسات ہیں، ان میں قائم، محمد علی زار، شوکت جنگ سوز، علی حزین، میر، سودا، اہلی اور جامی کی غزلوں پر مخمس کئے ہیں (تفصیل کے لئے باب پنجم ملاحظہ فرمائیے) یہ مخمس شعوری کوشش کا نتیجہ ہیں، ان میں فنی مہارت تو ہے لیکن کوئی خاص خوبی نہیں، مخمسات میں حسن اساتذۂ قدیم سے دب کر رہ گئے ہیں، ان مخمسات میں قائم کی غزل کی تضمین و تجنیس خوب ہے۔ باقی اللہ الله خیر سلا۔ مخمس در منقبت حضرت علی کچھ زوردار نہیں حالانکہ حسن کی شاعری میں حضرت علی کی تعریف کے شعر عموماً سب اچھے ہوتے ہیں، یہاں وہ بات نہیں، دیوان کے نسخوں میں یہ ان کے علاوہ سکندر کی ہجو میں مخمس اور عظیم کشمیری کے خلاف مسدس بھی پائے جاتے ہیں یہ غالباً ان کا کلام نہیں، مخمس ہجو یہ شاید ضاحک کا ہے اور مسدس جو حافظ کی مشہور غزل کی تضمین ہے، کلیات سودا میں بھی ملتی ہے۔

اس حصۂ کلام میں ایک ترکیب بند بھی ہے جو حسن کو خود بھی بہت پسند تھا، یہ درحقیقت ایک واسوخت ہے، اس میں فارسی شاعری کے واسوختوں کا تتبع ہے، فارسی شاعری کی یہ ایک خاص تحریک صفوی دور میں نمودار ہوئی تھی، حسن نے اس کی پیروی کی ہے، ایک خصوصیت کا البتہ انہوں نے اضافہ کیا ہے۔ اس میں ہر بند میں ٹیپ کا شعر کسی نہ کسی فارسی شاعر کا ہے، یہ واسوخت کے

اسی وزن میں ہیں، اساتذہ میں خان خاناں نظیری وغیرہ کے شعر ملتے ہیں، ایک بند ملاحظہ کیجئے ؎

ہر ایک بزم میں ہے اوس کا ذکر صبح مسا
ہر ایک مُلک میں ہے اوس کے حُسن کا شہرا
ہر ایک چشم میں ہر دل میں ہے اسی کی جا
ہر ایک ملّت و مذہب میں اس کا ہے چرچا
ہر ایک جان کو بُلبل صفت ہے اس کی ہوا
اگرچہ اور بھی گل ہیں بہت پہ نام خدا
"ندانم آں گل خنداں چہ رنگ و بو دارد
کہ مرغِ ہر چمنی گفت و گوی او دارد"

اُنیس بندوں کا یہ واسوخت تضمینوں ہی گوارا ہے، ورنہ ایسی کوششوں میں حسن کی شاعری بہت ہار کر رہ جاتی ہے، مثلث تعداد میں بہت ہیں (اندازاً ۱۷ ہیں پانچ مطبوعہ باقی غیر مطبوعہ ہیں (معیار اپریل ۱۹۳۶) یہ بھی تضمین کی قسم ہے، کہ اساتذہ کے ایک ایک شعر پر اپنا ایک ایک مصرع لگا کر حسن نے مثلث بنائے ہیں۔ شعری اعتبار سے یہ کوشش ناکام اور فضول ہے۔ اسی طرح کی ایک کارگری حسن نے "ترکیب تضمین" میں کی ہے۔ یہ بقول حسن اس کی اپنی ایجاد ہے، اور حقیقت میں "ایجاد بندہ اگرچہ گندہ" ہے۔ اس میں فارسی شاعروں کی غزلوں کو تضمین کیا ہے، پہلے اپنا ایک اُردو شعر بطور مطلع پھر فارسی شاعر کی غزل کا مطلع پھر حسن مطلع کے عنوان سے مطلع ثانی پر اپنا ایک اُردو مصرع اضافہ کیا ہے، پھر شاہ فرد کے عنوان سے فارسی غزل کا شعر مثلث کیا ہے پھر بیت الغزل کے عنوان سے ایک مثلث اور بنایا ہے، اسی طرح اساتذہ قدیم کی آٹھ غزلوں کے ساتھ یہ ظالمانہ سلوک کر کے اپنی مہارت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

اسے شاعری کہنا زیادتی ہوگا۔ یوں تضمین میں بذات خود کچھ برائی نہیں، اور اردو شعرا نے بعض بڑی عمدہ تضمینیں بھی کی ہیں لیکن حسن کی یہ کوششیں خالصتہً درجہ پست ہیں، انہیں حسن کی شاعری میں کوئی درجہ نہیں دیا جاسکتا۔

(۴)

حسن قصیدہ گو بھی تھے، اب تک ان کے سات قصیدے دریافت ہوچکے ہیں، ایک حضرت علی کی منقبت میں اور باقی دوسرے ممدوحین کی شان میں ہیں۔ سودا کے پرشوکت اسلوب کے زیر اثر حسن نے بڑی پائے کی غزلیں کہی تھیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ قصیدے میں انہوں نے اس انداز سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اور قصیدے کی مروجہ روش سے ہٹ کر اسے مثنوی کے قریب لانے کی کوشش کی ہے ان قصائد کا زمانہ متعین کرنا ممکن نہیں، البتہ اتنا قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جواہر علی، آفرین علی اور آصف الدولہ کی شان میں قصیدے انھوں نے عمر کے آخری ایام ہی میں کہے ہوں گے اس کی داخلی شہادت خود ان کے کلام کی مذکورہ بالا خصوصیت ہے، ان لوگوں کی مدح کا موقع تو ۱۱۹۶ھ کے بعد ہی آسکتا تھا۔ ان قرائن کی بنا پر ہم اسے حسن کے آخری زمانے کا کلام سمجھتے ہیں۔ قصیدے میں مضمون کا تسلسل ہوتا ہے حسن نے اس سے فائدہ اٹھا کر تشبیب میں ابھرنے کی ہمت کی ہے، یہاں ان کا محاکاتی پیرایہ اظہار جوش مارتا ہے، لیکن یہ اشعار کلام حسن کا اعلیٰ نمونہ نہیں ہیں، حسن نے بعض جگہ اپنے حال زار کی تصویر کشی کی ہے، عسرت کا رونا رویا ہے اور شعر کی بے قدری پر بھی آنسو بہائے ہیں، جس سے قصائد کے بعض حصے ان کی مثنوی (سحرالبیان) کی یاد دلاتے ہیں تاہم قدم کی پابندیوں نے حسن کو قصیدے میں زیادہ کھلنے نہیں دیا۔ خصوصاً گریز، مدح اور دعا کے مواقع پر تو قصیدے بالکل چوپٹ ہوکر رہ جاتے ہیں۔

تشبیب کے بعض اچھے ٹکڑے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :-

نظر پڑا ہے اسے کون سا ہلال آبرو
ہوا ہے جوں مہ نوروز ناتواں مہتاب
شب چہار دہم اور ہو سے وسانی
کہ آفتاب ادھر اور ادھر عیاں مہتاب
کون انگڑائیاں لیتا ہے چمن میں مخمور
غنچہ بھر بھر کے گلابی کرے ہے کیوں تقسیم

٭

ہزار طرح کی ہوتی ہے وقت شام خوشی | ہزار طرح کے شربت نئے سو طرح کی دال
وہ ماہتاب کسی فرنی کے خوانچے جس پر | بنائے بار کوئی آنکھیں لے سے کوئی ہلالی
وہ آب خورے اناروں کے اور لیموں کے | وہ کورے کورے دھرے شربتوں کے مالامال
نئی طرح کے وہ پنکھے ہیں اور فانوسے | کہ جن کا حسن شاروں کو ادھر دیوے جمال
وہ کوری کوری دھریں جھجریاں سرہانے اور
وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں وہ سرد آب زلال

(۵)

مثنوی نگاری حسن کے کمال فن کا بیّن ثبوت ہے، یہیں ان کے جذبات نے تازگی و شادابی پائی ہے، کل گیارہ مثنویاں ہیں

(۱) آصف الدولہ کی شادی (۱۱۸۳ھ)
(۲) رموز العارفین (۱۱۸۸ھ)
(۳) دریائے حسن بلی (۱۱۸۹ یا ۱۱۹۰ھ ؟)

۴۔ گلزار ارم (۱۱۹۲ھ) ۵۔ خوانِ نعمت (۱۱۹۹ھ)
۶۔ ہجو قصائی ۷۔ نقل کلاونت
۸۔ نقل زنِ فاحشہ ۹۔ تہنیت عید (۱۱۹۹ھ)
۱۰۔ قصرِ جواہر (۱۱۹۹ھ) ۱۱۔ سحر البیان (۱۱۹۹ھ)

ہجو قصائی، نقل کلاونت، اور نقل زنِ فاحشہ معمولی بیانیہ مثنویاں ہیں جن میں تین کہانیوں یا نقلوں کو مختصر طور پر نظم کر دیا گیا ہے۔ ہجو قصائی ۸ اشعار کی مثنوی ہے جس میں ایک قصاب کی لڑکی کی شادی پر "جائے تنگ و مہمان بسیار" کی حالت ہو جاتی ہے، قصاب اپنی بیوی کو گالیاں دیتا ہے، اس کی زبان "ق" اور "ک" کی جگہ "ج" ادا کرتی ہے، اس میں بات صرف اسی قدر ہے کہ ایک خاص طبقے کی زبان کا نمونہ دکھایا ہے۔ زنِ فاحشہ کا قصہ ۲۵ اشعار میں ہے، دو جوان ایک فاحشہ عورت سے شادی کرتے ہیں، ایک چارپائی پر یک جا سوتے ہیں اور "کا دوگیہ" کے لئے "گوشمالی" کی تجویز ہوتی ہے، "ایک مصروف" ہوتا ہے تو دوسرے کی گوشمالی کر کے اسے دوسری طرف منہ کرکے سونے پر آمادہ کیا جاتا ہے، زنِ فاحشہ ایک تیسرے سے رابطہ قائم کرتی ہے اور وہ دونوں خاوندوں کی گوشمالی کر کے خود اپنا کام نکال لیتا ہے، دونوں خاوندوں پر یہ حقیقت بعد میں روشن ہوتی ہے تو وہ ڈر جاتے ہیں، اور اس عورت کو چھوڑ جاتے ہیں۔ آخر میں سب لوگوں کو ایک اخلاقی نکتہ نکال کر ایسے کاموں سے منع کیا ہے۔ یہ غالباً کسی پر چوٹ ہے، اس میں شہوانی عمل کی تفصیل نہایت بھدی اور مکروہ ہے، سحر البیان کے ایسے مناظر اس کے مقابلے میں نہایت حسین اور لذت آگیں ہیں، اس مثنوی (نقل زنِ فاحشہ) کا مقصد فن کاری نہیں، محض فحاشی ہے، تیسری نقل ۱۸ اشعار کی ایک حکایت ہے جس میں ایک

پھبیٹر کلاونت کا مذاق اڑایا گیا ہے، حسن کی ناکامی یہاں بھی ظاہر ہے۔ حسن کامیاب بذلہ سنج ہوں تو ہوں، اس حکایت میں ان کا مزاح سپاٹ ہو گیا ہے تینوں مثنویاں اسلوب میں اکھڑی اکھڑی اور ابتدائی مشق کی چیزیں ہیں، ان کا کوئی قطعی سنہ مقرر کرنا ممکن نہیں۔

سب سے پہلی مثنوی جس کا سنہ متعین کیا جا سکتا ہے آصف الدولہ کی شادی والی مثنوی ہے (مطبوعہ معیار مارچ ۱۹۳۶ء) مطبوعہ ایڈیشن میں ۹۵ شعر اور مائی کردہ قلم میں ۹۶ شعر ہیں، اس کا آغاز یوں ہوتا ہے ؎

شام کو میں فکر میں بیٹھا تھا کل ... یعنی تھی میرے تئیں فکر غزل
یک بیک ہاتف نے دی آواز یوں ... آج کے دن فکر میں بیٹھا ہے کیوں
گھر سے ٹک باہر نکل اے بے خبر ... چل ذرا قدرت خدا کی سیر کر
فکر و غم ہے آج تو سب سے بعید ... شام میں ظاہر یہاں صبح امید
سن کے یہ مژدہ اٹھا میں یک بیک ... سیر کرتا چل گیا بازار تک

اس کے بعد بازار میں انہوں نے جو کچھ دیکھا اس چہل پہل، رنگ رلیاں، عیش و عشرت کے سین، آتش بازی کے مناظر، روشنی کی چمک دمک، کشتیوں کی جواہر ریزی فانوسوں کی چکاچوند، پھولوں کی اقسام، راگ رنگ حسن بیان کرتے نہیں تھکتے۔ ان مناظر کی تصویر کشی میں حسن کا محاکاتی ذوق لذت حاصل کرتا ہے، روشنی ان کے لئے روحانی کیف بن جاتی ہے۔ شجاع الدولہ کا فیض آباد حسن کی شاعری کا مرکز ہے، اس لئے شجاع الدولہ کی تعریف بھی آخر میں آ گئی ہے اس کے عدل و انصاف سخاوت، شجاعت وغیرہ کا بیان، پھر آصف الدولہ کے لئے دعا اور آخر میں اپنی دبی ہوئی خواہش کا اظہار کے پردے میں اظہار ؎

زر کی کچھ اس سے نہیں مجھ کو طرف ؛ گر قبول افتد ہے عز و شرف

مثنوی کا یہ آخری حصّہ بغیر دلچسپ ہے، اس لئے اچھا نہیں، باقی مثنوی ان تمام عناصر کی نمائندگی کرتی ہے جو حسن کی اعلیٰ پایہ کی شاعری کا حصّہ ہیں:

دیکھتا کیا ہوں کہ بے حد و قیاس — روشنی کا ٹھاٹھ ہے دریا کے پاس....
تھا شعاعِ روشنی کا بس وفور — شام سے لے صبح تک تھا وقتِ نور....
روشنی کچھ اک نہ تھی اس جا عیاں — اس میں آتش بازی کا بھی تھا سماں
اک چراغاں کا نہ تھا تنہا ظہور — موج زن ریتی میں تھا دریائے نور
کاسۂ مہتاب تھا اس کا حباب — نور سے لبریز مثلِ آفتاب
حلقۂ دودِ چراغاں تھے بھنور — لہر گوٹے کی سی اس میں سر بسر.....
بیچ میں جب اس کے چھٹتے تھے انار — نور کی سی نہر تھی فوارہ دار
ہاتھی آتش بازیوں کے چھٹتے جب — نورِ کوہِ طور تھا نظروں میں تب...
متصل چھٹتی تھی از بس پھلجھڑی — نور کی بارش کی تھی گویا جھڑی....
تو کہے دریا میں تھا کوہِ طلا — یا کہ بادل تھا سنہری شام کا....

ساچق کا منظر بھی اسی طرح حسین و دلکش ہے:-

کشتیاں یوں تھیں ہوا پر کی رواں — جس طرح دریا میں تیریں کشتیاں
سبز فانوسوں کی اس میں یوں جھلک — جس طرح پانی پہ سبزے کی لہک....
مشعلوں کے ہر طرف روشن تھے جھاڑ — تو کہے وہ تھے تجلی کے پہاڑ

حسن مجمع کے چابک دست نقاش ہیں، آصف الدولہ کی شادی کی روشنی، ساچق کے سامان، کشتیوں اور دریا کا منظر، گلشن کے نظارے، موسیقی، یہاں میر حسن اپنے آپ میں آتے ہیں، وہ رنگا رنگ مناظر میں کھو جاتے ہیں لیکن اس [illegible] مثنوی میں میر حسن ابھی پوری طرح غزل کے اثر سے نکلے نہیں، منظر کی جگہ اس کا ذکر اور تعمیم عقلی ... ... کرنے کی کوشش کرتے ہیں

ایک مصرع میں حسن چمکتے ہیں اور دوسرے مصرع ماند پڑ جاتے ہیں۔ اس طرح
چھلجھڑی چھوٹتی رہتی ہے کہ اشیا کی تفصیل پیش کرتے وقت البتہ یہ تعمیم ان کا پیچھا
چھوڑ دیتی ہے۔ تعمیم کی مثالیں ملاحظہ ہوں :-

نیچے اوپر جلتے تھے جوں جوں چراغ — تھا عدو کو داغ ہم بالائے داغ
دود اس کا ہوتا تھا جوں جوں بلند — آتش حسرت پہ تھا دشمن سپند
کیا بیاں اس کا کروں میں سربسر — طوطیٔ تقریر کے جلتے ہیں پر ....
دیکھ روشن اس میں کاغذ کے کنول — جل گئے غیرت سے پانی میں کنول
جنبش ہر شعلۂ شمع چراغ — موج دریا کے تپش کرتی ہے داغ ....

ہر منظر پر یہ عقلی تبصرہ اشعار کے انفرادی حسن کو چمکاتا ہے لیکن تسلسل میں
میں نقص ڈالتا ہے اور مثنوی کی مجموعی تاثر کو خراب کرتا ہے، اس مثنوی میں
ہم اس خامی سے بار بار دوچار ہوتے ہیں۔

دوسری طویل مثنوی رموز العارفین (۱۱۸۸ھ) کی تحریر کے وقت میر حسن
تصوف اور اخلاق کی گرفت میں زیادہ آگئے تھے، اور مولانا روم کی مثنوی کا
مطالعہ کرنے لگے تھے، اخلاقی طرز کی کہانیاں اور ان میں سے ہر ایک کے آخر میں
نکات کا استنباط، حسن اس طریقے کو پسند کرنے لگے۔ مصرعوں کی در و بست
پر بھی رومی کا رنگ چھایا ہوا ہے، حسن کا بیباکی مزاج ایک کھلنڈرے لڑکے کی طرح
مختلف اسالیب سے کھیلتا ہوا اس زمانے میں بہت دور نکل گیا ہے، انفرادیت
دب جاتی ہے اور اساتذہ قدیم کا دیو سفید حسن سے نبرد آزما ہوچکا ہے۔ رموز العارفین
ان صوفیانہ عقائد و خیالات کی داستان ہے جو حسن کے گھر میں تھے، لیکن حسن کی
اپنی طبیعت سے بہت دور تھے۔ دنیا دار کا سوال فقیر کا جواب، حکایت برسبیل
تمثیل، ابراہیم ادہمؒ کا سلطنت چھوڑنا، کسی کا مال ڈوبنے کا سبب پوچھنا،

ابراہیم ادہمؒ کا جواب، پیرزن کی حکایت، ہرنوں کا پانی پینا، ابراہیم پر خوانِ نعمت کا نزول، فریدالدین عطار کا درویشی اختیار کرنا، اکبر اور ملک محمد جائسی کا قصہ، حضرت جنید بغدادی، طالوت و جالوت، ابوالحسن نوری، بایزید بسطامی، میر حسن ان حکایات کو بیان کرتے ہیں، ان سے نتائج اخذ کرتے ہیں، لیکن مولانا روم کا ہیولا ان کا تعاقب کرکے ان کے تاثرات کا گلا دبا دیتا ہے اس مثنوی سے آخرت سنور گئی ہو گی، لیکن دنیا کا حال کچھ بہتر نہ ہوا۔
رموز العارفین (اس شہرت کے باوجود جو اسے تصنیف کے فوراً بعد حاصل ہو گئی تھی) حسن کی شاعری کی تاریخ کوئی بلند مقام نہیں رکھتی۔

اس تحفہ کرکے بعد میر حسن راہ پر آ گئے۔ اپنی حویلی کی ہجو میں انھوں نے ایک مثنوی لکھی۔ میر انیس کے سوانح نگار لکھتے ہیں، ان کے خاندان کا فیض آباد میں اپنا مکان تھا، حسن نے دو روپے کرایے پر یہ مکان غالباً لکھنؤ میں لیا ہو گا۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ مثنوی ۱۱۸۹ھ یا ۱۱۹۰ھ میں لکھی گئی ہو، جبکہ حسن لکھنؤ چلے آئے تھے، اس مثنوی کے ۸۴ اشعار ہیں۔ حسن نے اس میں مکان کی حالت زار کا نقشہ کھینچا ہے۔ عمارت کے ہر حصے کی تفصیل، اس کے استعمال کی کیفیت جگہ کی تنگی، خستگی، ضروریات زندگی کی عدم کفالت، حفظانِ صحت کے اصولوں کی عدم گنجائش، ہلکے پھلکے انداز میں ان سب کی مذمت کی ہے۔ حسن اپنے پر ہنس نہیں سکے، نتیجہ یہ ہے کہ مثنوی کی فضا میں ایک سراسیمگی کی کیفیت اور نوحے کا انداز پیدا ہو گیا۔ اپنے آپ پر ہنسنا بڑے دل گردے کا کام ہے اور حسن میں یہ ہمت نہ تھی۔ اس لیے ان کی مثنوی میں گہرائی پیدا نہیں ہو سکی۔ مثنوی حسین ہے لیکن اس میں ہر بار پڑھنے میں قاری کسی نئی معنویت سے دوچار نہیں ہوتا۔ لفظوں کی نئی نئی دنیائیں نہیں ہیں۔ ہر ورق ایک کھلی کتاب ہے کہ ایک بار پڑھ کر

سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے اور پھر اس سے آگے کچھ نہیں رہتا، لیکن شگون اچھا ہے۔ حسن تصوف کے پیچاک سے نکل آئے اور اعلیٰ درجے کی شاعری کرنے کے قابل ہوتے چلے گئے۔

گلزار ارم آصف الدولہ کی شادی والی مثنوی کے بعد اہم مثنوی ہے ۱۱۹۲ھ اس مثنوی کی فارم پر فارسی اثرات ہیں، فارسی زبان کے شعرا نے شہروں کی مذمت کے لئے ایک خاص صنف "کارنامہ" وضع کی تھی، سنائی کا کارنامہ بلخ اس کی عمدہ مثال ہے، اپنے شہر کی تعریف، دوسرے کے شہر کی مذمت۔ حسن نے بھی یہ کام کیا ہے زندگان کے رعب میں آکر نہیں اپنے جذبات کی تسکین کے لئے حسن نے یہ مثنوی لکھی، یہ ان کی غریب الدیاری کی پر سوز داستان ہے۔ دلی جیسے شہر سے نکل کر دشت پیمائی، محبوبہ سے جدائی، سفر کی تکالیف، چھڑیوں کے میلے کی تصویر کشی، چھوٹے چھوٹے پر لطف مناظر کی عکاسی، اس دھوم دھام میں ان کے دوست کا معاشقہ اور حسن کے اپنے غم پر ایک نئی ضرب، مکن پور سے روانگی، لکھنو کی آمد، اس کے اجاڑپن کی تفصیل، بدنمائی کا کامیاب اظہار، فیض آباد کی روانگی وہاں کی رونق۔ میلے ٹھیلے، ترپولیہ کی تمازگی، بازاروں کی چہل پہل، افراد کی ریل پیل، حسن کی فراوانی، دکانداروں کی صدائیں، ان کے اطوار و احوال، لال باغ کی خوبی اور رنگا رنگ بزم آرائی، حسینوں کے پرے، نازنینوں کے قافلے طوائفوں کے مجرے، لباس زرق برق، گہنے حسین و دلکش، لہلہاتے ہوئے دوپٹے، سرکتے آنچل، مچلتے ہوئے جذبات، معشوقانہ ادائیں، عشوہ طرازیاں فتنہ سامانیاں، رمنے کی کیفیت، میاں اسرار کی درگاہ کا احترام، آصف الدولہ کی تعریف، یہ مثنوی ان پھولوں کا گلدستہ ہے، سحرالبیان کے مناظر ذرا چھوٹے پیمانے پر یہاں درج ہیں۔ محاکات کا حسن اور جذبات کی درخشانی، گلزار ارم

میں جنت نگاہ بن جاتی ہے، حسن اپنے عظیم کارنامے کر تجربوں کی پٹاری کھول رہے ہیں، رنگ رنگ کی چیزیں، طرح طرح کے جاذبِ نظر سامان ہیں کہیں نظر نہیں ٹکتی ؎

کوئی پردے میں ہنستی چہرہ دکھاتی — کوئی آواز کچھ گا کر سناتی
کوئی چلتی ادھر اٹکھیلیوں سے — کوئی بیٹھی ہے جی لیتی دلوں سے
جہاں ملتا نہیں پانی کا منبع — وہاں ہوتا پری زادوں کا مجمع
کوئی آنچل سے اپنا منہ چھپاتی — کوئی پردہ اٹھاتی اور گراتی
ادھر کو جوہری ادھر کو بزاز — ادھر صراف اور ادھر طلا ساز
کناری اور گوٹے وال مسلسل — نثار برق کرتے ہیں جھلا جھل
کہیں تربوز اور خربوزوں کے انبار — کھڑی ہیں مالنیں لے کر کہیں ہار
صدا کرتا ہے کوئی ہاتھ اٹھا کے — معطر پھول ہیں جی موہنیا کے
کوئی "مصری کے گنے" کہہ پکارے — کوئی کہتا ہے میٹھے ہیں کتارے
زر و زیور سے ہیں آراستہ سب — کئے شمشاد حسن کی دیکھ کر چھب
کوئی پہنے کناری اور مسلسل — لباس شبنم و کمخواب و مخمل
تکلف سے کوئی پوشاک پہنے — جڑاؤ سر سے پا تک جس کے گہنے
وہ زنگار رنگ ہرا ہی کی پشواز — کناری کے وہ بند ان کے بس انداز
جو دیکھا تو کوئی اوڑھے دوشالا — بناتی ہے کھڑی چمپا کی مالا
کوئی بالے ہیں لے کر گل بھرے ہے — کوئی پھول اپنی انگیا میں دھرے ہے
رکھے ہے کان پر کوئی گلوں کو — شگفتہ دل کرے ہے بلبلوں کو
کوئی پھرتی ہے دامن اپنا گرداں — اکڑ کر کوئی دکھلاتی ہے آن
کوئی لاسے کی پینی توڑتی ہے — کھڑی کوئی پٹاخہ چھوڑتی ہے

حسن کی قوتِ مشاہدہ خس و خاشاک کو سونا بنا جاتی ہے۔ وہ روایات کو اپناتے ہیں اور بعض اوقات انہیں توڑ پھوڑ کر اپنے جذبات کی تعمیر بھی کر لیتے ہیں روایت یہاں تاپا تیار سہارا نہیں۔ دوسرے کے خیالات کو یہاں کھونٹے سے نہیں باندھا گیا۔ روایت تخیلی تجربے کا حصہ بن گئی ہے محض آرائش و زیبائش کی چیز نہیں، اب حسن کے لئے داستان تھا تمام بادل چھٹ چکے تھے۔ حسن نے اپنے آپ کو پا لیا تھا۔

سحرالبیان کے متصل، مثنوی تہنیتِ عید، اور قصرِ جواہر لکھی جاتی ہیں، ان میں بھی مناظر کا وہی جمال اور جذبات کی جوالا لکھی ہے۔ جواہر علی خاں کا محل ارضی نہیں رہتا۔ سماوی چیز بن جاتا ہے جس میں انسان نہیں فرشتے رہتے ہیں، جس کی تعمیر انسانوں نے نہیں الف لیلا کے جنوں اور پریوں نے کی ہے، تہنیت عید۔ میں میر حسن کی خاقہ مستی نور و سرور کے بہشت بناتی ہے۔ عید کے شادیانے، احباب کے جمگھٹے، برسات کی بہاریں، نور و نکہت کی آمیزش فضا کو لطیف و نظیف بنا دیتی ہے، غالباً اسی زمانے میں مثنوی "خوانِ نعمت" بھی لکھی گئی ہے یہ آصف الدولہ کے باورچی خانے کی روداد ہے، غالباً فرمائش کی چیز ہوگی، اسی لئے ہوٹل کا مینو معلوم ہوتی ہے۔ ان سب سے زیادہ اہم اور بڑا کارنامہ سحرالبیان کی تصنیف ہے، یہ نگار خانۂ چین ہماری دنیا کا نہیں کسی اور دنیا کا منظر پیش کرتا ہے ؎

نہیں مثنوی ہے یہ اک پھلجڑی
مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی

باب نہم

سحرالبیان

(۱)

ماحول کی خرابی یہ ہے کہ وہ نجم النساء کو تو جوگن بنا دیتا ہے لیکن میر حسن کو تارکِ دُنیا نہیں بناتا۔ ادیبوں کو شہروں میں بساتا ہے موئنٹ ایورسٹ پر نہیں بٹھاتا۔ اس لئے ہم آپ مجبور ہیں، چاہے نیند سے نڈھال ہو رہے ہوں۔ کہانیاں سُنتے رہیں اور فارسٹر کی طرح شہرزاد کی باتوں میں آکر اب کیا ہوگا؟ پھر کیا ہوگا؟ کہتے کہتے اپنے آپ کو شہریار فرض کر کے ایسی گدگدی محسوس کریں جو دوستوں کی محفل میں تو "موہنی منتر" اور نگارخانۂ چین ہے لیکن بازار میں پہنچ کر بقولِ انشا صرف سانڈے کا تیل ہے۔

پُرعظمت علیحدگی ابوالہول کا حصّہ ہے۔ میر حسن کو اس نعمت سے کچھ نہیں ملا اس لئے سحرالبیان کے بکھرے ہوئے اجزاء آپ کو کئی جگہ مل جائیں گے۔ الف لیلیٰ اور فضائل علی خان بے قید کی مثنوی کا نام اکثر لیا جاتا ہے۔ اسی فہرست میں نعمت خان عالی کی "وقائع حسن و عشق" اور نظامی کے سکندر نامے کو بھی شامل کر لیجئے اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ سارے کا سارا پلاٹ میر حسن کی نانی کا "بنا بنایا ہوا ہو"۔ نانی چاہے آپ کی ہو یا میر حسن کی قابلِ احترام ہے۔ کیونکہ وہ اچھی اچھی کہانیاں سُناتی ہے۔ پریوں کی جنوں کی شہزادوں کی شہزادیوں کی اور جانے کس کس کی۔ لیکن نانی ایک بات ہمیشہ چھپا جاتی ہے۔ اور وہ ہے موہنی منتر وہ ہے سید انشا اور یہاں سے میر حسن کا فنی کمال شروع ہوتا

ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ میر حسن سحر البیان لکھتے لکھتے وقائع نعمت خاں اور حسن و عشق یا سکندر نامہ لکھنے لگ گئے۔ انہوں نے دوسرے ادب پاروں کا اثر جذب کیا ہے اور اپنے ماحول سے نئی بصیرت حاصل کرکے سحر البیان کو زندگی عطا کی ہے۔

اس کا پلاٹ کچھ ایسا نیا نہیں۔ صرف ترتیب اور اثر نیا ہے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ بہت کچھ الف لیلیٰ اور قصائل علی خاں بے قید کے خوان کرم سے لیا گیا ہے۔ حالانکہ کل کا گھوڑا الف لیلیٰ میں بھی مستعار ہے۔ بے قید کی مثنوی نہ مل سکی تذکرۂ مسرت افزا اور تذکرۂ میر حسن میں اس کے جو اشعار ملتے ہیں اُن میں مناسبت ہجر کے لفظ سے آگے نہیں بڑھتی۔ بادشاہ کا بے اولاد ہونا۔ نجومی کا بشارت دینا۔ اولادِ نرینہ کا ہونا۔ پری کا اُٹھا کر لے جانا۔ شہزادے کا شہزادی سے عشق۔ دونوں میں جدائی اور آخر کار مل جانا۔ یہ سب کچھ مختلف قصے کہانیوں میں کے اجزا تو ہیں اور ان کی تلاش و جستجو فارسی اور اردو کی داستانوں میں یقیناً بے سود نہ ہوگی، کیونکہ کہانیاں از منۂ قدیم میں اجتماعی سوجھ بچار کا نتیجہ ہی تو ہوتی رہی ہیں۔

پلاٹ سے ہٹ کر اگر تکنیک کا جائزہ لیا جائے تو عالی اور نظامی گنجوی کا اثر خاصا نمایاں ہے۔ عالی کی 'حسن و عشق' اور 'وقائع نعمت خاں' میں واقعات کے گرد چوکھٹے لگائے گئے ہیں اور چوکھٹے لگانے کی یہ رسم نظامی گنجوی سے شروع ہوئی۔ مختلف حصوں کے گرد فریم لگانا دونوں کا محبوب شغل ہے۔ نظامی کے ہاں یہ عموماً یہ فریم چھوٹے چھوٹے ساقی ناموں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں لیکن عالی کے ہاں 'حسن و عشق' میں صنعتِ براعتِ استہلال اور 'وقائع نعمت خاں' میں اسکول کے بچوں کے کورس سے یہی کام لیا گیا ہے۔ میر حسن نے براعتِ استہلال اور ساقی ناموں سے سحر البیان کے فلم میں چھوٹے چھوٹے شاٹ لگا کر ہئیت کو خاص

(Typical) بنا دیا ہے[1]

تکنیک کے ساتھ ساتھ نظامی کا اثر اسلوب کے تتبع میں بھی ہوا ہے۔ مثلاً

گیا مژدۂ صبح سے ماہتاب   اُٹھا سورج آنکھوں کو ملتا شتاب

(سحرالبیان مرتبہ آسی ص ۳۴)

لیا ماہ نے اپنے منہ پر نقاب   اُٹھا بستر خواب سے آفتاب

(ص ۱۱۷)

شراب و کباب و بہار و نگار   جوانی و مستی و بوس و کنار

(سحرالبیان مرتبہ آسی ص ۹۴)

خوشی کا جو عالم تھا ماتم ہوا   نسب نامۂ دولت کیقباد

ورق کا ورق ہی وہ برہم ہوا   ورق بر ورق ہر سوئی برد باد

(سحرالبیان ص ۸۵)   (نظامی)

— کہ اے شاہِ شاہاں والے فخرِ جم

فریدوں مثال و سکندر نژاد

مرادِ جہان و جہاں را مراد

(سحرالبیان ص ۱۱۹)

---

[1] نظامی کا اثر مثنوی کے ابتدائی حصے میں آغاز داستان سے قبل تو اور بھی زیادہ ہے یہ سحرالبیان کا سب سے زیادہ بے جان حصہ ہے جس میں جذبات کی بجائے محض اینٹ پتھر جمع کر دیئے گئے ہیں۔

سحرالبیان پر فردوسی کے شاہنامے کا اثر بھی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے رسالہ مشرب، تاریخ ادب اردو نمبر ۱۹۵۶ء مقالہ بعنوان مثنوی سحرالبیان (پروفیسر خان رشید) ص ۱۱۸

آخری مصرعے میں لفظوں کی تکرار سے جذبات کی لہر کو جو خفیف سا ہلکا دیا ہے۔ وہ نظامی سے خاص ہے۔ لیکن حسن نے بھی اس سے کم کام نہیں لیا۔ بعض جگہ اسی عمل سے تاثر کو گہرا کرنے میں بڑی مدد لی ہے۔[1]

(۲)

حالی کے ہاں ایک اور رجحان بھی کارفرما ہے۔ تدریسی رجحان فارسی ادب میں اورنگ زیبی عہد کی یادگار ہے۔ اسی کے زیرِ اثر ہر ادیب کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کسی فن کا چلتے چلتے اگر ذکر آ گیا ہے تو تلازمے یا سلیقے سے طور پر اس کی تمام اصطلاحات کو یکجا کر کے طلبا کے افادے کا اہتمام کیا جائے۔ میر حسن کے ہاں بھی کہانی کا قالب (structure) اسی طرح پھیلتا اور بڑھتا ہے۔ حسن و عشق میں بیاہ شادی کی تمام رسومات اور اصطلاحات کا احاطہ ہے تو سحر البیان میں دربار۔ دربارداری۔ موسیقی۔ تدریس شادی کی رسوم غرض کہ ایک دنیا آباد ہے۔ جس میں ہر فن کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔

---

[1] تاثر کی گہرائی کے لئے میر حسن نے ایک اور ہتھیار بھی استعمال کیا ہے۔ وہ بعض باتوں اور چیزوں کا ایک ہی سانس میں ذکر کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک شے یا ایک بات کی تخصیص کر کے تاثر کو زیادہ مجتمع اور زیادہ پائدار بنا دیتے ہیں۔ مثلاً شہزادے کے سوتے وقت:

جہاں تک کہ چوکی کے تھے باری دار　　ہوا جو چلی سو گئے ایک بار
غرض سب کو واں عالمِ خواب تھا　　مگر جاگتا ایک مہتاب تھا (ص ۲۴)

یا پھر بے نظیر کے والدین کی حالت:

گلوں کی طرح کھل رہے تھے جو دل　　سو وہ سب خزاں سے ہوئے مضمحل
خزاں کا الم دل ہیں جو آ گڑا　　جگر برگِ گل کی طرح جھڑ پڑا
نہ غنچہ نہ گل نے گلستاں رہا!　　فقط دل میں اک خارِ ہجراں رہا

بظاہر یہ لفظ "ایک" کی شعبدہ بازی معلوم ہوتی ہے لیکن ان اشعار کو مثنوی کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھئے تو جذبات کی تندی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

لیکن یہ تدریسی کوشش کہانی پر سوار نہیں ہو گئی بلکہ مناظر کا ضروری حصّہ بن کر آئی ہے۔ صرف ایک جگہ زائد معلوم ہوتی ہے، جہاں کل کے گھوڑے کے ذکر میں گھوڑوں کی اقسام بیان کی گئی ہیں۔ اور ہر جگہ اظہار مناسب اور برمحل ہے۔[1]

(۳)

داستان کا آغاز اس طرح پر ہے کہ کسی شہر میں کوئی بادشاہ تھا، منصف، رعایا کا خیر خواہ، ملک اس کا آباد اور رعیت خوشحال تھی۔ اُسے دنیا کی سب نعمتیں میسر تھیں سوائے اولاد کے۔ آخر اس نے ترکِ دنیا کا ارادہ کیا۔ لیکن وزیر نے اُسے منع کیا۔ اور نجومیوں اور رمّالوں کو بلوایا۔ جنہوں نے اطلاع دی کہ شاہ کے گھر ایک بیٹا ہوگا۔ لیکن بارہ سال تک اس کی حفاظت کی جائے، کیونکہ اس عمر تک

---

[1] سحر البیان پر جو اعتراضات کئے جاتے رہے ہیں ان میں معرکۂ چکبست میں یہ اعتراض اہم ہے کہ "(گلزارِ نسیم میں) اختصار ... ہے۔ مثنوی کا عجیب جوہر یہ ہے واقعی دریا کو کوزے میں بند کیا ... میر حسن کی مثنوی میں معاملہ برعکس ہے اس میں ہر مضمون کو ضرورت سے زیادہ طول دیا ہے اور یہی اس مثنوی کا بڑا عیب ہے" (معرکۂ چکبست و شرر صفحہ ۳۴، ۳۵) لیکن یہ اعتراض درست نہیں شاعری میں منطقی اختصار ڈھونڈھنا فن سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ شاعری میں جذباتی اختصار کی ضرورت ہوتی ہے اور اس حیثیت سے سحر البیان لاجواب ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے ایک اور طرح اس کا جواب دیا تھا "میر حسن پر زیادہ سے زیادہ یہ الزام لگایا جائے گا کہ انہوں نے مثنوی نگاری اور قصہ نگاری کے ایک خاص طریقے کو ضرورت سے زیادہ استعمال کیا ہے لیکن نسیم نے دوسرے غلط طریقے سے کام لیا ہے۔ مختصر نگاری مثنوی کے شایانِ شان نہیں خاص کر ایسی مثنوی جس کا موضوع کوئی قصہ ہو اختصار کی کبھی بھی متحمل نہیں ہو سکتی"۔ (افسانہ صفحہ ۸۱)

اُسے بلندی سے خطرہ ہے۔ بیٹا ہوا اسا بے نظیر نام رکھا گیا۔ بڑی رنگ رلیاں ہوئیں بارہ ۱۲ برس تک حفاظت کی گئی۔ محل کے اندر ہی تعلیم و تربیت مکمل ہوئی اور بالآخر اسے منظرِ عام پر لایا گیا۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا وہ دن بارھویں سال کا تھا۔ رات کو شہزادے نے چھت پر سونے کی خواہش کی۔ وہ سویا۔ نیند میں مگن۔ پہرے دار بھی غافل ہوکر سو گئے۔ قضارا ایک پری کا ادھر سے گذر ہوا اور وہ عاشق ہو کر اُسے اُٹھا لے گئی۔ جب محافظوں کو معلوم ہوا تو بڑی تلاش ہوئی لیکن بے سود۔ بادشاہ اور ملکہ رو رو کر ہلکان ہوتے تھے۔ پری بے نظیر کو پرستان میں لے گئی اور ایک خوبصورت بنگلے میں رکھا۔ شاہزادہ بے نظیر ماں باپ سے بچھڑ کر بہت پریشان ہوا۔ اگرچہ پری جو اس پر عاشق تھی اس کی خاطر مدارت کرتی لیکن اس کا دل نہ لگتا اور وہ اکثر روتا رہتا۔ اُسے خوش کرنے کو پری نے اُسے کل کا گھوڑا دیا کہ اس پر سوار ہو کر شام کو دنیا کی سیر کر آیا کرے۔ آخر ایک چاند کی رات میں بے نظیر کا گزر ایک محل سے ہوا وہ وہاں اترا اور باغ میں شہزادی بدرِ منیر کو اپنی ہمجولیوں سے سیر کرتے دیکھا۔ بے نظیر درختوں میں چھپا ہوا تھا۔ بدرِ منیر درختوں کے قریب گئی اور شہزادے کو دیکھ کر پہلی ہی نظر میں اس پر عاشق ہو گئی۔ دونوں فرطِ شوق سے بے ہوش ہو گئے۔ دخترِ وزیر نجم النساء پاس تھی اس نے عطرِ گلاب چھڑکا اور دونوں ہوش میں آئے۔ اب ناز و انداز کا آغاز ہوا۔ شرم اور عشق میں کشمکش شروع ہوئی اور بدرِ منیر وہاں سے سرکی۔ نجم النساء اور بدرِ منیر میں چھیڑ چھاڑ چلی۔ نجم النساء شاہزادے کو لائی اور بدرِ منیر کے سامنے بٹھایا۔ شراب کا دور چلا۔ آپس میں بے تکلفی ہوئی اور دونوں نے اپنا اپنا حال کہہ سنایا۔

اگلی رات پھر ملاقات ہوئی۔ شہزادی خوب سج کر آئی۔ وصل ہوا۔ لیکن ماہ رخ کو اطلاع ہو گئی۔ جب شہزادہ واپس آیا تو ماہ رخ نے ناراض ہو کر اُسے اندھے

کنوئیں میں ڈال دیا۔ اُدھر ہجر میں بدرِ منیر کا بُرا حال ہوا۔ کسی طرح کل نہ پڑتی تھی۔ دل میں وسوسے پیدا ہوئے کہ کہیں ماہ رُخ نے اُسے قید میں نہ ڈال دیا ہو۔ خواب میں بدرِ منیر کو اس کا علم ہو گیا۔ اب اُس کی حالت اور بھی غیر ہوئی۔ نجم النساء جوگن بن کر بے نظیر کو رہائی دلانے کے لیئے نکلی۔ جنوں کا بادشاہ فیروز شاہ نجم النساء پر عاشق ہوا اور اُسے جنگل سے اٹھا کر پرستان میں لے گیا۔ وہ اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ شرط یہ ٹھہری کہ فیروز بے نظیر کو آزاد کرائے تو ایسا ہو سکتا ہے فیروز شاہ کے ماہ رخ کو دھمکی دینے پر بے نظیر کو آزادی مل جاتی ہے۔ رہائی پا کر نجم النساء، فیروز شاہ اور بے نظیر بدرِ منیر کے پاس آتے ہیں۔ چوری کی ملاقاتیں۔ غیروں کا ڈر۔ بے نظیر بدرِ منیر کے باپ کو لکھتا ہے کہ میں ملک شاہ کا بیٹا ہوں میری بات مانو اور بدرِ منیر کی شادی مجھ سے کر دو ورنہ لڑائی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ مسعود شاہ شادی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ شادی کے بعد فیروز شاہ اور نجم النساء رخصت ہوتے ہیں اور بے نظیر اور بدرِ منیر بھی بے نظیر کے ملک میں جاتے ہیں اور ناامید ماں باپ بیٹے کی آمد سے شاد ہوتے ہیں۔

(۴)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہانی کے اجزاء کی ترتیب بڑی محنت سے کی گئی ہے کیونکہ کئی جگہ شعوری کوشش نے واقعات کا ربط گہرا دیا ہے۔[۱] نجومیوں

۱۔ پلاٹ میں fantasy کے سبب دو جگہ احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا جا سکا۔ ایک تو وہ مقام جس کا ذکر مجنوں گورکھپوری اپنی کتاب تنقیدی حاشیے میں کیا ہے اور دوسرے وہ مقام جب ابھی بے نظیر اپنے ماں باپ کے پاس نہیں پہنچا اور بدرِ منیر سے بیاہ رچاتا ہے وہاں شادی کے ضمن میں عہدِ حضور کا ملنا بیان کیا ہے جس کا موقع نہ تھا۔
پلاٹ کے اس پہلو کے مختلف تجزیے کے لئے دیکھئے کاشف الحقائق (طبع ثانی) سنہ ۱۹۵۷ء جلد دوم ص ۲۴۰ تا ص ۲۹ جہاں فطرت نگاری کے اصولوں پر مثنوی کو جانچا گیا ہے۔

کا اظہارِ خیال اس لئے اہم ہے کہ پڑھنے والا کچھ نہ کچھ پہلے سے خیال کر لیتا ہے۔ کہ آگے جاکر کوئی اہم بات ضرور آئے گی اور بے نظیر آفتوں سے دوچار ہوگا۔ موقع فوراً پیدا ہو جاتا ہے جب بادشاہ اپنے حساب سے بے نظیر کو بارہ سال کا خیال کرتا ہے حالانکہ وہ ایک دن چھوٹا ہوتا ہے۔ اس ذرا سی لغزش سے کہانی پہلی اہم پیچیدگی اختیار کرتی ہے۔ اس کے بعد دوسری پیچیدگی کا ذریعہ کل کا گھوڑا اور بدرِ منیر کا عشق اور بے نظیر کا غم و اندوہ ہیں۔ آخری مرحلہ وہ ہے۔ جہاں بے نظیر کو قید کر دیا جاتا ہے اور بدرِ منیر میں ایک زبردست جذباتی ردِعمل شروع ہو جاتا ہے۔ بعد کا حصّہ انہیں ابتدائی پیچیدگیوں کا سلجھاؤ ہے ایک ایک تار پہلے واقعات میں الجھا یا جاتا ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ قصے کو سلجھایا جاتا ہے۔ قاری اسی انتظار میں رہتا ہے کہ دیکھئے آگے چل کے کیا ہو۔ اور مختلف کردار کیا کیا خدمت انجام دیں۔ اسی پر میر حسن کی چابکدستی کا مدار ہے۔ اور عمل (Action) کو آخر تک نبھا یا جاتا ہے۔ قصے پن کے علاوہ کردار نگاری بھی سحرالبیان میں موجود ہے۔ اور میر حسن کا تجزیہ بے نظیر، بدرِ منیر، ماہ رخ اور نجم النساء کو زندۂ جاوید کردار بنا دیتا ہے۔ قصے کی تعمیر میں احتیاط کے اثرات چھوٹی چھوٹی تفاصیل میں بھی ملتے ہیں جزئیات میں احتیاطِ نظر کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میر حسن نے اس کی نوک پلک سنوارنے میں بہت وقت صرف کیا ہے۔

نکلیں عمر کی اس کہانی میں صرف	تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف
جوانی میں جب ہو گیا ہوں میں پیر	تب ایسے ہوئے ہیں سخن دلپذیر

ہر اک بات پر دل کو میں خوں کیا
تب اس طرح رنگیں یہ مضموں کیا

ہر اِک بات پر دل کو خون کر کے میر حسنؔ نے اس مثنوی کو تیار کیا ہے۔ جزئیات پر یہ محنت، پلاٹ کی حسنِ ترتیب اور جذبات کے بھرپور اظہار پر منتج ہوتی ہے۔

ایسے مواقع بار بار آتے ہیں مثلاً ناچ رنگ کی محفلیں اور بیاہ شادی کے مناظر لیکن ہر جگہ میر حسن نے احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے اور تکرار سے اجتناب کیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی تفصیلات میں دلچسپی کو برقرار رکھنے کا اہتمام زیادہ ہے۔ کسی شہر میں کوئی بادشاہ تھا۔ حالانکہ میر حسن جانتے ہیں کہ یہ کوئی بادشاہ ملک شاہ ہے۔ لیکن قاری کو چوکس رکھنے کے لئے ایسے (Trick) ضروری ہیں یعنی صنعتِ براعتِ استہلال سے بھی یہی کام لیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ دلچسپی کا سامان کچھ تو مافوق الفطرت مظاہر سے، کچھ کردار نگاری، ہیجان انگیزی اور نیز شہوانی جذبات کی وجہ سے ہے۔ لیکن احتیاط ہر جگہ کارفرما ہے۔ اور پلاٹ کی تعمیر و ترتیب میں اس کی بڑی انوکھی مثالیں ملتی ہیں۔

دو تین واقعات کو لیجئے :۔

بدر منیر بے نظیر کے عشق میں تڑپ رہی ہے۔ لشبِ وصال کے بعد آئینہ دیکھنے کا موقع بھی نکل گیا ہے۔ اسے بے نظیر نے خود بتایا تھا کہ وہ پری کی قید میں ہے۔ اب خیال ہوتا ہے ضرور پری نے قید کر رکھا ہوگا۔ دو تین راتوں سے بے نظیر روپوش ہے۔ بے تابی نے زندگی بے کیف کر دی ہے۔ پیہم بے قراری اور ہر گھڑی کی آہ و زاری نے عشق کے درد دل کو عام کر دیا ہے۔ (دورے اسے شاید جنسی تشنگی کی وجہ سے پہلے بھی پڑتے تھے) اب اسے میر حسن کی چابکدستی کہیئے کہ بدر منیر کے زود حس (Super sensitive)

ہونے سے خواب میں اُسے بے نظیر دکھائی دیتا ہے۔

بظاہر یہ (Telepathy) دُور اندیشی ہے۔ لیکن میر حسن پڑھنے والے کے ذہن کو ایک غیر فطری دھکا دینے کے قائل نظر نہیں آتے۔ وہ تو پرستان کی پریوں کو بھی عام انسانی کردار بنا کر پیش کرتے ہیں اُن میں اور ہم میں فرق صرف اس قدر ہے کہ پریاں اُڑ سکتی ہیں اور ہم صرف اُڑنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ میر حسن تو بیداری کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ جس میں ہر خواہش کی فوری تکمیل مقصود ہوتی ہے ورنہ وحدتِ تاثر جس پر (Fantasy) کی بنیاد ہوتی ہے ختم ہو جاتا ہے۔ بدرِ منیر یہ جانتی ہے کہ بے نظیر ماہ رخ کی قید میں ہے۔ اُسے یہ بھی معلوم ہے کہ ماہ رخ بے نظیر سے عشق رکھتی ہے اور اگر اُسے بدرِ منیر کے عشق کا حال معلوم ہو گیا تو وہ اُسے سزا دے گی۔ اس کی اپنی حالت یہ ہے کہ (Sex starvation) کی وجہ سے بے نظیر سے پہلی ملاقات کے وقت ہی بیہوش ہو جاتی ہے۔ ہجر میں تو اور بھی بُرا حال ہوتا ہے اور اُسے جلد جلد دورے پڑنے لگتے ہیں۔ گویا ایک انوکھے خواب کے لئے فضا تیار ہے اب صرف تہیج کی ضرورت ہے۔ اُسے بے نظیر کی قید کا خیال عین نیند سے پہلے آتا ہے۔ یہ ہمیں معلوم ہے کہ بعض اوقات خواب کے اجزا سونے سے پہلے کے واقعات اور خیالات کا عکس ہوتے ہیں۔ سونے سے پہلے بدرِ منیر کے خیالات یہ تھے:-

ہوا قید یا آنے پایا نہ وُہ
گئے اتنے دن اپنا کما آیا نہ وُہ

مجھے رات دن اُس کا رہتا ہے ڈر
پری نے سُنی ہو نہ یاں کی خبر

نہ باندھا ہو اُس کو کسی صید میں
کیا ہو نہ اسکے تئیں قید میں

پری نے کہیں طیش کھا لاف میں
دیا ہو نہ پھینک اسکو کوہِ قاف میں

پرستان سے بھی نکالا نہ ہو　　کسی دیو کے منہ میں، ڈالا نہ ہو

خواب میں ایک خواہش کی تکمیل تو بے نظیر کو دیکھنا ہے دوسرا وسوسہ ہے کہ پری نے قید نہ کر دیا ہو۔ اسی وسوسے نے خواب کا تار و پود بنایا ہے۔[1]

اب خواب کا جائزہ لیجئے اس میں مکالمہ ہے بے نظیر اور بدر منیر کے درمیان۔ فرائڈ کے قول کے مطابق خوابوں کے مکالمے دیکھنے والے کی زندگی میں ہو چکنے والی گفتگو سے مستعار ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ خواب کی یہ زندگی بدر منیر کی زندگی ہے یا میر حسن کی۔ کیونکہ یہ خواب بیداری کے وسیع تر خواب کا حصہ بھی تو ہے اور بیداری کے خوابوں کی تحلیل بھی عام خوابوں ہی کی طرح کی جاتی ہے لیکن میر حسن کی زندگی ہمارے موجودہ موضوع سے خارج ہے۔

اب ایک دوسرا واقعہ لیجئے:۔

موقع یہ ہے کہ بدر منیر اور بے نظیر آمنے سامنے ہیں۔ دونوں میں پہلی ملاقات ہوتی ہے۔ حجاب کا پردہ ہے۔ بدر منیر بے نظیر کی طرف سے پہل چاہتی ہے۔ اس لیئے تصورات کے اسباب مہیا ہوتے ہیں۔

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے　　بدن کو چرائے ہوئے ناز سے

---

[1] یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہم کو ایسے خوابوں کی اکثر مثالیں ملتی ہیں جن میں چاند کی کرنیں سونے والے کی آنکھوں پر پڑے کہ دوشیزہ اور حسین لڑکیوں کی تمثالات پیدا کرتی ہیں۔

برگساں (نفسیات خواب) ص ۷۹۔ ممکن ہے اس خواب میں بصری احساسات کا مہیج بھی ملا ہو۔

مُنہ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے ‏ ‏ لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے
پسینا پسینا ہُوا سب بدن ‏ ‏ کہ جوں گُل شبنم آلودہ ہو یاسمن
(نجم النساء سے)

گلابی کو لا اس کے آگے دھرا ‏ ‏ پیالے کو پھر جلد اس نے بھرا
غرض ہو کے آپس میں راز و نیاز ‏ ‏ پیئے دو پیالے بصد امتیاز
جب آپس میں چلنے لگے جام و مل ‏ ‏ تو دے غنچہ سال دل کھلے مثلِ گل

میک ڈوگل شراب نوشی میں تین درجے بتلاتے ہیں۔ یہاں پہلے درجے کا تذکرہ مقصود ہے۔ پہلے درجے میں خود انتقادی کند اور ضبطِ نفس کی تخفیف ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے مختلف حواس ایک دوسرے سے نسبتاً علاحدہ کام کرتے ہیں لیے سماجی قیود کے اُٹھ جانے سے جنسی بے کلی کو نچلی سطح پر بآسانی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی چال اس شراب نوشی میں چلی گئی ہے۔ دوسری ملاقات میں شراب نوشی کا دوسرا درجہ دکھایا ہے۔ شہوانی خواہشات کے اُبھارنے کا خاص خیال ہے۔

نہا دھو کے اس روز ایسی بنی ‏ ‏ کہ دو دن کی بیچ بیچ ہو بیٹھی بنی
وہ مسی وہ دم اس کے لبِ لعل فام ‏ ‏ سوادِ یادِ بدخشاں کی شام
وہ بالوں کی بو رشکِ مشک ختن
وہ ڈوبا ہوا عطر میں پیرہن

---

[1] میک ڈوگل (نفسیات فاسدہ) ص ۱۸۶، ۱۸۷

[2] اس مضمون میں (Sex) کے لیے جنس اور Sexual کے لئے شہوانی کی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ نفسیات میں سیکس اور سیکشوئل کے الفاظ انہیں الگ معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

یہ سامان کیا کم تھے کہ ان میں شراب کا اضافہ ہوا۔ جو اس زیادہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اس لیے جسمانی فعلیت خارجی تحریک پر زیادہ موقوف ہو گئی۔

ہوئے جب کہ بدمست وہ ماہرو | لگی ان میں ہونے عجیب گفتگو
کہ دستے جو نرگس کے تھے ہمراہ | لگے ڈھانپنے آنکھ بے اختیار
خواصیں جو تھیں رو بر و ہٹ گئیں | بہانے سے ہر کام کے ہٹ گئیں
غرض رفتہ رفتہ وہ مدہوش ہو | چھپر کھٹ میں لیٹے ہم آغوش ہو
لبوں سے ملے لب دہن سے دہن | دلوں سے ملے دل بدن سے بدن
لگی آنکھ سے آنکھ خوشحال ہو | گئیں حسرتیں دل کی پامال ہو۔۔۔
غم و درد دامن کشیدہ ہوئے | وہ گل نارسیدہ رسیدہ ہوئے
اُٹھے پی کے باہم شراب امید | کوئی سرخرو اور کوئی روسپید
چھپر کھٹ سے باہر رکھ اپنے قدم | نکل آئے بھرتے محبت کا دم

نشے سے وہ لذت کے بیہوش ہو
گئے بیٹھ مسند پہ خاموش ہو

یہ دو دلوں کے ملنے کا حال ہے اس سے ذرا پہلے لیکن پہلی ملاقات کے بعد بے نظیر کی ماہ رُخ سے کٹی رات بسر ہوتی ہے۔ لیکن بے لذت:

پری ساتھ کاٹی وہ جوں تول کر رات | اُٹھا صبح ملتا ہوا اپنے ہات
سماں شب کا آنکھوں میں چھایا ہوا | مزا دل میں سارا سمایا ہوا
اُٹھے جو کوئی وصل کا دیکھ خواب | نہ ہو وصل اور دل میں ہو اضطراب

میر حسن اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ منظر کشی پر ہی ختم ہو جاتے ہوں ان کی تشبیہات بھی بعض اوقات داخلی ہوتی ہیں وہ ایک داخلی کیفیت کے اظہار کیلئے دوسری داخلی کیفیت ہی کا سہارا لیتے ہیں۔

اٹھے جو کوئی وصل کا دیکھ خواب — نہ ہو وصل اور دل میں ہو اضطراب

اسی طرح :۔

بال اور ان کی نمی کا ذکر کرنے کے بعد :

کہوں اسکی خوبی کی کیا تجھ سے بات — کہ جوں بھیگتی جائے صحبت میں رات

(۵)

اس بیداری کے خواب میں ہر واقعہ اور ہر عمل (Action) ایک خارجی صورت کے ساتھ ساتھ ایک گہری داخلی معنویت بھی رکھتا ہے۔ جا بجا ایک دلکش آسودگی اور معنی خیز للچاہٹ پنہاں ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ سوسائٹی سے گریز کا رنگ بھی ہے یعنی سوسائٹی کی تصویر کشی بھی مقصد ہے لیکن اولیں حیثیت ہوائی قلعے بنانے ہی کی ہے ہر منظر نور میں دھلا ہوا ہے :۔

خوشی کی زبس ہر طرف تھی بساط — لگے ناچنے اس پہ اہلِ نشاط

کناری کے جوڑے چمکتے ہوئے — وہ پاؤں کے گھنگرو چھنکتے ہوئے

وہ گھٹنا وہ بڑھنا اداؤں کے ساتھ

دکھانا وہ رکھ رکھ کے چھاتی پہ ہاتھ

(ص ۲۴)

منظر کی تفاصیل کے ساتھ ساتھ فن کار کی نظر کا کیمرہ بڑی تیزی سے گردش کرنے لگتا ہے لیکن بنیادی نقطہ روشنی ہی کا تصور ہے۔

چھپر کھٹ مرصع کا دالان میں — جھمکتا تھا اس طرح ہر آن میں

زمین پر تھی اس طور اس کی جھمک — ستاروں کی جیسے فلک پر چمک

عجب چاندنی میں گلوں کی بہار — ہر اک گل سفیدی سے مہتاب دار

(ص ۲۸)

عجب شب تھی وہ چوں سحر روسپید
عجب روز تھا مثلِ روزِ امید
(صلا ۲۴)

سنہری روپہلی تھیں عماریاں
شب و روز کی سی طرحداریاں
چمکتے ہوئے بادلے کے نشاں
سواروں کے غٹ اور بانو کی شاں
(صلا ۳۶)

وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بجا
وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا
وہ نکھرا فلک اور وہ مہ کا ظہور
لگا شام سے صبح تک وقتِ نور
(صلا ۵۱)

ہر اِک سمت واں نور کا ازدحام
لگے آئینے قدِ آدم تمام
لب با وہ چوبیٹر کی پاکیزہ نہر
پڑے چشمۂ ماہ سے جس میں لہر
زمیں نور کی آسماں نور کا
جدھر دیکھو ادھر سماں نور کا
(صلا ۵۴)

بدن آئینہ سا دمکتا ہوا
گلِ باغِ خوبی لہکتا ہوا
پڑا عکس اس کا جو طرفِ چمن
ہوا لالہ گل اور گل نسترن
درختوں پر اسکی پڑی جو جھلک
زمرد کو دی اور اس نے چمک
(صلا ۸۱)

وہ لگنے کا عالم وہ حسن بتاں
وہ گلشن کی خوبی وہ دن کا سماں
گھڑی چار دن باقی اس وقت تھا
سہانا ہر اِک طرف سایہ ڈھلا
درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ
وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ
لپیٹے ہوئے پوستوں پر تمام
روپہلے سنہرے ورق صبح و شام
(صلا ۸۳)

وہ اُجلا سا میداں چمکتی سی ریت — اُگا نور سے چاند تاروں کا کھیت

درختوں کے پتے چمکتے ہوئے — خس و خار سارے جھمکتے ہوئے

درختوں کے سائے سے مہ کا ظہور
گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور[۱]

---

[۱] میر حسن کے ہاں چاندنی کا تصور ہجر سے بھی وابستہ ہے اور وصل سے بھی۔ دیوانِ میر حسن کے چند شعر

اپنے دنوں کو بیٹھ کے روتا ہوں اُن دنوں — پاتا نہیں جو تم کو شبِ ماہتاب میں

آج کی چاندنی وہ ہے کہ کسی شوخ کے ساتھ — کھل آغوش لپٹ جائیے اور سو رہیے

بخت جاگے ہیں شبِ ماہ میں جو یار ہے پاس — چاندنی تخت پہ بچھوائیے اور سو رہیے

دیکھنے بیٹھا جو وہ مہ اپنے گھر کی چاندنی — جب تلک بیٹھا رہا تب تک نہ سرکی چاندنی

نور باقی ہے نہ آنکھوں میں نہ دل میں روشنی — تیرے بن کیا جاکے دیکھیں بحر و بر کی چاندنی

یک شب تو پھر بھی آجا آنکھیں بس ہو گئیں سفید (کذا) — کب تلک دیکھا کریں اُجڑے نگر کی چاندنی

جھمکے کپڑوں میں یوں ہے جلوہ گر اس کا بدن — دھوپ جیسے شام کی ہو اور سحر کی چاندنی

سیج پھولوں کی بچھی ہو ماہ رو بیٹھا ہو پاس — دیکھنا تب لطف دیوے یک دگر کی چاندنی

یاد آتا ہے کسی موسم کا اس رجا لوٹنا — جب نظر پڑتی ہے مجھ کو تیرے گھر کی چاندنی

سیکڑوں عالم دکھاتی ہے حسنؔ دلبر کے ساتھ
ٹھنڈی ٹھنڈی باؤ اور پچھلے پہر کی چاندنی

صنم پاس ہے اور شبِ ماہ ہے — یہ شب ہے کہ اللہ ہی اللہ ہے

٭

رنگ و نغمے کا سیلاب اُمڈتا ہے اور بڑھتا چلا جاتا ہے پھر محفل محفل نشّہ ہے، موسیقی کا اثر وہ ہے کہ شجر و حجر سنتے ہیں اور انسان کائنات کا ایک حصّہ بن جاتا ہے۔

وہ لالے کا عالم ہزاری کا رنگ — وہ آنکھوں کے ڈورے نشّے کی ترنگ
گلابی سے ہو جانا دیوار و در — درختوں سے آنا شفق کا نظر
وہ چادر کا چھٹنا وہ پانی کا زور — ہر اک جانور کا درختوں پہ شور
وہ سبزہ وہ سبزی اور وہ آبِ رواں — وہ پانی کا مستی سے بہنا وہاں
وہ اڑتی سی نوبت کی دھیمی صدا — کہیں دور سے گوش پڑتی تھی آ
وہ رقصِ بتاں اور وہ ستھری الاپ — وہ گُڑری کی تانیں وہ طبلوں کی تھاپ
وہ دل تھامنا ہاتھ پر دھر کے ہاتھ — اُچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے ساتھ
نہ انساں کا ہی دل ہوا اس میں بند — ہوئے محوِ حسن کہ چرند و پرند
غرض جو کھڑے تھے کھڑے رہ گئے — اڑے جس جگہ سے تھے اڑتے رہ گئے
جو پیچھے تھے آگے نہ وہ چل سکے — جو بیٹھے تھے بیٹھے نہ پھر ہل سکے
لگی دیکھنے آنکھ نرگس اٹھا — گلوں نے دیئے کان ادھر لگا

لگے ہلنے آ وجد میں سب درخت
کھڑے رہ گئے سرو ہو کر کرخت
درختوں سے گرنے لگے جانور
بنے مثلِ آئینہ دیوار و در
(۸۴)

اس کے ساتھ پریاں اور دیو بھی ہیں۔ کل کا گھوڑا بھی ہے غرض کہ مافوق الفطرت عناصر کا وہ جمگھٹا ہے کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔

خیالیہ کا انحصار گریتر یہ ہوتا ہے۔ جس میں جا بجا وحدتِ تاثر نے جنسی خواہشوں کو لَو دی ہے۔ یہی وہ پُراسرار قوت ہے جس نے کہانی کے تاثر کو یکجا کر دیا ہے۔

مافوق الفطرت عناصر وہ آتے ہیں بے نظیر کو ماہ رُخ اُٹھا کر لے جاتی ہے۔

محبت کی آئی جو دل میں ہَوا وہاں سے اُسے لے اُڑی دلرُبا

ہُوا جب زمیں سے وہ شعلا بلند ہُوا مَیں ستارہ سا چمکا دو چند

پرستان کے مناظر بھی دلکش و دلرُبا ہیں:

وہاں ایک تھا سیر کا اُس کے باغ

کہ جس کے گلوں سے ہو تازہ دماغ

رہا صحن و گل اس میں انواع کے

طلسمات کُل اُس میں انواع کے

طلسمات کے سارے دیوار و در

نہ یاں کے سے کوٹھے نہ یاں کے سے گھر

مطلّا منقش مشبک تمام

یہ کیا ہو جو ہو دھوپ کا اُس میں نام

گرے چھن کے واں اِس لطافت سے دھوپ

کہ زردی کا جوں زعفراں پہ ہو روپ

نہ آتش کا خطرہ نہ بارش کا ڈر

نہ سردی نہ گرمی کا اس میں خطر......

زمیں ساری واں کی جواہر نگار

ادھر میں چمن اور ہوا میں بہار

کسی کو ہو جس چیز کا اشتیاق
نظر آوے وہ چیز بالائے طاق
جواہر کے ذی روح وحش وطیور
خراماں پھریں صحن میں دور دور
پھریں دن میں سارے وہ حیوان ہو
کریں رات میں کام انسان ہو
لگے ہر طرف گوہر شب چراغ
وہی دن کو گوہر وہی شب چراغ

صدا آپ سے آپ گھڑیال کی
کہیں ناچ کی اور کہیں تال کی
رہے واں کے حجروں کا جو در کھلا
تو دنیا کے باجوں کی آئے صدا
وگر بند کر دیجئے ایک بار
تو چوکی ارغنوں راگ نکلیں ہزار
(ص ۔ ۶، ۴۷، ۴۸)

کل کا گھوڑا بھی عجیب چیز ہے کل موڑیے اور سیر کیجئے کل موڑیے اور ٹھہر جائیے۔ نجم النساء کو بھی پرستان کی سیر کا موقع ملتا ہے جب فیروز شاہ اُسے زبردستی اٹھا کر لے جاتا ہے۔

پری زاد نے تب پکڑ اُس کا ہاتھ
سنتا بی بٹھا تخت پر اپنے ساتھ

زمیں سے اُڑا آسماں کے تئیں
وہ کتنا کہا کی نہیں رے نہیں
نہ مانا اور اُس نے اُڑایا اُسے
پرستاں میں لاکر بٹھایا اُسے
(صد ۹۹)

دیو کا عورت سے عشق کر لینا۔ بے نظیر کا قید سے رہا ہونا یہ سب فوق الفطرت عناصر کہانی کو آگے لے جاتے ہیں۔ ان سب کی تہ میں دلیری کے واقعات ہیں پری کا لے جانا۔ دیو کا آزاد کرنا۔ لیکن یہ مافوق الفطرت عناصر عام زندگی سے الگ نہیں وہ ہماری خواہشات کا حصہ ہی تو ہیں۔ تطابق (empathy) کے لئے ضروری ہے کہ یہ شخصیتیں ہماری طرح انسان ہوں اس لئے سحر البیان کے دیو اور پریاں ہماری آپ کی طرح انسان ہیں ان کا اٹھنا بیٹھنا۔ ہنسنا بولنا ہماری آپ کی طرح ہے۔ انہیں سماجی قیود سے واسطہ پڑتا ہے جبھی تو ماہ رُخ اپنے باپ سے پوشیدہ بے نظیر کو رکھتی ہے۔ دیو بھی ہماری طرح بعض اوقات محبت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ماہ رُخ بے نظیر کو اور فیروز شاہ نجم النساء کو زبردستی لے اُڑتے ہیں۔ اور پھر بدرِ منیر اور بے نظیر کی ملاقاتیں، جوگن کے جوبن کا تذکرہ وصال کے مناظر یہ سب جیتی جاگتی عام زندگی میں کہاں ملتا ہے۔ اس کے لئے تخیل کی شمع ہی جلانی پڑے گی۔ لیکن سماجی قیود سے کہیں بھی مفر نہیں۔ بدرِ منیر بے نظیر سے ہنسی مذاق کرنے کے بعد دُنیا سے ڈرتی بھی ہے۔ پریاں بھی عشق میں جلتی ہیں تو بے تاب ہوتی ہیں، اور بس چلے تو انسانوں سے عشق بھی کر بیٹھتی ہیں۔ اور دیو بیچارے بھی موقع ملنے پر بھبھوت میں لپٹی ہوئی آگ پر عمر بھر ہاتھ

تاہم گوارا کر لیتے ہیں۔ ان کا ماحول نرالا سہی وہ بھی ہماری ہی طرح کے انسان ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے ملک میں مناظر زیادہ دلفریب ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مناظر تو ہماری زندگی میں بھی دلکش ہو سکتے ہیں۔ تخیّل کی ایک زقند لگائیے اور بیڑا پار ہے۔ لیکن جن مناظر تک میر حسن کے تخیّل کی رسائی ہے۔ وہ حواسِ خمسہ کی بعید از قیاس قوتوں کا مظاہرہ ہے۔ عام زندگی میں تخیّل کا عمل دخل جن ضمنی الاکتشول سے اٹ جاتا ہے۔ میر حسن تھوڑی دیر کے لئے ہمیں اُس سے علیحدہ کر دیتے ہیں۔ حواسِ خمسہ کا یہ محیر العقول کارنامہ سحر البیان کو رنگ در وغن عطا کرتا ہے۔ پانچوں بر حسیں اپنا اپنا کام کرتی ہیں[۱]

---

[۱] (محسوس کرنا) جب بے نظیر کنوئیں میں گرتا ہے تو:

ہوا داں سے اوپر گئی کانپ کانپ
کنوئیں نے لیا سنگ سے مُنہ کو ڈھانپ
(ص ۷۹)

سُونگھنا

عروسانہ اس نے کیا جو لباس
تو آنے لگی خوں کی اس میں باس

دیکھنا

کدارے کا عالم تھا یہ اس گھڑی
کہ ہتی چاند کی ہر طرف غش پڑی

تمام مناظر یا تو حواس کے امتزاج سے بنتے ہیں یا تراکم سے۔ امتزاج میں محض فوٹوگرافی ہی نہیں متحرک مناظر بھی ہیں :۔

گلوں کا لب نہر پر جھومنا — اُسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر — نشے کا سا عالم گلستان پر

(ص ۲۹)

رنگوں میں سبز، نیلے، زرد اور سرخ رنگ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہر رنگ کو دوسرے کے مقابل لایا جاتا ہے اور کہیں بھی ایک رنگ کو دوسرے میں جذب نہیں کیا جاتا یہی وجہ ہے کہ میر حسن کے مناظر میں نکھار اور رنگوں میں تیکھا پن ہے[1]

خواصوں کی آپس کی دیکھیئے :۔

کوئی حوض میں جا کے غوطہ لگائے — کوئی نہر پہ پاؤں بیٹھی ہلائے
کوئی اپنے غوطے کی لیوے خبر — کوئی اپنی مینا پہ رکھے نظر
کسی کو کوئی دھول مارے کہیں — کوئی جان کو اپنی وارے کہیں

شہزادے کا نہانا :

وہ گورا بدن اور بال اُسکے تر — ہے تو کہ ساون کی شام و سحر

[1] بھیگے سے ترا سنگ حنا اور بھی چمکا
پانی میں نگاریں کف پا اور بھی چمکا
(مصحفی)

افشاں کا وہ عالم ہے اس چاند سے مکھڑے پہ
جوں وقت سحر انشا سورج کی کرن نکلے
(انشا)

نمی سے تھا بالوں کا عالم عجب — نہ دیکھی کوئی خوب تر اس سے شب
کہوں اس کی خوبی کی کیا تجھ سے بات — کہ جوں بھیگتی جائے صحبت میں رات
زمرد کے سے ہاتھ میں سنگ پا — کیا خادموں نے جو آہنگ پا
ہنسا کھلکھلا کر وہ گل نوبہار — لیا کھینچ پاؤں کو بے اختیار
عجب عالم اس نازنیں پہ ہوا — اثر گدگدی کا جبیں پر ہوا ص ۲۵

لیکن میر حسن کی اپنی طبیعت کا رنگ انبوہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب وہ محفلوں اور مجلسوں کا ذکر کرتے ہیں تو وہاں ان کی فن کارانہ نگاہ تیزی سے گھومتی ہے اور رنگین صفائی سے ہر منظر کو پیش کرتی ہے اس کے نشان سحر البیان [1] میں جا بجا مل جاتے ہیں۔ بے نظیر اور بدر منیر کی شادی ہے برات آ رہی ہے بازار کا عالم دیکھیے

---

[1] دھرنا ہے بتوں کا ذہن سے جاتا وہاں گل پیرہن — جھمکڑا ہے خدائی کا میاں لندن کے پل پر
گھروں سے اپنے بن بن کر نکلنا ماہ رویوں کا — اکڑنا ناز پر انداز پر اپنے تجمل پر
کہیں بے بیکھے پنجرے عشق بازوں کا کھڑے صدا ہنسا — گلوں کا رام کر لینا صدا آواز بلبل پر
(دیوان میر حسن)

جو دیکھا تو کوئی اوڑھے دوشالہ — بناتی ہے کھڑی چمپا کی مالا
کوئی بالے میں لیکر گل بھرے ہے — کوئی پھول اپنی انگیا میں دھرے ہے
سکھے ہے کان پر کوئی گلوں کو — شکستہ دل کرے ہے بلبلوں کا
کوئی بھرتی ہے دامن اپنا گر دان — اکڑ کر کوئی دکھلاتی ہے آن
کوئی لالے کی پتی توڑتی ہے — کھڑی کوئی پٹاخہ چھوڑتی ہے
کوئی ماتھے پہ ہے ٹیکہ لگاتی — کوئی لے ڈھولکی بیٹھی ہے گاتی
کوئی گیندا اچھالے ہے کسی ساتھ — دیے بیٹھی ہے کوئی گال پر ہاتھ
پھرے ہے تیزی پر کوئی مائل — ملا جاتا ہے ناحق ایک کا دل
روش پر دوڑتی پھرتی ہے کوئی — سنبھلتی ہے کوئی آتی ہے کوئی
کھڑی ہے کوئی منہ کو بجار اکڑے — کوئی ہے سوچ میں ہنسی کو پکڑے

(دیکھیے مثنوی گلزار ارم، ص ۱۵۳)

وہ دولھا کے اُٹھتے ہی اِک غل پڑا — لگا دینے کھنے اُٹھ کے چھوٹا بڑا
کوئی دوڑ گھوڑوں کو لانے لگا — کوئی ہاتھیوں کو بٹھانے لگا
لگا کہنے کوئی اِدھر آ بیٹو — ارے رحمت شتابی مری لائیو
کسی نے کسی کو پکارا کہیں — نہ لانے پہ میانے کے مارا کہیں
کوئی پالکی میں چلا ہو سوار — پیادوں کی رکھ اپنے آگے قطار
جو کثرت میں دیکھا کہ گاڑی نہیں — کوئی تانگے تل تگے میں بیٹھا کہیں

سپہر اور رتھیں کھڑکنے لگے
سواروں کے گھوڑے بھڑکنے لگے

(ص ۱۲۳)

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہتات کا تصوّر دینے کے لئے اوپر نیچے چیزوں کی ایک فہرست دے دی ہے کہ پڑھنے والے کی نگاہ ان مناظر کو بڑی تیزی سے دیکھے۔ ساتھ ہی مصرعوں کی چلت ایسی رکھی ہے کہ نہ پڑھنے والے کی زبان رُکے نہ مناظر کی تیزی میں فرق آئے مثلاً

کھڑے نہر پر قاز اور قرقرے — لئے ساتھ مرغابیوں کے پرے
صدا قرقروں کی بطوں کا وہ شور — درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور
چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا — ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا
صبا جو گئی ڈھیریاں کرکے پھول — پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول

وہ کیلوں کی اور مولسریوں کی چھب اوُں
لگی جائیں آنکھیں لئے جن کا نافُولیا (صفحہ ۳۰)

سمدھنوں کی آمد ہے:

اسنا ہے کی والی سمدھنوں کی پھبن — کھلیں پھول جیسے چمن در چمن

گلوں میں پہنانا وہ ہنس ہنس کے ہار ستانا وہ پھولوں کی چھڑیوں کی مار

(۶)

لیکن سحرالبیان کے صرف یہی عناصر نہیں۔ میر حسن محض جنسی ہیجان انگیزی، قصّے کی تعمیر، اور سماجی تحلیل تک ہی نہیں رہتے بلکہ کردار نگاری کو بھی بنیادی اہمیت دیتے ہیں اور مثنوی میں ہر کردار ایک واضح اور الگ شخصیت رکھتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میر حسن جس فضا میں سانس لیتے ہیں وہ Types کی پرورش کے لئے مناسب تھی۔ اس لئے بے نظیر، ماہ رخ، نجم النسا اور بدرِ منیر کے کردار قصّے کی عقبی فضا کا ساتھ ہی نہیں دیتے بلکہ ایک مستقل نوع بھی ہیں۔ بے نظیر ایک نارمل انسان ہے جس پر حالات و واقعات کا اثر عام انداز میں ہوتا ہے۔ اُس سے ماہ رخ بھی اپنا الّو سیدھا کر لیتی ہے۔ بدرِ منیر بھی لکڑی کے گھوڑے کا جلوہ دیکھ لیتی ہے۔ کہانی کے پس منظر میں اگرچہ واقعات کو آگے لے جانے میں بے نظیر کی ذات مرکزی کردار ہے لیکن اثر کے لحاظ سے اس کی حیثیت فروعی ہے۔ اور ماہ رخ، بدرِ منیر، اور نجم النساء اُس سے زیادہ اہم کردار ہیں۔

ماہ رخ نرگسی Narcissistic عورت ہے جو اپنی خواہشات کی تکمیل ہی کو اہم سمجھتی ہے۔ جسے بے نظیر اچھا معلوم ہوتا ہے تو وہ اُسے اٹھا کر لے جاتی ہے لیکن نرگسی کردار میں خامی یہ ہوتی ہے کہ چاہنے سے زیادہ چاہا جانا اہم ہوتا ہے اس لئے بے نظیر کی طرف سے کسی اشتیاق کا اظہار نہ ہونے پر اُسے وہ بہلانے لگتی ہے۔ سیر کا جھانسا دیتی ہے لیکن جب بدرِ منیر کے عشق میں بے نظیر گرفتار رہتا ہے تو برافروختہ ہو کر اُسے

قید میں ڈال دیتی ہے۔ ماہ رخ جیسے کردار صرف اپنی سی کرنے کے قائل ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ بعض اوقات جنسی جذبہ اس خواہش کے ساتھ اہم ہو جائے لیکن ایسی عمارت مخالفت کی صورت میں فوراً گر جایا کرتی ہے۔ اور پھر انتقام اتنا سخت ہو جاتا ہے کہ اس میں محبت کے لئے کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی۔

بدر منیر کا کردار ایک ہسٹریا زدہ عورت کا کردار ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں اس کا بے ہوش ہو جانا۔ اور پھر ہجر کی صعوبتوں میں غشی کے مسلسل دورے۔ اسے ایک مفعول (Sadomasochism) اور بڑی "گرم" عورت بناتے ہیں دوسرے کرداروں کے مقابلے میں وہ نمایاں نہ سہی پھر بھی اہم ہے۔ نجم النساء سب سے زیادہ دلچسپ ہے وہ ایسی عورتوں میں سے ہے۔ جو عورت ہونے کی حیثیت سے غیر مطمئن ہوں۔ ایسی عورتیں یا تو نرسیں بن جایا کرتی ہیں یا فقیر بن کر زندگی گزار دیتی ہوں۔ کیونکہ اس طرح خدمت خلق کا ڈھونگ رچا کر وہ ازدواجی زندگی والی ثانوی حیثیت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتی ہیں۔ ایسی عورتوں میں جنسی تعلقات اور ہیجانات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی وہ ان اشغال و خواہشات کو کھلونوں کے طور پر استعمال کرتی ہیں جس سے دوسروں کو ستایا جا سکے۔ جب بے نظیر اور بدر منیر میں پہلی ملاقات ہوتی ہے۔ تو نجم النسا کی چھیڑ چھاڑ اور جنسی اشاروں کا برملا بیان اگرچہ سہیلیوں کی بے تکلفی کو ظاہر کرتا ہے لیکن ساتھ ہی نجم النسا کی ان افعال سے علیحدگی کا پتہ بھی دیتا ہے۔ وہ تو جذبات سے کھیلنا جانتی ہے اور ایک ارفع مقصد کے لئے (اپنی سہیلی کی خواہش کی تکمیل کی خاطر) جوگن بن کر ازدواجی جھمیلوں سے الگ رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ جب

جنوں کا شہزادہ اُس پر عاشق ہوتا ہے تو اُس کی بے تعلقی اور سانجھ ہی ساتھ ہی ساتھ فریق ثانی کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش اس کی شخصیت کے اس پہلو کو زیادہ واضح کرتی ہے۔ آخر میں جب اس کی شادی فیروز شاہ (جن) سے ہوتی ہے تو نجم النساء کی طرف سے گرم جوشی کی بجائے کھیلنے اور کھلانے کا انداز زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔

(۷)

سحرالبیان ایک fantasy ہے۔ یہ ایک عملی ناول Novel of action بھی ہے اور اسے کرداری ناول Novel of character بھی کہہ لیجئے۔ لیکن یہ سب حیثیتیں مل کر ایک واحد تاثر قائم کرتی ہیں اور یہی میر حسن کا فن ہے۔ اس طرح میر حسن اگرچہ "تارکِ دنیا" تو نہیں بنتا لیکن ماؤنٹ ایورسٹ پر ضرور "پہنچ جاتا ہے۔

*

باب دہم

سحرالبیان کی مقبولیت

(۱)

اُردو ادب میں دو مثنویوں نے بڑا مقام پایا ہے۔ نواب مرزا شوق کی زہرِ عشق اور میر حسن کی سحرالبیان، نشر و اشاعت اور مقبولیت کے اعتبار سے دوسری مثنویوں اور منظوم کارناموں سے بازی لے گئی ہیں۔ سحرالبیان کے بے شمار قلمی نسخے اور بیسیوں مطبوعہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ادبی حلقوں میں اس کی شہرت ۱۱۹۹ھ کے فوراً بعد ہی شروع ہو جاتی ہے۔ کتاب کی کلاسیکی حیثیت فوراً ہی تسلیم کر لی گئی۔ تقلید میں مثنویاں تصنیف ہوئیں۔ شعراء نے نظم نویسی کے لئے اسے مرِ مشق کے طور پر استعمال کیا۔ زبان، محاورات، الفاظ کی تراش خراش، اندازِ بیان کا انوکھا پن اور محاورات کی دلکشی کا اکتساب شعراء کا مطمحِ نظر ہوا۔ لغت نویسوں نے سحرالبیان سے سند لی۔ شعراء نے چراغ سے چراغ روشن کئے۔ طبیعتیں اس سے سیر نہ ہوئیں اور سحرالبیان کی کبھی نثر بنائی گئی، کبھی غیر ملکی زبانوں میں ترجمے ہوئے، کبھی مصوّر نسخے تیار ہوئے۔ غرض کہ سحرالبیان چھپتی چھپاتی بھی رہی اور اس کے قلمی نسخے بھی ملک کے گوشے گوشے میں پھیلتے رہے۔ بعض کاتبوں نے تو تلفظ تک کو محفوظ رکھنے کے لئے اعراب لگا کر نسخے مرتب کئے۔ اس کی نوبت بھی آئی کہ ساری مثنوی کا خمسہ ہوا اور انیسویں صدی میں تو اسے ڈرامے

کی صورت میں بھی ڈھالا گیا اور یہ سٹیج ہوئی۔

(۲)

Legend. آنے والی نسلوں نے سحرالبیان سے کئی طرح فیض حاصل کیا لیکن معاصرین بھی اس کے جادو سے نہیں بچ سکے۔

شہرت اور مقبولیت نے اسے جلد ہی Legend کا درجہ دے دیا۔ ہمارے ہاں شخصیت پرستی کچھ اس ڈھنگ پر ہوتی رہی ہے کہ جو کتاب شہرت کے اوج کمال پر آجائے وہ یکسر الہامی اور جو مصنف اس کا لکھنے والا ہو وہ جلد ہی اوتار یا پیغمبر مان لیا جاتا ہے۔ مرزا غالب کی عظمت نے بھی ان حدوں کو چھوا تھا۔ میر حسن کو کوئی عبدالرحمٰن بجنوری تو نہیں مل سکا لیکن ان کی تصنیف کو مافوق الفطرت پیمانوں سے ضرور ناپا گیا۔ سابق پنجاب کی سرزمین میں ہیر رانجھے کی منظوم داستان نے وارث شاہ کے کمال کا سکہ رائج کیا ہیر کے بارے میں اب تک مشہور ہے کہ جس گھر میں یہ کتاب بار بار پڑھی جائے اس کے افراد پر کوئی نہ کوئی بیتا ضرور پڑتی ہے بالکل یہی داستان میر حسن ہی کی زمانے سے سحرالبیان کے متعلق بھی مشہور ہوگئی۔ مثلاً تذکرۂ طبقات الشعراء میں لکھتے ہیں:—

طرفہ ایں کہ اگر روزے چند کسان تازہ شوق بصحبت ہم دگر
بزادلت بدال مثنوی (سحرالبیان) نمایند البتہ تغرقہ انتد[۱]

اسی طرح تذکرہ، خوش معرکۂ زیبا میں سعادت خاں ناصر لکھتے ہیں:—

میر حسن کی مثنوی سے ہزارہا عورات فاحشہ ہوگئیں۔[۲]

---

[۱] رودو گرافت۔ نسخۂ برلن۔ [۲] سب رس نومبر و دسمبر ۱۹۵۷ء ص ۹

ان بیانات میں صداقت نہ سہی عقیدت رکھنے والوں کی ذہنیت کا پتہ تو چلتا ہے یہ مثنوی کی ماورائی قوتوں کا ایک کھلا ہوا اعتراف ہے۔

سحر البیان سنۂ تصنیف کے فوراً بعد ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچ جاتی ہے۔ مبتلاؔ لکھتے ہیں :—

چناں پسند خاطر نوجوانان روزگار
افتاد کہ سوداگران ہر دیار بقیمد لقصاویر
و جدا ول زر کار آں را مرتب گردانیدہ
بجوانب و اقطار بسبیل سوغات می برند

اس بیان کی تصدیق مصنف کے ان قریب العہد نسخوں سے بھی ہوتی ہے جو حیدرآباد دکن اور کشمیر جیسے دور دست علاقوں سے دستیاب ہوئے ہیں کتاب کی شہرت نے میر حسن کے دوسرے کارناموں کو نظروں سے اوجھل کر دیا اور سو دو سو سال کے لئے میر حسن کی غزلیات ناپید ہو گئیں۔

(۳)

معاصرین :— سحر البیان کے منظر عام پر آنے سے پیشتر ہی ادباء کا طبقہ اس سے خاصا متأثر ہو چکا تھا۔ کتاب کی دلکشی کا اعتراف معاصرین نے بڑی دریا دلی سے کیا ہے۔ چنانچہ مثنوی کی تاریخوں میں قتیلؔ مصحفیؔ اور ماہر سنا اپنی اپنی پسند کا اقرار کیا ہے۔ قتیلؔ کہتے ہیں۔

بگوشم ز ہاتف رسید ایں ندا
بریں مثنوی باد ہر دل فدا

مصحفیؔ :—

کبھی اس کی تعریف یوں بر محل
یہ بیت خانۂ چین ہے بے بدل

اور ماہر خراجِ عقیدت اس طرح پیش کرتے ہیں :-

ہے شعر عرا پڑھا دیں یا کہ طرح
ہے اس مثنوی کی یہ نادر طرح

جوشِ عقیدت کا یہ اظہار تذکروں میں بھی جابجا ہوا ہے۔

"مثنوی آخر کہ سحر البیان نام دارد ید بیضا نمودہ الحق کہ کار نامۂ اوست۔ قطع نظر از بلاغتِ شاعری زبانش بسیار بامزہ و شیریں و عالم پسند افتادہ"[1]

"مثنوی بے نظیر : بدرِ منیر بے نظیر گفتہ"[2]

"شیر سخن کلامش از مثنوی بے نظیر کہ بہ سلک نظم آوردہ است ظاہر"[3]

"الحق مثنوی نہیں کہ زمانہ اور شاعری پہ حجت ہے"[4]

"مثنوی بے نظیر لاجواب کہی ہے"[5]

"مثنوی بدرِ منیر سے ان کے کلام کو مقبولِ انام کردیا تھا"[6]

"مثنوی بدرِ منیر از مشہور آفاق است"[7]

"غزل سست مگر مثنوی چیست جس کی مثال نہ ہوئی اور نہ ہوگی ہے"[8]

"مثنوی میں یکتائے زمانہ ہونا قطعی ثابت ہے"[9]

---

[1] مصحفی : تذکرۂ ہندی صفحہ ۶۸-۶۹ [2] قاسم مجموعۂ نغز صفحہ ۲۰۳ [3] مجمع الانتخاب۔ کمال۔ [4] خوش معرکۂ زیبا بحوالہ سب رس ۱۹۵۶ء [5] نساخ سخن شعراء صفحہ ۱۳۰ [6] جلوۂ خضر صفحہ ۱۷۸ [7] بزم سخن صفحہ ۲۴۵ [8] تاریخ عبد علیہ خادم علی صفحہ ۱۴۲ [9] خمخانۂ جاوید۔ جلد دوم صفحہ ۴۹۵

"دن کی سب سے یادہ مشہور تصنیف بدرِ منیر ہے۔"[1]

"سب سے نظیر اور بدرِ منیر کے احوال میں کیا خوب مثنوی لکھی ہے۔"[2]

"سحرالبیان کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ اردو زبان کی کسی مثنوی کو نہیں ہوئی۔ اس کی بدولت ان کے سر پر بقائے دوام کا تاج رکھا گیا۔"[3]

"یہ مثنوی میر حسن کا شاہکار ہے اور اردو زبان کے کلاسکس میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے جہاں تک طرزِ بیان کا تعلق ہے سحرالبیان اپنا جواب نہیں رکھتی۔ الفاظ کا دروبست محاوروں کا کھپانا بیان کی صفائی اور سلاست تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں۔"[4]

اردو میں نہ اس سے پہلے کوئی اس پایہ کی مثنوی ہوئی ہے نہ آئندہ امید ہے۔"[5]

"میر حسن ان شعرائے حقیقی میں سے ہیں جن کے کلام سے اردو زبان کو شرف ہے اس کی تائید و تردید اپنے اپنے مذاق پر منحصر ہے کائنات کے مطالعے کو جو بازیچۂ اطفال خیال کرتے ہیں ان کے نزدیک تو واقعی بے نظیر بدرِ منیر کی مثنوی لونڈوں کے پڑھنے کی کتاب ہے بلکہ سعدیؒ کی گلستاں بھی کچھ ایسی ہی ہے ؎

جانتا قدرت کو ہے اک کھیل تو
کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

ہاں جنہیں خود مطالعہ کا چسکا ہے ان کے خیال میں شاعر کی کمال پایہ

---

[1] یادگارِ شعرا صـ۲۷ [2] یحییٰ تنہا سیرالمصنفین طبع اول جلد اول صـ۶۷۔
[3] نور الحسن شعرائے اردو کا البم صـ۱۱ [4] اثر دیباچۂ سحرالبیان صـ۸ [5] اعجاز حسین مختصر تاریخ ادب اردو صـ۹۹

بہ لحاظِ شاعری اس سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتی کہ عمر بھر میں ایک مثنوی
سحرالبیان لکھ دے ... سحرالبیان میں بہ لحاظِ واقعیت یہ تین خوبیاں
ایسی ہیں کہ اردو کی ایک مثنوی میں بھی نظر نہیں آتیں ۔

(۱) جامعیت یعنی سلاطین و امراء کے یہاں جو جو حالتیں گذرتی تھیں اور
جو معاملات اکثر پیش آتے تھے قریب قریب سب کا ذکر آگیا ہے۔

(۲) اصلیت یعنی جو حالتیں انسان پر واقعی گذرا کرتی ہیں یا گذر سکتی ہیں
اور جو معاملات فی الحقیقت پیش آتے ہیں یا آنے ممکن ہیں انہیں سے
واسطہ رکھا ہے۔

ممکن کے یہی معنی نہیں کہ سائنٹیفک ثبوت سے مانا گیا ہو، عام خیال جس کی
تائید کرے وہ بھی مثل ممکن ہے۔

(۳) مناسبت یعنی محل و توقع کا خیال۔ اس میں میر حسن کو خاص ملکہ حاصل
تھا کہ جس موقعے کی جو بات سب سے زیادہ دلکش ہونی ممکن ہے۔
وہ نظر سے نہیں بچنے پائی یہی شاعرِ حقیقی کا کمال ہے[۱]

(۱) اختلاف تو ہر بات سے ہو سکتا ہے اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ میر حسن
کی مثنوی سحرالبیان (جس کا پورا نام کبھی کبھی "مثنوی سحرالبیان یعنی مثنوی
میر حسن معروف بہ بے نظیر و بدرِ منیر" لکھا جاتا ہے) اردو زبان کی سب سے
اچھی مثنوی ہے تو کہیں نہ کہیں سے یہ آواز ضرور آئے گی کہ یہ رائے درست
نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ یہ مثنوی اردو کی بہترین مثنویوں میں
شمار کی جاتی ہے تو شاید کسی کو شدت کے ساتھ اختلاف نہ ہوگا کیونکہ

۱؎ اشرف حسین دیباچہ مثنویاتِ حسن مخزن پریس ۱۹۴۶ء

اس کی کہانی اور انداز بیان میں ضرور کچھ ایسے عناصر ہیں جن کا مطالعہ ان کی عظمت کا پتہ دیتا ہے[۱]۔

کہتے ہیں اگر یہ مثنوی پریوں اور جنوں کی ایک کہانی پر مشتمل ہے اور اس میں سوائے مافوق الفطرت واقعات کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن در اصل پریوں اور جنوں کے پردے میں ہمیں اس کہانی سے شاہانِ اودھ کی پوری معاشرت اور ان کی رنگ رلیوں کا پتہ چلتا ہے۔ آصف الدولہ کے عہد کی پوری تہذیب ہمیں اس مثنوی میں یوں نظر آتی ہے جیسے سینما کے پردے پر کوئی فلم دکھائی جا رہی ہو۔ تمام واقعات من وعن ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے آتے ہیں اور یہی میر حسن کے اندازِ بیان کی خوبی ہے۔

انداز بیں بلا کا سحر ہے اور مثنوی ناقعی اسم بامسمٰی ہے۔ واقعہ نگاری جذبات نگاری جزئیات نگاری بے ساختہ انداز صحیح تناسب اور بیانیہ انداز پر پوری قدرت ہونا یہی ایک مثنوی نگاری کی خصوصیات ہوا کرتی ہیں۔ میر حسن ان تمام لوازمات کے اعتبار سے کامل نظر آتے ہیں اور سحر البیان اردو کی تمام مثنویوں پر بھاری نظر آتی ہے۔۔۔ محاکات کے اعتبار سے یہ مثنوی نادر الوجود ہے۔ جس واقعہ کو پڑھیے آنکھوں کے سامنے ہو بہو تصویر کھنچ جاتی ہے[۲]۔

(۴)

جواب : متقدمین میں سب سے پہلا نام مرزا کا آتا ہے میر حسن کے تذکرہ

---

[۱] احتشام حسین ۔ آجکل ۱۵ مارچ ۱۹۴۵ء، صہ ۱۷ [۲] ابوالحسن نعمی اخبار امروز ۲۵ فروری ۱۹۵۲ء۔

شعرائے اردو میں مروت کا ترجمہ موجود نہیں قیاس چاہتا ہے کہ وہ ۱۱۹۲ھ کے
بعد میر حسن کے شاگرد ہوئے ہوں۔ گلزار ابراہیم (۱۱۹۶ھ) میں ان کے حالات
ملتے ہیں انہیں شیخ محمد کبیر سنبھلی کا بیٹا جرأت کا شاگرد اور نواب فیض اللہ خاں
کی سرکار سے متعلق بتایا گیا ہے۔

۱۱۹۶ھ میں رام پور میں تھے (گلزار صفحہ ۲۲۹) مصحفی تذکرۂ ہندی میں ان کا
تفصیلی حال درج کرتے ہیں بتاتے ہیں کہ طب میں اپنے والد سے رام پور میں تکمیل
کی۔ نجو خاں پسر مقیم خاں کی صحبت سے شاعری کا چسکا پڑا جن ایام میں رامپور میں
قیام تھا ایک دو کہانیاں میر حسن کی مثنوی کی طرز پر لکھ ڈالیں چاہتے تھے کہ
میر حسن کو دکھائیں چونکہ انہیں ایام میں میر حسن وفات پا گئے۔ مروت کو بڑا دکھ
ہوا۔ رفتہ رفتہ انہیں چند قطروں کو دریا بنا لیا۔ چنانچہ جب پانچ چھ سال بعد
بنارس کے سفر سے لوٹے تو سحر البیان کا جواب معنی ہائے تازہ کے ساتھ مہیا
کر چکے تھے۔ قصے کو تھوڑی ہی مدت میں مکمل کرنے کے بعد مصحفی کی ہمسائیگی میں
مسودہ صاف کیا اور شہرت ہو گئی اس کی نازش شاعری اسی مثنوی پر ہے۔
آغاز شباب میں میر حسن کی ترغیب سے فکر شعر کی اور انہیں سے اصلاح لیتے
تھے۔ اس کے بعد جس زمانے میں رستم نگر میں قیام تھا جرأت سے قرب کے
باعث اس کی طرف رجوع کیا اب کسی کی شاگردی کا اقرار نہیں کرتے (تذکرہ
ہندی ص ۲۴۵، ۲۴۶) ان بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۱۹۲ھ اور ۱۱۹۶ھ کے
مابین پہلے میر حسن سے اور پھر جرأت سے اصلاح لی ۱۱۹۶ھ تک اپنے وطن رام پور
میں جا چکے تھے جہاں ۱۱۹۹ھ کے بعد ۱۲۰۰ھ کے لگ بھگ سحر البیان کے جواب
میں مثنوی کے ایک دو ٹکڑے لکھے میر حسن نے محرم ۱۲۰۱ھ میں وفات پائی مروت
پانچ چھ سال بعد بنارس سے لوٹے تو مثنوی مکمل ہو چکی تھی۔ تاہم تذکرہ مجموعۂ نغز میں مروت

کو سودا (متوفی ۱۱۹۵ھ) کا شاگرد بتاتے ہیں (مجموعہ نغز جلد دوم ص ۱۸۰)

تاہم کے تذکرے سے مشتبہ ہوتا ہے کہ شاید مثنوی کا نام قصۂ دلچسپ تھا۔ اب یہ مثنوی ناپید ہے[1] بقول عبدالسلام اصل کے سامنے اس نقل کا چراغ بھی گل ہوگیا۔ اور آج کوئی اس مثنوی کا نام بھی نہیں جانتا[2]۔

محمد بخش مہجور شاگرد جرأت نے نورتن کے نام سے ایک قصہ اردو نثر میں ۱۲۳۰ھ کے قریب لکھا یہ چھپ چکا ہے۔ اس میں مروت کی مثنوی کے تین شعر بقرار ذیل درج ہیں۔ بقول مروت :-

شرا اندیشہ پایا اندرو فرق
شب روز دریائے حیرت میں غرق

(طبع اول ص ۹۹)

بقول مروت ابیات :-

کروں بات کا اس کے میں ذکر کیا
پر اک اس کا ہوتا تھا اتنا بڑا
کہ گر کہکشاں خاک تھی جہاں
وہاں مارتا پھرتا تھا مچھلیاں

(ایضاً ص ۱۴۹)

ان تین شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مروت نے بحر بھی سحر البیان ہی کی استعمال کی ہے اور اسلوب بیان کو بھی حتی الوسع اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ان تین شعروں کی

---

[1] سخاوت مرزا صاحب کی رائے ہیں اس مثنوی کا نام "نذر جعفری" تھا (نوٹس اردو بیتی۔ جولائی ۱۹۵۵ء ص ۲۴) [2] شعر الہند جلد دوم ص ۱۳۴)

بنا پر مروت کے فن کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا جواب لکھنے کی دوسری کوشش بھی اسی زمانے میں رنگین کے ہاتھوں ہوئی۔ رنگین کے تفصیلی حالات اس سے پہلے مناسب مقام پر آ چکے ہیں ان کی ذات میں حد سے بڑھی ہوئی انا نے انہیں میر حسن کا مقابلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ مجالس رنگین میں وہ اس کا اقرار تو کرتے ہیں کہ انہیں سحر البیان سے عشق ہے لیکن در حقیقت وہ جس طرح سودا، میر اور سوز وغیرہ کو استدلال کی کند چھری سے ذبح کرتے ہیں۔ میر حسن کے مقابلے کا خیال بھی ان کے دل میں چٹکیاں لیتا ہے۔ مجالس رنگین ان کی خود فروشی کا یادگار کارنامہ ہے۔ اس میں سحر البیان کی عظمت کے اعتراف کے باوجود میر خلیق، میر ضیا اور میر حسن پر تعریض کے نشتر دبے دبے انداز میں چبھائے جاتے ہیں۔[1] امتحان رنگین میں بھی اپنے آپ کو انہوں نے اردو کا سب سے بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ سحر البیان کی عظمت کے باوجود وہ اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ مجالس رنگین میں یہ احساس بہت حد تک چھپے ڈھکے انداز میں ہے۔ فیض آباد میں وہ نواب مرزا تقی کی محفل میں میر خلیق سے ملے۔ اس سے میر حسن کی سحر البیان کے چار شعروں کا مطلب دریافت کیا:-

مغرق جواہر سے اک جفت کفش — نہ وہ مفت پا بلکہ پا مفت کفش
کہا اس نے اس سے کہ سچ مچ ہے یہ — دیا چھیڑنے کو مرے کچھ ہے یہ
گھڑے دونے ہوتے تجھے سر جوڑ جوڑ — نہ جی گران دیتا ہے بد بد کے ہوڑ
تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار — نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار

گفتم معنی شعر اول دریافت نمی شود و قافیہ شعرہا ہم بطور دیگر باشند

---

[1] تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر زور صفحہ ۱۰۳

البتہ صاحب آگاہی می دانند چیزے بہ چیزے بیان نمودند چند جائے دیگر ہم تسلی نشد یا[1]

یہ فقرے کسی اور دنیا کی خبر دیتے ہیں شروع میں مقابلے کی معمولی کوشش ہوتی ہے ان کی غزل کا مطلع مرزا ابراہیم سے سنا تو جواب کہنے بیٹھ گئے[2] رنگین نے اپنی ایلغہ (۱۱۹۵ھ) کے افسوں مجبور ہو کر بالآخر سحرالبیان کا جواب لکھا اور ۱۲۱۳ھ میں مثنوی دلپذیر کے نام سے اسے تکمیل تک پہونچایا۔ مصحفی اور ان کے رفقاء جو پہلے سحرالبیان کو نگارخانہ چین اور خبر نہیں کیا کیا کچھ قرار دے چکے تھے اب اس کی تاریخیں کہنے لگے۔ یہ مثنوی مکمل طور پر ابھی تک شائع نہیں ہوئی محمد علی خاں اثر رامپوری نے مثنوی دلپذیر مصنفہ رنگین کے عنوان سے معاصر حصہ سوم صد ۱۳۱ تا صد ۱۳۲) اس پر مفصل مضمون لکھا ہے اور اس میں طویل اقتباسات درج کئے ہیں، اس مضمون میں انشاء، قتیل، مصحفی، جرأت، فراق، مان سنگھ، راغب اور آشفتہ کی تاریخیں درج ہیں۔ ان میں قتیل مصحفی، جرأت اور فراق نے مثنوی دلپذیر کو سحرالبیان سے ٹکرا دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

قتیل :-

شد بدوں از دلِ صغیر و کبیر
الغتِ بے نظیر بدر منیر
بہ تکوں بد ربائے طبع دلزم ندا
دیدِ تاریخ داشدہ جویا
موجِ مضمون زغیب داد خبر
ایں کتاب است لجۂ گوہر

---

[1] مجالس رنگیں ۱۲۱۵ھ مرتبہ مسعود حسن رضوی صد ۱۲۶ء [2] ایضاً صد ۵

مصحفی :-

اس کہانی میں جب کہ رنگین نے
حرف اپنا کہا چکیدۂ دل
اس کے نقشے کے سامنے فی الحال
نقشِ سابق ٹھہر گئے باطل
دیکھ رنگینیٔ کلام اس کی
خوں میں لوٹے حسود جوں بسمل
جس نے دو داستانیں اس کی سنیں
جان و دل سے وہ ہو گیا مائل
گرچہ سائل اس کے کر چکے تحریک (کذا)
دلی اور لکھنؤ کے سب قابل
لیکن آخر جو مصحفی کے ہیں پاس
لائے باکِ خوں وہ جادوئے بابل
پڑھ کے دس پانچ داستاں اس کی
وہیں تاریخ کی ہوا سائل
گر نظر اس نے اس کے نقشے پہ
بہشتِ حسن و ناز الحاصل
لیے قلم دل کا سمت یہ لکھا مصرعہ
مثنوی ہے کہ نقشِ چینِ دلچسپ گل

جرأت :-

سنتا ہے یہ پدید منشیوں سے پڑھ کر

فراق :-

دلق رنگین پنہا کے اُس کو دیکھ
اُس کی یدرِ منیر سے مبٹھیں

سحرالبیان کے مقابلے کی یہ شعوری کوشش تھی اس کا احساس سید انشا رکھتے ہیں چنانچہ انھوں نے پھبتی کے انداز میں دریائے لطافت میں سحرالبیان اور مثنوی دلپذیر کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

"اور سب سے زیادہ اور سنیے کہ سعادت یار خان سپہ کا بیٹا اونچی ریختہ کا آگو جانتا ہے۔ رنگین تخلص ہے ایک قصہ کہا ہے اس مثنوی کا دلپذیر نام رکھا ہے۔ رنڈیوں کی بولی ہمیں باندھی ہے۔ میر حسن پہ زہر کھایا ہے"[۱]

مثنوی میں تاریخی قطعوں کو چھوڑ کر کُل دو ہزار شعر ہیں۔ ۱۲۱۰ھ میں تکمیل کو پہونچی شہر بلغار کے بادشاہ کا حال لکھا ہے کہ ۷۰ سال کا ہوا لیکن کوئی بیٹا وارثِ تخت و تاج نہ تھا۔ نجومیوں نے بتایا کہ قسمت میں بیٹا لکھا ہے شرط یہ ہے کہ ماں اس کی پری ہو چنانچہ اسم اعظم کی برکت سے جادو کا قلعہ مسمار ہوا پری ہاتھ آئی اس کے بطن سے مہ جبین پیدا ہوا۔ مہ جبیں چودہ برس کا ہوا تو بادشاہ نے سلطنت اس کے حوالے کی۔ مہ جبین نے سرکاری کتاب خانے میں ایک حسینہ کی تصویر دیکھی اور اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا یہ کہانی اسی طرح طلسمات کی سرزمین میں چکر کاٹتی ہے۔ جادوگرنیاں ہیں درخت اڑتے ہیں۔ شہزادہ آزمائشوں میں گرفتار ہوتا ہے۔ پریاں عاشق ہوتی ہیں۔ تلاش جاری رہتی ہے۔ بنارس میں انھیں پتہ چلتا ہے کہ تصویر پری گل کی

---

[۱] دریائے لطافت طبع انجمن ترقی اُردو صفحہ ۵۲،۵۱

رانی نازنین کی ہے جو مردوں سے نفرت کرتی ہے۔ شہزادہ زنانہ لباس پہن کر وزیر زادے کو ساتھ لے کر سری نگر جاتا ہے اور باغِ دلکشا میں داخل ہوتا ہے جہاں رقص و سرود کی محفل چل رہی ہے۔ یہاں مہ جبیں نے اپنا نام لخند مالی بتایا اور شہزادی سے مردوں سے نفرت کا راز پوچھا۔ اس نے پچھلے جنم کی حکایت بیان کی اس کے بعد شہزادہ پھر نیپال میں آیا۔ پچاس آدمی ساتھ لئے۔ عورتوں کے لباس پہن یہ سب سری نگر آئے۔ یہاں لڑائی ہوئی۔ بہت سی عورتیں تہِ تیغ ہوئیں۔ نامہ و پیغام کے بعد صلح ہوئی۔ مہ جبیں اور نازنین کی شادی ہو گئی۔ قصے کے دو ذیلی کردار مہ جبین کا وزیر دانشور اور نازنین کی دوست بہرور کی بھی شادی ہو گئی۔ اب شہزادہ اپنے ملک کو لوٹا وہاں آ کر معلوم ہوا کہ مہ جبیں کے ماں باپ انتظار میں مدتوں پہلے دم توڑ چکے ہیں۔

قصے کے مختلف نقوش سحرالبیان کے بہت زیادہ مرہونِ منت ہیں۔ اسی کہانی کو ادل بدل کر بعض تفصیلات نئی مہیا کر کے اور اختتام کو طربیہ کی بجائے المیہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ صاحب گلِ رعنا کے خیال میں سحرالبیان کے بعد مثنوی دلپذیر زبان کی صفائی اور پاکیزگی میں اس زمانہ کی بہترین تصانیف میں شمار ہونے کے قابل ہے۔[1] لیکن حقیقت یہ ہے کہ مثنوی دلپذیر اس دور کی دوسری عام مثنویوں سے کسی طرح بھی بلند نہیں ہے۔ رنگین کی انفرادیت اس میں کہیں بھی نہیں ابھر سکی۔ مناظر کی تصویر کشی اور واقعات کے بیان میں رنگین نا پہلو تہی حسن سے ہر جگہ دیتا ہے۔ مندرجہ ذیل منظر اس کا بین ثبوت ہے :—

دولہا کا لباس

تھی وہ نیمہ جو رنگ کا بھاری   لکھوں کس طرح اس کی تیاری

---

[1] گلِ رعنا صـ ۶۲۸

تو وہ صورت بھی کچھ زیادہ نہیں ۔۔۔ اور بگڑی نہ سونی آہ یہیں کہیں

کیا اک ستار نے تھا ایسا کام ۔۔۔ کہ کہیں ہمیں تھا نہ ددخت کا نام

مرشد آباد سے منگایا تھا ۔۔۔ بڑی محنت سے ہاتھ آیا تھا

رکھ کے منجاب اور اس میں ٹانک ۔۔۔ تو ٹیاں دی تھیں اس کے اوپر ٹانک

پر وہ تھیں تو تبیال جڑاؤ تمام ۔۔۔ عقل کرتی نہ تھی کچھ اس جا کام

اور تماہی کی اس میں تھی منجاف ۔۔۔ تھے مغزی کی جا سجے موتی صاف

اسکو نیمہ کہو تو نیمہ نہ تھا ۔۔۔ ایک دریا تھا وہ جواہر کا

مہ جبیں نے بہت کر اسکو پسند ۔۔۔ بس گلے میں پہن کے باندھے بند

وہ جو چہرہ دھانکے کی تھی بڑی دستار ۔۔۔ سج لیا سر پہ اس کو چوتی دار

رنڈیوں کی بولی اور محاکات کا رکھ رکھاؤ وہی ہے جو سحرالبیان میں ہے لیکن نہ وہ زور ہے نہ وہ بانکپن ۔ خالی خولی نقالی ہے ۔ بے مزہ اور بے نمک ان معاملات میں صاحب گل عنا کی رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے ۔

(۵)

تلمیح :- سحرالبیان کے زیر اثر رنگین نے کم معروف شعرا نے بدرجہا بہتر مثنویاں کہی ہیں ۔ ان میں سے کسی کو جواب کا دعویٰ نہیں ۔ شاید اسی لئے ان کی مثنویاں رنگین سے اچھی ہیں اگرچہ ادبی اعتبار سے سحرالبیان کی ٹکر کی نہیں ہیں لیکن بعض خوبیاں انہیں قابل ذکر مقام عطا کرتی ہیں ۔

شیر علی افسوس نے آصف الدولہ کی ہولی پر مثنوی لکھی ہے جو معاصر حصہ اول صـ۱ تا صـ۲ میں چھپ چکی ہے کل ۲۲۰ شعر ہیں یہ اس وقت لکھی گئی جب افسوس جہاندار شاہ کی سرکار میں متعلق ہو چکے تھے ۔ اس میں جہاندار شاہ کی تعریف بھی ہے

اور آصف الدولہ کے "جشن ہولی" کی کیفیت لکھی ہے۔ جہاندار شاہ سنہ ۱۱۹۸ھ میں لکھنؤ آگئے تھے اور ذی الحجہ کے عشرۂ دوم سنہ ۱۲۰۰ھ میں بنارس چلے گئے۔ میر حسن بھی ان کے ساتھ بنارس گئے۔ ظاہر ہے یہ ہولی کا تہوار جس پر یہ نظم کہی گئی ہے سنہ ۱۱۹۸ھ اور سنہ ۱۲۰۰ھ کے درمیان ہوا ہوگا۔ سحر البیان سنہ ۱۱۹۵ھ میں تکمیل کو پہنچی۔ ہولی کی مثنوی پر اس کا بڑا گہرا اثر ہے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے

یہ ابرق کے ریزے لگے تھے اڑنے
سروں پر وہ ہو ہو جنہیں کے پڑے

عجائب تھی بالوں میں ان کی دمک
اندھیرے میں جگنو رہیں جوں چمک

بکثرت ہر اک طرف بجتے ہیں ساز
ہر اک شمع رو ہے وہاں گرم ناز

تنبورے پہ کوئی چڑھاتا ہے تار
ادا سے بجاتا ہے کوئی ستار

ہر اک طرف مطرب خوش آہنگ ہے
جدھر دیکھئے نغمۂ چنگ ہے

رباب ادھر اور ادھر بین کار
لگی ہونے آپس میں تانوں کی مار

کہیں زمزمہ ہے کہیں ہے الاپ
کہیں لگ رہی ہے پکھاوج کی تھاپ

کسی طرف ڈھولک کہیں ہے مچنگ
جدھر دیکھئے ہے ادھر راگ رنگ

یہ طبلے کی پہنچی فلک تک گمک
صدا سے ہوئے محو حور و ملک

کھڑی ہیں دو رستہ پری طلعتیں
کہ دیکھ ان کو حوریں بھی حیراں رہیں

دکھاتی ہے ہر ایک چہرے کے چھب
جتاتی ہے ہر ایک اپنا کسب

لگت (؟) کوئی کرتا ہے انداز سے
کھڑی کوئی لیتی ہے گت ناز سے

کوئی ناچ جاتی ہے ایسی چمک
کہ دیکھ اس کو رہ جائے زہرہ جھجک

مسلسل کی کوئی دکھا کر دھمک
یہ کہتی ہے بجلی کو یاں سے سرک

کوئی بھاؤ بتلا کے کھوتی ہے مت
نشے میں کوئی بھولی جاتی ہے گت

بنا کوئی انگشت کو دیتی ہے جھانپ
کوئی سر سے دامن سے نیفے کو ڈھانپ

ہر اک میں تھی روشن وہ شمع سفید — صباحت صبا جس سے لے روز عید

وہ تالاب ہے اس کے آگے بھرا — کہ سرچشمہ کہیئے اسے نیل کا

یہ شفاف ہے موجزن اس میں آب — کہ دیکھے اس کو یا تما ہو وہ خوش آب . . . .

یہ گرد اس کے روشن چراغوں کے جھاڑ — چمکتے ہیں جیسے طلائی پہاڑ

چراغوں کی تھی روشنی کا یہ روپ — شب ماہ کے بیچ چھٹکی تھی دھوپ . . . . .

یہ کثرت ہوئی نور کی بر زمیں — کہ جا گہ نہیں نور ماہ کی کہیں . . . .

جہاں تک وہاں ماہوش جمع تھیں — ہوئیں مستعد ناچ کی ہر کہیں

ہر اک اپنی سج دھج بنانے لگی — ہر اک ہنسنے گھنگرو منگانے لگی

کوئی اپنی چیب کو سنوارے کھڑی — کوئی سا تھیوں کو پکارے کھڑی

سماجی بھی سازوں کے سر کو بنا — بجانے لگے بس شتابی سے آ

ہر اک نازنیں اپنے چمکا کے ہاتھ — لگی رقص کرنے شرارت کے ساتھ

چمک کر وہ گت سے کے جب آئی مڑ — تو زہرہ کے بھی ہوش سب جائیں اڑ

کمر کھائے مڑنے سے گر تک لچک — تو اک ناز سے جائے پیرو بہک . . . .

کبھی لیوے گت ڈگال پہ دھر کے ہاتھ — چمک کر دکھائے کبھی اپنی گات . . .

اسی طرح کا داں ہر اک دلربا — دکھاتی تھی عالم نیا ناچ کا

ہر اک گا رہی تھی تھرکنے سے کھڑی — اک انداز سے لیتی تھی گھنگھری . . .

ہوئے اس قدر لوگ یک بار مست — مثل ہے کہ در مست، دیوار مست

کہ افسوس اس کو دعا پر تمام — بحق محمد علیہ السلام

۱۲۲۸ اشعار کی اس مثنوی میں میر حسن کا اثر جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ نمونے کے طور پر یہ صرف چند شعر انتخاب کئے گئے ہیں جو قدر و قیمت کے لحاظ سے نگینے کی طرح دوسرے اشعار کے مقابلے میں بہتر قسم کی شاعری پیش کرتے ہیں۔

اسی طرح میر حسن کے ایک اور معاصر مہدی علی عاشق تھے جن کے خاور نامے میں سحر البیان کے اثرات جھلکتے نظر آتے ہیں۔ خاور نامے کا قصہ سب سے پہلے گجرات کے شاعر رستمی نے نظم کیا تھا۔ تہمینہ لودھی ہاشمی کی رائے میں کمال خان رستمی محمد عادل شاہ کے زمانے کے شاعر ہیں۔ سنہ ۱۰۵۹ھ میں محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان عرف بڑی صاحب کی فرمائش پر ڈیڑھ سال کی مدت میں چوبیس ہزار اشعار کی مثنوی تکمیل کو پہونچی [2] یہ مثنوی ہماری نظر سے نہیں گزری یہ کہنا مشکل ہے کہ مہدی علی عاشق نے اپنے خاور نامے میں اس مثنوی سے کس قدر فائدہ اٹھایا ہے۔ مہدی علی کے حالات مجموعۂ نغز اور سخن شعرا میں موجود ہیں اور اسپرنگر نے بھی عمدہ منتخبہ کے حوالے سے کچھ اطلاع مہیا کی ہے۔ قاسم کے مجموعہ نغز سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مہدی علی نواب علی مردان خان کے خاندان سے تھا۔ تین دیوان ریختہ کے اور دو دیوان فارسی کے یادگار چھوڑے۔ اس کے علاوہ حملۂ حیدری۔ یوسف زلیخا۔ لیلیٰ مجنوں۔ اور شیریں خسرو کے قصے ریختہ میں نظم کئے۔ شاہنامے کو نظم کرنے کا ارادہ تھا لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ تقریباً بارہ برس بلاناغہ ہر جمعے اپنے ہاں مشاعرہ کرتا تھا۔ چالیس برس ہوئے وفات پائی [3] عبدالغفور نساخ انہیں نواب علی مردان خان کا نبیرہ لکھتے ہیں اور ان کے اشعار کی مجموعی تعداد دو لاکھ کے قریب بتاتے ہیں [4] اسپرنگر عمدۂ منتخبہ کے حوالے سے اسے علی مردان خان کا پوتا بیان کرتے ہیں اور لکھنؤ کی تعریف میں ایک مثنوی کی تصنیف بھی اس سے منسوب کرتے ہیں۔ جو شعراء ان کے مشاعرے میں آتے تھے ان کے حال میں ایک تذکرہ بھی لکھا ہے [5]

---

[1] خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۱۵۸ [2] دکن میں اردو طبع ثالث ص ۱۳۶، ۱۳۷ [3] جلد اول ص ۳۷۹
[4] سخن شعراء ص ۳۱۷ [5] یادگار شعراء اردو ترجمہ اسپرنگر ص ۱۳۷، ۱۳۸

خاور نامے کے بارے میں دتا سی ہمارے واحد راوی ہیں اور وہ اس کا نام خاور شاہ بیان کرتے ہیں۔ ویسے ناموں کی رعایت سے اسے خاور نامے کی بجائے قصۂ ماہ لقا و قمر طلعت کہنا چاہیے۔ ہمارے سامنے خاور نامے کا جو قلمی نسخہ ہے وہ خاندان خبطہ قلی عادل شاہ کی ملکیت ہے اور ۱۰ جمادی الثانی ۱۲۲۵ھ کا مکتوبہ ہے۔ کاتب کا نام درج نہیں ہے۔ مالکوں کا بیان تھا کہ میر حسن دہلوی کی تصنیف ہے لیکن ظاہر ہے انھوں نے اندازِ بیان کی مشابہت سے دھوکا کھایا ہے۔ قصے کے دوران میں شاعر نے اپنی غزلیں بھی جا بجا لکھی ہیں اور ان میں اپنا تخلص بھی استعمال کیا ہے۔

غم سے جی ایک دن جو گھبرایا — شعر عاشق زبان پر لایا [۱]

چھپ رہے کیونکر نہ یار کو عاشق — کیا کرے جب نہ اختیار چلے [۲]

دل عاشق ہے غم ہو یارب دور — رہے مہدی علی سدا مسرور [۳]

اپنے دبیتوں میں عبدرے خاں آشفتہ اور غلام حسین شکیبا کا ذکر کیا ہے۔ آشفتہ نے اس مثنوی کی تاریخ بھی کہی ہے۔

نکتہ دان رمز فہم سحر بیان — خانِ آشفتہ یعنی عبدرے خاں

دوستی ہے مجھے انھوں کی بہ کمال — میرے مشفق ہیں وہ ستودہ خصال

یہ کہانی انھوں کو جو بھائی — طرز اس کی بہت ہی خوش آئی

دو ہی تاریخ کے ہوئے درپے — خوش ہو بولے یہ باغ معنی ہے [۴]

"یہ باغ معنی ہے" سے ۱۲۰۲ ہجری برآمد ہوتے ہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب

---

۱ ۱۳۶ ب — ۲ ۱۴۸ الف

۳ ۱۶۶ ب — ۴ ۱۶۷ الف

کی رائے میں "بے باغ معنی ہے"۔ سنہ ہونا چاہیئے اس حساب سے ۱۲۱۳ھ ہوتا ہے۔
کتاب کی ابتداء حمد، مدح شاہ عالم بادشاہ۔ مدح نواب معین الملک بہو المدولہ مرزا جلیل الدین خان بہادر میر آتش سے ہوتی ہے۔ آغاز داستان سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصر جنگ کی فرمائش پر یہ قصہ نظم ہوا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ قصہ عاشق کی اپنی ایجاد ہے۔ قصے کے دو مرکزی کردار مہ لقا اور قمر طلعت ہیں۔ مہ لقا کے والد کا نام خاور شاہ تھا جس کے ہاں اولاد نہ ہوتی تھی۔ شمس تبریزی کی دعا سے مہ لقا پیدا ہوا۔ بچپن ہی کا تھا کہ قمر طلعت پری اس پر عاشق ہو گئی۔ وہ بھی دل دے بیٹھا اور تلاش و جستجو میں جنگلوں میں نکل کھڑا ہوا اور ہمایوں شاہ کے شہر میں جا بیٹھا۔ یہاں سے مصائب کا آغاز ہوتا ہے۔ کئی طلسمات سے دو چار ہوا۔ شہپال تک رسائی ہوئی جس نے قمر طلعت کی شادی کے لیے چار شرطیں بیان کیں۔ ان شرطوں کو معلوم کرنے کے لیے پھر چل کھڑا ہوا۔ قمر طلعت کے والد شاہ بدر منیر سے ان چار شرطوں کا علم ہوا۔ ایک بار پھر طلسمات سے دو چار ہونا ہوا۔ شرطیں پوری کرنے میں کامیاب ہوا اور قمر طلعت سے شادی ہو گئی۔ اس کے بعد شاہزادہ وطن کو لوٹا اور اپنے باپ سے ملا۔

---

۵ فہرست کتب خانہ ذاتی میں یہ کتاب ۴۲۸ نمبر پر یوں لکھا ہے۔ "قصہ خاور شاہ" مثنوی اردو از مہدی علی عاشق دہلوی تقریباً ۴۷۵ اشعار (VERS) اس کا نام قصہ قمر طلعت بھی (ہے) دیباچہ میں نواب نصیر (NACIR) جان وزیر شاہ عالم کا ذکر، تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۳ھ میں لکھی گئی
مصور، صفحات ۴۴

(مقالہ: قاضی عبدالودود صاحب نوائے ادب بمبئی جنوری ۵۲ء)

خاور نامے کے یہ کردار سنہ ۱۲۳۱ھ میں ذرا بدلے ہوئے پارٹ کے ساتھ قصۂ دلپذیر میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہی کردار رجب علی بیگ سرور کے فسانۂ عجائب (سنہ ۱۲۴۰ھ) میں آتے ہیں۔ مہر طلعت۔ انجمن آرا۔ شہپال جادوگر، پیرمرد۔ شاہ فیروز بخت اور وزیرزادہ فسانۂ عجائب میں گھومتے پھرتے ہیں۔

انداز بیان کے اعتبار سے مہدی علی عاشق کی تصنیف پر سحر البیان کی چھاپ بڑی گہری ہے۔ موسیقی کی پیدائش کا منظر دیکھئے

ماننیا وقت عیش و راحت ہے — جلوہ گر کوکب سعادت ہے
دے کے جام شراب کر مسرور — اختر سعد کا ہے آج ظہور
شاہ یہ باتیں کرتا بیٹھا تھا — اتنے میں یک بیک کسی نے کہا
کہ لے شہ داد گر ملا تک خبر — شاہزادہ تجھے مبارک ہو
شہ نے سن کے کھلا منہ خزانے کا — ہوا مصروف زر لٹانے کا
آئے سب جمع ہو کے اہل نشاط — تھے جہاں بیچ جو کہ اہل نشاط
پہنی پوشاک شاہ نے اس دم — کیا کہوں اوس لباس کا عالم
باندھی دستار سر پہ مقیشی — جان خورشید صدقے جسکے ہوئی
جیغۂ الماس کا دھرا سر پہ — پڑتی تھی جس کی جا کے اہل پہ نظر...
ایک پکھراج کا نیا سر پیچ — باندھ سر پہ وہ خوشنما سر پیچ
گلے میں باندھ لعل کا کنٹھا — پہنی پھر موتیوں کی اک مالا...
ہو کے پھر تخت پہ وہ شاد سوار — چلا دیوان عام کو یک بار...
راگ تھا، ناچ تھا، تماشا تھا — گویا اندر کا وہ اکھاڑا تھا...
اور بزم محل کا اب احوال — کیا کہوں میں زبان ہے گنگ لال
ہو رہا تھا وہاں بھی راگ و رنگ — کہیں طبلے تھے اور کہیں مردنگ

واں کا عالم نہ یاں سے کچھ کم تھا
رنگینیِ مستی کی کوئی جھماتی تھی
کوئی کرتی تھی بال اپنے صاف
کوئی نظروں میں کام کرتی تھی
لے گئے منہ پہ دوپٹے کو کوئی
کوئی چھاتی سے لگ کے ہٹ جاتی
کوئی دامن کو مار کر ٹھوکر
بانوؤں کی کوئی کنگنی تھی دکھلاتی
کوئی گالی کسی کو دیتی تھی
کوئی کہتی تھی چل یہی کیا ہوں مفت
ہنستی تھی کوئی مار ہاتھ پہ ہاتھ
کوئی تھی سن کے عذر میں جیورا

اب ایک جشن کا منظر دیکھئے :-

تخت پریوں کے اسنے میں آگئے
ہر پری نے تار کیا تھا بناؤ
زعفرانی کسی کی تھی پوشاک
کوئی دکھلاتی پاؤں کا توڑا
کوئی دودامی پہنے تھی انگیا
کنج کسی کو کرتی تھی دکھلاتی

اب شادی کا منظر ملاحظہ فرمائیے -

آئی نوشہ کی جب برات کی رات
لگے نقارے بجنے ڈول دول دول

ہر کسو کا ہے ابھی عالم تھا
پھیلے کاجل کوئی بناتی تھی
کوئی چمکاتی تھی دزدی کا مباف
اک نگاہ میں غلام کرتی تھی ....
پردۂ شرم میں سے دیکھتی تھی
کوئی کچھ دے کسو کو ڈھکاتی (۲)
نکل آتی تھی گھر سے اٹھ باہر
کوئی پھرتی تھی حسن کی ماتی
کوئی بلائیں کسو کی لیتی تھی
کوئی کہتی تھی بیٹھی طاق اور جفت
کوئی پھرتی تھی واں کسو کے ساتھ ....
اور جوانی میں کوئی تھی معشوقہ (۱)

جلوے سو سو طرح کے دکھلائے
رنگ کا ایک سے نیا تھا چاؤ
سرخ جوڑے میں کوئی تھی چالاک
آگرئی تھا کسی کا [illegible] جوڑا
تھا خمسے کا کناروں پہ مینا
کوئی چھینٹ مار کر چھپاتی

بیاہنے کو چلا وہ نیک صفات
مل گئی زیر بم سے بحر شگون

وہ طلائی چھتیں رو پہلی در ‏— وہ چقیں اور سائبان پر زر

در و دیوار کی وہ گل کاری ‏— فرشِ زر لفت کی وہ تیاری...

صحن جوں آئینہ تھا صاف تمام ‏— نہر چوپڑ کی تھی مرصع کام

بید مشک اور گلاب سے لبریز ‏— لہر اس نہر کی تھی نکہت خیز

سرو بھی گرد گرد یوں چھپاں ‏— جوں قدح مہوشاں ہو ہلو، کہاں

بادلے میں درخت لپٹے تھے ‏— اور تمامی میں تخت لپٹے تھے

بوئے گل سے مہک رہا تھا چمن ‏— کہیں زنبیق تھی کہیں سوسن

کہیں نسرین و نسترن کی بہار ‏— کہیں لالہ و یاسمن کی بہار

تختہ تختہ کہیں کھلا تھا گل ‏— کہیں کرتی تھی چہچہے بلبل

کہیں تھا موتیا کہیں بیلا ‏— خشخش پیجاں کہیں تھا البیلا

کہیں مہندی کی تھی کھنچی دیوار ‏— گل مہندی کی اور کہیں تھی قطار

کہیں گیندا کھلا کہیں شبو ‏— کہیں تھی رائے بیل کی خوشبو

دستہ دستہ چمن کھلا تھا واں ‏— کتنی تحریریں تھیں گلوں کی بیاں...

سبزہ ہر طرف لہلہاتا تھا ‏— پانی نہروں سے بہ بہہ آتا تھا...

وہ پری زاد کی نرالی صف ‏— وہ طوائف کا حلقہ ایک طرف...

وہ طوائف کی چہلیں آپس میں ‏— کھانیاں چھوٹی چھوٹی وہ قسمیں

تھا مندر پری کا وہ آنا ‏— اپنی سج دھج ہر اک کو دکھلانا

آنا سازندوں کا وہ لے لے ساز ‏— سر ملانا بہم لگا آواز!

طبلوں کو کھینچ کھانچ دینا تھاپ ‏— سوہنی کی وہ سوہنی کا الاپ

تان پہلے بہل کی وہ گہری ‏— اور سارنگیوں کی وہ لہری!

وہ چھوا سر سے اور پکڑ کر کان ‏— پاؤں میں گھونگرو، پہن اس آن

مہر لیوا، کو الٹ جھٹک دامن — اٹھنا اس نازنین کا بن ٹھن

کر وہ انگیا کو ٹھیک، ٹھاٹ اور چست — آرسی دیکھ کر بھنوؤں کو درست

گت میں پھر آکے ایسی لے ٹھوکر — گرنا وہ شائقوں کا غش ہو کر

وہ اٹھا ہاتھ وہ بتانا بھاؤ — وہ نشے کی ترنگ دل کا چاؤ

وہ دوپٹے کی اوٹ شرمانا — بڑھ کے اک بار اور ہٹ جانا

لینی چک پھیری وہ نئی گت سے — ناز و انداز سے نزاکت سے

وہ کمر کو ادا سے لچکانا ! — چھاتیوں کو ابھار دکھلانا ....

تال و سم پر قدم کا پڑ جانا — آنکھ کا ہر طرف کو لڑ جانا

کان پر رکھ کے ہاتھ لینا تان — آن میں اک نئی دکھانی آن

گانا وہ لاڈلے بنے تو جی — نا در در تنم ری ری :

گائے ایسے خوشی کے ان نے خیال — کہ اٹھا دل سے عاشقوں کے ملال

آدمی و پری در و دیوار — بے خود و مست ہو گئے یک بار

ناچ کا بندھ رہا تھا یاں یہ سماں — سمدھنوں کا تھا غل محل میں وہاں

اور اترنا انہوں کا میانے سے — چھیڑنا وہ ہر اک بہانے سے

وہ دکھانی ابھر ابھر کے پھبن — وہ جوانی کے دن نیا جوبن

سہرے ہنس ہنس سہاگ کے گانے — ہار گل کے گلوں میں پہنانے

قہقہے گالیاں وہ دے دے تال — وہ انہوں کے نئے پرانے خیال

چہچہے لال لال وہ جوڑے — ڈگمگاتے سنہرے وہ توڑے

وہ کڑے وہ چھڑے وہ بانکے طور — پشوازوں کے وہ سجیلے دور

بند روی ازار کی وہ بھڑک — سرخ نیفوں کی وہ کمر سے ڈھلک

وہ سجیں وہ دھجیں وہ جی کے چاؤ — وہ دکھانے نئی چمک کے بناؤ

وہ ٹھٹھولے وہ چوچلے باہم — وہ محل بیگمات کا عالم!

وہ لٹکنا دو شالوں کا سر سے — وہ بندھے جوڑے سر پہ عنبر سے

وہ ہنسی جی کی وہ دلوں کی امنگ — وہ ہنسی وہ خوشی وہ راگ و رنگ

واں کا عالم غرض کہوں میں کیا — کہ نہ دیکھا کہیں نہ میں وہ سنا

اب وصل کا منظر دیکھئے :-

(۱۵۸ الف تا ۱۶۱ ب)

اب آن پہونچا جو وصل کا ہنگام — دولھا دلھن نے پھر کیا آرام

تھا چھپر کھٹ جو ایک موتی کا — ایک جا اس میں دونوں بیٹھے جا

ہٹ گئیں وہ جو تھیں خواصیں پاس — پھر ہوئی چھیڑ چھاڑ بے وسواس

بڑھنا ہاتھوں کا وہ کہیں کا کہیں — ہاں ادھر سے وہ اور ادھر سے نہیں

ایک کا ایک سے لپٹ جانا — سسکی (؟) پھر ایک کا وہ ہٹ جانا

ہوئی باہم جو دست اندازی — لگی کرنے صبا بھی غمازی

رفتہ رفتہ کیا جو شوق نے جوش — ہوئے بے اختیار ہم آغوش

مل کے آپس میں ہو گئے یوں وصل — ہوئے بادام توامان جوں وصل

عقل دانائی ہوئی تھی واں گم — خوشہ سے جوں نکل گئی گندم

اوٹھ گیا درمیاں سے شرم و حجاب — کشتِ امید ہو گئی سیراب

پی کے باہم اٹھے شرابِ وصال — کوئی خوشحال اور کوئی بے حال

(ص ۱۶۳ الف و ب)

ان اشعار پر میر حسن کا پرتو خاصا ہے۔ حتیٰ کہ بعض جگہ تو تقلیدی عناصر سے مناظر کا مزہ کرکرا کر دیا گیا ہے یہ معمولی درجے کی میر حسن پرستی ہے۔ ہاں تفاصیل مقابلتاً زیادہ ہیں لیکن ان سے احساسات میں مزید وسعت اور تنظیم پیدا نہیں ہوتی۔ اس دور میں مثنوی گل وصنوبر بھی اہم ہے۔ دیوان سودا اور

کے ساتھ ایک ہی جلد میں بندھی ہوئی یہ مثنوی ہمارے پیش نظر ہے۔ اس قلمی نسخے کا ترقیمہ ناقص ہے جس سے سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلتا۔ گل وصنوبر کے آخر میں صرف اس قدر لکھا ہے:

تمام شد کتاب گل صنوبر بتاریخ بیستم ہشتم (کذا) ماہ ربیع الثانی بتاریخ بقلم نیاز رقم محمد صدیق بہ تحریر رسید۔ تم تمام شد۔

اندازِ نگارش اور کاغذ سے تیرھویں صدی کے اوائل کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔ تیس صفحات کی اس مثنوی کے اشعار کی تعداد ۵۹۰ ہے۔ مصنف کا نام معلوم نہیں اشعار سے لکھنویت چھوٹی پڑتی ہے۔ شروع میں شاہ کی تعریف اور اس کے بیٹوں (سکندر شکوہ اور سلیمان شکوہ) کے نام ایک خاص ڈھنگ سے آئے ہیں جس سے زمانۂ تصنیف کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ جہاندار شاہ شعبان ۱۲۰۲ھ میں فوت ہوئے۔ سلیمان شکوہ ۱۲۰۵ھ میں لکھنؤ آئے اور ذی قعدہ ۱۲۵۴ھ میں آگرے میں پیوند خاک ہوئے۔ سکندر شکوہ جولائی ۱۸۳۶ء (جمادی الاول ۱۲۱۲ھ) میں پھانسی چڑھے۔ جہاندار کا ذکر اس کتاب میں نہیں اس لئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ۱۲۰۲ھ کے بعد تالیف ہوئی۔ شاہ عالم ثانی کی بادشاہت ۱۲۲۱ھ میں ختم ہوئی۔ اس لئے گل وصنوبر کا زمانۂ تالیف ۱۲۰۲ھ اور ۱۲۲۱ھ کے مابین قرار پاتا ہے۔ شاہ رعنا، والیٔ یمن کا جوان بیٹا تھا جس کی عمر سولہ برس کی تھی۔ اس کا نام گل تھا۔ ایک رات چاندنی میں سویا۔ صنوبر پری (عمر چودہ سال) اس پر عاشق ہوئی اسے بیدار کر کے باتیں کرتی رہی۔ واپس لوٹی تو اس وقت تک شمشاد پری زاد کی معرفت اس کی ماں کو اس کا علم ہو گیا تھا۔ صنوبر قید کر دی گئی۔ ادھر ہجر میں گل کو غش آنے لگے۔ ہر شام انتظار کرتا۔ لیکن بے سود۔

جو پینے کو پانی کسی نے دیا   لہو کا سا لیہ گھونٹ پی رہ گیا

صدا خونِ دل اپنا پینا اسے — غم و درد کھا کھا کے جینا اسے
جو بولا کوئی پھیر منہ کو لیا — جو چھیڑا کسی نے بہت رو دیا
نہ کھانے نہ پینے نہ سونے سے کام — شب و روز بس اس کو رونے سے کام

(ص ۱۲)

ماں باپ نے یہ حال دیکھا تو طبیبوں سے مشورہ کیا فصد لینے کی تجویز ہوئی لیکن گل نے اپنے دل سے فیصلہ کیا تو صحرا نوردی کی صلاح ٹھہری جب محل میں اس کی خبر ہوئی تو کہرام مچا۔

جب پہونچی محل میں یہ پر غم خبر — خواصیں لگیں چاک کرنے جگر
کوئی اپنے دانتوں میں انگلی دبا — لگی کہنے ہے ہے غضب کیا ہوا
کوئی باولی بن کے پھرنے لگی — کنوئیں میں کوئی جاکے گرنے لگی

(ص ۱۴)

ماں بھی بیہوش ہوئی چھوٹی بہن نازلو کو بھی غش آیا۔ سب گھر والے دیوانے کے پیچھے پیچھے چلے۔ روم کی سرحد تک گئے وہاں سے واپس لوٹ آئے:

نہ مونس کوئی اور نہ غم خوار تھا — فقط ایک غم اس کا ہمدم رہے

(ص ۱۵)

سال بھر موسم کی سختیاں جھیلتا گرتا پڑتا ایک درخت تک پہونچا اس پہ ایک طوطی اور مینا باتیں کر رہے تھے۔ پرستان کی حسینہ کی آہ وزاری کا ذکر کرتے تھے جو فیند میں پڑی تھی۔ صبح ہوئی تو گل پرندوں کے پاس آیا وہ اڑ گئے پھرتے پھراتے خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ ان کی راہنمائی میں ایک عمارت پہ پہونچا وہاں ایک پری اس پہ عاشق ہوگئی اس نے گل کو ساتھ لے جا کر طلسمات کے باغ میں رکھا اور ہدایت کی کہ کسی پھول کو نہ چھونا گل نے پھول چھو لیا طلسمات

کا باغ درہم برہم ہو گیا ۔ ؎

نہیں باغ وہ اور نہ ایوان رہا — فقط اک کفِ دست میدان رہا (۲۱)

سامنے جادو گرنی کھڑی تھی اس نے گل کو ہرن بنا لیا اٹھا کر ساتھ لے چلی ایک دوسری جادوگرنی نے ہرن چھیننے کی کوشش کی دونوں جادو کے زور پر لڑنے لگیں ہرن بھاگ نکلا اور ایک باغ میں پہونچا ۔

وہاں جا کے دیکھا عجب ہی بہار — کہ باغِ ارم اس پہ کیجئے نثار

چمن کی روش پر بحسنِ کمال — کھڑے دلکش و دلربا سب نہال

زمرد کے پتے تھے ہیرے دل کے ڈال — پھل و پھول یاقوت کے لال لال

لگے گچھے موتی کے ہر طاق میں — ثریا لگی جس کے ہے طاق میں

زمرد کے پتوں میں ہیرے جڑے — کہ سبزے پہ جس طور شبنم پڑے

جواہر کے سب جانور گل کے زور — درختوں میں آپس میں کرتے ہیں شور

ہر اک شاخ پر بلبلیں نغمہ ریز — نسیمِ سحر ہر طرف عطر بیز

لبا لب بھرا بیچ میں ایک حوض — وہ سب آبِ کوثر سے گھر کیجیے حوض

کٹہرا زمرد کا گرد ایک ڈال — عجب صنعتوں کا بنا اس میں جال

بنا لعل و فیروزہ سے سر بسر — بچھا تخت اک صفۂ حوض پر

اور اس تخت پر اک پری دلربا — پڑی سوتی تھی اک بنا ناز و ادا ....

جوانی کا جوبن بھری چھاتیاں — ہوئیں عین خوبی سے از بس عیاں

مہکتے تھے یوں سر بسر سر کے مو — کہ رس بہتی ہو جیسی دلہن کی بو

وہ دانت اس کے موتی کی گویا لڑی — شبِ قدر مستی یہ لب کی دھڑی

بھلا چھب غضب حسن چہرے کا رنگ — جوانی کی ہر عضو میں سے امنگ

دہن غنچہ لب لالہ رخ یاسمین — بدن سب کھلا حسن کا تھا چمن

چمن کے کیا حسن کے ہے گذار　　چھپائے ہے انگیا میں گویا انار

یہ دل پسند پری تھی اس کی نظر اس پر پڑی تو رخ صمصام نے ہرن کو پکڑ لیا گلے کا رومال دیکھ کر کھولا گیا۔ تو گل دوبارہ انسان بن گیا پری نے حال پوچھا اس نے رو رو کر اپنی داستانِ عشق بیان کی پری نے وعدہ کیا اور بتایا کہ جنوں کا بادشاہ مجھے چاہتا ہے ہر شب اس کے مجرے کو جاتی ہوں۔ تجھے بھی لے چلوں گی دل پسند پری آرائش میں لگ گئی۔ ؎

کیا محمل خور نے مغرب میں میل　　ہوئی جلوہ گر سر پہ لیلائے لیل
ستاروں کی پشواز کر کے درست　　سجی تن پہ بندِ ثریا سے چست
کیا زیب سرتاج مہتاب کا　　شفق سے لیا غازہ منہ پر لگا
پری نے نہا دھو کے بے اختیار　　سجے نازنیں تن پہ سولہ سنگار
مغرق وہ پشوازہ اک سر بسر　　کہ سورج کی جس پہ نہ ٹھہرے نظر
جھلا جھل سوئی رنگ کی اوڑھنی　　فرشتوں نے تارِ نظر سے ا بنی

تھی اس اوڑھنی میں ہی یوں رخ کی تاب
نمایاں شفق میں ہو جوں آفتاب

وہ شبنم کی انگیا جواہر نگار　　جسے دیکھ کر مست ہووے بہار...
کلی دار پاجامہ اک زرد رنگ　　تن نازنین پر کھچا چست و تنگ
جواہر کے زیور پہن جا بجا　　بنی جیسے دلہن نئی دل ربا

(ص ۲۵، ۲۶)

یہاں سے فرخندہ شاہ جو جنوں کا بادشاہ تھا اس کے دربار میں پہنچی وہاں ناچ ہوا۔ ؎

اٹھی اتنے میں کہہ کے یہ یا علی　　اور پشوازہ کو مار ٹھوکر چلی (کذا)

ہوئی جا کھڑی سامنے ناز سے
پڑی زہرہ غش کھا اس انداز سے

ملا کہ ہر اک عضو کو ساز سے
لگی ناچنے کافر انداز سے

لگی اس طرح کہنے جانانہ رقص
کرے جیسے طاؤس مستانہ رقص

کیا اس طرح ناز خواہی سے بل
فرشتوں کا لہرے سے لہرایا دل

وہ طبلوں کی تھاپوں (کی) ایسی گمگ
وہ تالوں پہ ہر سر کے ..... دھمک

چڑھیں سُر پہ ویسی ہی سارنگیاں
کہ تھی شمع ..... کی مردنگیاں :

شرارت کی دل سے سبھوں کی بھڑک
عیاں صاف سینے سے دل کی پھڑک

وہ گردن ہلانا نزاکت کے ساتھ
وہ بجلی کی لپ جھپ وہ توڑوں کے ساتھ

وہ دل مست اٹکھیلیوں کی لچک
قیامت تھا آنا اور جانا جھجک (رک رک)

وہ ہر بار گردن ہلانا غضب
کبھی زیر لب مسکرانا غضب

فلک پر سے کر مشتری نے نگاہ
کہا واہ واہ واہ واہ واہ

(ص ۲۷، ۲۸)

شاہ خوش ہوا گل اس کے سامنے پیش کیا گیا رحم کھا کر اس نے صنوبر کو بلا بھیجا ایک جن اسے لے کے آیا گل کو دیکھتے ہی وہ بیہوش ہوگئی۔ ہوش میں آئی تو دونوں ملے اور شاہ کے حکم سے دونوں کو یمن میں پہونچا دیا گیا۔ ؎

ہوئے دیکھ کر گل کو تازہ چمن
ہوئے ..... فرحت سے خندہ زن .....

پڑی جو خواصوں کی گل پہ نظر
ہوئیں آ کھڑیں اس کے ایدھر اودھر

کوئی تخت کو بوسے دینے لگی
بلائیں کوئی آ کے لینے لگی

نہا دھو چلی حلبہ خوش حال ہو
چڑھانے علم کوئی درگاہ کو

لگی ناچنے کوئی فرحت میں آ   کسی نے لپک ماں کو مژدہ دیا
ہوا بس دلوں سے وہ سب رنج دور   تو ماں باپ کی آنکھوں میں نور (کذا)
ہوئے شاد ماں واں کے سب مرد و زن   کہ تاباں ہوا پھر سہیل یمن
لگے پینے پھر وصل کے مل کے مل   بجام طرب یاں صنوبر اور گل (کذا)
لگا رہنے شہر یمن سب کا سب   بہ عیش و بعشرت بناز و طرب ....
الٰہی رہے جب تلک یہ جہاں   سلامت رہے شاہ کشورستاں
مرادیں سبھی شاہ کی مدعا   طفیل علی یا مجیب الدعا

یہی قصہ مرزا محمد تقی ہوس شاگردِ میر حسن نے بھی نظم کیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے "مرزا ہوس کی ایک نادر مثنوی" کے عنوان سے نوائے ادب (بمبئی) اپریل ۱۹۵۸ء میں اس کے ایک ناقص الآخر نسخے پر مفصل مقالہ لکھا ہے۔ اس کا زمانہ تصنیف ۱۸۲۷ء اور ۱۸۳۷ء کے مابین ہے۔ چونکہ شروع میں نصیر الدین حیدر کی مدح درج ہے۔ میر حسن کا اثر اس مثنوی میں نمایاں ہے۔ سہ

حسن

درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ
وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ
کہ رنگ چمن پہ نہیں اعتبار
یہاں چرخ میں ہے خزاں و بہار

ہوس

کناروں پہ سرسوں کے کھیتوں کا روپ
ملائم ملائم وہ دھانوں پہ دھوپ
کسی شئے کو یاں کی نہیں اعتبار
خزاں کے تصرف میں ہے یہ بہار

باغ میں صنوبر پری کی رفیقوں کے دلچسپ مشاغل دیکھ کر میر حسن کی سحر البیان اور گلزارِ ارم کے بیانات کی یاد آجاتی ہے۔ اس قسم کے بیانات سب سے پہلے فضائل علی خان کی مثنوی میں پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں میر حسن اور ہوس کے چند مماثلات درج کرتا ہوں :- سہ

مثنوی ہوس	سحرالبیان
کوئی حوض میں بیٹھی لٹکائے پاؤں	کوئی حوض میں جا کے غوطہ لگائے
کوئی نہر پہ پاؤں دھونے لگی	کوئی نہر پہ پاؤں بیٹھی ہلائے
کوئی مسی کی وہاں جما کر دھڑی	کوئی آرسی اپنے آگے دھرے
کھڑی دیکھتی ہاتھ کی آرسی	ادا سے کہیں بیٹھی کنگھی کرے
	مقابہ کوئی کھول مسی لگائے
	لبوں پہ دھڑی کوئی اپنے جمائے
	گلزارِ ارم
کوئی پھول انگیا میں رکھ کر دکھائے	کوئی پھول اپنی انگیا میں دھرے ہے
روش پہ کوئی گر کے رونے لگتی	روش پہ دوڑتی پھرتی ہے کوئی
	سنبھلتی ہے کوئی گرتی ہے کوئی
کوئی پھول کانوں پہ دھرنے لگی	رکھے ہے کان پہ کوئی گلوں کو
کوئی ٹہنی پکڑے ہوئے بید کی	کوئی ہے سوچ میں ٹہنی کو پکڑے
کسی سوچ میں محو حیراں کھڑی	

(نوائے ادب۔ بمبئی اپریل ۱۹۵۸ء، ص ۵۱، ۵۲)

اس کے علاوہ میر حسن کا تتبع دکنی شاعر غلام علی کوکنی نے بھی اپنی مثنوی تحفۂ اعظم میں کیا ہے۔ اس مثنوی پہ سخاوت مرزا نے نوائے ادب بمبئی کے جولائی ۱۹۵۵ء کے شمارے میں مفصل مقالہ لکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علی کے حالات فائق کے مخزنِ شعرا میں بھی درج ہیں۔ ان کا انتقال ۱۲۹۷ھ میں ہوا۔ مادۂ تاریخ "غلام علی مداح نبی" ان کی تصانیف میں مصباح المجالس (مثنوی۔ تصنیف ۱۲۴۴ھ) تحفۂ اعظم (مثنوی: تصنیف ۱۲۶۱ھ) کے نام لکھتے ہیں۔ دونوں

مثنویاں چھپ بھی چکی ہیں۔ تحفۂ اعظم مصنف کی زندگی میں ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ ۲۳۹۲ اشعار کی مثنوی اور اس میں "نجمۃ لقا" کا قصہ بیان کیا ہے۔ اس کے کل ۱۳ باب ہیں۔ کہانی کے بعض اجزا میر حسن کی سحرالبیان سے مستعار معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں بعض اشعار میں حسن کا تتبع صاحب نمایاں ہے۔ سخاوت مرزا صاحب نے اس مثنوی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں اور دبے لفظوں میں اسے میر حسن کی سحرالبیان سے بہتر قرار دیا ہے لیکن ان مثالوں کی بنا پر جو کثرت سے انھوں نے اپنے مضمون میں دی ہیں ان کی رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ بلکہ ان سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ علی میر حسن کے تتبع کی بڑی کوشش کرتے ہیں۔ اور گل وصنوبر کے مصنف کے مقابلے میں حسن کی تقلید ان سے کم بھی ہے سخاوت مرزا کا بیان یہ ہے:۔

"علی کے کلام پر سرقے کا گمان تو نہیں ہو سکتا اس لئے کہ علی ایک قادرالکلام شاعر ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ علی کے پیش نظر مثنوی سحرالبیان رہی ہے جس کو بموجب سطور بالا (وہ) اپنی مثنوی سے بہتر نہیں سمجھتا نیز معشوق کی ایک جگہ تعریف کرتے ہوئے یہ بھی اشارہ کیا ہے:۔ ؎

ہیر پانے طلا کار رشک چمن | دھری خوش نما مثنوی حسن
نہ کچھ مثنوی حسن پہ تھا جی | کہ اس میں مزا جیں ہیں اور دل لگی ...

غرض علی نے اپنی مثنوی کو بلحاظ فصاحت وبلاغت سحرالبیان پر فوقیت دی ہے اور ہماری رائے میں بلحاظ واقعہ نگاری تسلسل مضامین، لطیف تشبیہات واستعارات واشارات وکنایات وشستگی زبان ومحاورہ بندی، بمبئی (گجرات) جیسے دور دراز مقام سے قطع نظر بعض زبان کی لغزشوں کے یہ ایک بہترین مثنوی ہے" (نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۸ء صفحہ ۲۷)

اس کے علاوہ تقلید حسن کے ضمن میں سخاوت مرزا ایک دکنی شاعرہ بیبی دالاجاہ (مدارس) المتخلص بہ آبیمہ کا ذکر بھی کرتے ہیں جس نے حسن کی سحرالبیان کا جواب دینے کی کوشش کی۔ راقم السطور کی نظر سے اس شاعرہ کی کوئی مثنوی نہیں گزری۔

میر حسن کے تتبع میں جو کوششیں بھی ہوئی ہیں ان میں بشیر علی افسوس اور گل وصنوبر کے مصنف کے کارنامے بہت اہم ہیں۔ میر حسن کے اسلوب کو ان لوگوں نے جس طرح اپنی طبیعت میں رچاکر پیش کیا ہے وہ دوسرے مصنفوں کے حصے میں بہت کم آئی ہے۔ (گل وصنوبر کے مصنف پر تو کہیں کہیں سرقے کا الزام بھی ہو سکتا ہے) لکھنؤ کے آخری دور میں لذت عشق تصنیف ہوئی۔ یہ مثنوی عام طور پر نواب مرزا شوق سے منسوب کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نواب مرزا شوق کا کارنامہ نہیں ہے۔ تذکرۂ شوق میں عطاء اللہ پالوی فرماتے ہیں کہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے ذاتی کتب خانہ میں ایک بہت زیادہ پرانا نسخہ لذت عشق کا موجود ہے جو مولوی محمد مراد اللہ کی فرمائش پر خواجہ رحیم الدین کے اہتمام سے مطبع فیضی میں چھپا تھا اس نسخہ پر مصنف کا نام یوں لکھا ہے "شاعر تیز زبان طوطئ ہندوستان آغا حسن متخلص بہ نظم ہمشیرزادہ حکیم تصدق حسین خان صاحب دام اقبالہٗ" اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مثنوی شوق کے بھانجے کی تصنیف ہے جنکا تخلص نظم تھا۔ جیسا کہ مثنوی کے آخر میں درج ہے اور یہ نسخہ اس وقت چھپا تھا جب شوق زندہ تھے۔[1]

لذتِ عشق	سحرالبیان
لکھوں پہلے حمد خدائے کریم	کروں پہلے توحید یزداں رقم
کہ ہے نام اس کا غفور الرحیم	جھکا جس کے سجدے کو اوّل قلم

[1] تذکرۂ شوق صفحہ ۸۰

لذتِ عشق

ختن میں تھا اک شاہِ عالم پناہ
ہمارا تمہارا خدا بادشاہ
بہت ملک اس کے تھے زیرِ نگیں
خطا و ختن روم و ایران و چین
عجب دل پہ ہوتا تھا وحشت کا زور
منڈیروں پہ جب رقص کرتے تھے مور
وہ صورت میں تھا اک طرح بے نظیر
تجمل جس سے ہوتا تھا ماہِ منیر
امیروں کے پیچھے سواری چلی
کہے تو کہ بادِ بہاری چلی
حقیقت میں صحرا تھا وہ لق و دق
جسے دیکھ انساں کو ہو رنگ فق
شکایت کریں کیا تمہاری ہو غیر
نہیں پاس میرے وہ یادش بخیر
کوئی بولی چہرے کی پڑتی ہے پھوٹ
ہیں آنکھوں میں موتی بھرے کوٹ کوٹ
کوئی شرم سے ہو گئی آب آب
کوئی رہ گئی انگلی دانتوں میں داب
وہ واقف جو اس راز سے ہو گئیں
خواصیں ادھر اور ادھر ہو گئیں

سحرالبیان

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ
کہ تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ
کئی بادشاہ اس کو دیتے تھے باج
خطا و ختن سے وہ لیتا خراج
صدا قمریوں کی لیطوں کا وہ شور
درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور
گیا حوض میں جب شہ بے نظیر
پڑا آب میں عکسِ ماہِ منیر
غرض اس طرح سے سواری چلی
کہے تو کہ بادِ بہاری چلی
جو دیکھے تو صحرا ہے اک لق و دق
کہ رستم جسے دیکھ ہو جائے فق
لگی کہنے ہے ہے یہ دیکھوں میں سیر
نہ ہو پاس میرے وہ یادش بخیر
یہ آنکھیں جو روتی ہیں بس پھوٹ پھوٹ
تو گویا کہ موتی بھرے کوٹ کوٹ
رہی کوئی انگلی کو دانتوں میں داب
کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب
خواصیں جو تھیں روبرو ہٹ گئیں
بہانے سے ہر کام کے ہٹ گئیں۔

سحرالبیاں	لذتِ عشق
مطالب اگر میرے بر لائے تو	بجا میری شرطیں نہ لائے گا تو
تو شاید مراد اپنی بھی پائے تو	نہ پھر حشر تک مجھ کو پائے گا تو
وہ دیکھے جو تک آنکھ اٹھا بے نظیر	کہ اتنے میں آگئے سے ابن وزیر
تو نجم النسا ہے یہ دختِ وزیر	بنائے ہوئے تھا جو شکل فقیر
کیا نامہ لیں ایک اس کو رقم	یہ سن لیں منگا کر دوات و قلم
کہ اے شاہِ شاہان والے فخرِ جم	کیا اس طرح اس کو نامہ رقم
رہے شاد نواب عالی جناب	دعا پہ ہوئی ختم یہ مثنوی
کہ ہے آصف الدولہ جن کا خطاب	سلامت رہیں شاہ واجد علی
بحقِ حسین اور بحقِ حسن	مرادیں بر آئیں خفی و جلی
رہوں شاد میں بھی غلام حسن ہے	بحق رسول اور بحقِ علی

یہ سحرالبیان کی محض نقال ہے ۔ بھدے قسم کا سرقہ ہے جس میں نہ فنی توانائی ہے نہ احساس و جذبات کی برنائی ۔ اس کے مقابلے میں میرحسن کے کارناموں کا جاندار تتبع انہیں کے خاندان نے کیا ہے غزلوں میں میرخلیق نے میرحسن کے انداز کو اپنایا ان کے فرزند میرانیس کے مرثیوں کے ٹکڑے بھی اکثر و بیشتر سحرالبیان کی یاد دلاتے ہیں ۔ وہی زبان ۔ وہی محاورے وہی روزمرہ وہی مصرعوں کی دروبست وہی نور کی جھکا چوند غرض کہ ایک عالم اسی سے منور ہے ۔ گھسی پٹی راہیں نہیں ہیں ۔ احساسات کے نئے نئے ہیولے ہیں جو انہیں قدیم پیمانوں میں چھلکتے ہیں ۔ میرانیس کے شاگردوں میں سید ولایت علی فردوس تھے ۔ ابن سید اشرف علی بن سید حیدرعلی

۱؎ تذکرہ شوق ۔ عطاءاللہ پالوی ۔ ناشر مکتبۂ جدید ۱۹۵۷ء ، صفحہ ۲۶ تا ۴۷ ۔

رسالدار بن میر عزیز ناظم الملک افسرِ دستۂ فوج شاہی، سادات بنی فاطمہ اولاد حضرت امام موسیٰ علیہ السلام سے تھے۔ وطن ضلع جائس ہیں تھا۔ قیام زیادہ تر رائے بریلی اور باندہ میں رہتا تھا۔ لیکن زندگی کا بہترین حصہ لکھنو میں بسر ہوا۔ منیزہ بیژن افراسیاب اور دنیا کا ناٹک بھی تصنیف کیا تھا۔ مرثیہ بھی خوب کہتے تھے۔ لیکن اپنی مثنوی باغ فردوس کو بہت عزیز رکھتے تھے[۱]۔ مثنوی ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ گلزارِ نسیم اور سحرالبیان کے میل کا دلچسپ نمونہ ہے۔ بحر گلزار نسیم کی، لکھنوی رعایتِ لفظی بھی وہی۔ کہانی، فسانۂ عجائب سے مستعار ہے زبان اور محاکات سحرالبیان کے ہیں خصوصاً روشنی کا تصورِ حسن اور انیس کی طرح ان میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن مجموعی اعتبار سے باغ فردوس معمولی درجے کی تخلیق ہے۔ یہی روشنی کا تصور اس سے زیادہ کمال اور حسن کے ساتھ بے نظیر شاہ کی مثنوی میں دکھائی دیتا ہے۔ بے نظیر شاہ کا نام سید محمد بے نظیرؔ تخلص تھا۔ ۱۸۶۳ء میں کڑہ مانک پور ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ والد مولانا شاہ احسان علی قادری خلیفہ شاہ عبدالعزیز محدث تھے۔ مشاق غزل گو تھے۔ بیشتر کلام ایک سفر میں ضائع ہو گیا۔ غزل میں وحید الہ آبادی اور امیر مینائی سے مشورہ کرتے تھے۔ ان کا شاہکار ان کی مثنوی ہے جو ۱۸۹۰ء میں مکمل کی۔ یہ کتاب مبین اور جواہرِ بے نظیر کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ خاصی طویل ہے اسے مریدوں کی ہدایت کے لئے لکھا۔ عشق حقیقی کے مراحل بیان کئے[۲]۔ یہ مثنوی آج کل نایاب ہے۔ اس کے اقتباسات۔ انتخاب جدید مرتبہ آل احمد سرور و ڈاکٹر زیدا حمد)

---

[۲] تذکرہ جدید شعرائے اردو: ناشر فیروز سنز طبع اول ص ۱۳۲، ۱۳۳ ؛

[۱] :۔ باغ فردوس طبع اول ۱۹۲۵ء۔ الناظر پریس لکھنو تعارف ص الف

اور تذکرہ جدید شعرائے اردو میں پائے جاتے ہیں۔ مرتب تذکرۂ جدید شعرائے اردو فرماتے ہیں :۔

"بہت ممکن ہے یہ مثنوی لکھتے وقت بے نظیر شاہ کے پیش نظر مثنوی سحرالبیان ہو چونکہ اس کے اکثر بیانات اس سے ملتے ہیں لیکن اس کے باوجود الکلام کے محاسن کی داد دینی پڑتی ہے۔ بے نظیر شاہ کی منظریہ شاعری میں حسن و سادگی کا ایک عجیب و غریب امتزاج ملتا ہے جو سحرالبیان کے بعد کسی دوسری اردو مثنوی میں نظر نہیں آتا ان کا مشاہدہ کوئی انفرادیت نہیں رکھتا بلکہ اس میں ایک عام مشاہدہ کی جھلک پائی جاتی ہے بایں ہمہ وہ اتنا قومی اور اس کا اظہار اس درجہ دلکش ہے کہ پڑھنے والے کی روح وجد کرنے لگتی ہے۔[1]"

(۶)

مخالفین :۔ قاعدہ ہے کہ جس چیز کی بہت زیادہ شہرت ہو اس کی مخالفت بھی ہو جاتی ہے سب سے پہلے معترض رنگین تھے جنہوں نے سحرالبیان کے چار شعر دبے لفظوں میں مہمل قرار دیے اور خود جواب کہنے میں لگ گئے۔ دوسری آواز شیفتہ نے اٹھائی۔ تیرھویں صدی کا یہ تذکرہ نگار سحرالبیان کے بارے میں وہ اچھی رائے نہیں رکھتا۔ اس کا جواب باطن شاگرد نظیر اکبرآبادی نے گلستانِ بے خزاں یا نغمۂ عندلیب میں فرماتے ہیں :۔

"مثنوی سحرالبیان مشہور بہ بدرِ منیر اس متانت و فطانت سے لکھی کہ

---

[1] جدید شعرائے اردو صـ ۱۳۳۔

جس کے ہر ایک شعر کی صفت باہر تقریر سے اس کی ہر بیت کا وصف وحسن معانی ولطافت و شوخی خارج تحریر سے۔ صاحب گلشن بے خار کی ان کی نسبت کیا شوخی کی عبارت ہے جس سے ممدوح کی تحقیر و بزرگی اور ہجو ملیح کی اشارت ہے بخدمت انصاف فرمایان معرکۂ سخن عرض ہے اور اس کی منصفی حاکمان سخن پر محکمۂ مشاعرے میں فرض ہے۔ لہذا بعض فقرات محررہ ان کے درج گلستان بے خزاں کے منصفان سخن کے روبرو بیان کئے۔ منصفی کیجئے داد دیجئے حقیر سچ عرض کرتا ہے یا غلط، ہنگام تحقیق جس کا قصور ثابت ہو تو بموجب حکم شرع شاعری وہی مستوجب سزا ہو جو عدول حکمی کرے تو حکامان اقالیم سخن کے موافق عمل ناقص بدلہ ہو۔ حاکمان وقت طرفداری نہ فرما کر حق اللہ فیصلہ کریں، جیسی جس کی کیفیت اظہار ہو یہ ان کی عبارت ہے جس کی بندے کو شکایت۔ ہیں بر اصاف سخن۔۔۔۔ بدشگفتہ بلکہ داد بلاغت دادہ ــــ لفظ پا لغزی ہائے شاعری " کو غور کیجئے خیال ان کے لطور کیجئے، حرف " فی الجملہ " کو ملاحظہ فرمائیے داد معرکہ کی دلائے، "بمحاورۂ عوام بدشگفتہ"، مطلب یہ کہ خاص لوگوں کو یہ طرز خاطر پسند نہیں کچھ ان کے دل پسند نہیں۔ عیب لگانا ہر شخص کو ان کی عادت ہے۔ نزدیک رہنے والے ہوں یا دور کے یہی نیت ہے۔"

(ص ۶۷، ۶۸)

اس کے بعد ۱۸۹۳ء میں مولانا حالی نے جب مقدمہ دیوان لکھا تو اس میں سحر البیان کے بعض عناصر کی بڑی تعریف کی، خصوصاً نیچرل شاعری کی لیکن کچھ اعتراض بھی کئے جن میں ایک اعتراض یہ بھی تھا۔

"اس بات کا بھی خیال رکھنا ضرور ہے کہ قصہ کے ضمن میں کوئی بات ایسی بیان نہ کی جائے جو تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہو جس طرح ناممکن اور فوق العادت باتوں پر قصہ کی بنیاد رکھنی آج کل زیبا نہیں ہے، اسی طرح قصہ کے ضمن میں ایسی جزئیات بیان کرنی، جن کی تجربہ اور مشاہدہ تکذیب کرتا ہو، ہرگز جائز نہیں ہے۔ اس سے قصہ نگار کی آتنی بے سلیقگی ثابت نہیں ہوتی۔ جتنی کہ اس کی لاعلمی اور دنیا کے حالات سے ناواقفیت اور ضروری اطلاع کرنے سے بے پروائی ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً بدرِ منیر میں خاص موقع اور وقت کا سماں اس طرح بیان کیا ہے۔ ؎

وہ گانے کا عالم وہ حسنِ بتاں وہ گلشن کی خوبی وہ دن کا سماں
درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

اخیر مصرع سے صاف یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ایک طرف دھان کھڑے تھے اور ایک طرف سرسوں پھول رہی تھی مگر یہ بات واقعہ کے خلاف ہے، کیونکہ دھان خریف میں ہوتے ہیں اور سرسوں ربیع میں گیہوں کے ساتھ بوئی جاتی ہے۔"

اس کے جواب میں امداد امام اثر کاشف الحقائق جلد دوئم میں فرماتے ہیں:۔

"جن صاحب نے اس شعر پر" درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ۔ یہ اعتراض وارد فرمایا ہے کہ دھان اور سرسوں کا ایک وقت نہیں ہوتا ان کا یہ اعتراض

---

۱ مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ راقم ص ۱۹۶

فن باغبانی یا فن زراعت کے اصول پر وارد کیا جا سکتا ہے۔ ان دو پہلو کے سوا کسی پہلو سے اس شعر پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر زبان کی بدترکیبی پر کوئی اعتراض وارد کیا جائے تو راقم کو اس میں مجالِ گفتگو نہیں ہے، کس واسطے کہ یہ ناچیز نہ زبان دان ہے نہ اہل زبان ہے۔ بحرکیف اگر فن باغبانی کی زد سے یہ اعتراض وارد کیا گیا ہے اور قرینہ بھی ایسا ہی ہے کہ فن باغبانی کی رو سے یہ اعتراض وارد کیا گیا ہوگا۔ کس واسطے کہ یہ دھان اور سرسوں بدرِ منیر کے باغ کے اندر واقع تھے جہاں وہ گاناسن رہی تھی، ظاہر ہے کہ مرگشتی کے لئے زراعتی کھیتوں میں تو وہ نہیں گئی تھی، بس اس کا جواب باغبانی کے فن کی رو سے یہ ہے کہ امراؤ کے باغوں میں مجرد سبزی کے خیال سے دھان اور جو بوئے جاتے ہیں ان سے پیداوار کی غرض متعلق نہیں ہوتی جس فصل میں جو کوئی چاہیے سبزی کی غرض سے دھان یا جو بو کر دیکھ لے بس جب ہر وقت میں دھان یا جو کا تختہ تیار کیا جا سکتا ہے تو پھولی ہوئی سرسوں کے ساتھ دھان کے تختہ کا موجود رہنا خلافِ امکان کیا ہے۔ سرسوں بونے کے وقت جب دھان بو یا جائے گا۔ اس میں ناکامیابی لاحق نہ ہوگی، بالشکلِ ثانی اگر اعتراض بالا زراعت کے اصول پر وارد کیا گیا ہے تو بھی میر حسن کے کلام میں عدم تناسب کا نقصان پایا نہیں جاتا ہے کس واسطے کہ جن ملکوں میں دو فصلیں یا تین فصلیں دھان کی ہوا کرتی ہیں وہاں دھان کی سبزی سرسوں کے پھولنے کے وقت میں ہوگی علاوہ اس کے ایک قسم دھان کی ہوتی ہے جسے بورا کہتے ہیں یہ قسم سرسوں کے پھولنے کے وقت نہایت سبز رہتی ہے یہ قسم دھان کے

محاصل کے اعتبار سے فصل گرما میں تیار ہوتی ہے، اس وقت سے بہت پہلے سرسوں تیار ہو کر کٹ جاتی ہے۔ حضرت معترض کے ایسے اعتراض وارد کرنے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر دلیسوں میں جب سرسوں پھولتی ہے۔ تو دھان میں سبزی باقی نہیں رہتی لیکن اگر حضرت معترض کو پورے طور پر زراعتی معاملات سے اطلاع ہوتی تو ایسے اعتراض کے وارد کرنے پر جرأت نہیں فرماتے۔[۱]

پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے تنقیدی حاشیے میں اس کا جواب دوسری طرح دیا ہے فرماتے ہیں:

'دوسرا مصرعہ تو استعارہ ہے دھانوں کی سبزی اور سرسوں کے روپ کا۔

نیاز فتح پوری کا مسلک بھی یہی ہے۔[۲]

۱۹۰۵ء میں جب چکبست نے گلزارِ نسیم کا ایک خاص ایڈیشن شائع کیا تو شرر نے اس پر اعتراضات کیے یہ بحث ۱۹۱۰ء تک چلتی رہی نولکشور کی طرف سے کتابی صورت میں بھی چھپ گئی۔ بحث کے دوران میں مقابلہ ومقایسہ کرنے والوں نے سحر البیان پر اعتراضات بھی کیے چنانچہ اس کی تفصیل صفحہ ۱۷۲، ۲۲۸، ۲۳۲ وغیرہ پر موجود ہے۔ نقاد لکھنؤی کے اعتراضات میں یہ اعتراض بھی ہے کہ حمد و نعت و منقبت میں طرز بیان پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حسن نے شیخ سعدی کی کریما کی نقل کی ہے۔ اسی طرح میر حسن کی زبان مشابہ سے

۱؎ طبع ثانی صفحہ ۳۹۹ تا ۴۰۱۔

۲؎ تفصیل کے لئے دیکھئے مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ راقم صفحہ ۳۶، ۲۶۱۔

وغیرہ پر بھی اعتراضات ہوئے، اس کی تفصیل صفحہ ۱۷۶ تا ۱۸۵ میں درج ہے۔ اسی طرح ہوا خواہ نسیم نے ۲۳۲ تا ۲۴۷ پر سحرالبیان کے بعض اشعار پر فنی اعتبار سے کچھ اعتراض کئے ہیں ان اعتراضات کا جواب مظہرالحق صاحب نے ۲۴۸ تا ۲۴۵ پر دیا ہے۔[1] دور حاضر کے نقادوں میں کلیم الدین احمد نے سحرالبیان پر زہر کھایا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری پر ایک نظر[2] میں میرحسن کو مثنوی کا مردِ میدان قرار دیا ہے لیکن اس پر رسمی تکرار کا الزام لگایا ہے۔ اردو شاعری پر ایک نظر میں لہجہ اتنا غیر ہمدردانہ نہیں ہے جتنا فنِ داستان گوئی میں اختیار کیا گیا ہے، صفحہ ۱۹۲ سے ۲۰۷ تک منظوم داستانوں کے ضمن میں سحرالبیان پر تفصیلی بحث کی ہے ضمنی طور پر انہوں نے اختصار اور تفصیل والی اس بحث کا جواب بھی دیا ہے جو معرکۂ چکبست کے معترضین کا بنیادی اعتراض تھا لیکن مثنوی کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت اس کے بعض مناظر کا مقابلہ میرامن کی باغ و بہار سے کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ :۔

"میرحسن کے شعر میں کہنے کو اختصار تو زیادہ ہے لیکن وہ بات نہیں وہ اثر نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرحسن میں بظاہر اختصار تو ہے لیکن اس اختصار کے پردے میں تکرار بھی ہے"[3]

کلیم الدین صاحب نے اس جائزے میں انصاف سے کام نہیں لیا اس لئے کہ انہوں نے سحرالبیان کے بنیادی رجحان کو پیش نظر نہیں رکھا جیسا کہ ہم نے پچھلے باب میں لکھا ہے سحرالبیان ایک خیالیہ ۔۔۔۔ ہے ہاں حقیقتیں اسی مرکزی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے معرکۂ چکبست و شرر مرتبہ مرزا محمد شفیع طبع ثانی ۱۹۴۲ء۔

[2] طبع اول صفحہ ۱۲۰ تا ۱۲۷۔ [3] فن داستان گوئی ص ۱۹۹۔

نقطے کے گرد چکر کاٹتی ہیں؛ اس میں فوری طور پر پیدا ہونے والے جذبات و احساسات کی فوری تکمیل کی کوشش کی جاتی ہے اس لئے کہانی کے عام ڈھانچے میں بعض تضادات کا رونما ہوجانا غیر ممکن نہیں ہے، لیکن اس سے پہلے ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اس سے مرکزی تاثر مجروح ہوتا ہے یا نہیں. میر امن کی باغ و بہار اس سے بالکل مختلف مرکزی جذبے کا نتیجہ ہے وہاں خیالیہ.... کی بجائے قصے کی دلچسپی اس کی کڑیوں کے ربط پر منحصر ہے ایک حقیقت پسند کے نقطۂ نظر سے تو سب سے بڑا اعتراض سحرالبیان کے خیالیہ .... ہونے پر کیا جا سکتا ہے. یہ انسانی سوچ بچار کا نارمل اور معاشرتی اعتبار سے جائز طریقہ نہ سمجھا جائیگا بلکہ زندگی سے فرار اور ماحول سے گریز کا نتیجہ ہے اسی دو اور دو چار والے نقطۂ نظر سے سحرالبیان پر کئی اعتراض ہو سکتے ہیں اور مولانا حالی کا ہمنوا ہو کر کہا جا سکتا ہے کہ :

(۱) میر حسن نے بدر منیر اور بے نظیر کی شادی کے موقع پر سمدھنوں کا ذکر کیا ہے. بے نظیر کے ماں باپ وہاں نہیں تھے اس لئے اس ذکر کا موقع نہ تھا.

(۲) میر حسن کی موسیقی کے آلات سے واقفیت بھی واجبی معلوم ہوتی ہے وہ بین کو جوگن کے کاندھے پر دکھاتے ہیں اسی طرح دوسرے آلات کی شکل و صورت میں انہوں نے حقیقت پسندی کا ثبوت نہیں دیا.

(۳) میر حسن راگوں اور ان کے اثرات سے بھی پوری واقفیت

ص۱ : تفصیل کے لئے رسالہ آج کل ۱۹۴۵ء ملاحظہ فرمایئے.

نہیں رکھتے وہ ایک موقع پر "اڈانا" اور "سگھڑئی" کا ذکر کرتے ہیں
یہ راگنیاں ہیں میر حسن "اڈانا" کو مذکر باندھ گئے ہیں علاوہ ازیں
"اڈانا" غم کی چیز ہے اور انہوں نے اسے خوشی کے موقع پر استعمال
کیا ہے اس موقع پر آسانی سے اڈانا کی جگہ کدارا لکھا جا سکتا تھا
اسی طرح زیل (کم عمر لڑکوں کی آواز کو کہتے ہیں) زیل کے مقابلے میں
انہوں نے کھرج کے لفظ کا استعمال کیا ہے کھرج کا مقابل زیل نہیں
ٹیپ ہے۔ اسی طرح دربار میں انہوں نے ترحنی اور قرنا کا ذکر کیا ہے
جو مندروں کی چیز ہے درباروں کی نہیں۔ ستار اور مرچنگ کے ساتھ
انہوں نے موم کے استعمال کا ذکر کیا ہے موم تاروں کی آواز کو
درست نہیں کرتی ختم کر دیتی ہے ایسے موقع پر گندہ بروزہ استعمال
کرتے ہیں اور وہ بھی مرچنگ پر نہیں کمانچوں پر استعمال ہوتا ہے،
تاروں پر عام طور پر تیل استعمال ہوتا ہے تاکہ زنگ بھی نہ لگے
اور چکنی ہونے کے سبب انگلیاں پھسل سکیں، مرچنگ کے ساتھ طنبورے
کا استعمال بھی بے معنی ہے۔ اسی طرح میر حسن ایک جگہ الاپ میں طبلے
کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ طبلہ استھائی وغیرہ میں تو استعمال ہوتا ہے
الاپ میں اسے استعمال نہیں کرتے وہ الاپ کے ساتھ رقص کا بھی
ذکر کرتے ہیں دونوں چیزیں ایک وقت میں نہیں ہوا کرتیں اسی طرح
کدارا کے ساتھ انھوں نے ہاتھ پاؤں مارنے کا ذکر کیا ہے یہ بھی بیک
وقت ممکن نہیں اس لئے کہ بقول میر حسن بین میں کدارا بج رہی ہے
دونوں ہاتھ مصروف ہیں ہاتھ پاؤں ہلانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا،
ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ بین میں کدارا بجانا ممکن ہی نہیں۔

پہلے عرض کیا جاچکا ہے ان اعتراضات کی حیثیت ضمنی ہے[1] خیالیہ بادقتیکہ بنیادی تاثر مجروح نہ ہو لکھنے والا ناممکن کو ممکن اور ناقابلِ عمل کو قابلِ عمل بناتا ہے، معترض یہ تو کہہ سکتا ہے کہ میر حسن کو خیالیہ نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ لیکن یہ اعتراض بھی اخلاقی نقطۂ نظر سے ہوگا ہمارے نزدیک تخیل کی پرواز بھی انسانی سوچ بچار کا جائز ذریعہ ہے، اس سے جذبات کی تنظیم و تہذیب ہوتی ہے اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو پھر مذکورہ بالا اعتراضات کی حیثیت ضمنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

زبان: سحرالبیان کی زبان اور تذکیر و تانیث پر ایک گذشتہ باب میں مفصل بحث کی جا چکی ہے۔ اس کی مقبولیت کے پیشِ نظر لغت نویس سند کے طور پر میر حسن کی سحرالبیان کو پیش کرتے آئے ہیں۔ نوراللغات اور امیراللغات جیسی مستند ڈکشنریوں میں الفاظ کی سند میر حسن کے کلیات اور سحرالبیان سے لی گئی ہے، امیراللغات کی صرف ا ردیف کی دو جلدیں طبع ہوئیں ان میں ۱۴۴ الفاظ کی سند میں میر حسن کے کلام سے حوالے دیے گئے ہیں اور اکثر و بیشتر سحرالبیان ہی کے شعر درج ہیں جن الفاظ میں کلام حسن سند کے طور پر پیش ہوا ہے وہ یہ ہیں۔

آبدار (۱۷) آب دیدہ رہنا (۱۸) آب شورہ (۲۰) آب دانے کے ہاتھ ہے (۲۳) آب کھونا (۸۳) آرسی (۹۰، ۹۱) آرسی مصحف دکھانا (۹۱) آس ہونا (۱۰۲) آسمانی بلا (۱۲۰) آسودہ ہونا (۱۲۲) آفت اٹھانا (۱۳۳) آگے دھرنا (۱۶۴) آل اولاد (۱۶۸) آن (۱۶۸) آن کی آن (۱۶۹) آنکھ نیم وا (۲۰۰) آنکھ حق بین (۲۰۹) آنکھ (۲۲۲) آنکھوں کا نور اڑ جانا (۲۵۲) آنکھیں ڈھانپنا (۲۷۹) آنگن (۲۸۶)۔

[1] بنگلہ یرسی۔ ڈی منظر

اب (۲) ابرک (۱۰) ابرو (۱۲) ابجنا (۲۰) اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے (۳۸) اپنی والی پہ آنا (۳۹) اپنے وقت کا حاتم ہے (۴۰) اوتار (۴۱، ۴۲) اتالیق (۴۵) اترانا (۴۶) اٹھا مارنا (۶۱) اثنا عشر (۶۸) اجالا (۷۱) اچنبھا (۸۰) اچھا (۸۱) اوچھالنا (۸۳) احتمال جانا (۸۸) احرام باندھنا (۸۹) احوال پرستی (۹۱) اختلاط (۹۳) اخلاص رکھنا (۹۷) اخلاص رہنا (۹۷) اخلاص کرنا (۹۷) ادا بندی (۹۹) ادا دکھانا (۹۹) اداس کرنا (۱۰۰) ادراک (۱۰۲) ادرسا (۱۰۳) اذیت پانا (۱۱۴) ارباب نشاط (۱۱۵) ارجن (۱۱۶) ارذل (۱۱۷) ارگجا (۱۱۹) اریب کی باتیں (۱۲۲) اڑانا (۱۲۴) اڑنا (۱۲۸) اِستاد (۱۳۹) اُستُت (۱۴۰) اش اش کرنا (۱۴۵) افسانہ گو (۱۶۷) افواہ اڑانا (۱۷۹) افیم (۱۷۹) اکھٹا (۱۹۳) اگھری (۱۹۶) انگل پڑنا (۱۹۷) التجا (۲۰۳) التماس (۲۰۳) الیٹنا (۲۰۷) الجھانا (۲۱۱) الگ (۲۱۸) اللہ سے لو لگی ہے (۲۲۴) اللہ کی چوری نہیں تو بندے کی کیا چوری (۲۲۶) اناکانی دینا (۲۴۰) اندھیرا (۲۵۸) اندھیرے اجالے (۲۵۹) انڈلانا (۲۶۱) انڈوا (۲۶۱) انگوٹھا دکھانا (۲۷۱) اوپر اوپر (۲۷۷) اوپر کے دم بھرنا (۲۷۸) اوٹ کر (۲۷۹) اور (۲۸۱) اوجھنی (۲۸۳) اوسان آنا (۲۸۴) اوسان لے جانا (۲۸۴) اوقات (۲۸۶) اوقات کھونا (۲۸۶) اونچ نیچ (۲۹۳) اہل اللہ (۲۹۶) اہل حرفہ (۲۹۷) اہموں (۲۹۸) ایک راس (۳۱۴) ایک سے دن نہیں رہتے (۳۱۴) ایلچی (۳۱۸) اینٹھنا (۳۲۳) اینچنا (۳۲۴) اس سے سحرالبیان کی مقبولیت اور اس کی زبان کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

ے قوسین میں لغت کے صفحات درج ہیں۔

تراجم :۔ سحرالبیان کے تراجم بھی مختلف زبانوں میں ہوتے رہے ہیں۔ اردو نثر میں "نثرِ بے نظیر" کے نام سے فورٹ ولیم کالج میں میر بہادر علی حسینی نے کیا[۱]۔ (انگریزی میں ترجموں کی تفصیل باب پنجم میں درج ہے)

نسخے۔ اعراب دار نسخوں اور مصور ایڈیشنوں کی کیفیت بھی بیان کی جاچکی ہے۔[۲]

ڈراما :۔ مثنوی کی مقبولیت کے سبب اسے ڈرامے کی صورت میں بھی ڈھالا گیا۔ اردو کے قدیم ترین ڈرامہ نویس آرام نے کوئی تیرہ منظوم و منثور ڈرامے اردو میں لکھے۔ منظوم ڈراموں میں بے نظیر و بدرِ منیر کا قصہ بھی آتا ہے۔ یہ ۱۸۶۲ء کا واقعہ ہے اس کے بعد رونق بنارسی نے بے نظیر و بدرِ منیر کا قصہ ۱۸۷۹ء میں ڈرامے کی صورت میں ڈھالا۔ ڈرامے اور اس کے بعد کے ایڈیشنوں کے بارے میں ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے لکھا ہے[۳]۔

" یہ منظوم ڈرامہ تین ڈراپ سینوں پر مشتمل ہے اور پہلی بار اگست ۱۸۷۹ء کو بمبئی میں اسٹیج ہوا۔ میری لائبریری میں اس منظوم ڈرامے کا جو نسخہ ہے اس پر ۱۸۸۲ء درج ہے یہاں یہ بتلادینا بیجا نہ ہوگا کہ خان صاحب نسروان جی مہروان جی آرام نے ۱۸۶۲ء میں یہ ڈرامہ پارسی وکٹوریہ تھیٹر کے لئے لکھا تھا جو اسٹیج پر مقبول ہوا تھا۔ غالباً کمپنی نے اس ڈرامہ کو رونق سے ازسر نو لکھوایا یا اس میں تبدیلیاں کرائیں۔ آرام کا اوریجنل ڈرامہ اب تک مفقود ہے اور دادا بھائی پٹیل اردشیر ٹھونٹھی خورشید جی بلی والا اور جمشید جی میڈن کی پرائیویٹ لائبریریوں میں بھی تلاش بسیار کے

---

[۱] تفصیل باب پنجم میں :۔ [۲] باب پنجم :۔ [۳] ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کا مقالہ بعنوان رونق بنارسی نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۵۴ء صـ۲۷ :۔ [۴] ایضاً صـ۳۹ :۔

باوجود دستیاب نہ ہوسکا ممکن ہے اس کا کوئی نسخہ میڈن کی لائبریری دارفتح کلکتہ میں موجود ہو۔

پلاٹ :۔ شہزادہ بے نظیر اپنے باغ میں مصروفِ خواب ہوتا ہے کہ مہ رخ پری اسے اپنے چھپر کھٹ پر اڑا لے جاتی ہے بادشاہ اور ملکہ اپنے اکلوتے بیٹے کی یاد میں رو رو کر پاگل ہو جاتے اور خود اس کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ مہ رخ پری شہزادہ بے نظیر سے اظہار محبت کرتی اور اس کو سیر و تفریح کے لئے اپنا چھپر کھٹ دیتی ہے، بے نظیر مہ رخ کی محبت کو ٹھکرا کر تفریح کے لئے نکلتا اور بدرِ منیر کو مصروفِ گلگشتِ چمن دیکھ کر اس پر عاشق ہو جاتا اور چھپر کھٹ کو نیچے اتار کر اس سے ملاقات کرتا ہے۔ مہ رخ پری فریب دیو سے یہ حال سن کر پیچ و تاب کھاتی اور بے نظیر کو قید کرتی ہے دوسری طرف بدرِ منیر شہزادہ کا انتظار کرتی اور بدقسمتی پر آنسو بہاتی ہے، وزیرزادی نجم النساء اپنی سہیلی کا یہ حال دیکھ کر شہزادے کی تلاش میں نکلتی اور شاہ اخیار سے مل کر بے نظیر کے لئے رہائی کی طالب ہوتی ہے، شاہ اس کی درخواست منظور کرتا ہے نجم النساء کی درخواست پر وہ شہزادہ کے والدین کو بھی طلب کرتا ہے اور ان کی موجودگی میں عاشق و معشوق کے ہاتھ ملا دیتا ہے۔

اس منظوم ڈرامہ میں دو جگہ رونق تخلص آیا ہے۔ اس میں فارسی کی بھی دو غزلیں شامل ہیں ایک غزل جس میں چار شعر ہیں بدرِ منیر پڑھتی ہے جبکہ وہ پہلی بار شہزادہ سے ملتی ہے۔ بے نظیر بھی اس کے جواب میں ایک فارسی غزل پڑھتا ہے جس میں چھ شعر ہیں ان کے علاوہ مثنوی میرحسن کے آٹھ منتخبات بھی شامل ہیں ظفر کی بھی ایک غزل ہے۔ ایک غزل کسی نامعلوم

شائع کی ہے۔

اندرونی سرورق پر تحریر ہے یہ ناٹک ۱۸۶۳ء کے ایکٹ ۲۵ کے مطابق رجسٹر کیا گیا اور اس کے تمام حقوق وکٹوریہ ناٹک منڈلی کے مالکوں میسرز خورشید جی بالیوالا دھنجی بھائی خورشید جی گھڑیالی اور دوسا بھائی فریدون جی مغل کے نام محفوظ ہیں لہٰذا مذکورہ مالکوں کی اجازت کے بغیر کوئی ناٹک کے کسی حصے کو چھاپنے یا اسٹیج کرنے کی کوشش نہ کرے۔

اسی ڈرامہ کو بعد میں حافظ محمد عبداللہ نے از سر نو لکھ کر اپنے نام سے شائع کیا اور اس کا نام بے نظیر بدر منیر عرف تماشائے دلپذیر رکھا۔ تیغ محمد تیغ نے اصل نام کو بجنسہ قائم رکھا اور پورے ڈرامہ کو اپنے الفاظ میں لکھ کر اپنے نام سے شائع کیا۔[1] (ایضاً صفحہ ۱۱۸)

ریڈیو فیچر:۔ ستمبر ۱۹۵۷ء میں ریڈیو پاکستان لاہور نے اس مثنوی کو فیچر کے طور پر پیش کیا۔

(۸)

خمسہ

خمسہ :۔ قطب الدین باطن شاگرد نظیر اکبرآبادی نے نومبر ۱۸۹۲ء میں سحرالبیان کے ہر شعر کا خمسہ کر کے شائع کیا۔ یہ کتاب محمد انعام اللہ خاں کے اہتمام سے گلشن ہند آگرہ میں شائع ہوئی۔ ٹائٹل کی پشت پر یہ اعلام (اعلان) چھپا ہے۔

"اعجاز رقم اعنی خمسہ مثنوی میر حسن مرحوم مصنفہ شاعر نازک خیالی ناظم بے مثال جناب حکیم قطب الدین باطن کا حق تالیف مجھ پر ہمیشہ کے واسطے منتقل ہو گیا ہے لہٰذا کوئی صاحب قصد طبع نہ فرمائیں۔ ورنہ بجائے منفعت کے نقصان اٹھائیں گے فقط المشتہر محمد انعام اللہ خان مہتمم گلشن ہند آگرہ"

۱۴۴ صفحات کے اس خمسے میں ایک دو جگہ کے سوا ہر جگہ عنوانات مرصع و مقفیٰ انداز میں لکھے ہیں ایک عنوان ملاحظہ فرمایئے۔

صاحبو آپ بیتی کہوں یا جگ بیتی مجھائی تو غیر کی کہانی مت چھیڑ اپنی ہی نبیڑ۔

خمسے میں ہر شعر کی تضمین کی گئی ہے، اس پابندی کی وجہ سے بعض جگہ تضاد بھی پیدا ہو گیا ہے مثلاً صفحہ ۹۷ پر لکھتے ہیں۔

جو یہ لطف اٹھے اور یہ جوش ہو — صنم سے صنم اپنے ہم دوش ہو
نہ یادِ خدا پر فراموش ہو — غرض رفتہ رفتہ وہ مدہوش ہو
چھپر کھٹ میں لیٹے ہم آغوش ہو

اس سے ایک صفحہ پہلے شراب کا ذکر کر کے انہیں مدہوش قرار دے چکے ہیں۔ یہاں ضرورتِ شعری کے تحت تکرار سے کام لیا ہے۔

باطن کی تضمین نے مثنوی کے اشعار کے باہمی ربط کو بڑا صدمہ پہونچایا ہے۔ مضمون میں تکرار خیالات ہیں بے جا طوالت اور مصرعوں کی پستی کے سبب، یہ کوشش ناقص ہو گئی ہے بعض مصرعے محض خانہ پری کی خاطر لکھے گئے ہیں جس سے مثنوی کے بہترین حصوں کو خاص طور پر بڑا شدید نقصان پہونچا ہے۔ اختلاط کی کیفیت کو میر حسن نے بڑے پر لطف انداز میں پیش کیا تھا۔ لیکن قافیہ پیمائی کے سبب خمسے میں مزید تفصیلات مہیا کی گئیں جس سے تاثر میں اضافہ ہونے کے بجائے ابتذال پیدا ہو گیا ہے فرماتے ہیں۔

جو حائل ہوئی ایک پردے کی آڑ — دیا شہزادے نے اس کو پچھاڑ
سپر کا دیا تیغ نے سینہ پاڑ — لگی ہونے پردے میں جب چھیڑ چھاڑ
درِ حسن کے کھل گئے دو کواڑ

وہ دی سبز شیشے سے ساغر میں ڈال | شتابی سے ساقی نے مے لال لال
اٹھا ہجر کا دل سے یکسر خیال! | لگے پینے باہم شراب وصال
ہوئے نخلِ امید سے وہ نہال

شکم سے شکم مرد سے چشم زن | جبیں سے جبیں اور شکن سے شکن
زباں سے زباں جان سے جان تن سے تن | لبوں سے ملے لب دہن سے دہن
دلوں سے ملے دل بدن سے بدن

لعاب دہن منہ کی جیب رال ہو | مقابل نہ کیوں خال سے خال ہو
برابر گیا گال سے گال ہو | ملی آنکھ سے آنکھ خوش حال ہو
گہریں حسرتیں دل کی پامال ہو

کسی کا گریباں گیا خود مسل | کسی کی گئی آستیں چل پہل
کسی چاک دامن میں آیا خلل | کسی کی گئی چولی آگے سے چل
کسی کی گئی چلیں (مہاریں) نکل

شگفتہ گل نو دمیدہ ہوئے | بہم سلامت سرِ خمیدہ ہوئے
شنیدہ جو تھے لطفِ دیدہ ہوئے | غم و درد دامن کشیدہ ہوئے
وہ گل نارسیدہ رسیدہ ہوئے

برہمن تھے دونوں سے پڑھ پڑھ کے بید | بھری گوشِ دل میں صدائے نوید
کھلے دو دلوں میں جو تھے بند بھید | اٹھے پی کے باہم شراب امید
کوئی سرخ رو اور کوئی رو سپید

فراغت ہوئے کام سے دو صنم | جو مشغول تھے عیش میں وہ بہم
اٹھے پیار کرتے ہوئے دم بدم | پھر کھٹ سے رکھ دبنا (کذا) باہر قدم
نکل آئے بھرتے محبت کا دم (ص ۶۹)

ان اشعار سے باطن کی شعری صلاحیتوں کا پتا چلتا ہے۔ اس نے تفاصیل سے محاکات کو بھونڈا ہی نہیں مضحکہ خیز بھی بنا دیا ہے۔ مختلف بند آپس میں اچھی طرح مربوط بھی نہیں اس سے تاثر کو نقصان پہونچا ہے، یہ عالم خمسے میں ہر جگہ دکھائی دیتا ہے میر حسن کی منظر کشی اردو شاعری میں یادگار ہے باطن نے ان اشعار کا حلیہ اس طرح بگاڑا ہے۔ فرماتے ہیں: ۔

اٹھائی جو تھی بس کہ تکلیف راہ — تو بیٹھی اک آرام کی پا جگہ
بچھی چادر نور تھی تہ بہ تہ — وہ تھی اتفاقاً شب چار دہ
ادا سے وہ بیٹھی وہاں رشک مہ

جگہ نور انور سے معمور تھی — کہ گویا زمین عارض حور تھی
اسی جا تھا اور حق کی مشکور تھی — بچھی ہر طرف چادر نور تھی!
یہی چاندنی اس کو منظور تھی

وہ میدان ہو گا یہ تنہا ادھر — وہ ہر سمت گویا تھی نور سحر
وہ ذرے چمکتے ہنسیں برق پر — وہ سنسان جنگل وہ نور قمر
وہ براق تھا ہر طرف دشت و در

وہ روشن بیابان چمکتی سی ریت — وہ ماہ درخشاں چمکتی سی ریت
وہ براق ساماں چمکتی سی ریت — وہ ابلا سا میدان چمکتی سی ریت
اگا نور سے چاند تاروں کا کھیت

وہ ذرے زمین کے دمکتے ہوئے — گل چاندنی سے جھلکتے ہوئے
شگوفوں کے تارے چمکتے ہوئے — درختوں کے پتے چمکتے ہوئے
خس و خار سارے جھلکتے ہوئے

(صفحہ ۱۰۸)

ان اشعار میں میرحسن کی منظرکشی کو بھدا کر دیا گیا ہے لایعنی تکرار اور بے معنی منظرکشی نے اصل سین کو خراب کر دیا ہے۔

سحرالبیان کا ایک دوسرا قابلِ قدر منظر اسی طرح برباد کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

مگر کیا کہوں اس کا عاشق پہ جور | کہ اس جور پہ محو گردوں کا دور
شفق کی قسم کھا کے کہتا ہوں غور | دیے آگ اس نے لگائی ہے اور
کہ پوشاک کی سرخ لائے کے طور

وہ گلنار پوشاک رشکِ چمن | وہ لالہ کی غنچے کی صورت دہن
برنگِ شفق سرخ سارا بدن | جلانے کو عاشق کے دکھلا چھبن
لیا سرخ لاہی کا جوڑا پہن

کرن اس میں سورج کی چپا کی جا | دھنک برق کی ٹانک دی جگمگا
عقیقِ یمن کی لگی گوٹ کیا | تمامی کی سنجاف اس پہ لگا
طلا کی طرح سے دیا دگدگا

سہاگن کے پھولوں سا رنگیلا ساس | شفق کا لہو اور مرجاں کے پاس
ہوئی اس سے رنگِ شہابی کو یاس | اسی رنگ کے ساتھ کا سب لباس
تصور میں ہو سرخ جس کے قیاس

وہ لعل یمن سر سے پاؤں تلک | لہو ہو بہے گا عقیق اس کو تک
بنی ہے وہ لو کا سراسر جھپک | بھبھو کا ساتن اور منہ کی دھمک
کہ جوں شعلہ آتش سے اٹھے بھڑک

عجب طرح جوبن وہ دکھلاتیاں | فرشتوں سے ہیں ہاتھ ملواتیاں
کچھ ایسی ہیں وہ سخت اتراتیاں | نکیلی وہ اٹھی ہوئی چھاتیاں
بھری اپنے جوبن میں اٹھلاتیاں

(صفحہ ۱۲۴)

سحرالبیان کی یہ خواتین باطن کی صحبت میں اگر فرشتوں سے ہاتھ ملوائیں۔ اس سے ان کی پاکیزگی تو بڑھی ہو گی لیکن حسن میں اضافہ ممکن نہیں۔

حسن کی مثنوی کے نام اور کرداروں کی آب وتاب مصنفوں کو بھاتی رہی ہے چنانچہ غلام علی عشرت رام پوری کی اردو نثر میں داستان کا نام "سحرالبیان" ہے افزود قصہ میں خاور شاہ بادشاہ۔ یعقوب شاہ بادشاہ۔ جمال بانو ڈومنی، شہزادہ یوسف شاہ۔ حسن آرا۔ روشن آرا۔ اور حسن افزا بیگم کے نام ماہر دیری اور فیروز شاہ مصاحب کا ذکر، میر حسن کی سحرالبیان کی یاد دلاتا ہے۔ نثر میں تاج رنگ کی منظر کشی۔

تری عمر دولت ہو یا رب مدام
بحق محمد علیہ السلام!

کا ذکر، شہزادی کے حضور میں روشن آرا کا غزل پڑھنا' اور جوگن بن کر یوسف شاہ شہزادے کی تلاش میں نکلنا' وزیر زادی روشن آرا کا بحالت جوگن دیو کے ہاتھوں اٹھائے جانا' دسترخوانوں کے کھانوں کی تفصیل؛ خاص خاص مواقع پر تفصیلات میں جانا' یہ ساری باتیں میر حسن کی یاد دلاتی ہیں۔ ۵۲ اوراق کا یہ منظوم قصہ ۱۲۳۰ھ میں لکھا گیا۔ عشرت نے ۱۲۳۶ھ میں وفات پائی "انتخاب یادگار" میں سنۂ وفات غلط لیکن قطعۂ تاریخ درست ہے۔

ان اقتباسات ومباحث سے سحرالبیان کی مقبولیت اندازہ ہو سکتا ہے۔

مصادر

(نوٹ:- اس فہرست میں ان کتابوں کی تفصیل ہے جن کا ذکر کتاب کے متن میں بار بار آیا ہے، جن کتب کا حوالہ صرف ایک آدھ بار آیا ہے ان کیلئے حواشی دیکھے جائیں)

آب بقا، عبدالرؤف عشرت، نامی پریس لکھنؤ۔ س۔ ن

آب حیات، محمد حسین آزاد، طبع دوازدہم مبارک علی

آب حیات کا تنقیدی مطالعہ، مسعود حسن رضوی، طبع لکھنؤ

آثار الصنادید، سرسید احمد خاں، طبع اول

آخری تاجدار اودھ، محمد تقی احمد، سنہ ۱۹۳۶ء

آرائش محفل، شیر علی افسوس، طبع انجمن ترقی اردو دہلی

احوال غالب، مرتبہ مختار الدین احمد، سنہ ۱۹۵۳ء

ارباب نثر اردو، سید محمد قادری، طبع دکن

اردو ادب کی تاریخ، نسیم قریشی، دہلی سنہ ۱۹۵۵ء

اردو تذکرے، ڈاکٹر سید عبداللہ، لاہور سنہ ۱۹۵۲ء

اردو شاعروں کا البم، ازوار حسین، طبع اول

اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، س۔ ن

اردو غزل مع انتخاب، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، طبع اول ۱۹۴۸ء

اردوئے ہندو شعراء، عبدالسلام خورشید، سنہ ۱۹۳۹ء

اردو کی عشقیہ شاعری، فراق گورکھپوری، طبع اول

اردو کا سب سے پہلا دانشور محمد حسن عسکری، سنہ ۱۹۴۲ء

افسانہ، مجنوں گورکھپوری،

امیر اللغات، دو جلد، امیر مینائی (طبع اول)

انتخاب زریں، ڈاکٹر مسعود، طبع ثانی سنہ ۱۹۲۰ء

انتخاب سخن، حسرت موہانی

انتخاب سودا، ڈاکٹر وحید قریشی، طبع لاہور

انیس العاشقین، رتن سنگھ زخمی، (دو ٹو گراف۔ یونیورسٹی لائبریری نمبر (۲۹)

اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، شبلی نعمانی،

بحث و نظر، ڈاکٹر سید عبداللہ، سنہ ۱۹۵۲ء لاہور

بدائع وقائع، آنند رام مخلص (۱) مرتبہ ڈاکٹر شفیع (۲) قلمی مملوکہ راقم

بزم سخن، سید علی حسن خاں، سنہ ۱۲۹۸ھ

بیاض، قلمی کتب خانہ عباس بیگ مملوکہ راقم

بیاضِ سخن، شیدا، (دکن) (صفحہ ۱۷۰)

بیاضِ فائق، کلب علی خاں فائق (قلمی)

تاریخ ادب اردو، مترجمہ عسکری، نولکشور پریس

تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، طبع دکن سنہ ۱۹۲۰ء

تاریخ اسلام (جلد پنجم) ذاکر حسین سنہ ۱۹۱۹ء (نمبر ۱۶۲۸ پر جس کے حوالے)

تاریخ اودھ، مولانا نجم الغنی (پانچ جلد) سنہ ۱۹۱۹ء نولکشور پریس،

تاریخ حدیقہ، خادم علی سندیلوی، طبع ثانی نومبر سنہ ۱۸۷۱ء (۱۳۲ تا ۱۳۹)

تاریخ ریختی، محمد مبین

تاریخ روہیلکھنڈ .... طبع رامپور

تاریخ مثنویات اردو، جلالی

تاریخ مرہٹہ، مولوی محمد ادریس، (نظام المشائخ دہلی)

تاریخ نظم و نثر اردو، آغا باقر، طبع لاہور

تحقیقی نوادر، ڈاکٹر آمنہ خاتون، مہارانی کالج میسور

تزک جہانگیری، جہانگیر، مطبوعہ نولکشور پریس

تذکرہ ابن طوفان، مرتبہ قاضی عبدالودود

تذکرہ اعجاز سخن (حصہ اول) شبیر علی خاں مرخوش، طبع اول۔ لاہور

تذکرہ اردو مخطوطات در کتاب خانہ ادارہ ادبیات اردو، مرتبہ زور سنہ ۱۳۶۲ھ، ۱۹۴۳ء

تذکرہ بے نظیر، عبدالوہاب افتخار، مطبوعہ سنہ ۱۹۴۰ء الہ آباد یونیورسٹی

تذکرہ روزِ روشن، مظفر حسین صبا، (مطبوعہ سنہ ۱۲۹۷ھ)

تذکرہ ریختہ گویاں، گردیزی، انجمن ترقی اردو دکن سنہ ۱۹۳۳ء

تذکرۂ خندۂ گل، آسی، طبع اوّل

تذکرۂ شعرائے اردو، میر حسن، طبع اوّل ۱۹۲۲ء
طبع دوم ۱۹۴۰ء

تذکرۂ شعرا (مطبوعہ)

تذکرۂ عشق، گفتار، طبع دکن

تذکرۂ صوت افزا، (اوراق مخطوطہ معاصر)

تذکرۂ ناصر (اقتباس)

تذکرۂ ہندی گویاں، مصحفی، ۱۹۳۳ء

تنقیدی دنیا تجھے، احتشام حسین، ادارہ اشاعت اردو
طبع اوّل دکن (حصہ ۱۹۳ [illegible] ۱۳۱۶)

تنقیدی حاشیے، مجنوں گورکھپوری، طبع
اوّل دکن ۱۹۳۵ء

ثمرات البدائع، قتیل (مطبوعہ)

جرأت، ان کا عہد اور عشقیہ شاعری، ڈاکٹر [illegible]
صدیقی ۱۹۵۲ء طبع کراچی

جواہر سخن، کیفی چریا کوٹی، جلد اوّل، جلد
چہارم۔ ۱۹۳۳ء

جلوۂ خضر، صفیر بلگرامی، جلد اوّل۔
طبع ۱۸۸۰ء

چہار شربت۔ قتیل۔ طبع لکھنؤ

چراغ محفل فصاحت، مرتبہ گلشن ۱۳۶۰ھ

چمنستانِ شعرا، شفیق، طبع انجمن ترقی اردو
۱۹۲۸ء

حدیقۃ الاولیاء، مفتی غلام سرور لاہوری،
۱۲۹۳ھ

حسن و عشق، نعمت خاں عالی، طبع لکھنؤ

حیاتِ انیس، مولانا امجد علی اشہری ۱۹۰۷ء

خمخانۂ جاوید (جلد دوم) سری رام، ۱۹۱۱ء

خزانۂ عامرہ، غلام علی آزاد مطبوعہ

خمسۂ مثنوی میر حسن، قطب الدین باطن،
نومبر ۱۸۹۲ء

خطباتِ گارساں دتاسی، ۱۹۳۵ء

خواجہ میر درد اور ان کی شاعری، اکرام اللہ
قلمی ایم اے کا تحقیقی مقالہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری

خواجہ میر درد کا تصوف، ڈی۔ نسیم،
ایم۔ اے کا تحقیقی مقالہ قلمی
پنجاب یونیورسٹی لائبریری

داستانِ اردو، [illegible]، طبع انجمن
دریائے لطافت (۱) اردو ترجمہ نسخہ ۱۹۳۵ء
(۲) متن فارسی طبع ۱۹۱۶ء
(مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی)

دستور الفصاحت، احمد علی یکتا (مرتبہ عرشی) ۱۹۴۳ء

دلی کا دبستانِ شاعری، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی
انجمن ترقی اردو۔ کراچی ۱۹۴۹ء

دنیائے افسانہ، عبد القادر سروری، طبع ثانی
۱۹۳۵ء دکن (سحر البیان پر تبصرہ) ص ۱۴۷

دیوانِ اثر، مطبعہ انجمن ترقی اردو

دیوانِ حسن، نولکشور پریس طبع اول

دیوانِ حسن، قلمی مملوکہ عبد العلیم نصر کوٹی

دیوانِ بیدار، بیدار، مرتبہ جلیل احمد قدوائی ۱۹۳۷ء

دیوانِ جوشش، مرتبہ قاضی عبد الودود،
انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۱ء

دیوانِ درد، مرتبہ آسی، نولکشور پریس

دیوانِ زادہ، حاتم، قلمی بحوالہ برٹش میوزیم لائبریری

دیوانِ ذوق، ذوق (مرتبہ محمد حسین آزاد)

دیوانِ سودا، قلمی مملوکہ زبیر الحسن عابدی

دیوانِ فغاں، اشرف علی خاں فغاں،
انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۵۰ء

دیوانِ نسبتی تھانیسری (قلمی)

دیوانِ نظیری، مطبعہ مبارک علی لاہور

ذکرِ میر، میر تقی میر، انجمن ترقی اردو ۱۹۲۸ء

رانی کیتکی کی کہانی، انشا، انجمن ترقی اردو

رسالہ تذکیر و تانیث، جلال لکھنوی، ۱۹۲۳ء
کانپور

رسومِ دہلی، سید احمد دہلوی، طبع لاہور

رقعاتِ قتیل نولکشور پریس

رقعاتِ لچھمی نرائن، لچھمی نرائن، المکتوبہ
۱۸۸۲ء نولکشور پریس

رموز العارفین، مطبع نامی واقع لکھنؤ
۱۳۰۹ھ
۱۸۹۲ء
مطبع مجتبائی دہلی
۱۳۰۸ھ

مرتبہ سید احمد اللہ قادری
۱۳۵۲ھ

رنگینِ انشا، مرتبہ نظامی بدایونی، س ن

روایت کی اہمیت، ڈاکٹر عبادت بریلوی
(۱۹۵۳ء) کراچی (ص ۲۸-۲۳)

روحِ تنقید (جلد دوم) ڈاکٹر زور، دکن

رودِ کوثر، شیخ محمد اکرام، طبع بمبئی

ریاض الشعرا، والہ داغستانی، قلمی پنجاب یونیورسٹی لائبریری
(اس کا حال موجود نہیں، دوسرے ادبا
کے لیے دیکھا گیا)

ریاض الفصحا، مصحفی، طبع انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۴ء

(مصورہ) سحر البیان (۱) قلمی مکتوبہ ۱۲۳۹ھ

(۲) مملوکہ وزیر الحسن عابدی

(۳) مطبع حیدری ۱۲۶۹ھ

(۴) ۱۹۴۷ء مرتبہ شمس بیلوی

(۵) قلمی ۹۸۲ھ ذخیرہ شیرانی

(نواب حسن کی خود نوشت نسخہ)

(۶) مطبوعہ ۱۹۴۰ء نولکشور پریس

(اس کے علاوہ تین اشاعتیں اور بھی)

(۷) قلمی لاہور نسخہ نعیم

(۸) مرتبہ حامد اللہ افسر الہ آباد ۱۹۲۹ء

(۹) مطبع نظامی کانپور

(۱۰) قلمی مملوکہ ڈاکٹر نور محمد شفیع

سخن شعرا، نساخ، نولکشور پریس ۱۲۹۱ھ

سراپا سخن، سید محسن علی، نولکشور ۱۸۶۱ء

سرگذشت عجیب لعل، مطبع علی گڑھ

سرمۂ آزاد، غلام علی آزاد، طبع دکن ۱۹۱۳ء

سعادت یار خاں رنگین (حیات و کلام) صابر علی خاں

(پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ قلمی

پنجاب یونیورسٹی) (اب یہ کتاب انجمن ترقی

اردو کراچی کی طرف سے شائع بھی ہو چکی ہے)

سفینۂ ہندی، بھگوان داس (اقتباسات)

سکندر نامہ، نظامی، مطبع نولکشور پریس

سلک گوہر (انشاء) مرتبہ عرشی

سودا، شیخ چاند، انجمن ترقی اردو ۱۹۳۶ء

سیر المصنفین، یحییٰ تنہا (دو جلد) طبع اول دہلی

سیر المتاخرین، غلام حسین طباطبائی (اردو ترجمہ

مرآۃ السلاطین نولکشور پریس)

شباب لکھنؤ، محمد احمد علی (الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۱۲ء)

شعر الہند (دو جلد) عبد السلام ندوی ۱۹۳۹ء

شہزادہ سلیمان شکوہ کی اردو شاعری،

مظفر خاں برکی (ایم۔ اے کا تحقیقی مقالہ

پنجاب یونیورسٹی لائبریری)

طبقات الشعراء، شوق سنبھلی (اقتباسات)

قدرت اللہ سنبھلی (محض مطبوعہ علی گڑھ

میگزین، اگست ۱۹۳۹ء ص ۱۰۰ تا ۱۶۰)

طبقات شعرائے ہند، کریم الدین (طبع اول دوم)

طرز عشق (انتخاب کلام شعرا) نور حسن خان

مطبع نامی مفید عام آگرہ

طور کلیم، سید نور الحسن خاں ۱۲۹۵ھ

عقد ثریا، مصحفی، طبع انجمن ترقی اردو ۱۹۳۴ء

عماد السعادت، سید غلام علی خاں نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۹۷ء

غزل اور مطالعۂ غزل، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ۱۹۵۵ء کراچی ۹۶–۲۹۸

غزلیات میر حسن (غیر مطبوعہ) مرتبہ مرزا علی حسن لکھنؤ

فدوی حالات، شاعری اور کلام (دو جلد) پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ پٹنہ یونیورسٹی ڈاکٹر حسنین ۱۹۵۶ء

فلسفۂ میر، ڈاکٹر آہ سیتاپوری، ۱۹۳۶ء

فن داستان گوئی، کلیم الدین احمد، طبع اول ۲ ملین

فہرست کتبخانہ آصفیہ سرکار عالی (جلد دوم) ۱۳۳۲ھ

فہرست کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی ۱۳۱۳ھ

قاموس المشاہیر (دو جلد) نظامی بدایونی۔ ۱۹۲۴، ۱۹۲۶

قدیم ہندو مہتر دان اردو، سید اسرار حسین

قصۂ ماہ لقا، قلمی نوشتہ ۱۲۴۵ھ

تیسیر التواریخ، امیر محمد زائر، طبع ثانی

کاشف الحقائق، امداد امام اثر (دو جلد) طبع لاہور ۱۹۵۶ء

کلمات الشعراء سرخوش، مرتبہ دلاوری طبع لاہور

کلیات انشا، نولکشور پریس طبع جدید

کلیات انیس (تین جلد) نظامی پریس، نظم طباطبائی

کلیات جرات، جرات، قلمی پنجاب یونیورسٹی (امتر یبری)

کلیات سودا، سودا، قلمی مملوکہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی) ۱۹۳۱ء

کلیات سودا، سودا، (دو جلد) مرتبہ آسی)

کلیات مصحفی، قلمی مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

کلیات میر، میر تقی میر، (مرتبہ آسی) ۱۹۴۰ء

کلیات میر حسن، میر حسن، ۱۲۵۹ قلمی برٹش میوزیم مائیکرو فلم مملوکہ راقم)

گلدستۂ نشاط، منولال، طبع کلکتہ ۱۸۳۶ء

گذشتہ لکھنؤ، شرر، طبع لاہور

گلزار ابراہیم، خلیل، مطبوعہ انجمن (مرتبہ گلشن ہند)

گل رعنا، عبدالحی، طبع سوم ۱۳۶۴ھ دارالمصنفین اعظم گڑھ

گلشن بےخار، شیفتہ، طبع دوم نولکشور پریس

گلستان سخن، مرزا قادر بخش صابر، طبع اول

گلشن ہند، مرزا علی لطف، طبع ۱۹۲۴ء لاہور

گنجینۂ گلدستہ) طبع رامپور س۔ ن

لغات النسا، سید احمد دہلوی، ۱۹۱۷ء ۱۹۴۴ء

لکھنؤ کا دبستان شاعری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

طبع اوّل علی گڑھ
(طبع ثانی ابھی تک کو استعمال نہیں کیا گیا)

مثنویاتِ جرأت، قلمی پنجاب یونیورسٹی لائبریری

مثنویاتِ میر حسن (۱۹۰۸ء مخزن پریس دہلی)

مثنویاتِ میر حسن، مرتبہ آسی، نولکشور پریس ۱۹۴۵ء

مثنوی میر حسن، قلمی مکتوبہ ۱۲۳۸ھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

مثنوی خواب و خیال، طبع ثانی انجمن ترقی اردو۔ کراچی

مثنوی گل و صنوبر، قلمی مملوکہ وزیر الحسن عابدی

مجالس رنگین، رنگین، مرتبہ مسعود حسن رضوی ۱۹۲۹ء

مجمع النفائس، خان آرزو، قلمی پنجاب یونیورسٹی لائبریری

مجموعۂ نغز، قدرت اللہ قاسم (مرتبہ شیرانی) ۱۹۳۳ء

مختصر تاریخِ ادبِ اردو، اعجاز حسین دکن طبع سوم ۱۹۴۸ء

مخزن الغرائب، احمد علی سندیلوی، قلمی پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۱۴۸۲ (ذخیرہ شیرانی)

مخزنِ نکات، قائم، انجمن ترقی اردو دکن

مراۃ الشعراء، یحییٰ تنہا، طبع لاہور

مرزا میر (دو جلد) اثر لکھنوی، دہلی ۱۹۴۷ء

مسدسِ رنگین، رنگین، مرتبہ تحسین سروری کراچی ۱۹۵۳ء

مصحفی اور ان کا کلام، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مبارک علی طبع لاہور

مضامین چکبست، چکبست ۱۹۳۶ء الٰہ آباد

معرکۂ چکبست و شرر، ۱۹۴۲ء طبع ثانی نولکشور پریس

معدن الفوائد، قتیل، مطبوعہ

معمولاتِ مظہری، مطبوعہ

مفتاح التواریخ، بیل، نولکشور ۱۸۶۷ء

مقالات گارساں دتاسی، طبع اوّل ۱۹۴۳ء

مقاماتِ مظہری، مطبوعہ

مقدمۂ شعر و شاعری، حالی، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی

مقدمۂ رقعاتِ عالمگیر، مولانا نجیب اشرف ندوی، اعظم گڑھ

میر تقی میرؔ، خواجہ احمد فاروقی دہلی

میر حسن اور ان کے خاندان کے شعراء، محمود فاروقی، طبع اوّل راولپنڈی (طبع دوم دیکھی گئی لیکن حوالے صرف طبع اوّل کے ہیں)

نادراتِ شاہی، شاہ عالم آفتاب، مرتبہ عرشی ۱۹۴۴ء)

نسخۂ صحیحِ مجمع الاشعار، منشی حسین علی و سید جمیل الدین ہجر ۱۸۷۵ء

نشترِ عشق، قلمی ذخیرہ شیرانی پنجاب یونیورسٹی لائبریری

نفسیاتِ خواب، برگساں (اردو ترجمہ از معتضد ولی الرحمن)

نفسیاتِ فاسدہ، میک ڈوگل، اردو ترجمہ معتضد ولی الرحمن

نقد الادب، حامد اللہ افسر، لکھنؤ ۱۹۳۳ء

نکات الشعراء، میر تقی میر، طبع ثانی ۱۹۳۵ء انجمن ترقی اردو دکن

نور اللغات (چار جلد) مولوی نور الحسن نیر

نورتن، محمد بخش مہجور، (مطبوعہ)

نہر الفصاحت، قتیل، طبع لکھنؤ

واقعاتِ انیس، میر مہدی حسن احسن لکھنوی (طبع لکھنؤ)

واقعاتِ دار الحکومت دہلی (جلد اوّل دوم) بشیر الدین احمد، طبع اوّل

وقائع عالم شاہی، فراقی (مرتبہ عرشی) ۱۹۴۹ء رام پور

وقائع نعمت خان عالی، طبع لکھنؤ

ہفت تماشا، قتیل، ۱۸۷۵ء

ہفت قلزم، گوری شنکر

ہندو شعراء، عبد الرؤف عشرت، نامی پریس لکھنؤ ۱۹۳۱ء

یادگارِ انیس، مولوی امیر احمد علوی، (طبع لکھنؤ)

یادگارِ شعراء، مترجمہ طفیل احمد، ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد ۱۹۴۳ء

نوٹ:۔ مندرجہ ذیل کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا، لیکن مصادر کی فہرست میں بر اعتبار حروف تہجی درج نہ ہو سکیں۔ اب یہاں درج کی جاتی ہیں:۔

انتخاب جدید، مرتبہ آل احمد سرور و عزیز احمد طبع اوّل انجمن ترقی اردو دہلی

انتخاب یادگار، طبع رامپور

باغ فردوس، سید ولایت علی فردوس، سنہ ۱۹۲۵ء لکھنؤ،

تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی، (فرانسیسی زبان میں) دتاسی طبع ۱۸۷۱ء۔ ۱۸۷۰

تذکرۂ جدید شعرائے اردو، فیروز سنز لاہور

تذکرۂ شوق، عطاء اللہ پالوی، طبع لاہور سنہ ۱۹۵۷ء

(تذکرہ) مخزن شعراء، فائق، بسعی انجمن ترقی اردو

دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی، طبع ثالث

فسانۂ عجائب، رجب علی بیگ سرور، طبع نولکشور

کارنامۂ بلخ، سنائی، قلمی پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

رسائل و اخبارات

آجکل (دہلی) (۱) ڈاکٹر اطہر علی (بعنوان شیر علی افسوس)

(۲) سحر البیان، مقالہ از سید احتشام حسین، مارچ سنہ ۱۹۴۴ء

(۳) ۱۵ اپریل و یکم جون سنہ ۱۹۴۷ء

اخبار کارنامہ لکھنؤ، جلد ۲ نمبر ۴۶

ادب لطیف (لاہور) (۱) اکتوبر سنہ ۱۹۵۱ء ص ۵ تا ص ۷ مقالہ مولانا صلاح الدین احمد بعنوان میر حسن)

(۲) فروری سنہ ۱۹۵۲ء (ص ۱۳ تا ص ۱۵ مقالہ مرزا علی حسن بعنوان "میر حسن"

(۳) سالنامہ ۴۷-۱۹۴۸ء دیوان جہاں ص ۲۵ تا ص ۳۶ از ڈاکٹر عندلیب شادانی

(۴) ستمبر سنہ ۱۹۵۶ء مقالہ از راقم میر حسن (میر حسن کی ولادت)

ادبی دنیا (لاہور) (۱) اشاعت خاص سنہ ۱۹۵۱ء (ص ۸ تا ص ۱ مقالہ) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بعنوان میر حسن کی شاعری

(۲) دسمبر ۱۹۴۲ء مقالہ مختار الدین آرزو
بعنوان تاریخ ادب اردو از نگینہ
(صہ ۱۳ تا صہ ۳۱)
امروز (اخبار لاہور) ۲۵ فروری ۱۹۵۲ء
(مقالہ بعنوان سحر البیان
از ابوالحسن نخعی)
اورنٹیل کالج میگزین (لاہور)
(۱) فروری و مئی ۱۹۵۵ء (مقالہ دیم نسیم)
(۲) مقالات شیرانی بر آب حیات
نومبر ۱۹۴۱ء بیجد
(۳) مئی ۱۹۲۶ء (مقالہ ڈاکٹر محمد شفیع)
(۴) اکتوبر ۱۹۲۸ء
(۵) مارچ ۱۹۵۷ء (مقالہ راقم حالات
فن کے دو ماخذ)
تصویریہ (رامپور) مدیر سید اشرف نیدی جلد ۵
نمبر ۲ فروری ۱۹۴۳ء
(مقالہ فائق بعنوان رموز العارفین
پر ایک نظر (صہ ۲۴ تا صہ ۳۰)
دکن ریویو (دکن) تبصرہ بر سحر البیان
زمانہ / جنوری ۱۹۲۰ء فروری ۱۹۳۱ء
(دیباچہ افسوس)

سب رس (دکن) نومبر / دسمبر ۱۹۵۰ء
جلد ۲۱ شمارہ ۱۱ / ۱۲
(حصہ ۹ بعد)
صحیفہ (لاہور) نمبر ۳ (مقالہ بر تاریخ ادبیات
مندوی و ہندوستانی
ضمیمہ اورنٹیل کالج میگزین (لاہور) مئی
۱۹۴۸ء
عالمگیر (لاہور) دسمبر ۱۹۵۰ء (مقالہ بعنوان
سحر البیان)
علی گڑھ میگزین (علی گڑھ) طنز و ظرافت نمبر
(مقالہ بر میر ضاحک از قاضی عبدالودود
صاحب (صہ ۱۲۳ تا صہ ۱۴۷)
کاروان (لاہور) ۱۹۳۴ء جلد دوم
کامران (سرگودھا) سالنامہ ۱۹۵۷ء
(مقالہ راقم میر حسن کی شخصیت)
ماحول (راولپنڈی) شمارہ نمبر ۲ (مقالہ راقم
بر مصحفی اور اس کا کلام)
ماہ نو (کراچی) (۱) مقالہ فائق
(۲) نومبر ۱۹۴۹ء
مخزن (لاہور و دہلی) اپریل ۱۹۱۰ء مقالہ شیرانی
بر کلیات حسن جلد اول نمبر ۴ (صہ ۲۵ تا صہ ۳۵)

مشرب (کراچی) تاریخ ادب اُردو نمبر ۱۹۵۶ء

بر مقالۂ پروفیسر خان رشید

بعنوان مثنوی سحرالبیان)

معارف (اعظم گڑھ) (۱) نمبر ۱ جلد ۸۰،

(دہشتی یزدی بر ڈاکٹر نذیر احمد کا مقالہ

ص ۲۱ بعد)

(۲) نمبر ۱ جلد ۷ جولائی ۱۹۵۲ء

(مقالہ فائق بعنوان سودا کی صحیح عمر)

ص ۶۸ بعد)

معاصر (پٹنہ) حصہ اول تا حصہ چہارم دہم

معیار (پٹنہ) مارچ تا اگست ۱۹۳۶ء

منشور - ۱۲ جولائی ۱۹۵۴ء

مقالۂ مرزا علی حسن بعنوان میر حسن

کی غزل گوئی

نوائے ادب (بمبئی) جلد اول بعد

نقوش (لاہور) (۱) اگست ۱۹۵۳ء

(قاضی عبدالودود کا مقالہ ص ۲۲(۲۰))

(۲) جنوری ۱۹۵۷ء (مقالہ راقم تذکرہ

شعرائے اُردو)

نگار (لکھنؤ) (۱) جنوری فروری ۱۹۵۰ء

(ص ۵۳ تا ص ۶۲ مقالۂ سید محمد قادری

بعنوان ضمیر شیر علی افسوس)

(۲) دسمبر ۱۹۵۲ء

(۳) فائل ۱۹۳۷ء (۴) مصحفی نمبر

نئی تحریریں (لاہور) شمارہ نمبر ۱ (مقالہ راقم

سودا کی غزل گوئی)

ہمایوں (لاہور) نومبر ۱۹۴۱ء اردو کی

مثنویاں (سحرالبیان پر مدعلیخاں کا مقالہ)

A catalogue of the Arabic, Persian and Hindustani MSS. of the libraries of the kings of Oudh.-(1854) A Sprenger Vol. I

A Description catalogue of the oriental library of the late Tipu Sultan of Mysore (1809) C. Stewart.

A History of the urdu literature R.B Saksena

Anis and Shakespeare. S. Ghulam ...

Supp. cat. of Hindustani Books in British Museum (1889) M. H court.

Cambridge History of India (vols 4&5) Ed. Dodwel

Cat. of the Hindi Punjabi & Hindustani Mss. in the Lib. of B. M.

Cat. of Hindustani Printed Books in Britsh Museum (1827) Blumhardt.

Catalogue of the Hindustani Mss. in India Office (1926) Blumhardt.

Delhi Guide.

Encyclopodia of Islam. (Under Afsus)

Hand Book of Urdu Literature. Dr. Mohan Singh.

History of British India (1921) P.E. Robert.

Humayum Badshah (2 vols.) Dr Banerji.

India of Aurangzeb (1901) J. N. Sarkar.

Imperial Gazetteer of India (1888) W. Hunter.

Islamic Literature. March. 1954.

Khan-e-Arzu his life and times (Typescript) Dr. Manohar S. ... Anwar.

Lahore past and present Dr. M. Baqir.
Later Mughal rule in the punjab. Gupta
The Later Mughals (2 vols) 1922. W. Irvine.
Life and times of Imad-ul-Mulk (M.A Thesis
P.U.L. S. Ali Abbas.
Memoirs of Delhi and Faizabad (2 vols)
Eng. Tr. of Tarikh-e-Farah Bakhsh. (1889) W. Hoey.
Mir Qasim (1935) Dr. Nand Lal chatterjee.
Najib-ud-Daula - his life and times (Tr. of
Sarguzasht-e-Najib-ud-Daula) P. (52).
Tr. with Int. Sh. Abdur Rashid.
proceedings of Indian Historical congress
Allahabad session (1938.)
PSYCHOLOGY of day dreams. (192) T. Varendonck.
psychology the study of Man (ch. T. by Dr. Mary collins.)
seven cities of Delhi.
Shuja-ud-Daulah (2 vols) Dr. Srivastava.
vol I (1939) vol II (1945)
The Agrarian system of Moslem India. W. H. Moreland.
The Basic writings of Freud Brill.
The cambridge shorter History of India

Part III. H. H. Dodwell.

The central structure of Mugal empire

Dr. Ibn-e-Hasan.

The Fall of the Mughal Empire (4. vols)

vol I 1949. II (1950) III (1952) IV (1950) Sir. J. N. Sarkar.

The First two Nawwabs of Audh. Dr. Srivastava.

The history of Jahangir. Dr. Beni Parshad.

The Main currents of Maratha History - G. S. Sardesai.

The Making of Indian Princes. E. Thompson.

The oriental Biographical dictionary Beale.

Twilight of the Mughals (1951) P. Spear.

حاشیہ صفحہ ۱۱۰

نشترِ عشق (قلمی شیرانی کلیکشن) ورق ۴۷ و ۴۸ ل پر میر امانی کا ذکر کر کے لکھا ہے: بہ ہندوستان آمدہ بعہدِ اکبری در سنۃ نہصد و ہشتاد و یک بہ جونپور رسیدہ در دوانیدن اسپ از خانۂ زین بر روئے زمین افتادہ امانتِ جاں بجاں آفریں سپرد۔ مخزن الغرائب (احمد علی سندیلوی قلمی شیرانی کلیکشن) میں ورق ۲۴ ب پر میر امانی ہروی اور ورق ۲۶ ل پر میر امانی کابلی کا ذکر کیا ہے کابلی کے حال میں لکھا ہے کہ "در جونپور از اسپ افتادہ و بہ آں الم درگذشت ... شاید کہ ایں ہر دو شاعر یکے باشند از غلطی ہرانی نوشتہ اند۔ اما صحیح تر در کابلی بودنِ او شکے نیست۔ چرا کہ شیخ عبدالقادر او را دیدہ و اشعارش در بدائونی (کذا) ثبت نمودہ (ورق ۲۶ الف) امانی اکبری دور میں ہندوستان آیا۔ میر حسن کے مورثِ اعلیٰ شاہجہانی عہد میں آئے اس لیے ہمارے خیال میں امامی ہروی اور امانی کابلی کو ایک سمجھنا درست نہ ہوگا۔

محمد شمیم پرنٹر پبلشر نے استقلال پریس لاہور سے چھپوا کر اردو بک سٹال لاہور سے شائع کیا